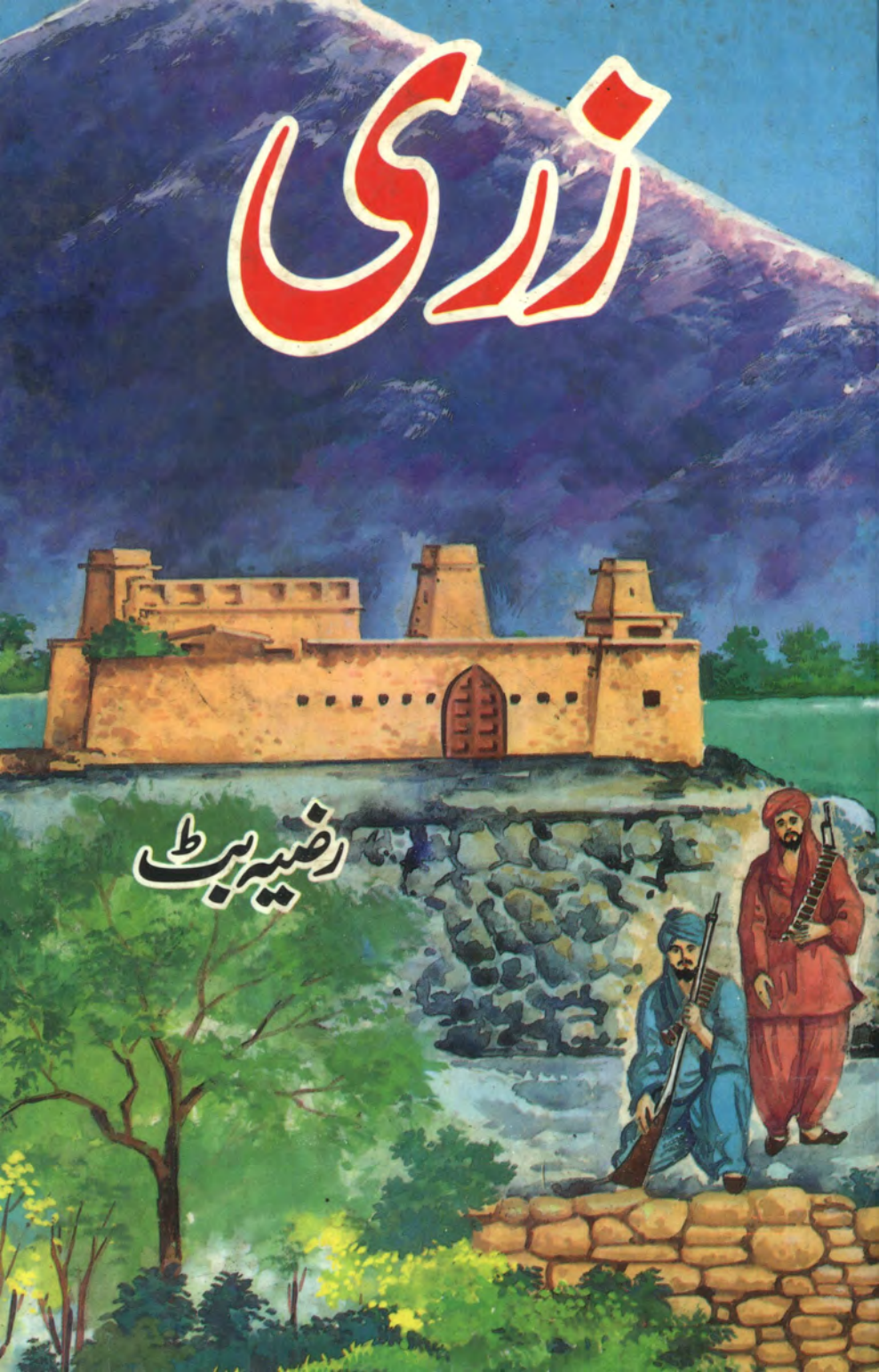


زری

رضیہ پٹ





اس رات موسم بے حد حسین تھا۔ بارش اب تھم چکی تھی۔ آسمان دھل کر نکھر آیا تھا۔ بدلیاں ٹوٹ ٹوٹ کر آوارہ پھر رہی تھیں۔ سینہ چرخ پر چاند ستاروں سے آنکھ پھولی کھیل رہی تھیں۔ کبھی سمٹ کر غائب ہو جاتیں تو دو دھیاسی چاندنی ہر سو پھیل جاتی۔ اور کبھی امنڈ آتیں تو چاند ستاروں کی روشنی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتیں۔ اک نام تمام سامنے لگ جاسا جالا دو دھیاسی چاندنی کی جگہ لے لیتا۔

ہواؤں کا زور بارش ختم ہونے کے ساتھ ہی ٹوٹ چکا تھا۔ اور اب ہولے ہولے دھیرے دھیرے پھوار کا نرم و لطیف بوجھ اٹھائے چل رہی تھیں۔ پھولوں کی مہک پھوار کی خنکی میں رچی بسی تھی۔ جب یہ مترنم ہوائیں سر سراتے ہوئے کھڑکیوں کے ریشمی پردوں سے چھینر چھاڑ کر تیں۔ تو پھوار کا ہلکا سا ریلا پھولوں کی مہک اور مٹی کی سوندھی خوشبو کمرے کے اندر لے آتا۔ فضا میں یہ حسین خوشبو اور مہک بکھر جاتی کمرے کی فضا مترنم اور متبسم ہو اٹھتی۔

لیکن

موسم کے اس حسن سے اس خوبصورتی اور مہک سے اس وقت زوہی محفوظ ہو رہی تھی نہ ہی شہباز

خان۔

زوہی خوبصورتی اور سلیقے سے آراستہ خوابگاہ کے نرم و گداز بید پر چت پڑی تھی۔ کمرے میں گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ روشنی اندھ سی لگ رہی تھی۔ آرائش و زیبائش سے وحشت ہو رہی تھی۔ ان گنت سوچوں نے اس کے ذہن کو مازف کر دیا تھا۔ وقفوں کے بعد اس کے نرم و نازک وجود کو جھٹکے لگ رہے تھے۔ اندر ہی اندر ہچکیاں ٹوٹ رہی تھیں..... سسکیاں دم توڑ رہی تھیں۔ اس کا پرکشش خوبصورت چہرہ پریشانی اور اداسی سے دھندلا رہا تھا..... وہ کھلی آنکھوں سے ٹونٹے بکھرتے سنے دیکھ رہی تھی۔

کچھ ہی حال شہباز خان کا بھی تھا.....

وہ خوابگاہ میں ٹل رہا تھا..... کبھی ٹپٹے ٹپٹے رک جاتا۔ سوچنے لگتا۔ سگریٹ پہ سگریٹ پھونکے جاتا..... وہ خوبصورت گرائڈیل اور باوقار سانہ جوان حالات کے سامنے جھک جانے کی سی کیفیت سے دوچار دکھائی دینے لگتا تھا۔

اور

اس کی اسی کیفیت سے زوبی کے اندر موت کی سی کپکپاہٹ اتر رہی تھی..... وہ بیدم سی ہو گئی تھی..... آنکھیں متورم تھیں بال بکھرے تھے..... لباس بے ترتیب تھا..... آنکھیں بالکل خشک تھیں ان کا سارا پانی تو دو دن میں بہ چکا تھا.....

شہباز نے اک نیا سگریٹ سلگا یا۔ ماچس کی تیلی جھٹکے سے بجھا کر ایش ٹرے میں پھینک دی۔ ایک بے جان سا کش لیتے ہوئے زوبی کی طرف دیکھا۔

زوبی نے اپنی ویران خشک آنکھیں بند کر لیں۔

شہباز نے چاہا کہ آگے بڑھ کر اسے تسلی دے۔ اسے بازوؤں میں بھر کر پیار کر لے۔ اس کے سارے دکھ اپنے اندر اتار لے۔

لیکن

وہ کیسے تسلی دیتا ہے۔ کیا کتنا..... دو دن سے تسلیاں ہی تو دے رہا تھا..... لیکن وہ بھی جانتا تھا اور زوبی بھی آگاہ تھی کہ ان تسلیوں سے کچھ نہیں ہونے کا..... کچھ بھی نہیں ہونے کا.....

خان بابا نے شہباز خان کو صرف دو دن کی مہلت دی تھی سوچنے کی..... اور آج رات دس بجے انہوں نے فون پر اس کا فیصلہ سننا تھا۔

یہ دو دن کیسے گزرے تھے زوبی اور شہباز ہی جانتے تھے۔

اور

اب

گھڑی کی سوئیاں دس بجے کی طرف سرک رہی تھیں۔ فیصلہ کن لمحہ ہوئے ہوئے قریب آ رہا تھا.....

دونوں کے دل تھم تھم جاتے تھے۔ دھڑکننا بھول رہے تھے۔ گاہے گاہے دونوں کی نگاہیں وال کلاک کی طرف اٹھتی اور پھر سائیز ٹیبل پر رکھے فون کی طرف آ جاتیں۔ موسم کے حسن کی رعنائیوں اور شادابیوں کو جانچنا پرکھنا محسوسات کی دُور سے بندھا ہوتا ہے۔ فضا میں کتنی ہی رنگینی ہو۔ موسم میں کیسی ہی خوبصورتیاں رچی بسی ہوں ماحول میں کتنا ہی فسوں ہو۔ انسان اس سے پہلے اس وقت تک متاثر نہیں ہوتا جس

وقت تک اس کے اندر انہیں جانچنے پر کھٹے اور ان سے حظ اٹھانے کی امنگوں کا پھیلاؤ نہیں ہوتا۔ شوق اور زندہ دلی نہیں ہوتی۔

من میں سکون ہو تو ہر چیز ہنستی مسکراتی لگتی ہے۔ خوبصورت رعنائیوں سے بھرپور دکھائی دیتی ہے۔ فضا ماحول اور گرد و پیش کا کھرا کھرا حسن آپوں آپ متاثر کرنے لگتا ہے۔ جی اس رعنائی اور شادابی کے ایک ایک انگ سے اپنا حصہ وصول کرنے کے لئے چل اٹھتا ہے۔

چند دن پہلے بھی کچھ ایسا ہی موسم تھا۔ ایک ایک بادل گھر آئے تھے۔ ہواؤں میں زور آ گیا تھا..... سوکھی زمین پر بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ تو فضا میں سوندھی سوندھی باس پھیل گئی تھی..... پھولوں کی مہک اتر آئی تھی.....

شہباز باہر سے آیا تھا۔ تو زوبی کھلے ہوئے پھول کی طرح اپنی مہک پھیلاتی اس کی طرف لپکی تھی۔ اس کے ہاتھ سے بریف کیس لیتے ہوئے بولی تھی ”موسم کتنا حسین ہے شہباز۔ چلو باہر چلتے ہیں۔ لمبی ڈرائیو پر..... برا مزہ آئے گا.....“

شہباز نے اس کی نازک سی کمر کے گرد اپنا مضبوط بازو حائل کرتے ہوئے اسے اپنے قریب کر لیا تھا اور پھر مستی بھرے انداز میں بولا تھا..... ”مزہ تو گھر پہ بھی آئے گا۔ موسم انجوائے کرنے کے لئے لمبی ڈرائیو ہی کیوں..... اپنا بیڈروم.....“

”ہو بھئی.....“ زوبی اس کے ساتھ ساتھ قدم اٹھاتے اندر آ گئی تھی۔ پھر بڑے شوخ اور رسیلے لہجے میں بولی تھی..... ”باہر چلتے ہیں نا..... گھر میں موسم انجوائے کرنے کو جی نہیں چاہ رہا۔“

”اچھا بھئی.....“ شہباز نے اس کے بالوں پر لب رکھ کر کہا ”پہلے کپڑے تو بدلنے دو۔ چائے تو پلاؤ..... باہر سے آ رہا ہوں.....“

”ٹھیک ہے.....“ زوبی اس کے بازو کے حلقے سے ٹپکتے ہوئے بولی ”آپ کپڑے بدل لیں۔ میں چائے بنواتی ہوں..... پھر شام تک..... نہیں رات تک باہر گھومیں گے..... ٹھیک.....“ شہباز نے پیار سے اس کی ناک کی پھنگ پر انگلی رکھ کر اس کا ہوائی پیار لے لیا تھا..... وہ اٹھلاتی مسکراتی بچن کی طرف بڑھی اور شہباز اپنے کمرے میں کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا۔

زوبی نے حاکم بابا سے چائے بنانے کا کہا تھا..... ”حاکم بابا اچھی سی چائے بنا کر لاؤنج میں لے آؤ..... بسکٹ تو ہوں گے!“

”ہاں بیٹا میں بسکٹ..... حلوہ بھی ہے.....“ حاکم بابا نے کندھے پر پڑے کپڑے سے ہاتھ پونچتے ہوئے کہا تھا.....

”ہاں وہ طلوہ..... جو می کل لائی تھیں..... کراچی والا.....“ زوبی نے بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے طلوہ کا مزہ لیتے ہوئے کہا تھا..... ”ضرور لاؤ چائے کے ساتھ بڑا مزیدار ہے۔ شہباز کو تو بہت پسند ہے یہ طلوہ.....“ می نے انہی کے لئے مشکوٰۃ لایا ہے کراچی سے“

”اچھا بیٹا.....“ حاکم بابا بچن میں جاتے ہوئے بولا تھا۔

زوبی لاؤنج میں پڑے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ واسنے ہاتھ کی لمبی چوڑی کھڑکی کے پردے ہٹا دیئے تھے..... کھڑکیوں کے پٹ کھول دیئے تھے۔ سبک خرام ہوائیں البرد و شیزہ کی سی متانہ روی سے اندر آ رہی تھیں..... لاؤنج کے کونوں میں سجائے ہوئے خوبصورت پلانٹ ہوا کی اس چھیڑ سے محظوظ ہو کر جموم رہے تھے۔ بارش کھل کر تو نہیں برس رہی تھی۔ ہاں بڑی بڑی بوندیں بادلوں کے سینے سے رس رس کر مٹی میں جذب ہو رہی تھیں..... تیز بارش اتر آنے کا بھی امکان تھا۔ اور صرف بادلوں کے ہواؤں کے دوش پر اڑنے بکھرنے کا بھی.....

زوبی کو ایسا موسم ہمیشہ ہی پسند تھا..... اور اب تو شہباز کے سنگ اس موسم کی رومانیت بھی اثر انداز ہوتی تھی۔ زوبی تو جیسے بیخود بے سدھ ہو جاتی تھی..... ایسا موسم اور محبوب کی قربت..... رنگ ہی اور ہو جاتا تھا.....

ان کی شادی کو ابھی صرف دو ماہ تین دن ہی تو ہوئے تھے۔

جنوں خیر خوشیوں اور ہمار آفریں مسرتوں کے دن تھے..... شادی ہوتے ہی وہ گھونٹے پھرنے نکل گئے تھے۔ ڈیڑھ پونے دو ماہ مری کے مرغزاروں اور کراچی میں شوریدہ سرسندری لہروں کے سنگ گزارے تھے۔ ملک سے باہر جانے کا بھی پروگرام تھا۔ لیکن شہباز نے ابھی پروگرام کو آخری شکل نہ دی تھی۔ ملک و مقام ان دنوں ان کے لئے بے معنی بھی تو تھے۔ دونوں کا ساتھ تھا۔ جہاں بیٹھ جاتے زمانے بھر کی رنگینیاں وہیں سمٹ آتیں۔ جہاں چل پڑتے مسرتیں دیدہ و دل فرس راہ کئے ہوتیں..... انہیں ان دنوں گرد و پیش کا ہوش ہی کب تھا..... ہوش تھا تو فقط اتنا کہ اب وہ دونوں ایک ہو چکے ہیں.....

ایک دوسرے کو چاہتا اور پایا تھا۔ اب پا کر تو چاہتیں اتنی اپنی ہو گئی تھیں۔ کہ زندگی کے کسی ایک بھی لمحے سے انہیں الگ کرنا ممکن نہیں تھا.....

گھوم پھر کر وہ واپس آئے تھے۔ تو دو ہفتے می کے ہاں ہی قیام کیا تھا۔ نئی نئی چاہتوں کی رت تھی۔ دونوں بہت چاہتے تھے۔ کہ ان کی تمنائیاں اپنی رہیں۔ کوئی ان میں غل نہ ہو۔

لیکن

عزیزو اقارب اور می ڈیڈی کے دوستوں کی محبتیں بھی بڑی زور آور تھیں۔ کبھی کوئی دعوت دے رہا ہے۔ کبھی کوئی کھانے پہ بلارہا ہے۔ ان محبتوں کا حزام بھی کرنا ہی پڑتا تھا.....

بڑے حسین و رنگین شب و روز تھے۔ می کے ہاں سے وہ اپنے اس نئے گھر میں آگئے تھے..... جب وہ ماہ عمل منانے گئے ہوئے تھے۔ می نے شہباز کا تین بیڈروم کا بنگلہ نئے ساز و سامان سے آراستہ کر دیا تھا۔ زوبی کے ذوق کو مد نظر رکھتے ہوئے پورے گھر کی آرائش نئے سرے سے کی تھی۔ فرنیچر کارپس پردے سبھی نئے ڈلوائے تھے..... منگی ترین زسریوں سے ان ڈور پلائس خرید کر رکھے تھے۔ جانتی تھیں زوبی کو مصنوعی پھول پودے بالکل نہیں بھاتے.....

شہباز اور زوبی نے گھر کو دیکھ کر نہال ہو گئے تھے۔ می نے اپنا پرانا خانہ سالماں حاکم بھی بھیج دیا تھا..... ایک معمر سی نوکرانی کا بندوبست بھی کیا ہوا تھا..... وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی اکلوتی حسینی بیٹی کے آسائش و آرام میں کسی قسم کی بھی خلل اندازی ہو..... می نے گھر گرہتی کا سارا بار نوکروں پر ڈال دیا تھا۔ زوبی ہر طرح سے آزاد تھی۔

یہ دن بھی تو ایسے ہی تھے نا..... صرف مسرتیں حاصل کرنے کے خوشیاں نچوڑنے کے گھر کے اندر گھر کے باہر صرف اور صرف ایک دوسرے کی معیت میں زندگی سے خراج وصول کرنے اور چھیننے کے..... موسم کی بہاریں لوٹنے اور پانے کے.....

دونوں جب جی چاہتا بیڈروم میں کھس جاتے..... ان کے خوش کن قہقہے فضا میں تحلیل ہوتے و لہر بہ سرگوشیاں وقت کے کانوں میں اترتیں تو وقت کے لب بھی متبسم ہو جاتے..... جی چاہتا تو گھر سے باہر نکل جاتے..... میلوں ڈرائیو کرتے..... ہنستے کھیلتے..... چھیڑتے چھاڑتے..... روٹھتے ہنستے..... یوں زندگی اور حسین بنا لیتے.....

اس دن بھی موسم کے حسن کو دیکھ کر زوبی کا من مچلا تھا۔ شہباز کو انکار نہیں تھا۔ وہ تیار ہو کر لاؤنج میں آگیا تھا..... خان کھر شلوار قبض پر اس نے ڈارک براؤن رنگ کی کوئی پٹنی تھی۔ بھاری تلے والی پشادوری چپل پاؤں میں تھی۔

زوبی نے اسے سر سے پاؤں تک بڑے پیار سے دیکھا تھا۔

”کیا دیکھ رہی ہو.....“ شہباز دھم سے اس کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

”بالکل پٹھان لگ رہے ہو.....“ وہ چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ شہباز کو اس کی بات پر ہنسی آگئی۔ اسے گد گدی کرتے ہوئے بولا تھا۔ ”پٹھان ہی تو ہوں..... اصل پٹھان.....“

”وہ تو ہو.....“ زوبی مسکرائی تھی..... ”لیکن اس وقت بالکل ہی پٹھان لگ رہے ہو.....“

”بے وقوف کہیں کی.....“ شہباز نے اپنی خوبصورت سیاہ آنکھوں کی مستی اس کی نشیلی حسین آنکھوں میں انڈ بلیتے ہوئے اسے پھر گد گدی کرنا چاہی تھی تو وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے اس سے قدرے دور

ہٹ گئی تھی.....

شہباز نے اس پر چہنچہنا چاہا تھا۔ لیکن حاکم بابا چائے کی ٹرائی لئے آگیا تھا.....
چائے کے بعد دونوں باہر چلے گئے تھے.....

پھر

میلوں ڈرائیو کی تھی..... موسم کی دلفریبی کا پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ کبھی گاڑی سڑک کے کنارے روک لی تھی۔ کبھی سڑک کے کنارے پھیلے درختوں پودوں اور جھاڑیوں تلے بیٹھ رہے تھے..... سنسان سے گوشے بھی تلاش کر لئے تھے..... جہاں محبتوں نے اپنا خزانہ وصول کیا تھا.....
رات کھانا بھی باہر ہی کھایا تھا..... اور جب واپس آئے تھے۔ تو بدست شرایین کی طرح قدم بمک رہے تھے۔ سرشاری کی کیفیت دونوں پر ہی طاری تھی۔

آج

آج بھی موسم رسیاہی تھا۔ رنگین حسین اور جذبات انگیز.....

لیکن آج

ذہن منتشر تھے۔ من تفکرات کے گہرے سمندر میں ڈوبے تھے۔ کچھ سوچہ بوجھ ہی نہیں رہا تھا..... کوئی راہ بھائی نہ دے رہی تھی..... کرب و اذیت کی منزلوں سے گزرتے دودن ہو گئے تھے.....
دودن پہلے ہی تو خان بابا کا فون آیا تھا.....

یہ فون کیا تھا..... مسرتوں اور خوشیوں کے خرم پر کڑکڑاتی بجلی آن گری تھی۔

خان بابا نے اپنی کڑکڑتی گویخدا آواز میں صرف چند جملے کہے تھے..... ان کا آخری جملہ تھا۔

”دودن بعد رات دس بجے میں فون کروں گا..... تمہارا جواب سننے کے لئے.....“

جواب

جو اس وقت بھی وہ مانگتے تو یہی سنا چاہتے اور دودن کے بعد بھی سنیں گے تو جواب وہی چاہیں گے جو

وہ چاہتے ہیں.....

شہباز جانتا تھا..... کہ خان بابا کے رویے میں چلک کا کوئی گزر نہیں۔ جو بات ان کے منہ سے نکل جائے پتھر پر لکیر ہوتی ہے۔ وہ جو کہتے ہیں بلا تامل کر گزرتے ہیں..... یہی بات وہ دودن سے زوبی کو بھی سمجھا رہا تھا.....

لیکن

زوبی

زوبی کیسے مان لیتی..... کس دل سے ہاں کہہ دیتی..... کیونکر خان نواز خان کی لٹکائی ہوئی سولی پر

چڑھ جاتی.....

رورو کر اس نے برا حال کر لیا تھا..... شہباز خود بھی بہت پریشان تھا بے چین تھا مضطرب تھا۔

لیکن اس حقیقت سے بھی آگاہ تھا..... جو ملنے والی نہ تھی.....

گھڑی کی سوئیاں دھیرے دھیرے اپنی مخصوص رفتار سے کھسک رہی تھیں..... ایک ایک منٹ جو گزر رہا تھا۔ زوبی کو یوں لگ رہا تھا۔ وہ لمحوں کے بوجھ تلے دفن ہوتی جا رہی ہے۔ وہ شہباز کو حسرت سے دیکھ رہی تھی..... جو وقت کے ساتھ ساتھ ٹوٹے بکھرتے جھکاؤ کی سمت جا رہا تھا.....

دس بج گئے

اور

پھر

دس بج کر ایک منٹ پر فون کی گھنٹی خطرے کے سنگین الارم کی طرح بج اٹھی۔ شہباز پلٹا.....

قدم اٹھائے

ہاتھ بڑھایا

لیکن

”نہیں..... شہباز نہیں.....“ زوبی چیختے ہوئے بیڈ سے اٹھی اور شہباز سے لپٹ گئی.....

”زوبی میری جان.....“ شہباز نے اسے بازوؤں میں بھر کر فون اٹھالیا.....

”ہلو.....“ زوبی نے صرف شہباز کے منہ سے نکلا یہی لفظ سنا..... اس کے بعد وہ بھر بھری ریتلی

مٹی کی طرح اس کے بازوؤں سے ٹکلی چلی گئی.....

.....○.....

کی کھلی اجازت تھی۔ خان کے ملازمین آنے والوں کی خاطر مدارات کرنے میں مصروف رہتے۔ بڑھیا قسم کے تمباکو سے چلمیں بھر بھر کر آنے والوں کو پیش کرتے تھے۔ قبوے کے دور چلتے۔ چینی کی نفیس پیالیوں میں سنہری سنہری رنگت کا خوشبودار قہوہ سب کو پیش کیا جاتا.....

خان خوشدل خان کا حجرہ بہت وسیع و عریض تھا۔ پٹھانوں کی تہذیب میں حجرے کو اک خاص مقام حاصل ہے۔ یہ بیٹھک ہوتی ہے مہمان خانہ ہوتا ہے۔ مردان خانہ ہوتا ہے۔ گاؤں کے لوگ یہاں آکر بیٹھتے ہیں..... اپنے سکھ دکھ بانٹتے ہیں۔ معتبر لوگ بھی آتے ہیں اور عام لوگ بھی..... مسافروں کو بھی یہاں پناہ ملتی ہے اور گھروں سے فرار حاصل کرنے والوں کو بھی..... کبھی کبھی تو مفرو اور مخبر بھی یہاں سر چھپایا کرتے تھے۔

خوش دل خان کے حجرے سے ملحقہ مسجد بھی تھی..... جہاں خان خود بھی پانچوں وقت کی نماز پڑھتا تھا..... مسجد چھوٹی سی تھی۔ لیکن سرسبز رختوں سے گھری ہوئی صاف ستھری تھی..... گرمیوں میں جب حجرے میں لوگوں کی تعداد بڑھ جاتی تو بہت سے لوگ مسجد میں چلے آتے۔

حجرے میں بڑے بڑے پایوں والے بان کے پلنگ پڑے رہتے۔ جن پر گاؤں تکتے ہوئے دیواروں پر جابجا شکار کئے ہوئے جانوروں کی کھالیں لٹکی ہوتیں۔ بندوقیں اور رائٹفلیس بھی دیواروں پر لٹکی رہتیں..... صحن کے عین درمیان میں آگ جلتی رہتی۔ سردیوں میں یہ آگ تاپنے کے لئے ہوتی اور گرمیوں میں صرف چلمیں بھرنے کے لئے.....

خان کے حجرے میں ہمیشہ رونق رہتی۔ شامیں بڑی خوشگوار ہوتیں۔ لوگ رات گئے تک بیٹھے رہتے۔ باتیں ہوتیں۔ مسائل گوش گزار کئے جاتے۔ ان کے حل تلاش کئے جاتے۔ کبھی کوئی خوش الحان محفل کوٹے سنا کر لوٹ لیتا..... عثمان خان کو قدرت نے بڑی رسیلی اور دردیلی آواز سے نوازا تھا..... یہ خوش دل خان کے اک مزارعے کا بیٹا تھا۔ گھرے کی تھا پرجب وہ پُرسوز لے میں پُے گا تاواک ساں بندھ جاتا۔ خان اسے بطور خاص سننے حجرے میں رات گئے تک ٹھہرا رہتا.....

اس حجرے میں جرگے بھی بیٹھتے تھے۔ بڑے بڑے تنازعات یہیں حل کئے جاتے۔ مفتی بھی آجاتا..... لیکن خوش دل خان کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوتا۔ کسی کو اس فیصلے سے انکار کی جرأت نہ ہوتی..... اور کبھی ایسا ہوتا۔ تو خان کے جانثاروں کی رائٹفلیس اور بندوقیں حرکت میں آجاتیں.....

حجرے کے ہال نما لیے لیے کمرے بھی تھے۔ جہاں فرش سرخ قالینوں سے ڈھاپے رہتے۔ یہاں بھی دیواروں پر بہادری اور شجاعت کی کہانیاں کتبی برسوں پرانی اور نئی بندوقیں منگی رہتیں۔ قالینوں پر دیواروں کے ساتھ ساتھ موٹے موٹے روٹی کے گدے پڑے ہوتے۔ جن پر گاؤں تکتے رکھے ہوتے تھے۔

شہباز کا تعلق سرحد کے ایک معزز اور معتبر خاندان سے تھا۔ اس کے دادا خوش دل خان اپنے علاقہ کے مانے ہوئے رئیس تھے۔ چار سده سے تھوڑی دور جہاں بیحد زر خیز زمینیں اور باغات تھے ان کا گاؤں آباد تھا..... گاؤں کے کچے کچے مکانوں میں خوشدل خان کی شاندار حویلی اک تمکنت اور وقار سے کھڑی تھی۔ یہ حویلی پٹھانوں کی روایات کی آئینہ دار تھی..... حویلی کے چاروں طرف فصیل نما کچی دیوار تھی۔ جس کے چاروں کونوں پر مورچے بنے ہوئے تھے۔ ان مورچوں میں خوشدل خان کے چاک و چوبند سپرہ دار رائٹفلیس سے لیس موجود رہتے تھے۔ یہ حفاظتی تقاضے بھی تھے اور حویلی کی آن بان کے مظہر بھی..... لوہے کا بہت بڑا اور بہت اونچا پھانک حویلی میں داخل ہونے کا راستہ تھا..... اس پھانک پر خان خوشدل خان کے جیالے اور جانثار ملازم ہمیشہ اپنے فرض کی ادائیگی کے لئے مستعد ہوتے تھے..... بڑے بڑے پایوں والے بان کے پلنگ وہاں پڑے رہتے۔ جن پر یہ سپرہ دار بیٹھ کر آنے جانے والوں پر نگاہ رکھتے۔ ساتھیوں کے ساتھ چلمیں پیتے اور زمانے بھر کی باتیں کیا کرتے..... حویلی کئی لمبے لمبے دالانوں پر آمدوں اور شہ نشینوں پر مشتمل تھی۔ بے شمار کمرے تھے..... ہر کمرہ سرخ سرخ قالینوں اور پھولدار پردوں سے آراستہ تھا۔ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی..... خان خوشدل خان پشاور جاتے آتے رہتے تھے۔ شہری سولتیں وہاں دیکھتے۔ پھر جو چیز بھی اپنی حویلی کے لئے موزوں نظر آتی خرید لاتے اور پھر یہ چیزیں حویلی کی زینت میں اضافے کا باعث بنتیں۔

خوشدل خان گاؤں کے مالک تھے۔ سونا انکلتی زمینیں تھیں۔ باغات تھے..... مکانات تھے حجرے تھے۔ ان کا رعب اور دبدبہ اتنا تھا کہ کسی کو ان کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ یہ رعب اور دبدبہ ان کی بہادری اور سخت گیری کی وجہ سے ملحقہ علاقوں میں بھی پھیلا ہوا تھا..... ان علاقوں کے خان و خاندان خوشدل خان کی برتری مانتے تھے.....

حویلی سے ملحقہ خان خوشدل خان کا طویل و عریض حجرہ تھا۔ اس حجرے میں ہر خاص و عام کو آنے

سردیوں میں محفلیں انہی کمروں میں جتنی تھیں۔ گدوں پر نکیوں کے سہارے بیٹھ کر باتیں بھی ہوتیں۔ لڑائی جھگڑوں کے فیصلے بھی۔

خوشی کے موقع پر ڈھول نفیری بجاتے اور لوک گیت خوبصورت آوازوں کی تان پر اڑا کرتے۔ خان اپنے علاقے میں سخت گیری کے باوجود لوگوں میں بڑا ہر دلعزیز بھی تھا۔ لوگ اپنا دکھ سکھ اس سے کہتے بالکل نہ جھجکتے تھے۔ خان اپنی آمدنی کا معقول حصہ ضرورت مندوں اور حاجت مندوں پر خوشی خرچ کیا کرتا تھا۔ مزارعوں سے بھی روپیہ مصفاہ اور دوستانہ تھا۔ اس لئے لوگ دل لگا کر محنت کرتے تھے۔ اور اپنا حصہ پاکر خوشی سے پھولے نہ ساتے تھے۔ خان کے لئے دعائیں کرتے وہ تھکتے نہیں تھے۔

لیکن دوستی کے ساتھ دشمنی کا بھی اسی طرح ساتھ ہے جس طرح روشنی اور اندھیرے کا۔ خان کی بھی خاندانی عداوتیں رقتیں تھیں۔ اکاخیل قبیلے سے دور پار کی رشتہ داری تھی۔ لیکن خاندانی دشمنی صدیوں سے چلی آتی تھی۔ کوئی سال نہیں جاتا تھا۔ جو خون خرابہ نہ ہو۔ کبھی اس خاندان کا کوئی فرد لڑائی جھگڑے میں مارا جاتا۔ کبھی اس خاندان کا۔

خوش دل خان نے اس برسوں پرانی عداوت کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب تک لگ بھگ بارہ قتل ہو چکے تھے۔ کورٹ کچریوں میں مقدمے سزائیں جھگڑتے دونوں خاندانوں کے افراد زمینیں بچ بچ کر کنگال ہو رہے تھے۔

باپ کے مرنے کے بعد جب خوش دل خان نے نظام سنبھالا تھا۔ تو سب سے پہلے اس پرانی دشمنی کو ختم کرنے کا تہیہ کیا تھا۔ اپنی ساری کوششیں صرف کرنے کا ارادہ کیا تھا۔

اتفاق سے انہی دنوں اکاخیل کا ایک آدمی بدلے کی آگ میں جھونک دیا گیا۔ خوش دل خان کے رشتے کے چچا زاد نے اسے قتل کیا تھا۔ دوسری پارٹی مشتعل تھی۔ ان کا خور و نو جوان مارا گیا تھا۔ جو اپنی بیوہ ماں اور دو کنواری بہنوں کا واحد سہارا تھا۔ اس کا بڑا بھائی اپنی بیوی اور بچی سمیت الگ رہتا تھا۔

خوش دل خان نے اطلاع ملتے ہی ہمیشیں گل کا کا اور اس کے دونوں بیٹوں کو بلایا۔ حجرے میں سب اکٹھے ہوئے۔

”تم میں سے کس نے ایاز خان کو مارا ہے۔“ خان نے پوچھا

”میں نے خان۔“ ہمیشیں گل کے بڑے لڑکے عظمت خان نے کہا۔

”میں نے تم لوگوں کو کتنا بھجایا۔ لیکن تم نہیں مانے۔“

”خان خدا کو حاضر تا ضر جان کر کہتا ہوں۔ کہ میں نے دانستہ اسے نہیں مارا۔“

”کیا؟“

”ہاں خان“ رحمت خان بھائی کی طرف داری کرتے ہوئے بولا۔

”تو پھر۔“

”خان گولی اتفاقاً سے جا لگی۔“

خان نے بے یقینی سے اسے دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔

”یقین کریں خان۔“ عظمت خان بولا۔ ”شکار کھیلتے ہوئے وہ اچانک ہی اس کی گولی کی زد

میں آگیا تھا۔ اس بات کے گواہ اس کے وہ دوست بھی تھے جو اس کے ساتھ شکار کھیلنے گئے تھے۔“

”اگر یہ بات ہے تو بہت برا ہوا۔“ خان نے سوچتے ہوئے کہا۔

”مجھے احساس ہے خان۔“ عظمت خان سر جھکاتے ہوئے بولا۔

”پھر۔“ ہمیشیں گل نے پریشانی سے خان کو دیکھا۔

خان خوش دل خان نے پوری تحقیق کی۔ جائے واردات کا معائنہ کیا۔ ارد گرد کے لوگوں سے

پوچھا۔ قتل واقعی اتفاقی طور پر ہو گیا تھا۔

لیکن

مقتول کے وارث یحیٰ بد بھڑکے ہوئے تھے۔ وہ اتفاق سے گولی لگنے قاتل نہ تھے۔ ان کا

موقف تھا کہ ایاز خان کو دانستہ مارا گیا ہے۔ یہ قتل اتفاقاً نہیں انتقام ہوا ہے۔

بات بہت بڑھ گئی۔ اکاخیل اپنی بندوقیں رائفلیں اور طمنچے لے کر کھلے مقابلے کے

لئے آگئے۔ چوڑیاں ان لوگوں نے بھی نہ پہن رکھی تھیں۔ بزدلی کا مظاہرہ کب کرنے والے تھے۔ ادھر سے

بھی اسلحہ لئے لوگ مرنے مارنے پر تڑپ گئے۔

خان نے بڑی مشکل سے دونوں قبیلوں کو سنبھالا۔ بڑی دقت سے دونوں طرف کے بزرگوں

کو نزاکرات کے لئے آمادہ کیا۔ خان کی بات مانی جاتی تھی۔ پھر بھی بڑی تگ و دو کے بعد جرگہ بیٹھا۔

قتل و غارت کو ہر صاحب عقل و شعور ختم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بھڑکے ہوئے جذبات کو ٹھنڈا کرنا

بھی مشکل ترین کام تھا۔

خان خوش دل خان نے اپنی عقل و فراست اور بصیرت سے کام لے کر یہ مشکل مرحلہ سر کر

لیا۔ دونوں پارٹیوں میں صلح کروادی۔ اور آئندہ کے لئے مفاہمت کی راہیں یوں نکالیں کہ دونوں قبیلے آپس میں

بدلے کی شادیاں کریں۔ تاکہ رشتوں کی نزاکت اور پاکیزگی کو دیکھتے ہوئے جذبات کبھی مشتعل نہ ہوں۔

یہ فیصلہ تو آسان تھا۔ لیکن اس پر عمل کرنا بہت مشکل۔ کوئی فریق بھی یہ قدم اٹھانے پر آمادہ

نہیں ہو رہا تھا۔

کئی دن مذاکرات ہوتے رہے۔

بالآخر خوشدل خان نے بی فیصلہ کیا۔ اس نے اکاخیلی قبیلے کے اک سرکردہ خان بلند خان بیٹی کا رشتہ اپنے بڑے بیٹے صبور خان کے لئے مانگا۔ اور عظمت خان کی بہن کا رشتہ اکاخیلی سردار کے بیٹے کے لئے دینا منظور کیا۔

قبیلوں کے مفاد کی خاطر یہ قدم اٹھائے گئے۔۔۔۔۔ دونوں طرف سے اس فیصلے کو سراہا گیا۔ صبور خان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی گئی۔

صبور خان خوشدل خان کا بڑا بیٹا تھا۔ دو ہی تو بیٹے تھے۔ چھوٹا بیٹا نواز خان ان دنوں پشاور یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ صبور خان نے آٹھ نو جماعتیں چار سہ کے سکول ہی میں پڑھی تھیں۔ اسے اپنا وراثتی انداز ہی پسند تھا۔ باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ زمینوں کی دیکھ بھال۔ دیہات سدھار اور شکار اس کے دل پسند شغل تھے۔ باپ کا بہت ہی تابعدار قسم کا بیٹا تھا۔ لیکن باپ کے اس فیصلے پر اس نے چون چراں کرنے کی کوشش کی۔۔۔۔۔ دشمنوں میں رشتہ داریاں اسے پسند نہ تھیں۔

”آغا بی بی۔۔۔۔۔ اس نے باپ کی بجائے ماں کے سامنے احتجاج کیا۔

”کیا ہے بیٹے۔۔۔۔۔“ آغا بی بی اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سب کچھ سمجھ گئی۔

”خان بابا نے جو فیصلہ کیا ہے آپ تک پہنچا ہے“

”ہاں۔۔۔۔۔“

”آپ کا کیا خیال ہے“

”تم جانتے ہو۔۔۔۔۔ تمہارے خان بابا کے کسی فیصلے سے اختلاف میں نے کبھی نہیں کیا۔۔۔۔۔“

”تو آپ بھی متفق ہیں۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ ایسا کرنا ہم سب کے لئے اچھا ہے۔ اور پھر سر بلند خان کی بیٹی کوئی معمولی لڑکی نہیں۔

حسن سیرت اور حسن صورت میں اس کا جواب نہیں بیٹے۔۔۔۔۔“

”لیکن یہ تو حقیقت ہے آغا بی بی کہ وہ ہمارے دشمن قبیلے کی لڑکی ہے“

آغا بی بی نے مسکرا کر اسے دیکھا تو وہ قدرے اونچی آواز میں بولا۔۔۔۔۔ ”یہ تو شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے والی بات ہے۔۔۔۔۔“

”صبور خان۔۔۔۔۔“ آغا بی بی تقاخر سے مسکراتے ہوئے بولیں ”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن یاد

رکھو بیٹے شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے والے بہادر ہی ہوتے ہیں۔ شیر سے بھی زیادہ طاقتور۔۔۔۔۔ اور مجھے اپنے بیٹے کی

طاقت اور بہادری پر ناز ہے۔۔۔۔۔“

”آغا بی بی۔۔۔۔۔“

”تمہارے خان بابا نے جو قدم اٹھایا ہے۔ وہ کسی مصلحت کے تحت ہی اٹھایا ہے۔ خون خرابے کا یہ تماشہ ڈیڑھ صدی سے چلا آ رہا ہے۔ کیا یہ فخر کی بات نہیں کہ یہ دشمنی تمہارے بابا کی عقل و دانش سے ختم ہو جائے گی۔۔۔۔۔“

صبور خان چند لمحے چپ رہا۔۔۔۔۔

آغا بی بی بڑی سلجھی ہوئی خاتون تھی۔ بڑی دانشمندی سے سسرالی خاندان میں نبھا کر رہی تھی۔ شوہر کی آنکھ کا اشارہ سمجھنے والی تھی۔۔۔۔۔ اس نے خوش دل خان کے کسی فیصلے سے کبھی اختلاف نہیں کیا تھا۔ اسی لئے تو خوش دل خان کی جہیز تھی۔ وہ اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ بہت چاہتے تھے۔۔۔۔۔ اور خود سراور سخت گیر ہونے کے باوجود کئی معاملات میں آغا بی بی کی رائے لینے میں ہرج نہیں سمجھا کرتے تھے۔

آغا بی بی نے صبور خان کو سمجھایا۔۔۔۔۔ باپ کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دینے کی مصلحت سمجھائی۔۔۔۔۔ سر بلند خان کے گھر کے لوگوں کے اخلاق کی تعریف کی۔ تمکینے کے حسن اور سیرت کے متعلق بیٹے کو بتایا۔۔۔۔۔ اور پھر یہ بات بھی ذہن نشین کرائی۔ کہ خان بابا کا فیصلہ اٹل ہوتا ہے۔ ان کے منہ سے جو بات نکل جائے پتھر پر لکیر ہوتی ہے۔

”تم انکار کرنے کی جرات نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔ تمہارے باپ نے یہ رشتہ طے کر دیا ہے۔ اب اس پر نظر ثانی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔۔۔“

”دشمن خاندان سے رشتہ داری کر کے آپ لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔۔۔۔۔“

”اچھے کے لئے ہی کیا ہے۔۔۔۔۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سر بلند خان کی بیٹی ہمارے خاندان میں آئے گی۔ عظمت خان کی بہن ان کے خاندان میں جائے گی۔۔۔۔۔ یوں دونوں قبیلے ایک دوسرے کے دباؤ میں رہیں گے۔ دشمنیاں ختم ہو جائیں گی۔۔۔۔۔“

صبور خان کی ایک نہ چلی۔ چل بھی کیسے سکتی تھی۔ خوش دل خان فیصلہ کر چکا تھا۔۔۔۔۔

شادی ہوئی۔۔۔۔۔

اور بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ شادی سے پہلے ہی ہفتہ بھر سے ضیافتیں اڑ رہی تھی۔ گانا بجانا ہو رہا تھا۔ حجرے میں اتنی چل پھل مدتوں بعد دیکھنے میں آئی تھی۔۔۔۔۔ پشاور سے ناچ گانے کے لئے طوائفیں بلائی گئی تھیں۔ قوال آئے تھے۔

خوب دھوم دھڑکے سے صبور خان سر بلند خان کی بیٹی تکینے کو بیاہ لایا۔

دوسرے دن رحمت اور عظمت کی بہن کو بیاہنے کا خیالی لوگ آئے۔ لیکن رخصتی سے پہلے

ہی براتیوں میں جانے کون شریک تھا۔ جو اس صلح کو نہیں دیکھ سکا۔ اس نے ہجوم میں سے گولی چلائی۔ جو ہمیشہ گل کا کاسینہ چیر گئی۔

اک کھرام مچ گیا.....

ہندو قیس رائفلیں نکل آئیں۔ لوگ بھاگے دوڑے۔ لیکن پھر بھی خون خرابہ ہونے سے نہ رکا۔ دونوں طرف کے بہت سے آدمی زخمی ہو گئے.....

صدیوں کی دشمنی اور عداوت جسے خان خوش دل خان نے ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ بدلے کی شادیاں کر کے بہت بڑا قدم اٹھایا تھا۔ وہ پھر سے تازہ ہو گئی.....

دونوں قبیلوں میں پھر سے ٹھن گئی تھی..... بدلے کی آگ بھڑک رہی تھی..... لوگ پھرے ہوئے تھے..... اکا خیل قبیلے کے ایک ایک فرد کی تکتہ بوٹی کروڑنا چاہتے تھے۔ ہمیشہ گل کا کاکلی موت کا صدمہ گاؤں کے ہر فرد کو تھا..... عظمت خان صلہ پسند آدمی تھا۔ لیکن اب وہ بھی انتقام لینے کے لئے بے تاب تھا..... رحمت خان کا تو بس چلنا تا تو اپنے ساتھیوں سمیت اکا خیل قبیلے پر ٹوٹ پڑتا۔

لیکن

سب خان بابا کے فیصلے کے منتظر تھے۔ اپنے طور پر کچھ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

خان بابا ان دنوں خاموش تھے۔ اس سنگین مسئلے کو سلجھانے کی سوچ رہے تھے۔ لیکن ان کی خاموشی بھیاں تک طوفانوں کا پیش خیمہ تھی..... مصلحت اور رواداری اس خاموشی میں نظر نہ آتی تھی.....

آغا بی بی بھی ان دنوں بہت پریشان تھیں۔ اکا خیل قبیلے کی بیٹی بہو بن کر ان کے گھر آچکی تھی..... تنکینے معصوم سی لڑکی تھی..... اس کے ساتھ وہ کسی قسم کا ظلم زیادتی کرنا نہیں چاہتی تھیں.....

خان بابا کا کیا فیصلہ تھا۔ یہ تو ابھی انہیں معلوم نہ ہو سکا تھا۔ ہاں صبور خان نے ان سے کہہ دیا

تھا۔

”آغا بی بی..... تنکینے کو اس کے گھر واپس بھیج دیں..... میں نے خطرے کی بو پہلے ہی سونگھ لی

تھی۔ دشمن قبیلے میں شادی کرنا عقل مندی نہیں تھی.....“

”صبور خان.....“ آغا بی بی نے مستحکم آواز میں کہا۔ ”تنکینے اب سر بلند خان کی بیٹی ہی نہیں

ہماری بہو ہے.....“

”تو.....“

”یہ ہماری عزت ہے۔ تم اس عزت کو اچھا لانا چاہتے ہو.....“

”آغا بی بی.....“

”اس سلسلے میں آئندہ ایسی بات میں نہ سنوں۔ سمجھے.....“

”دشمن کی بیٹی کو آپ اس طرح تحفظ دیں گی۔“

”دشمن کی بیٹی کو نہیں۔ اپنی بہو کو.....“

”آپ جانتی ہیں لوگ اکاخیلی قبیلے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں.....“

”ہاں۔ بدلہ لینا ان کا حق ہے.....“

”آپ کیا کہہ رہی ہیں آغا بی بی..... ایک طرف بدلے کو حق قرار دے دیتی ہیں۔ دوسری

طرف اس لڑکی کو تحفظ دینا چاہتی ہیں..... جس کے باپ اور بھائی.....“

”صبر خان آخری فیصلہ تو تمہارے بابا کا ہو گا۔ لیکن یہ فیصلہ اکاخیلی قبیلے کے خلاف حماز

آرائی کا ہو گا۔ تمہارے اس فیصلے کی زد میں نہیں آئے گی..... میں اسے اکاخیلی قبیلے پر دباؤ ڈالنے کے لئے استعمال

نہیں ہونے دوں گی.....“

یہی بات آغا بی بی نے نواز خان سے بھی کہی..... نواز خان بہت جوشیلا نوجوان تھا۔ وہ خان بابا

سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔ ہمیشہ گل کا کاکلی موت کو کھلا چیلنج سمجھتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اس قبیلے پر موت

بن کر ٹوٹ پڑتا۔ وہ پڑھا لکھا تھا۔ اسلامیہ کالج سے گریجویشن کر چکا تھا۔ لیکن تعلیم نے اس کی سوچ کو نہیں

بدلا تھا..... سر جھکانے سے سر کٹانے کو افضل سمجھنے والا آدمی تھا..... صبر خان کے فیصلوں میں لچک کی گنجائش

تھی۔ لیکن نواز باپ کی طرح دو ٹوک اور اوٹل فیصلوں کا عادی تھا۔

آغا بی بی نے تمہارے بارے میں بات کی تو نواز بولا..... ”آغا بی بی۔ ٹھیک ہے تمہارے بھائی

ہماری عزت ہے..... ہم ان کو بدلہ لینے کے لئے ہرگز استعمال نہیں کریں گے۔ لیکن ہمیں بھی تو یقین ہونا

چاہئے کہ اس معاملے میں ان کا رد عمل کیا ہے۔ اگر وہ باپ اور بھائی کی طرف داری کرنا چاہتی ہیں..... تو پھر

اس خاندان میں ان کی گنجائش کیسے نکل سکتی ہے.....“

”تمہارے بھائی کے گھر میں آگئی ہے۔ اب یہ گھر اس کا گھر ہے۔ میں اس سے پوچھ چکی

ہوں..... وہ اس گھر سے اب کہیں نہیں جانا چاہتی.....“

”پھر ٹھیک ہے۔ وہ ہمارا ساتھ دیں گی تو ہم بھی ان کا تحفظ کریں گے.....“

”یہی میں چاہتی ہوں.....“

”خان بابا کہہ سکتے ہیں بھائی کے ارادے کا علم ہے“

”پتہ نہیں۔ فی الحال انہوں نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی.....“

”لیکن یہ تو اٹل حقیقت ہے کہ خان بابا ہمیشہ گل کا کاکے خون کا بدلہ لیں گے.....“

”ہاں۔ بالکل.....“

”تمہارے بھائی زرد میں آسکتی ہیں.....“

”یہ کبھی نہیں ہو گا.....“

”آپ جانتی ہیں خان بابا کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوتا ہے.....“

”میں یہ بھی جانتی ہوں کہ ان کا کوئی فیصلہ غلط نہیں ہو گا.....“

”میرا بھی یہی اندازہ ہے“

”تمہارے بابا فیصلہ کرنے سے پہلے تمہارے سے ضرورت کریں گے.....“

”خان بابا سے پہلے میں ان سے اس سلسلے میں بات کروں آغا بی بی“

”نہیں۔ میں اس سے پوچھ چکی ہوں۔ وہ اک بہادر اور نڈر لڑکی ہے۔ مجھے یقین ہے اس نے

جو کچھ کہا ہے۔ اس پر قائم رہے گی..... ہاں اس سے پوچھنا چاہیے تو تمہارے بابا پوچھ سکتے ہیں.....“

”ٹھیک ہے..... لیکن بابا نے ابھی کچھ کہا نہیں۔ خاموش ہیں.....“

”یہ خاموشی طوفانوں کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ کیا تم محسوس نہیں کرتے.....“

”لیکن آغا بی بی..... یہ خاموشی طویل ہوتی جا رہی ہے۔ لوگ بے تاب ہیں۔ عظمت اور

رحمت خان کا خیال کیجئے..... باپ کے خون کی اک اک بوند پکار پکار کر انہیں بدلہ لینے کے لئے اکسارہی ہے۔

نامراد بہن کا ڈولہ اٹھ نہیں سکا۔ یہ سبکی انہیں مارے جا رہی ہے۔ وہ اور ان کے بہت سارے ساتھی بدلہ لینے کو

بے چین ہیں۔ صرف بابا کے حکم کے منتظر ہیں.....“

”ٹھیک ہے۔ مجھے ان سب کے جذبات کا احساس ہے۔ لیکن تمہارے بابا کے حکم کے بغیر

کوئی ہاتھ نہیں اٹھا سکتا..... کوئی ہندو گولی نہیں داغ سکتی..... کوئی تلوار میدان سے باہر نہیں آسکتی.....“

”یہ تو ہے“

”وہ کچھ سوچ ہی رہے ہوں گے..... جو فیصلہ بھی کریں گے..... ٹھیک ہی ہو گا.....“

نواز خاں چپ ہو گیا..... وہ بھی آغا بی بی کی طرح اپنے خان بابا کو اچھی طرح جانتا تھا۔ کرناوی

تھا جو ان کا حکم تھا۔ صرف نوجوانی جو شبیلی تھی..... اسی کے تقاضے سے کچھ کر گزرنے کی خواہش شدید

تھی۔

اس کی طرح دوسرے نوجوان بھی اس رسوائی کا بدلہ لینے کے لئے جلدی چاہ رہے تھے۔ خان

خوش دل خان کے حکم کا انتظار تھا۔ وہ سب روز حجرے میں جمع ہوتے۔ تو یہی باتیں ہوتیں۔

نواز خان بھی ان کے ساتھ صلاح و مشورے کرتا رہتا تھا۔

گاؤں والے خونی تصادم کے منتظر تھے۔ اکثر لوگ اکاخیلی قبیلے کے ظلم اور زیادتی پر بیچ و تاب کھارہے تھے۔ لیکن کچھ ہوش مند بھی تھے۔ اس ہونے والے خون خرابے کی اپنے طور کافی کوششیں کر رہے تھے۔ ان میں معمر اور بزرگ لوگ بھی تھے اور نوجوان بھی۔ وہ جب بھی موقع ملتا ان جوشیلے اور بد لے کی آگ میں جلنے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے۔

”عقل سے کام لو۔ خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ گھرا جڑ جائیں گے۔ بچے یتیم اور عورتیں پیوہ ہو جائیں گی۔ حاصل کیا ہو گا۔ خون صرف دشمن ہی کا تو نہیں بنے گا۔ اپنے عزیز بھی اس قربان گاہ کی بھیٹ چڑھ جائیں گے۔ دشمن بھی اپنا ہی ہے۔ اپنی طرح وہ بھی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وار کرنے والا ہے۔ دونوں طرف تباہی ہی تباہی ہوگی۔ مصالحت کی راہ نکالنی چاہئے۔ سکون سے سوچنا چاہئے۔ پھر اس قبیلے کی بیٹی ہماری بہن بن چکی ہے۔ صبور خان کی ازدواجی زندگی متاثر ہوگی۔“

ایسے ایسے کئی نقطے نکال کر وہ دلائل کے طور پر پیش کرتے ہوئے ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے۔ لیکن کسی پر اثر نہ ہوتا۔

ان صلح جو لوگوں نے نواز خان سے بھی بات کی ”خان۔ تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو۔ تعلیم نے تمہیں غلط ٹھیک کی پہچان سکھائی ہے۔ انتقام اندھا ہوتا ہے۔ تباہی و بربادی ہی جلد لاتا ہے۔ تم علم کی روشنی میں حالات کا جائزہ لو۔ بدلہ لینے معاف کر دینا زیادہ افضل ہوتا ہے۔“

لیکن نواز خان نے غیظ و غضب سے پھنکارتے ہوئے کہا ”تعلیم نے مجھے اپنی روایات سے منہ موڑنا نہیں سکھایا۔ نہ ہی میری ببادری کے اوصاف چھین کر بزدل بنایا ہے۔ ظلم سہہ جانا بذات خود ظلم ہے۔ کیا آپ کو عظمت خان اور رحمت خان کے جذبات کا احساس نہیں۔ خوشی کی تقریب کس طرح غم میں بدل گئی۔ باپ مر گیا۔ بہن جو کھٹ پہنچی رہ گئی۔ اس بہن کا ڈولہ کبھی اٹھ سکتا ہے اب۔۔۔۔۔ یہ سینے کا سوراخ بن کر بھائیوں کے لئے جئے گی۔ کیا قصور ہے اس لڑکی کا۔۔۔۔۔ میرے بابائے یہ خونی باب ختم کرنے ہی کے لئے تو بدلے کی شادیاں کرنے کی پیش کش کی تھی۔۔۔۔۔ میں جانتا ہوں۔ میرے گل لالہ صبور خان اس شادی کے حامی نہ تھے۔ لیکن صرف اور صرف صدیوں پرانی دشمنی ختم کرنے کے لئے انہوں نے خان بابا کے حکم پر سر جھکا دیا تھا۔۔۔۔۔ لیکن اس کے باوجود اکاخیلیوں نے زیادتی کی۔ ہم اس زیادتی کا بدلہ لے کر رہیں گے۔ ان لوگوں کو ایسا سبق دیں گے۔ کہ ان کی آنے والی سلسلیں یاد رکھیں گی۔“

یہ جوش و خروش کی باتیں اور تیاریاں دیکھی چھپی نہ تھیں۔ اڑتی اڑتی خبریں سر بلند خان تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ وہ بہت پریشان تھے۔۔۔۔۔ حکینے ان کی ایک اکلوتی بیٹی تھی۔ بہت پیاری اور بیحد لاڈلی بھی

تھی۔۔۔۔۔ خوش دل خان کی طرح انہوں نے بھی قبیلوں کی بہتری ہی کا سوچ کر بیٹی کا رشتہ صبور خان کو دیا تھا اور بیٹے کی شادی ہمیشہیں گل کا کاکی بیٹی سے طے کی تھی۔۔۔۔۔ ان کے ذہن میں کوئی کھوٹ نہ تھی۔ بے ایمانی کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ خوشی خوشی سب کچھ کر رہے تھے۔ وہ تو کسی شریک نے ہمیشہیں گل پر گولی چلا دی تھی۔ جو بد قسمتی سے ہلاکت کا سبب بن گئی تھی۔ وہ متاسف بھی تھے۔ پریشان بھی۔ گولی چلانے والے کا بھی پتہ چل گیا تھا۔ وہ دونوں قبیلوں کا ملاپ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اپنی بیٹی کا رشتہ سر بلند خان کے بیٹے سے طے کرنے کا خواہشمند تھا۔ اس نے اپنی خواہش کا اظہار بھی کیا تھا۔ یہ مقیم خان تھا۔ سر بلند کا دور پار کا رشتہ دار۔

لیکن

سر بلند خان خوش دل خان کو زبان دے چکے تھے۔ دو متخارب قبیلوں کے درمیان صلح و آشتی کروانا مقصود تھی۔ اس لئے مقیم خان کی خواہش پوری نہ کر سکے۔

قصور سر بلند خان کا تھا نہ ان کے بیٹے کا۔ لیکن ہمیشہیں گل کا کاکی موت سے حالات یکسر بدل گئے تھے۔ پوزیشن سر بلند خان کی تشویش ناک تھی۔ بیٹی و داع کر چکے تھے۔ ایسے حالات میں بیٹی کا کیا ہو گا۔ یہی سوچ سہانہ روح تھی۔

جوابی کارروائی کے لئے ان کے قبیلے کے لوگ بھی اسلحے سے ہر وقت لیس رہتے تھے۔ چاک و چوبند بھی تھے۔ خان سر بلند خان کے اشارے کی دیر تھی۔ پل پڑنے پر وہ بھی تیار تھے۔

معاملہ بیحد سنگین ہو گیا تھا۔

تھے.....

”یہ جانتے ہوئے بھی آپ دونوں کچھ نہیں کر رہے۔ مسلح تصادم کی سوچ رہے ہیں.....“
 ”خوشدل خان کے لوگ بہت پھرے ہوئے ہیں۔ ہمیشہ گل صرف خوشدل خان کا چچا ہی
 نہیں سارے قبیلے کا چیتا بھی تھا..... اس کی موت کو وہ لوگ بھلا نہیں سکتے سردار بی بی۔ پھر اس کی بیٹی بھی گھر بیٹھی
 رہ گئی..... یہ ہنک دہ لوگ.....“

”ہم اس کی بیٹی کو لانے کے لئے تیار ہیں..... میرا بیٹا اپنی منگ سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں

ہے.....“

”سردار بی بی..... کیا واقعی؟“

”خان..... حیدر آپ بی بی کا بیٹا ہے۔ اس کی رگوں میں بھی غیور پٹھانوں کا خون دوڑ رہا ہے۔
 کشمالے اس کی مگتیر ہے۔ عین شادی کے دن سانحہ ہو گیا۔ جو اس سے سرزد ہوا نہ آپ سے۔ پھر وہ اپنی منگ
 سے کیونکر دستبردار ہو سکتا ہے.....“

”یہ تم اپنی طرف سے کہہ رہی ہو۔ یا حیدر نے یہ سب کچھ کہا ہے.....“

”حیدر اک غیرت مند اور بہادر نوجوان ہے۔ بدلے کی شادی میں عزت و غیرت کا پہلو بھی
 ہوتا ہے خان..... برابر کی کاہنری کا..... یہ حیدر کے لئے خون کھولا دینے والی بات نہیں کیا۔ کہ اس کی بہن تو
 صبور خان بیاہ کر لے گیا۔ لیکن وہ کشمالے کو اب تک نہیں لاسکا.....“

”بات اور بھی تشویشناک ہو گئی ہے.....“

”اسی لئے تو کہتی ہوں۔ آپ کچھ کریں۔ مجھے اپنی بیٹی کے متعلق بہت تشویش ہے خان۔

میرا دل بیٹھا جاتا ہے..... جانے میری بچی کا کیا حال ہو گا..... گھر والوں کا رویہ برا نہ بھی
 ہوا..... تب بھی اس کے شب و روز چین سے گزر رہے ہوں گے کیا؟ ہمارے لئے اس کا دل تڑپا نہیں ہو گا..... وہ
 ہمیں یاد کر کر کے روتی ہوگی..... خان..... تم تو اپنی بیٹی کی آنکھوں میں کبھی آنسو دیکھ ہی نہیں سکتے تھے.....“

خان سر بلند خان نے پریشان ہو کر بیوی کی طرف دیکھا۔ جس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے
 تھے۔ سردار بی بی بہت بہادر عورت تھی۔ خان نے اسے یوں روتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ دکھ درد آنسوؤں کی
 صورت جس روانی سے بہہ رہا تھا، اس نے سر بلند کو بے چین کر دیا..... وہ اس وقت حویلی کے بڑے دالان میں
 گدے دار دیوان پر نیم دراز تھے۔ سرخ ساٹن کے گاؤتکے کے سارے پڑے چلم کے کش لے رہے تھے۔
 سردار بی بی قریب ہی غمگین پر بیٹھی تھی..... خوبصورت نقش و نگار والی گرائڈیل سی عورت نیلے پیلے پھولوں والی
 کالی بڑی سی چادر کی بھل مارے تھی..... چہرے کی دلکشی اندرونی درد و کرب نے جیسے لوٹ لی تھی..... وہ بار بار اپنی

۴

”سردار بی بی“

”جی خان“

”تم یوں حوصلہ ہار دو گی۔ مجھے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا.....“

”میں..... میں ماں ہوں خان.....“

”باپ ہم بھی ہیں۔ سردار بی بی۔ تمکینے ہمیں بھی اتنی ہی پیاری ہے جتنی تمہیں۔ ہمیں کیا خبر

تھی کہ ہماری نیک نیتی پر یوں آج آئے گی.....“

”اب ہو گا کیا.....؟ میری بچی کا جانے کیا حال ہو گا.....“

”یہی سوچ تو ہمیں پریشان کر رہی ہے۔ گو ہم جانتے ہیں۔ کہ تمکینے کے ساتھ اس کے گھر

والوں کا رویہ برا نہیں ہو گا.....“

”یہ بھی تو صرف آپ کی سوچ ہے“

”نہیں سردار بی بی۔ ہم ایسی خاندانی روایات کو انتہائی دشمنی میں بھی ہاتھ سے نہیں

چھوڑتے۔ یہ ہم پٹھانوں کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ خوشدل خان خاندانی آدمی ہیں۔ تمکینے اب ان کی عزت
 ہے اور اپنی عزت اک پٹھان کو اپنی جان سے بھی پیاری ہوتی ہے..... وہ تمکینے کا ہر طرح سے خیال کریں گے۔
 اسے تحفظ دیں گے۔ فکر تو صرف یہ ہے کہ اس جھگڑے میں ہم اپنی بچی سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے۔ ہماری
 لاڈلی بیٹی ہم سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئی.....“

”نہیں خان..... ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اپنی تمکینے کو ہمیشہ کے لئے اپنے سے جدا نہیں کر سکتی

میں نے بیٹی کی ڈولی اٹھائی تھی..... جنازہ نہیں.....“

”مقیم نے ہی سہرا افساد کھڑا کیا ہے۔ ورنہ ہماری طرح خوشدل خان کے ارادے بھی نیک

آنکھیں چادر کے کونے سے پونچھ رہی تھی۔ لیکن آنسو اک تواتر سے بے جا رہے تھے۔ گالوں پر لڑھک رہے تھے۔ ناک کی پھنگ چادر کی رگڑ سے سرخ ہو رہی تھی۔

سردار بی بی کی باتوں نے خان سر بلند خان کو اور پریشان کر دیا تھا۔ اب تک تو وہ صرف کہنے ہی کے لئے سوچ رہے تھے۔ حیدر اور کشمالے کا انہیں خیال ہی نہیں آیا تھا۔ لیکن اب..... واقعی حیدر کی منگ کشمالے تھی..... حیدر اس سے دستبردار نہیں ہو سکتا تھا..... یہ ذلت اور رسوائی کی بات تھی..... معاملہ کچھ اور پیچیدہ ہو گیا تھا.....

چلم پرے ہٹاتے ہوئے خان اٹھ بیٹھا۔ تکلے پر رکھی چادر اٹھا کر کندھے پر ڈالی۔ پاؤں میں بھاری پشاور کی چپل پہنی.....

سردار بی بی نے ان کی طرف دیکھا۔ آنسو پونچھتے ہوئے بولی ”کہاں جا رہے ہیں خان.....“

”حجرے میں“

”اسی وقت“

”ہاں.....“

”کیوں“

”حیدر وہیں ہو گا۔ اس کا دوست گل زمان آیا ہوا ہے.....“

”آپ حیدر سے بات کریں گے“

”ضرورت تو نہیں..... میں اس کے جذبات کو سمجھتا ہوں“

”پھر.....“

”کوئی راہ نکالنا ہی پڑے گی.....“

”کیسی راہ.....“

”اچھا کہنے تک پہنچنے کی..... اپنی کشمالے کو لانے کی.....“

”خان.....“

”ہاں سردار بی بی..... میں نے سوچا ہے کہ صلح کا ہاتھ ایک بار پھر خان خوشدل خان کی طرف

بڑھاؤں.....“

”یہ..... یہ..... آپ کہہ رہے ہیں..... آپ.....“

”اس کے سوا چارہ نہیں ہے سردار بی بی.....“

”لیکن..... یہ بات آپ خود کہیں گے..... آپ جھک جائیں گے؟..... آپ.....“

خان سر بلند کھڑے ہو گئے..... وہ اونچے لانبے اور قوی جتنے کے آدمی تھے..... بہت مضبوط ارادوں کے مالک تھے۔ چہرے پر ہمیشہ تاؤ کی سی کیفیت رہتی تھی۔ رعب راب ان کا بھی بہت تھا..... لیکن دل کے مومن بھی تھے..... حق پر ڈٹ جانے والے تھے۔ لیکن ظلم و زیادتی کی ہمیشہ مذمت کرتے تھے..... انہوں نے سردار بی بی کی بات کا جواب نہیں دیا۔

سردار بی بی نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے کا تاؤ کچھ بڑھا ہوا تھا..... تشویش جھلک رہی تھی۔ اور اس جھلک میں پسائی کا عنصر بھی غالب نظر آ رہا تھا۔

اک بہادر اور غیور شوہر کی بیوی ہوتے ہوئے اسے خان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ کر دکھ سا ہوا.....

لیکن اولاد کا معاملہ تھا..... کچھ جذلوں کی قربانی دے کر انہیں بچایا جاسکتا تھا..... ایسا کرنا پڑ رہا تھا..... نہ کہنے سسرال سدھار نہ چکی ہوتی تو شاید سردار بی بی کی سوچ ایسی نہ ہوتی.....

خان والا ان سے نکل گئے۔ سردار بی بی تھوڑی دیر وہیں بیٹھی رہی۔ وہ اس وقت کشمکش میں مبتلا تھی..... خان خوشدل خان کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھانے میں انہیں پہل کرنی چاہئے یا انہیں وہ یہی سوچ رہی تھی..... لیکن سوچیں امتیاء اندھیروں میں بے نتیجہی گم ہو رہی تھیں۔ کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا.....

گھبرا کر وہ اٹھ بیٹھی..... چادر کو ٹھیک طرح سے اوڑھا اور باہر آ کر صحن کے اس حصے کی طرف چلی گئی۔ جس میں خادائیں رات کے کھانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ وہ بھی کام کرتے ہوئے تھیں کہ بی بی کی باتیں کر رہی تھیں۔ بیگم کو آتے دیکھا تو ایک نوکرانی نے جلدی سے بان کے بڑے بڑے رنگین پاپوں والے پلنگ پر چادر بچھا کر گاؤں تک لے کر رکھ دیا.....

گوشت اور سبزیوں کے بھرے لگن تخت پر رکھے تھے۔ کچھ نوکرانیاں سبزی بناری تھیں ایک دو پیاز کاٹ رہی تھیں..... کچھ چاول چن رہی تھیں.....

بیگم کو دیکھ کر سب کام میں منہمک ہو گئی تھیں..... ابھی دوپہری ڈھلی تھی۔ لیکن کھانا بنانے کی تیاریاں شروع تھیں۔ کھانا بھی تو روزانہ ملتا آدھیوں کے لئے پکنا تھا تاہم حجرے میں کھانے کے وقت جتنے آدمی بھی موجود ہوتے، وہ خان سر بلند خان کے دسترخوان پر ضرور کھانا کھاتے..... چھوٹے بڑے کی کوئی تفریق نہ ہوتی..... لمبا چوڑا دسترخوان اور غوانی قالینوں پر بچھ جاتا..... کھانا چن دیا جاتا..... خان کی طرف سے حجرے میں موجود ہر شخص کو کھانے کی دعوت دی جاتی..... یہ اس گھرانے کا برسوں پرانا دستور تھا..... غریب کارندے ہوتے یا صاحب حیثیت مہمان، سب ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔

سردار بی بی نوکرانیوں سے باتیں کرنے لگیں..... باتیں ہر پھر نہ کہنے کی ذات پر آ گئیں۔ ان

نوکرانیوں میں شاہ بی بی بھی تھی۔ جس نے تمکینے کو پالا تھا۔ ماں کی طرح پیار کیا تھا۔ تمکینے کی باتیں کرتے کرتے وہ رو دی۔

”شاہ بی بی.....“ سردار بی بی نے گری سانس لے کر کہا..... ”حوصلہ رکھو..... خدا سے دعا کرو..... وہ بہتری کی کوئی صورت نکال دے.....“

”بی بی جان“ شاہ بی بی ملل کے دوپٹے سے آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی ”کیا تھا۔ جو مجھے بھی تمکینے بی بی کے ساتھ اس کے سسرال بھجوا دیا ہوتا..... میں نے کتنا کہا تھا۔ تمکینے بی بی بھی چاہتی تھی کہ میں ساتھ جاؤں۔ لیکن.....“

”شاہ بی بی“ سردار بی بی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”دوسرے دن تمہیں بھجوانا ہی تھا۔ تم جانتی ہو۔ ڈولی کے ساتھ لڑکی والوں کے ہاں سے کوئی نہیں جاتا..... ہاں دوسرے دن سب جاتے ہیں..... لیکن..... دوسرا دن..... اف.....“

”کتنی پریشان ہوتی ہوگی میری بچی.....“

”خدا اس کا حافظہ ناصر ہو.....“

شاہ بی بی نے پھر دوپٹے سے آنکھیں پونچھیں۔ اور بولی۔ ”جی چاہتا ہے اڑ کر وہاں چلی جاؤں“

”لیکن جانیں سکتیں نا.....“ ایک نوکرانی پالک کاٹتے ہوئے بولی۔

شاہ بی بی نے اسے جواب دینے کی بجائے سردار بی بی کی طرف دیکھا اور بولی ”بی بی جان..... اگر.....“

میں..... میں وہاں چلی بھی جاؤں۔ تو کیا ہرج ہے۔ تمکینے بی بی کے پاس کوئی توانا ہونا چاہئے.....“

”نہیں شاہ بی بی..... ایسا کرنے کا کبھی سوچنا بھی نہیں..... خان جب تک کوئی فیصلہ نہیں کرتے ہم سب کو اپنے جذبات پر پوری طرح سے قابو رکھنا ہے۔ میری طرف دیکھو نا..... میں ماں ہوں میرا دل بھی اپنی بیٹی کے لئے تڑپ رہا ہے.....“

چاول چنتے ہوئے زمی بولی ”خان خوشدل خان کے متعلق سنا تو بہت کچھ تھا..... لیکن وہ اچھے ثابت نہیں ہوئے“

دوسری کنیز نے غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”اچھے ہوتے تو جھگڑا نہ تنہا تک تمکینے بی بی کو

یہاں نہ بھیج دیتے.....“

سردار بی بی کے چہرے پر غمزہ مسکراہٹ پھیل گئی..... نوکرانیوں کی کھپ پراک نگاہ ڈالی..... پھر شفقت سے بولیں..... ”یہ تو اچھا ہوا کہ ان لوگوں نے تمکینے کو واپس نہیں بھیجا..... اور وہ بھیج بھی کیسے سکتے ہیں۔ تمکینے ان کی بہنوں جیگی ہے۔ اب وہ ان کی عزت ہے مجھے اس بارے میں کوئی تشویش نہیں..... صرف

دکھ ہے تو اس بات کا کہ بی بی ناحق میں بچھڑ گئی.....“

”خان مقیم خان نے سارا معاملہ بگاڑ دیا..... سنا ہے وہ گاؤں چھوڑ کر پشاور چلا گیا ہے“

”جہاں بھی جائے..... جو آگ یہاں بھڑکا گیا ہے۔ اس کی لپک سے محفوظ تو نہیں رہے گا“

سردار بی بی نے جو شیلے لہجے میں کہا.....

نوکرانیاں بیگم کی خوشنودی کی خاطر اسی کے لہجے میں باتیں کرنے لگیں۔

ادھر حجرے میں خان سرہند خان بھی اسی موضوع پر اپنے قریبی دوستوں ضیفم خان اور حنیف

گل سے باتیں کر رہے تھے..... ضیفم خان بڑا جوشیلا آدمی تھا..... لیکن حنیف گل بڑا متین قسم کا بزرگ تھا۔ عمر میں

سرہند خان کچھ سال بڑا تھا۔ لیکن دونوں میں بڑی دوستی تھی۔ دکھ سکھ کے موقع پر دونوں ایک دوسرے کے شانہ

بشانہ چلتے تھے.....

”مقیم نے بہت غلط قدم اٹھایا.....“ سرہند خان موقع کی نزاکت اور متوقع تصادم کی باتیں

کرنے کے بعد بولے۔

”غلط یا درست کی بات نہیں.....“ ضیفم بولا ”جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اب دیکھنا تو یہ ہے۔ کہ

دشمن کا منہ توڑ جواب کیسے دیا جائے.....“

”ضيفم خان“ حنیف گل نے سمجھانے کے انداز میں کہا ”یہ دشمنی ختم ہونی چاہئے۔ خون

خرا بے سے آج تک کیا حاصل ہوا ہے.....“

”لیکن خوشدل خان کے آدمی بھرے بیٹھے ہیں۔ ہمارے آدمیوں کو اشتعال دلاتے ہیں۔

تصادم تو اب ہو کر ہی رہے گا.....“

”اسے روکنے کی کوشش میں کروں گا.....“ حنیف گل نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”آپ.....“ سرہند اور ضیفم دونوں بولے۔

”ہاں میں.....“ وہ بولا..... ”سرہند..... یقیناً تم بھی خون کی ندیاں بہانے کے حق میں نہیں

ہو دوسرے تمہاری بیٹی اس خاندان میں جا چکی ہے۔ تمہارے بیٹے کی منگیت اس خاندان میں بیٹھی ہے۔ ہمیں

جوش سے نہیں ہوش سے کام لینا پڑے گا.....“

”یوں کیوں نہیں کہتے میرے بزرگ“ ضیفم نے طنز سے کہا ”کہ خوشدل خان کے سامنے

اس قبیلے کے سر جھکانا چاہتے ہو.....“

”ایسی بات نہیں۔ مصالحت کے لئے کوئی فریق بھی آگے بڑھ سکتا ہے.....“ حنیف گل نے

اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ملائمت سے کہا..... ”کیوں سرہند خان.....“

سرہند نے چلم کے دو تین کش لے کر چلم ضیغم کی طرف بڑھادی..... چند لمبے کچھ سوچا اور پھر بولے ”خون ناحق بہانا مجھے بھی پسند نہیں خان..... اگر آپ اپنی طرف سے مصالحت کی کوشش کرنا چاہیں گے تو میں آپ کو روکوں گا نہیں.....“

”اگر وہ لوگ اپنی ضد پر اڑے رہے تو..... تو بتاؤ سبکی کس کی ہوگی“ ضیغم غصے سے بولا۔

”میری.....“ حنیف گل نے سینے پر ہاتھ رکھا.....

سرہند نے اس کی طرف عقیدت اور احترام سے دیکھا۔ ضیغم کچھ کہنے والا تھا کہ حنیف گل ملائمت سے بولا..... ”میں سب کچھ سوچ کر ہی اس فیصلے پر پہنچا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میں ناکام نہیں لوٹوں گا..... خدا کا نام لے کر جو کام میں شروع کرتا ہوں۔ وہ نہ تو کبھی ادھورا رہا ہے نہ ہی ناکام..... یہ اللہ تعالیٰ کا خاص انخاص فضل ہے مجھ پر.....“

حنیف گل نے ضیغم کو بھی قائل کر ہی لیا.....

تینوں جب حجرے سے باہر نکلے تو فیصلہ ہو چکا تھا..... حنیف گل نے مصالحت کرانے کا ذمہ اپنے سر لے لیا تھا..... اور سرہند خان نے اس کی اجازت دے دی تھی۔

تمکین نے اپنے کمرے ہی میں تھی۔ طویل و عریض کمرہ خوب آراستہ پیراستہ تھا۔ فرش ارغوانی ایرانی قالینوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ریشمی پردے کھڑکیوں پر لہرا رہے تھے ایک طرف بھاری پلنگ پڑے تھے۔ جن پر ریشمی سوزنیاں ڈالی گئی تھیں۔ دوسری طرف دیوار کے ساتھ فرش نشست کے لئے گدے اور گاؤں تکتے رکھے تھے۔ مشرقی سمت کھلنے والی کھڑکی کے سامنے بھی چوبی پلنگ تھا۔ جس پر سرخ ساشن کی چمچم کرتی چادر پڑی تھی۔ تکتے اور گاؤں تکتے بھی بچکیے تھے۔

تمکین نے ناشتہ کرنے کے بعد بھی بستر سے نہیں اٹھی تھی۔ اس کی سرخ و سپید رنگت کھلائی ہوئی تھی۔ اور سبزی مائل نیلگوں آنکھوں میں سرخی لہریں لے رہی تھی۔ ماتھے پر بالوں کی کٹی جھا لربے ترتیب سی تھی۔ نوکرانی نے صبح اس کے بال سنوارے تھے مینڈھا گندھی تھیں۔ لیکن بستر میں بیقراری سے کروٹیں بدلنے سے بال الجھے سلجھے تھے۔ اس نے اس وقت اپنا رواجی لباس پہنا ہوا تھا۔ تنگ موری کی بھاری قرمزی پھولدار ریشمی شلوار پر سبز رنگ کا گیردار کرتا پہن رکھا تھا۔ کرتے کے گھیرے اور کھلے کھلے بازوؤں کے سروں پر سچے طلے کی پٹیاں تھیں کمر پر بے شمار چٹنوں پر بھی طلے کا کام تھا اور سینے پر گول گول طلائی سکے لگے تھے۔ طلے کے بارڈروالی سرخ چادر تھی۔ جو اس نے پلنگ کے بھاری چوبی تکتے پر ڈال رکھی تھی۔

وہ گاؤں تکتے پر سر رکھے اور گندھی پڑی تھی۔ ایک ہاتھ تکتے پر تھا۔ دوسرا سرتلے۔ کلاہوں میں پڑے سونے کے موٹے موٹے نگن اور چوڑیاں جب وہ ہاتھ اٹھاتی تو کھٹک اٹھتیں۔ وہ بیحد پریشان تھی۔ آغا بی بی سے تو اس نے کہہ دیا تھا۔ کہ وہ بیاہ کر آچکی ہے۔ اس لئے ہر قدم پر سسرال والوں کا ساتھ دے گی۔ لیکن سیکے کی یاد بھلاؤ ابھی تو آسان نہیں تھا۔ سسرال میں اتنے ہی ایسی واردات ہو چکی تھی کہ جائے رفتی نہ پائے۔ ماندن والا معاملہ ہو گیا تھا۔ کتنی خوشیاں منائی گئی تھیں۔ کتنے ارمانوں سے یہ شادی ہوئی تھی۔ ہر جوان لڑکی کی طرح اس نے بھی آنکھوں میں سنہری پنے سجائے ہوئے تھے۔ کتنے شوق کیے ارمان تھے۔ وہ دلہن بنی تھی تو

انگ انگ سے مسرتوں کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔

لیکن

خواب تعبیریں پانے سے پہلے ہی بکھر گئے تھے۔ اس نے تو خوابوں کے سمجھنے جیالے اور بہادر شہزادے کو پوری طرح دیکھا بھی نہ تھا کہ ظلماتی ماحول ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ شادی کے رنگین و حسین دن سنگین باتوں اور فیصلوں کی نذر ہو گئے تھے.....

وہ سوچوں میں الجھی ہوئی تھی..... کم عمری کی سوچیں بے تجربہ ہی تو ہوتی ہیں۔ فیصلے کر کے بھی پچھتاوہ دامن نہیں چھوڑتا..... من ہر بات کو اپنے انداز سے دیکھنے کا متمنی ہوتا ہے۔ افتاد پڑ جائے تو برداشت نہیں کر پاتا..... کبھی باغی ہو جاتا ہے۔ کبھی بکھر جاتا ہے۔

”چھوٹی بی بی.....“ نوکرانی نے پٹنگ کے قریب آتے ہوئے اسے بڑے احترام سے پکارا۔
تمکین نے سر اٹھایا..... گردن موڑ کر نوکرانی کو دیکھا..... پھر سیدھی ہو کر اٹھتے ہوئے بولی

”کیا ہے“

”چھوٹی بی بی..... آپ کو خان بابا نے بلایا ہے.....“

”مجھے.....“

”جی“

”کیوں“

”پتہ نہیں جی.....“

”کہاں ہیں وہ.....“

”صدر دالان میں بیٹھے ہیں.....“

”آغا بی بی بھی وہیں ہیں.....“

”جی.....“

”اور کون کون ہے“

”دونوں چھوٹے خان بھی ادھر ہی ہیں.....“

تمکین نے اک گہری سانس لی۔ وہ سمجھ گئی کہ کوئی خاص ہی بات ہے۔ اور خاص بات جو ہو سکتی تھی اس کا بھی اسے اندازہ ہو گیا۔ نوکرانی کو غور سے دیکھا..... وہ خاصی سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

تمکین نے کورات صبور خان کی باتوں سے بھی کچھ اندازہ ہو چکا تھا۔ خان بابا شاید اک خبیلی قبیلے سے نہنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ مسلح تصادم اب ناگزیر تھا.....

نوکرانی نے چادر اٹھائی..... تمکین نے اٹھی۔ تو اس نے آگے بڑھ کر چادر اس کی پشت پر پھیلاتے ہوئے سر اور کندھوں پر ڈال دی۔ پھر جھک کر موٹی ٹوک والی طلے وار جوتی اٹھا کر اس کے پیروں کے قریب رکھ دی.....

تمکین نے اپنے گلابی خوبصورت پاؤں جوتی میں ڈالے اور چادر سر کے پیچھے درست کرتے ہوئے قدم اٹھایا۔

نوکرانی اس کے پیچھے پیچھے چلی.....

صدر دالان کے دروازے پر رک کر تمکین نے چادر پھر ٹھیک کی۔ لمبی چوڑی چادر کا ایک کنارہ ہاتھ میں لے کر سینے پر ڈال لیا۔ پھر سر جھکائے آہستہ آہستہ چلی اندر آئی۔

ایک نگاہ چاروں اور ڈالی۔

خان خوشدل خان درمیانے قد کے خاصے چوڑے چکلے آدمی تھے۔ چھوٹی چھوٹی گھنی داڑھی اور بھاری بھاری مونچھوں نے ان کے چہرے کو خاصہ سنگین بنا رکھا تھا..... ان کے رویے میں ایسی سنگینی ہوتی تھی کہ دیکھنے والے پر ایک بار تو بہت سے کپکپی سی ضرور طاری ہو جاتی تھی۔ تمکین نے ان کا رویہ مشفقانہ تھا۔ اتنے دنوں سے وہ یہاں رہ رہی تھی۔ ایک بار بھی خان بابا نے اس سے تلخ ترش بات نہ کی تھی۔ پھر بھی تمکین کے من میں خوف سا اترا ہوا تھا.....

آغا بی بی ان کے قریب ہی دیوان پر بیٹھنے کے سارے بیٹھی تھیں..... صبور خان کھڑکی کے قریب کھڑے تھے اور نواز خان گدے پر بیٹھا تھا.....

نواز تمکین کو دیکھتے ہی تعظیم اٹھ کھڑا ہوا.....

تمکین نے قدرے جھک کر آغا بی بی اور خان بابا کو سلام کیا.....

سلام کا جواب دیتے ہوئے خان بابا نے اسے قریب بلایا۔ اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے قریب بیٹھنے کو کہا۔

”بیٹھو.....“

تمکین خاموشی سے دیوان کے کنارے پر ٹک گئی۔

چند لمحوں کے لئے دالان میں خاموشی کا تسلط رہا۔ یہ خاموشی بڑی گہمیر اور معنی خیز تھی.....

تمکین کا دل طائر بے بس کی طرح سینے کے بنجرے میں پھڑپھڑا رہا تھا.....

”خان بابا.....“ تمکین نے خاموشی کو توڑا..... ”آپ نے مجھے یاد فرمایا.....“

”ہاں بیٹی..... تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں.....“ خان بابا چلم کے کش لینے کے بعد اسے

ایک طرف کرتے ہوئے بولے۔

”جی فرمائیے..... تمکینے نے ہمت سے کہا۔

خان بابا نے اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ بھولی بھالی پیاری سی لڑکی پر رحم بھی آیا لیکن وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ فیصلہ کر لیا تھا۔ اور ان کا فیصلہ پتھر پر لکیر ہوا کرتا تھا..... اپنے بچے کے خون کا بدلہ انہوں نے لینا ہی تھا.....

”تم جانتی ہو بیٹی“ خان بابا بولے..... ”کہ میں نے اپنے اور اکا خیل قبیلے کی دشمنی کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی تھی..... بدلے کی شادیاں اک مضبوط قدم تھیں۔ لیکن افسوس کہ اکا خیل اپنی شریندی سے باز نہیں آئے ہمیشہ گل کا کاچیسے شریف النفس انسان کا خون کر کے انہوں نے بھتی آگ کو پھر سے بھڑکا دیا ہے.....“

وہ چند لمحوں کو رکے۔ آغا بی بی دم سادھے بیٹھی تھیں۔ صبور خان بھی چپ تھا۔ اور نواز خان بھی خاموش۔ لیکن نواز خان کی خاموشی امنڈ آنے والے طوفانوں کی خاموشی سے مشابہ تھی۔ وہ کونے میں دھنسا بیٹھا تھا۔ لیکن کئی بار بے چینی سے پہلو بدل چکا تھا۔

خان بابا نے کافی لمبی چوڑی تسنید باندھی۔ تمکینے کا دل کبھی بے اختیار اندھڑکنے لگتا۔ کبھی پھڑپھڑاتا اور کبھی گلتا بالکل جامد ہو گیا ہے..... اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا مشاہدہ آغا بی بی اور صبور خان خاموشی سے کر رہے تھے۔

”دشمنی ختم ہونے کی بجائے اور بڑھ گئی ہے۔ عظمت خان رحمت خان بہت پھرے ہوئے ہیں کشمالے ان کی اگلوٹی بہن ہے۔ وہ اس کے چہرے کی سوگواری کو زیادہ دیر برداشت نہیں کر پائیں گے.....“ خان بابا بولتے چلے گئے..... تمکینے سستی رہی.....

لمبی چوڑی باتوں کے بعد خان بابا بولے ”یہ سب باتیں تمہارے علم میں بھی تھیں۔ لیکن میں نے انہیں پھر اس لئے دہرایا ہے۔ کہ تم حقیقت حال سے پوری طرح باخبر ہو جاؤ..... اور ہمارے فیصلے سے بھی تمہیں آگاہی ہو جائے..... اب طمنچوں اور رائفلوں کو زیادہ دیر بیکار نہیں رکھا جاسکتا.....“

تمکینے نے خان بابا کے رکنے پر نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں خان بابا.....“ وہ آہستگی سے بولی۔

صبور خان نے بے تابی سے اسے دیکھا..... نواز خان نے گہری نگاہ اس پر ڈالی۔ اور آغا بی بی کے چہرے پر تاریک سے سائے لہرا گئے۔

”تمکینے بی بی..... خان بابا بولے ”تم ہماری بہنو۔ ہماری عزت ہو..... یہ گھراب تمہارا

گھر ہے۔ اسی گھر کے نفع نقصان سے اب تم بھی وابستہ ہو..... لیکن..... وہ چند لمحوں کے پھر بولے..... ”لیکن یہ سب ہمارے نقطہ نظر سے ہے۔ میں تم پر کوئی دباؤ نہیں ڈالنا چاہتا۔ کوئی پابندی لگانا نہیں چاہتا..... دباؤ اور پابندی بزدلی کے زمرے میں آتا ہے۔ اس لئے تمہیں فیصلے کی اجازت دیتا ہوں..... تم چاہو۔ تو واپس اپنے باپ کے گھر جاسکتی ہو۔

تمکینے نے ہولے ہولے سر اٹھایا۔ اس کی نگاہیں صبور خان کی نگاہوں سے ملیں۔ صبور نے جلدی سے رخ پھیر لیا..... تمکینے کا دل دکھا۔ لیکن وہ بڑی مضحکم آواز میں بولی۔

”خان بابا..... میں اپنے گھر میں آچکی ہوں۔ اس گھر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی..... ڈولی اس گھر میں آئی ہے۔ تو اب جنازہ ہی نکلے گا..... یہاں سے.....“

”تمکینے.....“ آغا بی بی نے اٹھ کر اسے لپٹا لیا۔ صبور خان نے بھی پلٹ کر اسے دیکھا۔

خان بابا بھی متاثر ہوئے اور نواز کو بھی جیسے سکون مل گیا.....

”اک ہمار اور غیور بیٹی سے مجھے انہی الفاظ کی توقع تھی.....“ خان بابا نے جلدی سے کہا

”آفرین ہے تم پر تمکینے آفرین ہے.....“

تمکینے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی..... اس کے سینے میں جولاٹم تھا اسے بمشکل روکے ہوئے تھی۔ اتنا بڑا فیصلہ کر لینا آسان کام نہیں تھا..... ماں باپ سے ہمیشہ کے لئے پھڑک کر جینا اور سنگین دشمنی کی دیوار درمیان میں حائل کر لینا ازیت ناک تھا..... خان بابا سے داد و تحسین دے رہے تھے۔ کہ وہ بولی ”میں جاسکتی ہوں خان بابا.....“

”جاؤ.....“

اس نے قدم اٹھایا تو خان بابا نے کہا ”سنو.....“

”جی“

”تمکینے یہ فیصلہ تم نے کسی دباؤ میں آکر تو نہیں کیا.....“ خان بابا نے کہا اور پھر صبور کی طرف دیکھا۔

”جی نہیں.....“ وہ بوجھل آواز سے بولی..... ”یہ میرا فیصلہ ہے اور میں نے ہمت سوچ سمجھ کر کیا ہے.....“

”میں سر بلند خان کو سلام کرتا ہوں۔ جس نے تمہاری ایسے خطوط پر پرورش کی.....“

”شکریہ خان بابا.....“ وہ اندھی آواز میں بولی..... اسے خوشی بھی ہوئی۔ کہ باپ کے اس

دشمن نے اس کے باپ کی سر بلندی کو کسی طور تسلیم تو کیا۔

”اب میں جاسکتی ہوں“ تمکینے چند لمحوں بعد بولی۔

”جاؤ.....“ خان بابا نے اجازت دی۔ تو وہ تیز تیز قدموں سے چلتی دالان سے نکلی اور پھر تیر کی سی تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی.....

کمرے میں آتے ہی وہ پٹنگ پر اوندھی گر گئی..... اور مبرو ضبط کے بند ٹوٹ گئے..... بابا بے بے اور بھائی بہت یاد آئے..... ان خون کے اٹوٹ رشتوں کو توڑ دینے کے معاہدہ پر وہ مرثیت کر آئی تھی..... وہ بے اختیار ہو کر رو رہی تھی.....

”تمکینے“ اس کی پشت پر مبرو خان نے ہاتھ رکھ کر آہستگی سے جھکتے ہوئے پکارا..... تمکینے نے سر اٹھایا..... گردن گھما کر پٹنگ کے قریب جھکے مبرو خان کو دیکھا..... وہ گہرا گئی۔ جلدی سے آنکھیں چادر کے کونے سے پونچھتے ہوئے بولی ”آپ نے مجھے بلایا.....“

”تمکینے“ مبرو خان نے اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے سامنے پٹنگ پر آہستگی سے بٹھادیا.....

تمکینے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

مبرو خان اسے بھرپور نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا..... ”تمہارے جذبات کا مجھے احساس ہے تمکینے.....“

تمکینے کے آنسو اک بار پھر بہہ نکلے.....

”تم نے جس حوصلے سے خان بابا کو اپنا فیصلہ سنایا ہے۔ اس پر حوصلے ہی سے قائم رہو..... یہ فیصلہ تم نے جس مصلحت کے تحت.....“

”میں نے کسی مصلحت کے تحت یہ فیصلہ نہیں کیا خان.....“ تمکینے جھللاتی آنکھوں سے مبرو خان کو دیکھ کر بولی..... ”یہ فیصلہ میں نے صرف اور صرف آپ کی خاطر کیا ہے۔ اب آپ ہی میرے سب کچھ ہیں.....“

”تمکینے.....“ بڑے جذباتی انداز میں مبرو خان نے کہا۔ اور یہی وہ لمحہ تھا۔ جو اس کے دل میں تمکینے کے لئے پیار و محبت کے طوفان چگا گیا..... بڑی بے اختیاری سے اس نے تمکینے کو بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگالیا.....

تمکینے اس اظہار سے حیران ہو گئی..... مبرو خان کی بے دلی سے شادی کرنے کا اسے پتہ چل چکا تھا..... لیکن اب..... اب اسے لگتا تھا..... وہ مضبوط حصار میں محفوظ ہو گئی ہے..... وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر ہچکیوں سے رونے لگی۔

”تمکینے“ صبر نے اس کے بالوں پر گال رکھتے ہوئے بڑے جذباتی انداز میں کہا ”میں نادام ہوں..... میں نے اتنے دنوں سے تمہارے ساتھ سرد اور بیگانہ سلوویہ قائم رکھا مجھے معاف کر دو..... تمکینے..... میں اپنے رویے پر بہت شرمندہ ہوں..... تم اتنی عظیم ہو..... مجھے اب احساس ہوا ہے..... میں..... میں..... بہت خفت محسوس کر رہا ہوں“

”نہیں خان..... نہیں.....“ تمکینے نے آنسوؤں سے رندھی آواز میں کہا..... ”ایسا نہ کہئے.....“

”تم نے مجھے جیت لیا..... تمکینے..... خرید لیا..... ساری عمر کے لئے..... ساری عمر کے لئے خرید لیا“

مبرو خان کے بازوؤں کا حلقہ تنگ ہو گیا.....

اور مضبوط تحفظ کا احساس تمکینے کے دل میں تو مند ہو گیا.....

خان بابا بڑے تساہل سے نیم دراز تھے۔ خوشبودار تمباکو چلم میں بھرا تھا..... مزے مزے سے کس لگا رہے تھے۔ کبھی کبھی کسی سیاسی خبر پر تبصرہ بھی کر دیتے۔ نواز خان بھی اخبار ایک طرف کر کے اس تبصرے میں حصہ لے لیتا..... اخبار روزانہ چار سہ سہ سے منگوائی جاتی تھی۔

”نواز خان چھوڑوان باتوں کو.....“ خان بابا نے کرسی میں سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا ”یہ بتاؤ پشاور کب جارہے ہو.....“

”پشاور!“ آغا بی بی نے جلدی سے کہا..... پھر نواز کو دیکھا۔

”ہاں بابا۔ اگلے ہفتے جاؤں گا۔ ابھی یونیورسٹی بند ہے..... میں.....“ نواز بولا۔

آغا بی بی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”کیا ضرورت ہے اب داخلہ لینے کی.....“

”کیوں..... پڑھ رہا ہے پڑھنے دوا سے.....“

”بس اتنی پڑھائی کافی ہے بیٹے۔ اپنے بھائی کی طرح تم بھی زمینوں کی دیکھ بھال کیا کرو صبور خان نے کب سے باپ کا بار اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے.....“

نواز خان نے مسکرا کر ماں کو دیکھا..... پھر بولا ”آغا بی بی..... یہ کام گل لالہ ہی کریں گے“

”اور تم..... تم کیا کرو گے“ نوکری..... ”وہ نوکری پر جیسے نعرین کر رہی تھیں نواز خان ہنس کر بولا.....“ کیا ہرج ہے آغا بی بی..... پڑھ لکھ کر بیکار میں ضائع کرنا کوئی اچھی بات ہے.....“

”نوکری غلامی ہوتی ہے اور تو جانتا ہے تیرے خاندان نے اپنا خدا کے سامنے ہی جھکا یا ہے۔ کسی انسان کے سامنے نہیں.....“

”میں بہت برا افسر بنوں گا.....“ اس نے خوشی سے ماں کو چھیڑا.....

”اسی لئے اور پڑھنا چاہتا ہے“ وہ بولیں۔

”علم کی کوئی حد نہیں آغا بی بی.....“ خان بابا نے مسکرا کر بیوی کو دیکھا..... ”ویسے نواز خان نوکری نہیں کرے گا۔ اس سرشت کا آدمی نوکری نہیں کر سکتا.....“

”آپ نے سچ کہا بابا.....“ نواز بولا.....

”تو پھر.....“ آغا بی بی نے کہا۔

”ویسے آپ کو یہ بتا دوں آغا بی بی“ نواز خان نے کہا ”یہ زمینداری والے جھجھٹ میں بھی نہیں پڑنے کا ہیں.....“

”کیا ارادے ہیں“ خان بابا پھر کس لیتے ہوئے نیم دراز ہو گئے۔

”بزنس کروں گا خان بابا.....“ وہ جلدی سے بولا..... ”میرا بزنس کرنے کا پختہ ارادہ

حویلی کے صحن میں پھولوں کی خوش رنگ کیاریوں کے پاس بان کے بھاری بھر کم پلنگ اور تخت پڑے تھے..... خان بابا ایک تخت پر نیم دراز چلم کے کش لے رہے تھے..... ان کے قریب ہی نواز خان بیٹھا اخبار کی موٹی موٹی سرخیاں انہیں پڑھ کر سنا رہا تھا..... دھوپ بڑی نکھری ہوئی تھی۔ سردیوں کے موسم میں دھوپ کا یہ نکھار من کو بھار رہا تھا.....

آغا بی بی اور ہمکنے پلنگ پر قریب قریب بیٹھی تھیں۔ دونوں باتیں کر رہی تھیں۔ آغا بی بی ہمکنے کی دلجوئی میں کوئی کسر اٹھانہ رکھتی تھیں۔ عورت تھیں۔ انہیں ہمکنے کے دلی جذبات سے آگئی تھی..... اس کے میکے کی کمی پوری کرنے کی ہر طور پر کوشش کرتی رہتیں..... خان بابا کا فیصلہ تو سب سن چکے تھے..... لیکن تا حال اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھایا نہیں گیا تھا..... وقت اور موقع کا انتظار تھا..... یہ وقت اور موقع ضروری نہیں تھا..... کہ فوری طور پر ہی آجاتا..... اس کے لئے دنوں ہفتوں مہینوں سالوں اور کبھی کبھی سال ہا سالوں بھی انتظار کرنا پڑتا تھا۔ انتقام اور بدلے کی آگ کبھی یکدم بھی بجڑک اٹھتی تھی..... اور کبھی یہ آگ چنگاریوں کی صورت راکھ میں برسوں دہی رہتی تھی..... شعلے سے چنگاریاں اور چنگاریوں سے شعلے بن جانا اس کا مقدر تھا.....

ہمکنے کو گھروالوں کی پوری توجہ اور شفقت مل رہی تھی۔ صبور خان کا گھر پوریا میر تھا۔ پھر بھی اندر ہی اندر دکھ کی کیفیت طاری رہتی۔ اپنی ہمت اور حوصلہ خود ہی بندھائے رہتی۔ اپنے فیصلے سے سرمو ادھر ادھر نہ ہو سکتی تھی۔ پھر بھی کبھی کبھی بے طرح اداس ہو جایا کرتی چپکے چپکے دعائیں مانگتی۔ پچھڑے ماں باپ اور بھائی سے ملنے کی دعائیں.....

اب بھی وہ بظاہر آغا بی بی کی طرف متوجہ تھی۔ لیکن خان بابا اور نواز خان کو دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں اپنے اللہ کو یاد کرتے ہوئے کہہ رہی تھی ”میرے مولا..... ان کے دلوں میں رحم ڈال۔ دشمنی کی آگ کو سرد کر دے..... میرے ماں باپ اور بھائی کو مجھ سے ملادے.....“

ہے۔۔۔۔۔

”بزئس۔۔۔۔۔“

”جی بابا۔۔۔۔۔“

”کوئی بزئس۔۔۔۔۔“

”میں کسی وقت اپنے پورے پلان سے آپ کو آگاہ کروں گا۔۔۔۔۔ وہ تہکال بالا والے سعد اللہ خان ہیں نا۔۔۔۔۔ بابا آپ انہیں جانتے ہیں؟“

”ہاں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔۔۔۔۔“

”ان کے بیٹے عبید اللہ نے پشاور میں کاروبار شروع کر رکھا ہے۔ لکڑی کی بزئس کر رہا ہے۔ اب ایک ٹیکسٹائل مل بھی لگانے کی سوچ رہا ہے کوہاٹ میں۔۔۔۔۔ بہت اونچے پیمانے پہ کام کر رہا ہے۔ وہ میرا گرا دوست ہے۔“

”تم بھی اس کے نقش قدم پہ چلنا چاہتے ہو۔۔۔۔۔“

”فی الحال سوچ رہا ہوں۔ پلان کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ ہر پہلو زیر غور ہے میرے۔۔۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔“

”نواز خان۔۔۔۔۔ میں جانتی ہوں۔ تھیں شہر میں رہنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ بزئس کے بارے

میں اسی لئے سوچ رہے ہو کہ مستقل شہر میں رہنا چاہتے ہو۔۔۔۔۔“

”شہر کو سنا دور ہے آغا بی بی۔۔۔۔۔“ نواز بولا۔۔۔۔۔ ”خیر ابھی سے فکر شروع نہ کر دیں جب پلان

کھل ہو گا تب اس بارے میں سوچ لیجئے گا۔۔۔۔۔ ابھی تو میں نے ایم اے کرنا ہے۔“

”کوئی ہرج بھی نہیں ہے۔۔۔۔۔“ خان بابا بولے۔۔۔۔۔ ”پشاور آنا جانا تو رہتا ہی ہے۔ اتنا دور بھی

نہیں ہے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔“

وہ کچھ کہنے کو تھے۔۔۔۔۔ کہ حویلی کے صدر دروازے سے حکمت خان کو اندر آتے دیکھ کر بات

ادھوری چھوڑ دی۔

حکمت خان ان کاموں زاد بھائی تھا۔ نہایت شریف آدمی تھا۔۔۔۔۔ حجرے کی دیکھ بھال اسی کے ذمہ تھی۔ بیوی تھی نہ بچے۔ اسی گھر کا فرد بن کر رہ گیا تھا۔ اس نے کھلے گھیر کا کھدر کا کرتا اور چوڑے ہائینچوں والی اس کھدر کی شلوار پہن رکھی تھی۔ سر پر گلی بندھی تھی۔ گلے میں کالی واسکت تھی۔ جس کے اندر سے کارتوسوں کی پٹی نظر آ رہی تھی۔ اس پٹی کے سرے پر پستول چمڑے کے کیس میں لٹک رہا تھا۔۔۔۔۔ خان خوشدل خان کا مستند خاص بھی تھا۔ جہاں بھی خان جاتا۔۔۔۔۔ وہ دوسرے چند خدمت گاروں اور باڈی گارڈوں کے

ہوتے ہوئے بھی خان خوشدل خان کے ساتھ ہوتا تھا۔۔۔۔۔ بہت وفادار اور جانثار قسم کا بندہ تھا۔۔۔۔۔ سب گھر والے اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ ایک دفعہ تو وہ خان کی جان بھی اپنی جان پر کھیل کر بچا چکا تھا۔ صبور خان اور نواز خان کی گھرائی بھی اس نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ ان کے حفاظتی ملازم اس نے بڑی جانچ پڑتال کے بعد رکھے تھے۔

اس نے کئی گز دور ہی رک کر خان کو سلام کیا۔

”کیا بات ہے حکمت کا کا“ نواز نے پوچھا۔

”خان۔۔۔۔۔“ حکمت نے خوش دل خان سے کہا ”کچھ لوگ حجرے میں آئے بیٹھے ہیں۔“

”تو۔۔۔۔۔“ خان نے کرسی سے پشت نکالتے ہوئے کہا۔

”آپ سے ملاقات کرنے آئے ہیں۔۔۔۔۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ چلو۔۔۔۔۔ میں آتا ہوں۔ تم ان کی خاطر مدارت کرو۔۔۔۔۔“

نواز خان نے اخبار میز پر رکھ دی۔ حکمت خان سے پوچھا ”کون لوگ ہیں۔۔۔۔۔“

حکمت خان نے سر قدرے جھکایا۔ چورسی نظروں سے آغا بی بی اور تمکینے کو دیکھا پھر

بولا۔۔۔۔۔ ”حیف گل اور ضیغم خان آئے ہیں۔۔۔۔۔“

”حیف گل کا کا“ تمکینے کے منہ سے بے اختیار اٹھ نکل گیا۔۔۔۔۔ سب نے اس کی طرف

دیکھ کر تمکینے اپنی جلد بازی پر کچھ پریشان سی ہو گئی۔ آغا بی بی نے اس کے کندھے کو ہولے سے تھپ تھپایا۔۔۔۔۔

میکے سے آدمی آیا تھا۔ تمکینے کی بے اختیار قدردانی تھی۔

خان خوشدل خان نے معنی خیز نظر نواز خان پر ڈالی۔۔۔۔۔ پھر حکمت خان سے بولے ”چلو ہم

آتے ہیں۔۔۔۔۔“

”خان بابا۔۔۔۔۔“ نواز نے ہولے سے کہا ”یہ سر بلند خان کے آدمی ہیں۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“

”کس لئے آئے ہیں۔۔۔۔۔“

خان نے پھر معنی خیز نگاہ نواز پر ڈالی۔ اور تفاخر سے بولے ”جس لئے بھی آئے ہیں وہ

ہمارے ہاں آئے ہیں۔ ہم نہیں گئے ان کے ہاں۔۔۔۔۔“

”میں بھی آؤں بابا۔۔۔۔۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ ہم خود ان سے بات کریں گے“

خان بابا نے کندھے کی چادر اتار کر جھاڑی اور پھر کندھے پر ڈال لی۔ واسکت کے

بٹن بند کئے اور سینہ تان کر چلتے صدر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

حنیف گل خاصہ معتبر آدمی تھا۔ ضیغم بھی اپنے علاقے کا مانا ہوا خان تھا۔ دونوں مفاہمت اور مصالحت کے مشن پر آئے تھے۔ حنیف گل سے تو خان خوشدل خان کی بھی جان پہچان تھی۔ اور ضیغم سے بھی علیک سلیک تھی۔ ان کے ساتھ دو تین اور آدمی بھی آئے تھے۔

سب حجرے کے صحن میں بچھے بان کے پلنگوں پر بیٹھے تھے۔ حکمت خان نے تازہ کئے ہوئے حقے ان کے سامنے رکھے تھے۔ فرید اللہ ان کی خاطر تواضع کے لئے قہوہ ڈرائے فروٹ اور مالٹے وغیرہ ٹرے میں رکھ کر لا رہا تھا۔

لیکن

ان لوگوں نے ابھی چلموں کا بھی کوئی کش نہیں لیا تھا۔

خان خوشدل خان حجرے میں داخل ہوئے تو نوکر چاکر کھڑے ہو گئے سینے پر ہاتھ باندھ باندھ کر سلام کرنے لگے حنیف گل اور اس کے ساتھیوں نے بھی کھڑے ہو کر خان سے مصافحہ کیا۔ سلام دعا ہوئی۔

”تشریف رکھئے“ خان نے ان کو بیٹھنے کے لئے کہا اور خود بھی ایک پلنگ پر گاؤنٹیکہ کھنی تلے دبا کر بیٹھ گیا۔

چند لمے خاموشی رہی۔ پھر خان نے بات چھیڑی ”آج موسم بہت اچھا ہے۔ اتنے دنوں بعد ایسی نکھری نکھری دھوپ نکلی ہے۔“

”دھوپ میں بیٹھنا اچھا لگ رہا ہے“ حنیف گل نے کہا۔

”رات بہت ٹھنڈی تھی“ ضیغم بولا۔

”لنڈی کوتل برف پڑی ہے“ حکمت خان بولا۔

”اسی لئے سردی تھی۔“ خان خوشدل بولا۔

”اب بھی ہوا بند ہے۔ ہوا چلنے لگے تو دھوپ میں بھی ٹھنڈ لگے گی“ ضیغم نے کہا۔

”موسم خوشگوار ہی رہے تو اچھا ہے“ حنیف گل نے مسکرا کر خان خوشدل خان کو دیکھا

”کیوں خان!“

”بالکل“ خان خوشدل خان نے بھی مسکرا کر کہا۔ پھر ہولے سے کہا ”لیکن سردی گرمی کا

مقابلہ بھی کرنا ہی پڑتا ہے۔“

ضیغم نے معنی خیز نظروں سے حنیف گل کو دیکھا۔ جو خان کی بات کا جواب دیئے بغیر ہولے ہولے سر ہلا رہا تھا۔ اس نے دو ایک بار اپنی سر بندھی مشدی لٹکی اور طلے والے کلاہ کو دور ست کیا۔

خان خوشدل خان نے بھی اپنی داڑھی پر پونہی ہاتھ پھیرا۔

فرید اللہ قہوہ اور دوسرے لوازمات لے آیا۔

خان خوشدل خان نے اپنے ہاتھ سے قہوے کی بے ڈنڈی کی پیالی ٹرے سے اٹھائی اور خود

حنیف گل کو پیش کی۔

حنیف گل نے پیالی لے لی۔

خان نے ضیغم اور دوسرے ساتھیوں کو بھی خود قہوہ پیش کیا۔ حنیف گل تقلید کرتے ہوئے سب

نے قہوہ لے لیا۔ اور جب تک حنیف گل نے قہوے کا گھونٹ نہ پیا۔ وہ بھی پیالیاں لئے بیٹھے رہے۔

”نوش فرمائیے“ خان نے ان سے کہا۔

حنیف گل نے قہوے کا گھونٹ لے لیا۔ سب ساتھی بھی اپنی پیالیاں منہ کی طرف لے

گئے۔ یہ اچھی علامت سمجھی گئی تھی۔ خان نے اپنے ہاتھوں سے قہوہ پیش کر کے ان کی عزت افزائی کی تھی۔

اور انہوں نے قہوہ پی کر خان کو نوازا تھا۔

تھوڑی دیر قہوے کا دور چلا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ تمباکو نوشوں نے چلمیں اپنے سامنے کر لیں

پھر

حنیف گل نے اپنی آمد کا مدعا خان پر واضح کیا۔

خان خوشدل خان نے گاؤنٹیکہ ہٹا کر سیدھا بیٹھے ہوئے حنیف گل کو گہری نظروں سے دیکھا اور

بولا۔ ”آپ یہ سب کچھ نہ بھی کہتے تو بھی آپ کی آمد سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا تھا۔ لیکن۔۔۔۔۔ آپ جانتے ہیں

معاملہ کتنا سنجیدہ ہو چکا ہے۔“

”اسی لئے تو میں حاضر ہوا ہوں۔۔۔۔۔ مقیم خان کی حماقت کا خمیازہ معصوم اور بے گناہ لوگ

کیوں بھگتیں۔“

”ہمارے علم میں بھی یہی بات آئی ہے کہ مقیم خان نے ہمیشہ گل کا کاپر گولی چلائی

تھی۔“ خان نے کہا۔

”سر بلند خان کا تو کوئی قصور نہیں تھا خوش دل خان۔۔۔۔۔ حنیف گل ملائمت سے بولا۔

”وہ بھی آپ کی طرح اس صدیوں پرانی دشمنیوں کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ بڑی خوشی سے اس

نے یہ دونوں رشتے طے کئے تھے۔“

حنیف گل نے مقیم کی شریستگی کی پوری تفصیل خان خوشدل خان کو سنائی ضیغم نے بھی چند باتیں

کیں۔ باقی ساتھی خاموشی سے باتیں سنتے رہے.....

خان خوشدل خان کے آدمی اس کے پٹنگ کے پیچھے سینوں پر ہاتھ باندھے مستعد کھڑے

رہے۔

حیف گل متاثر کن انداز میں باتیں کر رہا تھا..... خون خرابے کو روکنے کی باتیں کر رہا تھا خدا اور

رسول کے فرمان بتا رہا تھا۔

خان خوشدل خان کا چہرہ کبھی لال بھبھو کا ہو جاتا۔ کبھی سپید پڑ جاتا..... چہرے کے اتار چڑھاؤ

بڑے جذباتی تھے.....

حیف گل نے اپنی لمبی چوڑی تقریر ختم کی۔ تو خان نے مستحکم آواز میں پوچھا ”اب آپ چاہتے

کیا ہیں.....“

”آپ نے اور خان سر بلند خان نے جن نیک خواہشات کے ساتھ پرانی دشمنیوں کو جنہیں مقیم

نے پھر سے بھڑکا دیا ہے..... ایک بار پھر ختم کر دیا جائے.....“

”حیف گل“ خان نے جو شیلے لہجے میں کہتے ہوئے گلے میں پڑی کارٹوس کی پٹی اور اس میں

لٹکتے طمنچے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”خون ہمارے بندے کا ہوا ہے..... یہ خون ارزاں نہیں ہے.....“

”میں مانتا ہوں خوشدل خان.....“ حیف بولا۔

”ہمیں اس بات کا احساس ہے“ ضیف نے کہا۔

”پھر.....“ خان خوشدل خان نے تلخی سے کہا۔

”ہمیں عقل و ہوش کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے..... بدلہ لینے سے معاف کر دینا بہت افضل

ہوتا ہے خوشدل خان..... بدلے کی آگ یقیناً آپ سب لوگوں کے دلوں میں بھڑک رہی ہے..... یہ آگ اگل دی

گئی تو بہت کچھ بھسم ہو جائے گا..... سناں جانیں جانیں گی تباہی اور بربادی کے سوا ہاتھ کیا آئے گا.....“

”تسکین.....“ خوشدل بولے۔

حیف گل کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی۔ جو تلخی کا پہلو لئے ہوئے تھی۔ اس نے اس

تسکین پر بھی خاصہ لیکچر دے ڈالا..... حدیث و سنت کی روشنی میں خوشدل خان اور اس کے آدمیوں کو سمجھانے کی

کوشش کی۔

درمیان درمیان میں خوش دل خان بھی بولتے رہے۔ ضیف بھی باتیں کرتا رہا اور ان کے

ساتھیوں میں سے بھی دو ایک نے چند جملے کہے۔

خاصی دیر بحث و مباحثے کی کیفیت رہی۔

”آپ کو سر بلند خان نے بھیجا ہے“ خوشدل خان نے لمبی چوڑی بحث کے بعد پوچھا۔

”ہم صلح و آشتی کا پیغام لے کر آئے ہیں خان..... بڑے نیک جذبوں کے ساتھ آئے ہیں

آپ نے میرے سوال کا براہ راست جواب نہیں دیا.....“

”یعنی.....“

”یہی کہ کیا آپ کو خان سر بلند خان نے بھیجا ہے.....“

”صلح کا پیغام میں نے آپ کو دیا ہے.....“

”اور سر بلند خان نے.....“

”بے شک اس کے مشورے سے ہی ہم نے یہ قدم اٹھایا ہے.....“

حیف گل کی بات سے خان خوشدل خان کے چہرے پر فتح یابی کی چمک لہرا گئی۔ بڑے قفاخر سے

اس نے گردن گھما کر پیچھے کھڑے اپنے جائزہ ساتھیوں کو دیکھا..... ان کے چہروں پر بھی قفاخر آمیز مسکراہٹ

پھیل گئی۔ سب گردن اگڑا کر کھڑے تھے۔ حیف گل اور اس کے ساتھیوں کو بڑے غور سے دیکھا۔

ضیف نے تو پیچ و تاب کھائے۔ اس کے باقی ساتھیوں نے بھی نظروں کی یہ حقیر بڑی مشکل سے

برداشت کی۔ لیکن حیف گل نے صبر کا دامن نہیں چھوڑا..... پرسکون انداز میں باتیں کئے گیا.....

”میں نے سر بلند کو بھی اسی طرح سمجھا بجا کر قائل کیا ہے۔ اور آپ کو بھی کر کے رہوں گا۔

میں خون ناحق پینے نہیں دوں گا.....“

اس کی لمبی چوڑی باتوں کے جواب میں خان خوشدل خان سینہ تان کر بولا ”ٹھیک ہے حیف

گل مقیم خان کو ہمارے حوالے کر دو..... ہم اپنی رائے کے دہانے نہیں کھولیں گے.....“

”ضیف کے چہرے پر کئی رنگ آئے اس کے دو ساتھی تو اٹھ کر کھڑے بھی ہو گئے۔

حیف گل نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں بیٹھنے کو کہا..... ضیف کے کندھے پر بھی ہاتھ رکھا۔

پھر خان سے گویا ہوا..... ”مقیم خان کو قتل کرو گے.....“

”بالکل.....“

”تو پھر صلح کا امکان کہاں رہے گا۔ بات وہیں نہ آجائے گی..... کہ اکاخیل قبیلے کا آدمی قتل

ہو گیا۔ وہ بھی ذلت اور رسوائی کے ساتھ.....“

”تو پھر یہی بہتر ہے کہ حالات کو ان کے دھارے پر بننے دیا جائے.....“

”نہیں خوشدل خان..... تم اپنے قبیلے کے سردار ہو..... سارے علاقے کے مانے ہوئے آدمی

ہو..... تمہارے اشارے پر قتل قتل ہو بھی سکتا ہے اور رک بھی سکتا ہے“

”ہم اپنی عزت بچانے کے لئے ہر قدم اٹھا سکتے ہیں..... یہ ہماری روایت ہے.....“

”تم سمجھ دار اور ہوشمند آدمی ہو.....“

”اپنی روایات سے منحرف نہیں ہو سکتا.....“

کافی دیر باتیں ہوتی رہیں..... لیکن باتیں تقریباً بے نتیجہ ہی رہیں.....

حنیف گل نے پھر آنے کا کہا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر واپس چلا گیا۔

حنیف دوبارہ بات چیت کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ تو اس ملاقات ہی سے سبکی کا اثر لے رہا تھا۔

لیکن حنیف گل صاحب عقل و دانش تھا۔ دل کا مومن تھا۔ خدا اور اس کے رسول کی

تعلیمات سے آگاہی تھی۔ نفرت کے بیچ جو دلوں میں بھرے ہوئے تھے۔ انہیں اکٹھا دیکھنے کا اس نے بھی تہیہ کر لیا

تھا.....

اس نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ کئی ماہ ان کو کششوں کی نذر ہو گئے۔

خوشدل خان نے بڑی کڑی شرائط رکھیں۔ یہ شرائط اکاخیلیوں کے لئے قابل قبول نہ تھیں پھر

بھی حنیف گل مایوس نہ ہوا میدان اسی کے ہاتھ میں رہا..... دونوں قبیلوں میں بالآخر صلح ہو گئی.....

وہ دن تکینے کے لئے عید کا دن تھا..... خوشی سے پھولی نہ سارہی تھی..... جب اس صلح کی

خوشی میں سینکڑوں ہوائی فائر کئے گئے۔ تو وہ سجدے میں گر گئی۔ اس رب عزوجل کا شکر ادا کیا۔ جس نے

حالات کار خیر یوں موڑ دیا تھا.....

کئی دن دونوں قبیلوں میں خوشیاں منائی گئیں..... جمروں میں میلے کا سا سماں رہا..... پورے

گاؤں کی دعوتیں اڑیں..... کھیلیں تماشے ہوئے..... گانے بجانے کے پروگرام مرتب کئے گئے.....

عظمت خان اور رحمت خان نے بھی خان کے فیصلے پر سر جھکا دیا تھا..... کشمالے اور حیدر کی

شادی بڑی دھوم سے ہوئی.....

لوگوں نے خوب خوشیاں منائیں..... ان خوشیوں میں یہ احساس غالب تھا کہ جیت خان

خوشدل خان کی ہوئی ہے..... اور ہتھیار سر بلند خان نے ڈالے ہیں.....

خان خوشدل خان کے وقار میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس کے رعب اور دبدبے کی دھاک دلوں پر

بیٹھ گئی..... دور دور تک لوگوں نے اس کی حاکیت کو تسلیم کر لیا.....

جو کچھ بھی تھا۔ تمکینے نے خوشی اور اطمینان پالیا تھا..... اور بھرپور انداز میں ازدواجی زندگی

شروع کی تھی.....

(۷)

اس دفعہ فصل بہت اچھی ہوئی تھی۔ گنا اور تمباکو بڑی قیمتی اشیاء تھیں۔ بہت بھاری منافع ہوا تھا.....

یہ صبور خان کی محنتوں کا ثمر تھا۔ جب سے اس نے زمینداری کا نظام اپنے ہاتھوں میں لیا تھا.....

زمینیں سوناٹا کئے گئی تھیں۔ اور دھن دولت کی بارش ہونے لگی تھی۔ روپیہ پیسہ پہلے بھی کم نہ تھا۔ لیکن خان بابا

نے صبور کے ہوش سنبھالنے سے پہلے کام اپنے کارندوں کے سپرد کر رکھا تھا..... نوابی ٹھاٹھ ہاتھ سے رہتے

تھے..... دشمنوں کا قلع قمع کرنے پر زیادہ دھیان دیتے۔ اپنا آپ منوانے کے لئے ہر ممکن قدم اٹھاتے..... کوئی

ناگوار بات گوارہ کرنے کی عادت نہ تھی..... جرگوں کی سربراہی کرتے اور چھوٹے بڑے فیصلے اہتمام سے

کرتے۔ صبور خان کو اپنے آبائی پیشے سے محبت تھی۔ وہ کھیتوں کھلیانوں میں خود بھی جایا کرتا تھا۔ مزارعوں پر

کام نہیں چھوڑ دیتا تھا..... یہی وجہ تھی کہ زمین ہر سال پہلے سے کہیں اچھی فصل دیتی تھی.....

اس دفعہ تو صبور کی توقع کے خلاف بھی فصل نے حیران کن منافع دیا تھا..... مزارعوں کو تسلی

بخش حصہ دے کر بھی بہت خطرہ رقم بچی تھی..... اس رقم سے صبور خان وہ زمین خریدنا چاہتا تھا..... جو کبھی اس کے

آباؤ اجداد کے پاس تھی۔ لیکن بٹنے بٹنے کئی خاندانوں میں ٹکڑوں کی صورت میں موجود تھی..... دو تین خاندانوں

سے تو اس نے پچھلے سال خریدی تھی۔ بٹایا بھی لینے کا خیال تھا..... یہ خاندان بڑے شہروں کا رخ کر رہے تھے۔

صرف حمید اللہ اپنا حصہ دینے پر راضی نہیں تھا۔ صبور کو امید تھی۔ کہ خان بابا یہ زمین آسانی سے لے سکتے ہیں۔

حمید اللہ کی کیا مجال جو دینے سے انکار کرے۔ وہ کوئی بااثر فرد نہیں تھا۔ جو خان خوشدل خان سے ٹکر لینے کی

سوچ بھی سکتا اور خان کی تواریکی پوزیشن تھی۔ کہ یہ زمین جھین بھی لیتا۔ تو کسی کو چوں و چراں کرنے کی جرات نہ

ہوتی۔

صبور خان نے اس رات جب سب کھانا کھانے کے بعد بڑے دالان میں بیٹھے تھے۔ اور مختلف

باتیں ہو رہی تھیں..... اس زمین کے متعلق باپ سے بات کرنے کا ارادہ کیا.....

فصل کا ذکر اس نے اسی لئے چھڑا تھا۔

خان بابا خوش تھے..... آغا بی بی بھی پھولی نہ ملدی تھیں۔

”یہ سب تمہاری دن رات کی محنت کا نتیجہ ہے بچے.....“ خان بابا نے گاؤں کے ٹکڑے سے ٹیک لگاتے

ہوئے کہا.....

آغا بی بی نے سامنے گدے پر بیٹھی تمکینے کی طرف دیکھا اور ہنس کر بولی ”نہیں خان

جی.....“

”کیا؟“ خان اس کی طرف دیکھ کر بولے۔

”آغا بی بی؟“ حیرانی سے صبور نے بھی کہا۔

آغا بی بی نے تمکینے کی باتیں لیتے ہوئے کہا ”یہ میری بیٹی کے طفیل ہے۔ یہ اپنی قسمت ساتھ

لائی ہے.....“

خان بابا مسکرائے..... صبور خان نے اک پیار بھری نگاہ تمکینے پر ڈالی اور بولا..... ”لو جی۔ حد

ہو گئی آغا بی بی..... محنت کر کر کے میں مر گیا ہوں اور نام ہو گیا آپ کی بیٹی کا.....“

”دولت عورت کی قسمت میں ہوتی ہے اور اولاد مرد کی قسمت میں.....“ آغا بی بی نے سر ہلاتے

ہوئے تقاضے سے کہا.....

صبور سرگوشی کے انداز میں بولا..... ”پھر ہم تو بد قسمت ہوئے نا.....“

اس کی شوخ نگاہی سے تمکینے کا چہرہ سرخ ہو گیا..... آغا بی بی نے صبور کے گال پر ہلکا سا تھپڑ

لگا کر مسکراتے ہوئے کہا ”اللہ نہ کرے جو تو بد قسمت ہو.....“

”آپ خود ہی تو کہہ رہی ہیں۔ اولاد مرد کی قسمت میں ہوتی ہے..... دولت عورت کی.....“

”بالکل.....“

”تمکینے کی قسمت تو نظر آگئی..... لیکن ہماری.....“ اس نے منہ بناتے ہوئے ہاتھوں کو

مصلحہ خیز انداز میں جنبش دی تو آغا بی بی نے ہنس کر کہا ”بھولانہ بن۔ جیسے تجھے پتہ نہیں“

”کیا؟“

”کہ تو باپ بننے والا ہے“

”سچ آغا بی بی.....“

”سچ“

صبور خان نے ماں کو بازوؤں میں بھر کر بھیج لیا۔ تمکینے شرمائی۔

”بھئی یہ ماں بیٹے میں کیا باتیں ہو رہی ہیں.....“ خان بابا جو کچھ فاصلے پر گدے پر نیم دراز چلم

کے کش لے رہے تھے بولے..... ”ہمیں بھی تو پتہ چلے.....“

”یہ۔ یہ پرائیویٹ باتیں ہیں خان بابا.....“ صبور مسکرا کر بولا.....

آغا بی بی مسکرائے گی.....

تمکینے چٹخوزوں والا پیالہ اور پلیٹ اٹھا کر خان بابا کے قریب آ بیٹھی اور چٹخوزے چھیل چھیل

کر انہیں دینے لگی.....

صبور خان شوخ شوخ نظریں تمکینے کی طرف اچھالنے لگا۔ اسے کچھ کچھ اندازہ تو تھا۔ لیکن

تمکینے سے اس سلسلے میں کوئی بات نہ ہوئی تھی۔ آغا بی بی نے آج انکشاف کر کے اس کی خوشیوں کو دوبالا کر دیا

تھا.....

نوکرانی گردن کی نفیس چائے دانی اور پیالیاں لے آئی۔ چکیلا سنہری خوشبودار قہوہ کھانے کے

بعد سب ہمیں بیٹھ کر پیتے تھے.....

اس نے ٹرے تمکینے کے قریب رکھ دی..... ”ناوے (ولمن) قہوہ آپ ڈالیں گی یا میں

ڈال دوں پیالیوں میں.....“

”تم جاؤ خیراں..... آج ہم سب ناوے کے ہاتھ سے قہوہ پیتیں گے“ صبور خان نے کہا۔

خیراں تعظیم سے سر جھکائے باہر چلی گئی۔

والان کے اس حصے میں زمینی نشست تھی۔ سرخ چکیلے موٹے قالین بچھے تھے۔ جن پر دیوار

کے ساتھ ساتھ موٹے گدے پڑے تھے..... ان پر ریشمی غلافوں اور چاندی کے چم چم کرتے پھندوں والے گاؤں

تکڑے رکھے ہوئے تھے..... آرائش کے لئے کونوں میں بڑے بڑے قیمتی روسی گلدان تھے۔ کچھ چاندی کے ظروف

طاقوں میں رکھے تھے..... کر سٹل کے بڑے بڑے پیالے بھی کونوں میں چھوٹی چھوٹی میزوں پر جھجک جھجک کر

رہے تھے۔ موٹے ریشمی سرخ پھولدار پردے کھڑکیوں اور دروازوں کے سامنے تنے ہوئے تھے.....

تمکینے نے چٹخوزوں والی ٹرے پرے سرکاتے ہوئے خان بابا سے پوچھا ”اور لیں گے

چٹخوزے“

”نہیں۔ بہت کھائے..... مزہ آیا۔ مدت بعد کھائے ہیں.....“ وہ بولے۔

”مدت بعد.....“ تمکینے نے حیرانگی سے انہیں دیکھا اور بولی ”کیوں بابا۔ آپ کو پسند

نہیں کیا.....“

”بہت پسند ہیں۔ گل بی بی..... لیکن کبھی کسی نے یوں چھیل کر دیئے ہی نہیں.....“ وہ مسکرا

کر آغا بی بی کی طرف دیکھنے لگے.....

”توبہ توبہ..... خان جی..... کیا کہہ رہے ہیں.....“ آغا بی بی بولیں ”جب سے میں اس گھر میں آئی ہوں۔ یہ فرض سمجھا رہی ہوں۔ اب تمکینے آگئی ہے۔ تو اس نے میرا بار سنبھال لیا.....“

سب مسکرانے لگے۔ خان بابا مود میں تھے شوخ سی مسکراتی آنکھوں سے آغا بی بی کو دیکھ کر بولے ”پچھلی سردیوں میں کب کھلائے تھے.....“

”آپ کو کھانسی تھی..... ڈاکٹر نے منع کیا ہوا تھا.....“ آغا بی بی نگاہوں سے سرزنش کرتے ہوئے بولیں۔

”پچھلے سال کھانسی تھی۔ اس سے پچھلے سال بیمار تھا۔ اس سے پچھلے سال ہندوستان گیا ہوا تھا ہیں نا..... پھر ٹھیک نہیں کہا میں نے کہ مدت کے بعد کھائے ہیں۔ وہ بھی اپنی پیاری بیٹی کی مہربانی سے..... ورنہ آپ نے تو ہمارا خیال رکھنا ہی چھوڑ دیا ہے“

”بہت رکھ لیا ہے.....“ آغا بی بی بھی مسکرا کر بولیں۔ اب سو آگئی ہے۔ میں آرام کرتی ہوں میری ذمہ داریاں وہ سنبھالے گی..... کیوں ناوے“

”جی..... یہ میری خوش نصیبی ہے۔ کہ آپ کی خدمت کروں.....“

”اور ہماری بھی.....“ صبور خان نے ہنس کر کہا۔ کس ان ہر رگوں کی خدمت کرتے کرتے ہمیں بھول ہی جاؤ.....“

تمکین نے اپنی خوبصورت آنکھیں صبور خان کی آنکھوں سے ملائیں۔ یہ آنکھیں بول رہی تھیں کہہ رہی تھیں..... تمہاری خدمت کے لئے تو اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے.....

صبور خان کانک ایک مسکراٹھا.....

”لاؤ جی قہوہ.....“ آغا بی بی نے کہا۔

تمکین نے قہوے کی ٹرے اپنے سامنے کر لی۔ پھر قہوے کی کیتلی میں چمچ ہلایا..... اور نیلی پھولدار چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں سنہری خوشبودار قہوہ بھرنے لگی۔

صبور خان اپنی جگہ سے اٹھا۔ اور قہوے کی دو پیالیاں اٹھا کر ایک خان بابا کے قریب رکھ دی۔

دوسری آغا بی بی کو دی.....

خود تمکین کے قریب ہی بیٹھ کر قہوہ پینے لگا..... سبز الائچیوں کی ہلکی ہلکی خوشبو پھیل گئی۔

قہوے کی پیالی کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں.....

صبور خان نے زمین کا ذکر چھیڑ دیا..... حمید اللہ کا بطور خاص بابا سے ذکر کیا۔

خان خوشدل خان نے لا پرواہی سے کہا ”اس کی کیا مجال..... زمین خرید لی جائے گی تم فکر نہ

کرو.....“

”زبردستی.....“ تمکین کے منہ سے نکل گیا.....

آغا بی بی نے گھبرا کر تمکین کو دیکھا۔ وہ جانتی نہیں تھی۔ کہ خان بابا ایسی بات سننا گوارہ نہیں کرتے..... جلدی سے بات بدلنے کو بولیں ”قہوہ ہے یا ختم ہو گیا؟“

”ہے جی“

”ڈال دو“

”اچھا.....“

خان خوشدل خان سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ تمکین کی بات کو دانستہ نظر انداز کیا۔ لیکن بڑے جلال میں آکر بولے ”حمید اللہ سے زمین لے لی جائے گی..... تم دوسری زمینوں کا سودا کرو۔ کتنے جریب ہے کل.....“

صبور خان نے انداز بتایا..... جو قیمت لگی تھی وہ بھی بتائی.....

”حمید اللہ کو بھی یہی قیمت ادا کی جائے گی۔ اس نے چوں چراں کی تو بلا معاوضہ زمین لے لی جائے گی..... تم فکر نہ کرو صبور خان.....“

تمکین حیران حیران نگاہوں سے خوشدل خان کو دیکھ رہی تھی۔ کسی کو خواہ مخواہ اپنی زمین سے محروم کرنا زیادتی نہیں تھی کیا؟ اتنے شفیق اور پیار کرنے والے خان بابا اتنے سخت گیر بھی تھے..... تجربہ قواس اپنے باپ کے معاملے میں بھی ہو چکا تھا..... لیکن وہ تو قتل کا معاملہ تھا۔

یہاں تو صرف اپنے بڑے پن کا فائدہ اٹھا یا جارہا تھا.....

باپ بیٹا باتیں کرتے رہے۔ خان نے زمین لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ فیصلہ پھر برکیر تھی.....

”کل حمید اللہ کو بلا بھیجنا..... بات ہو جائے گی“ خان بولے۔

صبور خوش ہو گیا.....

”اور ہاں.....“ خان بابا بولے۔

”جی.....“

”نواز خان جو قائل دے گیا تھا۔ دیکھی تم نے.....“

”جی.....“

”کیا خیال ہے“

”آپ بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں.....“

”پشاور میں فیکٹری لگانا چاہتا ہے۔ زمین دیکھ لی ہے۔۔۔۔۔ یا شاید جرود روڈ پر۔۔۔۔۔“

”جی سارا پلان اس نے بنا رکھا ہے۔ اس فائل میں سارا تخمینہ۔۔۔۔۔“

”اندازاً تین لاکھ کی ضرورت پڑے گی“

”جی۔۔۔۔۔ اندازہ یہی ہے۔۔۔۔۔“

”اس کا دوست ہے کیا نام ہے اس کا۔۔۔۔۔“

”وہ عبید اللہ خان۔۔۔۔۔“

”ہاں تہ کمال بالا کے سعد اللہ خان کا بیٹا۔۔۔۔۔ وہ بھی شہر میں کاروبار کر رہا ہے۔ اسی نے یہ سکیم

بنا کر وی اس کو۔۔۔۔۔“

”بہت پھیلا ہوا ہے اس کا کاروبار۔۔۔۔۔“

”فیکٹری لگانے میں وہ اس کو پوری مدد دے گا“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔“

”میں بھی متفق ہوں۔۔۔۔۔ ویسے بھی نواز خان کو زمینداری سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔۔۔۔۔“

”جی خان بابا۔۔۔۔۔ وہ بزنس میں دلچسپی لیتا ہے۔ فیکٹری لگا دیں اسے۔۔۔۔۔“

”اس دفعہ وہ آئے تو ساری تفصیلات ڈسکس کر لیں گے۔۔۔۔۔“

”جی“

وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ آغا بی بی اور سہیلہ گئیں۔ رات خاصی اتر آئی تھی۔ آغا

بی بی باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ جہاں نوکرانیاں چولے ٹھنڈے کر کے صفائی ستھرائی کر رہی تھیں۔

سہیلہ اپنے کمرے میں آگئی۔۔۔۔۔ کسی کی زمین زبردستی چھین لینے والی بات اسے اچھی نہ لگی

تھی۔۔۔۔۔ خان بابا کی سخت گیری کسی طور جائز نہ تھی۔ یہی سوچتے سوچتے وہ چنگ پر آلیٹی۔۔۔۔۔ اور نیند اس کی آنکھوں

میں اتر آئی۔۔۔۔۔

جب صبح خان کمرے میں آیا تو وہ گرمی نیند سو رہی تھی۔۔۔۔۔

○

۸

”عبید بیٹے“

”جی آغا جان۔۔۔۔۔“

”تم سے ایک بات کرنا تھی“

”کہئے۔۔۔۔۔“

”آؤ بیٹھو“

”ابھی آیا۔ میں ہاتھ دھو لوں۔۔۔۔۔“

”دھو آؤ۔۔۔۔۔ پتہ نہیں مالی کے ہوتے ہوئے تمہیں کیاریوں میں گھسنے کی کیا ضرورت پڑ جاتی

ہے۔۔۔۔۔“

”آغا جان مجھے گارڈننگ اچھی لگتی ہے۔۔۔۔۔ کبھی میری فیکٹری کا لان آکر دیکھیں۔ کتنا شاندار

ہے۔ میں خود اس کی نگرانی کرتا ہوں۔۔۔۔۔“

”گھر آکر تو آرام کر لیا کرو۔۔۔۔۔“

”یہ کیاریاں ٹھیک کر دی ہیں میں نے۔۔۔۔۔ آپ کا مالی شاید ادھر دھیان ہی نہیں دیتا۔۔۔۔۔“

”چلو ہاتھ دھو کر آؤ ادھر۔۔۔۔۔ چائے بھی ادھر ہی آ رہی ہے۔۔۔۔۔“

”بس آتا ہوں۔۔۔۔۔“

سعد اللہ خان اپنے وسیع و عریض چمن میں بیٹھے تھے۔ کین کی کرسیاں لان میں پڑی تھیں۔

تھوڑی دیر پہلے ہی ان کے چند ملنے والے آئے ہوئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد بھی وہ چمن ہی میں بیٹھے تھے۔۔۔۔۔

آج موسم بہت خوشگوار تھا۔ بادل گھر گھر آ رہے تھے۔ ہواؤں میں نمی تھی۔ سردی کا زور اب ٹوٹ چکا تھا۔۔۔۔۔

لیکن گرمی بھی نہیں تھی۔ بادل اور ہواؤں نے موسم میں تازگی بھر دی تھی۔۔۔۔۔ یہ تازگی اور ٹھنڈک خوشگوار لگ

رہی تھی۔

سعد اللہ خان تہکال بالا کے خاصے بڑے زمیندار تھے۔ پشاور کے قریب ہونے کی وجہ سے ان کا طرز زندگی روایتی اندازوں سے کچھ ہٹ چکا تھا۔ اس وقت پٹھان خاندانوں میں لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی رنجان نہیں تھا۔ لڑکے بھی واجبی سی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے آبائی پیشوں سے منسلک ہو جاتے تھے۔

لیکن

خان سعد اللہ خان کا دل و دماغ روشن تھا۔ وہ لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کو بھی زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے حامی تھے۔ بہت نرم خور و متحمل مزاج انسان تھے۔

اپنی نرم خوبی کی وجہ سے لوگوں میں بہت مقبول تھے۔ ہر کسی کے کام آتا بھی ان کی سرشت میں تھا۔ کسی پر جبر نہیں کرتے تھے۔ کوئی کام سختی سے نہیں لیتے تھے۔ خالص پٹھان تھے۔ اور پٹھانوں کی فطری خامیاں خوبیاں ان میں بھی تھیں۔ لیکن تعلیم نے ان کو سنوار دیا تھا۔ غصے پر قابو پانا نہیں آتا تھا۔ وہ اک متاہل اور آسودہ سکون بھری زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے ہاں نہ توبہ جا آزادی تھی نہ ہی بے جا سخت گیری۔ ان کے خاندان میں بھی نسل در نسل دشمنیاں چلی آرہی تھیں۔ لیکن وہ اس میں نہ کسی کی طرف درامی کرتے تھے۔ نہ ہی کسی کا ساتھ دیتے تھے۔ جہاں تک ہو سکتا غیظ و غضب میں آئی متحارب پارٹیوں کو سمجھا بھگا کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کیا کرتے۔

سعد اللہ خان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بڑا بیٹا سعید اللہ شادی شدہ تھا۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ یو کے جا چکا تھا۔ وہیں ملازمت کر رہا تھا۔ عبید اللہ نے پشاور میں کاروبار شروع کیا تھا۔ جو خاصہ پھیل چکا تھا۔ اس کی رہائش بھی پشاور میں تھی۔ لیکن تہکال بالا بھی دور نہیں تھا۔ جب بھی فرصت ملتی گھر آ جاتا تھا۔ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

عبید اللہ سے چھوٹی ریشمینہ تھی۔ ریشمینہ نے پچھلے سال پشاور کے ہائی سکول سے میٹرک پاس کیا تھا۔ یہ خاندان کی پہلی لڑکی تھی۔ جو ہوشل میں رہ کر تعلیم حاصل کرتی رہی تھی۔ ریشمینہ بچہ خوبصورت تھی۔ لاڈلی بھی بہت تھی۔ لاڈپیار کا بے جا فائدہ اس نے کبھی نہیں اٹھایا تھا۔ بہت سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ وہ تو مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ان دنوں پشاور میں کوئی گز لڑکے نہیں تھا۔ اور لاہور بھیجے پر اس کی ماں کی طور راضی نہ ہوتی تھی۔ وہ تو پشاور بھیجے پر بھی رضامند نہ تھی۔ سعد اللہ خان نے اپنی خوشی اور خواہش کے مطابق یہ قدم اٹھایا تھا۔

ان دنوں ریشمینہ کی شادی کی بات چل رہی تھی۔ رشتہ داروں میں دو تین خواہشمند تھے۔ صوابی سے بھی ایک بڑے خان زادے کا رشتہ آیا تھا۔ سعد اللہ خان کے دوست ثمن گل نے بھی اپنے

بیٹے کے لئے خواہش کا اظہار کیا تھا۔

لیکن

سعد اللہ خان نے فی الحال کسی رشتے کے متعلق سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا۔ جتنے رشتے بھی آئے تھے بلاشبہ مالی لحاظ سے مضبوط تھے۔ دو ایک تو سعد اللہ خان سے بھی بہت بڑے زمینداروں کے بیٹے تھے۔ شرافت بھی مسلم تھی۔ لیکن تعلیمی لحاظ سے کمتر تھے۔ کوئی مل پاس تھا۔ کوئی میٹرک فیل۔ صرف ثمن گل کا بیٹا ایف اے پاس تھا۔ لیکن وہ کوئی بڑا لینڈ لارڈ نہیں تھا۔

پچھلے ماہ چار سہ میں کسی عزیز کی شادی میں سعد اللہ خان اپنی بیگم اور ریشمینہ کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔ وہاں خوشدل خان کا سارا خاندان بھی آیا ہوا تھا۔ کشمالے اور تمکینے بھی تھیں۔ ریشمینہ کو انہوں نے دیکھا۔ اتنی خوبصورت اور شائستہ لڑکی دیکھ کر کشمالے نے کہا۔

”کاش میرا کوئی بھائی غیر شادی شدہ ہوتا۔“

”ہاں بیحد پیاری لڑکی ہے۔“ تمکینے نے کہا پھر ہنس کر بولی ”بھئی میں تو نہیں کہہ سکتی نا۔ کہ کاش میرا بھائی غیر شادی شدہ ہوتا۔“

”کشمالے ہنس پڑی۔ پھر بولی ”لڑکی بہت پیاری ہے۔“

”ہو سکتا ہے اس کی بات کہیں طے بھی ہو چکی ہو۔“

”ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے“

”اس سے پوچھیں۔“

”چلو۔ باتیں کرتے ہیں اس سے۔ پوچھ لیتے ہیں۔“ کشمالے اور تمکینے اپنے

بھاری بھر کم لباس اور جھلک کرتے زیورات سنبھالنے اٹھ کر ریشمینہ کی طرف گئیں۔ کشمالے ہی کے

ذہن میں اچانک یہ بات آئی۔ وہ سرگوشی کرتے ہوئے بولی ”تمکینے نواز خان کے لئے یہ لڑکی کیسی رہے گی“

”ہاں۔۔۔ یہ تو مجھے خیال ہی نہ آیا۔ نواز خان کی بھی تو شادی کرنا ہے۔ شکر ہے اس کی

ابھی کہیں بات نہیں ہوئی۔ میں تو اس لڑکی ہی سے کروں گی اس کی شادی۔“

”ہنگی۔ پہلے پوچھ تو لیں۔ اس کی منگنی دگنی تو کہیں نہیں ہو چکی۔“

دونوں اس کے قریب آ بیٹھیں۔

”آپ کا نام کیا ہے۔“ کشمالے نے پوچھا۔ تو ریشمینہ نے دونوں دہنوں کو بڑی

دلچسپی سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”ریشمینہ۔“

”آپ ہمیں بہت اچھی لگیں“ تمکینے نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”بہت پیاری ہیں

آپ“

”آپ دونوں بھی کچھ کم تو نہیں ہیں..... میں بھی آپ کو دیکھ رہی تھی.....“

”آپ کہاں سے آئی ہیں..... چار سہ ہی سے یا.....“

”میں تہکال بالا سے آئی ہوں..... میں خان سعد اللہ خان کی بیٹی ہوں..... اور آپ

دونوں؟“

”یہ کشمالے ہے۔ میری بھالی.....“ تمکینے نے کہا

”اور یہ تمکین ہے میری بھالی.....“ کشمالے ہنس کر بولی۔

”بدلے کی شادیاں ہیں.....“

”ایک طرح سے..... کیونکہ کشمالے میرے نگے بھائی کی بیوی ہے اور میں اس کے رشتے کے

بھائی کی“

تینوں مسکرائے لگیں۔

”ہمارے خاندانوں میں ابھی تک بدلے کی شادیاں کرنے ہی کا رجحان ہے“ ریشینے نے کہا

”جو اچھا بھی ہے اور برا بھی..... بعض اوقات نتائج خوشگوار نہیں ہوتے۔ ویسے آپ دونوں تو خوش لگتی ہیں۔“

تمکینے اور کشمالے نے ایک دوسری کی طرف دیکھا..... پھر تمکینے بولی ”ہم بدلے کی شادیوں کے بدترین

نتائج بھگت چکی ہیں.....“

”ریشینے نے حیرانگی سے دیکھتے ہوئے کہا.....“ وہ کیسے؟“

کشمالے نے چند لفظوں میں اپنی بدلے کی شادیوں کے متعلق اسے بتایا..... تو وہ جلدی سے

بولی ”آپ لوگ خان خوشدل خان کی بہو..... بیٹی.....“

”ہاں..... تم ہمیں جانتی ہو.....“ تمکینے جلدی سے بولی ”میں ان کی بہو ہوں..... صبور خان

کی بیوی اور یہ ہمیشیں گل کا لکڑی بیٹی ہے عظمت خان اور رحمت خان کی بہن.....“

ریشمینے نے ان کی طرف دیکھا اور بولی ”میرا بھائی عبید اللہ اور آپ کا دیور نواز خان

گھر سے دوست ہیں..... میرے عبید اللہ نے ہی آپ کی شادیوں پر ہونے والے جھگڑے کے متعلق بتایا تھا.....

اب تو آپ لوگ خوش باش ہیں نا.....“

”ہاں خدا کا شکر ہے معاملہ طے ہو گیا تھا۔ ورنہ یہ دشمنی تو آنے والی صدیوں پر بھی خون

بکھیرے چلی جاتی.....“

”بالکل.....“

”تمہارے خاندان میں تو ایسا نہیں ہوتا نا.....“

”ریشمینے نے مسکرا کر سر ہلایا..... اور بولی ”پٹھانوں کی یہ ریت روایت ہے۔ لیکن

میرے آغا بی ان سب باتوں کے خلاف ہیں..... ہم لوگ بڑے سکون کی زندگی گزار رہے ہیں.....“

”تمہاری منگنی کہیں ہو چکی ہے“ کشمالے نے براہ راست سوال کر دیا۔

ریشمینے کے چہرے پر سرخی لرا گئی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا..... ”میں تو ابھی اس جھنجھٹ

میں پڑنا ہی نہیں چاہتی۔ مجھے تو تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہے..... لیکن میری بی بی گل آگے پڑھنے ہی نہیں

دیتیں..... میٹرک ہی کیا ہے..... کانچ پٹا اور میں ہوتا تو بی اے ضرور کرتی.....“

”تم نے دس جماعتیں پڑھی ہیں“

”ہاں.....“

”پھر تو تمہارا امیدوار بھی پڑھا لکھا ہونا چاہئے؟“ کشمالے نے کہا تمکینے بولی ”ظاہر ہے

پڑھی لکھی لڑکی کے لئے پڑھا لکھا لڑکا ہی ٹھیک رہے گا.....“

ریشمینے تو کچھ نہیں بولی..... ہاں کشمالے اور تمکینے نے ایک دوسری کو آنکھوں ہی

آنکھوں میں خوبصورت سے اشارے کئے۔

دونوں تھوڑی دیر ریشمینے کے ساتھ گپ شپ لگاتی رہیں..... ریشمینے انہیں بہت

اچھی لگی۔

کھانے کے دوران تمکینے نے آغا بی کا تعارف ریشمینے سے کرایا..... آغا بی کو بھی یہ

لڑکی بہت اچھی لگی.....

”نواز خان کا دوست عبید اللہ ہے نا..... یہ اس کی بہن ہے آغا بی.....“

”اچھا..... خان سعد اللہ خان کی بیٹی ہے؟“ آغا بی نے پوچھا۔

”جی.....“

”ہم لوگ انہیں جانتے ہیں تمکینے..... تمہارے خان بابا کے ملنے والے ہیں۔“

”اچھا..... پھر تو بات بن گئی آغا بی.....“ تمکینے نے ان کے کان میں ہولے سے کہا۔

”کیسی بات؟“ آغا بی بی چاولوں کا نوالہ بتاتے ہوئے بولیں۔

”نواز خان کے لئے یہ لڑکی کیسی رہے گی آغا بی..... بہت اچھی ہے..... دس جماعتیں پاس

ہے۔ مجھے تو بہت پیاری لگی ہے.....“

ریشمینے دسترخوان کے دوسری طرف بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ آغا بی بی نے دو ایک بار نظر بھر کر اسے دیکھا۔ لڑکی واقعی لاجواب تھی۔

”اس کی ماں بھی آئی ہوگی“

”ضرور آئی ہوگی۔۔۔۔۔“

”مل لیں گے۔۔۔۔۔ ویسے ایک مدت سے آنا جانا نہیں ہے۔۔۔۔۔ میرے خیال میں سات آٹھ سال

پہلے ملی تھی میں ان سے۔۔۔۔۔“

کھانے کے بعد خدمت گاریں کندھوں پر تکیہ ڈالے چلیں اور پانی کے کوزے لئے مہمان عورتوں کے ہاتھ دھلا چکیں تو آغا بی بی تکیے اور کشمالے کے ساتھ ریشمین کی طرف آئیں۔

”یہ نواز خان کے دوست کی بہن ریشمین ہے آغا بی بی۔۔۔۔۔ خان سعد اللہ خان کی بیٹی“
تکیے نے کمار ریشمین نے آغا بی بی کو سلام کیا۔ پشتونوں کے دستور کے مطابق آغا بی بی نے سلام کا جواب دیتے ہوئے ریشمین کی پیشانی چوم لی ریشمین نے جواباً ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔۔۔۔۔

”تمہاری ماں کہاں ہے“ آغا بی بی نے مختصر اپنے اور اس کے والدین کے تعلقات کا ذکر

کرنے کے بعد پوچھا۔

”وہ آ رہی ہیں۔۔۔۔۔“ ریشمین نے اپنی بھاری بھر کم گوری چٹی خوش لباس اور خوش مزاج

ماں کی طرف اشارہ کیا۔ آغا بی بی نے اسے دیکھتے ہوئے کہا ”وللہ۔۔۔۔۔ کتنی موٹی ہو گئی ہے مریم۔۔۔۔۔“

مریم نے چند لمحے انہیں دیکھا پھر ریشمین کے کچھ کہنے سے پہلے ہی پہچانتے ہوئے آغا بی بی سے لپٹ کر بولی ”تم کہاں۔۔۔۔۔ اتنے عرصے بعد دیکھا ہے تمہیں۔۔۔۔۔ ویسی کی ویسی ہو۔۔۔۔۔“

”تم جو پھول کر کہا ہو گئی ہو۔ گلتا ہے ماشاء اللہ بے فکری اور خوشی کی زندگی گزار رہی ہو۔۔۔۔۔“
وہ ہنس پڑی۔۔۔۔۔ پھر تکیے اور کشمالے سے ملی اس نے بھی ان کے ماتھے چومے اور جواباً

انہوں نے اس کے ہاتھ پر بوسے دیئے۔

”ایک ہی بیٹی ہے نا تمہاری“ آغا بی بی نے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ریشمین ہی ہے اکلوتی۔۔۔۔۔“ وہ ہنس کر بیٹی کی طرف دیکھ کر بولی۔

”بہت شائستہ اور بہت پیاری ہے۔ اس کی بات تو طے نہیں کی کہیں۔۔۔۔۔“ آغا بی بی نے پوچھا تو

مریم مسکرا کر بولی ”کئی جگہ سے رشتے آئے ہیں۔۔۔۔۔ اس کا باپ کہیں حامی ہی نہیں بھرتا ابھی۔۔۔۔۔“

”ایک رشتہ اور آجائے تو۔۔۔۔۔ شاید حامی بھر لیں“ آغا بی بی نے ذومعنی انداز میں کہا۔ تو مریم

مسکرا کر بولی ”شاید۔۔۔۔۔“

آغا بی بی کو بھی ریشمینے بہت من بھائی تھی۔ دیکھے بھالے لوگ تھے۔ اپنے ہم پہلے تھے۔ لڑکی بھی پڑھی لکھی تھی نواز خان کے لئے اس سے اچھا رشتہ اور کہاں ملتا تھا۔۔۔۔۔ آغا بی بی نے اسی رات خان بابا سے بات کی۔۔۔۔۔ اپنی تکیے اور کشمالے کی پسند کا ذکر کیا۔۔۔۔۔ نواز خان کے لئے یہ رشتہ انتہائی موزوں تھا۔

”دیکھیں گے“ خان نے کہا۔

”دیکھیں گے نہیں خان جی۔۔۔۔۔ ان کے ہاں رشتے آرہے ہیں۔ یہ نہ ہو ہم دیکھتے ہی رہ جائیں

اور رشتہ کوئی اور لے جائے۔۔۔۔۔“

”ایسا نہیں ہو گا۔۔۔۔۔“

”پھر آپ جلدی پیغام بھجوادیں نا۔۔۔۔۔ کہ ہم ریشمین کے سوا لی بن کر آنا چاہتے

ہیں۔۔۔۔۔“

”کہہ دیا نا۔۔۔۔۔ کہ یہ رشتہ ہم ہی لیں گے۔۔۔۔۔“

”پھر پیغام۔۔۔۔۔“

”بھجوادیں گے۔۔۔۔۔“

”بہت اچھا لیکن۔۔۔۔۔ ذرا جلدی۔۔۔۔۔“

”تم اچھی طرح جانتی ہو۔ خوشدل جب کوئی بات کہہ دیتا ہے تو پھر اس کے نہ ہونے کی

صورت نہیں رہتی“

”جی۔۔۔۔۔ خان جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔“

خان نے چند دنوں بعد پیغام سعد اللہ خان کے ہاں بھجوادیا۔۔۔۔۔

سعد اللہ خان اور مریم خوش ہوئے تھے۔ ابھی ان کے پیغام کا جواب نہیں دیا تھا۔ سعد اللہ

عبید سے نواز خان کے اخلاق اور کردار کے بارے میں تسلی کرنا چاہتے تھے۔

عبید ہاتھ دھو کر لان میں آگیا۔ چائے آچکی تھی۔ سعد اللہ نے کرسی کی طرف اشارہ کیا

”بلیٹو عبید بیٹھ گیا۔ اور چائے بنا کر باپ کو پیالی پیش کی۔ پھر اپنی پیالی میں چائے انڈ بلیتے ہوئے بولا۔

”آغا جی۔۔۔۔۔ آپ کہہ رہے تھے کوئی بات کرنی ہے مجھ سے“

”ہاں۔۔۔۔۔“ وہ چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے پھر خان خوشدل خان کے پیغام کا ذکر کیا۔

عبید نے پیالی واپس پلیٹ میں رکھتے ہوئے پوچھا ”نواز کے لئے۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ صبور خان کی شادی تو ہو چکی ہے۔۔۔۔۔“

”ہوں“

”نواز تمہارا دوست ہے تم اسے اچھی طرح جانتے ہو۔ کیسا لڑکا ہے“
 ”لڑکا تو بہت اچھا ہے۔ ایم اسے کر رہا ہے۔ ساتھ فیکٹری بھی بنوا رہا ہے اس کا ارادہ بزنس
 کرنے کا ہے۔“

”میں اس کے اخلاق اور کردار کا پوچھ رہا ہوں.....“
 ”ٹھیک ٹھاک ہے آغا جی..... بس اکھڑے تھوڑا سا۔ جوشیلا بھی بہت ہے۔ بات تو پتھر پر لکیر
 ہوتی ہے اس کی۔ سخت خوبے..... ویسے بڑے مضبوط کردار کا مالک ہے.....“
 ”ریشمینے کے لئے تمہارے خیال میں ٹھیک رہے گا.....“

”آغا جی..... وہ اصل پٹھان ہے۔ یہ ساری باتیں ان کی طبیعت کا خاصہ ہوتی ہیں۔ اس کے
 والد کو آپ بھی تو جانتے ہیں۔ اس کی خصلت اپنے باپ کی سی ہے۔ مالی لحاظ سے ہم سے کچھ اونچے ہی ہیں پورا
 گاؤں ان کا اپنا ہے..... ویسے نواز خان گاؤں میں نہیں رہے گا۔ مستقل رہائش پشاور ہی میں ہوگی..... آپ دیکھ
 لیں..... میرے خیال میں تو جتنے رشتے اب تک آئے ہیں ان میں سے ہر لحاظ سے یہ رشتہ اچھا ہے.....“
 ”کوئی..... عیب..... تو نہیں اس میں“ آغا جی نے رازداری سے پوچھا۔

”نہیں..... نہیں آغا جی..... بالکل نہیں۔ بہت اونچے کردار کا آدمی ہے۔ ایسی کوئی بات
 نہیں۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ بالکل بے فکر رہیں..... میں نے کمانا صرف جوشیلا ہے ذرا اکھڑا اور
 سخت خوبے بس.....“

”ہوں“

”ہاں آغا جی“

”تو پھر انہیں کسلا بھیجیں کہ وہ آجائیں.....“

”بخوشی.....“

دونوں باتیں کرتے ہوئے چائے پینے لگے..... عبداللہ پشاور سے ایک لایا تھا۔ چائے کے
 ساتھ اس نے ایک باپ کو پیش کیا اور خود بھی ایک ٹکڑہ پلیٹ میں رکھ کر کھانے لگا۔

۹

نواز خان گھر آیا ہوا تھا..... ان دنوں فیکٹری کی تعمیر کا کام زوروں پر تھا..... پاکستان بننے کے
 بعد نئی صنعتیں لگ رہی تھیں۔ پشاور کے علاقے میں بہت کم لوگ اس طرف متوجہ ہوئے تھے..... جو صنعتیں لگا
 رہے تھے..... ان کے لئے میدان خاصہ وسیع تھا۔ نواز کو پھولے پھلنے کے مواقع ملنے کی قوی امید تھی..... خان
 بابا نے بھی اسے اجازت دے دی تھی۔ روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ اس لئے کام تسلی بخش طریق سے ہو رہا
 تھا۔ صبور خان کو اپنے آبائی پیشے سے ہٹ کر بزنس میں پڑنا کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ نواز خان فیکٹری
 لگانے کے بعد شہری کا ہو جائے گا۔ بھائی سے یہ حد پیا رہتا تھا..... اس سے بچھڑنے کا خیال بھی سوہان روح تھا۔

اس دفعہ نواز خان آیا تو کافی دیر خان بابا اور صبور خان سے یہی باتیں ہوتی رہیں.....

”میرے خیال میں تو ایک ٹھکانہ پشاور میں ہونا بہت ضروری ہے“ خان بابا نے کچھ سوچتے

ہوئے کہا.....

”جگہ تو ہے وہاں“ صبور بولا۔

”نہیں بیٹے..... کسی اچھی آبادی میں شاندار سی کوٹھی لینے کا خیال ہے میرا.....“

”ہاں بابا..... میں بھی یہی چاہتا ہوں“

”تو کسی بروکر سے بات کرو۔ بنی بنائی مل جائے تو زیادہ اچھا ہے“

”ضرور کروں گا.....“

”لیکن بابا.....“ صبور خان بولا۔

”کیا؟“

”پھر تو نواز خان شہری کا ہو جائے گا..... ہم سے چھٹ جائے گا۔ پھر گاؤں کیا بھائے گا

اے۔“

”نہیں خان لالہ.....“ باپ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی نواز بولا..... ”مجھے برنس کے سلسلے میں شہر میں ضرور رہنا پڑے گا..... لیکن خان لالہ..... میرا رشتہ اس گاؤں سے کبھی نہیں ٹوٹے گا..... میری جڑیں جس زمین میں ہیں۔ ان سے کٹ کر کبھی جیا جاسکے گا؟.....“

”شاباش میرے بچے.....“ خان بولے ”اپنی زمین اپنے گاؤں اور اپنے رسم و رواج سے کبھی کنارہ کشی نہ کرنا..... جو لوگ اپنی پہچان بھول جاتے ہیں کہیں کے نہیں رہتے..... یاد رکھنا یہ گاؤں اور اس کے رسم و رواج..... اس کے بسنے والے سب تمہاری شناخت ہیں.....“

”اپنی شناخت کوئی نہیں گنوا تا خان لالہ.....“
”خدا تمہیں اپنے الفاظ پر کاربند رہنے کی توفیق دے“
”آمین.....“

”خان لالہ آپ اسی لئے میری طرف سے مشکور ہیں.....“
”ایک ہی تو بھائی ہو میرے..... جگر گوشہ سمجھتا ہوں تمہیں اپنا.....“
”میری محبتوں میں کبھی فرق نہیں آئے گا خان لالہ..... میں اپنے آپ کو آپ سے الگ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا.....“
”جیتے رہو.....“

”آپ کی دعائیں میرے ساتھ ہیں..... مجھے کامیابیوں کا یقین ہے۔ یہ کامیابیاں ہمیں ایک دوسرے کے اور قریب کر دیں گی خان لالہ.....“

تینوں باتیں کرتے رہے۔ خان بابا دونوں بیٹوں کے پیار سے بہت مطمئن تھے۔

کچھ دیر بعد نواز خان اٹھا اور آغا بی بی کو ڈھونڈتا پچھلی طرف چلا آیا۔

آغا بی بی ادھر نہیں تھیں۔ وہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کروانے باورچی خانے میں مگنی تھیں..... بہت بڑے باورچی خانے میں مٹی کے بڑے بڑے چولہے تھے۔ جن پر بڑے بڑے دیکچوں اور مٹی کی ہانڈیوں میں کھانا بن رہا تھا۔

نواز برآمدے کی طرف چلا آیا۔ جہاں تکینے اور کشمالے بیٹھی گپ شپ لگاری تھیں۔

کشمالے نے نواز کو دیکھا تو بڑے پیار سے سلام کرتے ہوئے دستور کے مطابق پوچھا ”خیر سے آئے ہو۔ خان گل.....“

”تم سناؤ کیسی ہو کشمالے۔ راضی ہو خوش ہو..... تمہارے گھر والے سب بخیر ہیں نا.....“
”شکر ہے سب خیریت ہے“

”کب آئیں تم.....“

”تھوڑی دیر ہوئی“

”اکیلی آئی ہو.....“

”حیدر خان چھوڑ گیا تھا“ تمکینے نے کہا۔

”حیدر آیا تھا۔ ملا نہیں.....“

”جلدی میں تھا۔ خان بابا کو سلام کرنے تو ادھر گیا تھا۔ تم کہاں تھے.....“

”میں یہیں تھا.....“

”واپسی پر ملے گا سب سے۔ شام کو لوٹے گا.....“

”میرا جی سب سے ملے کو چاہ رہا تھا“ کشمالے نے کہا۔ ”اس لئے چلی آئی.....“

”بہت اچھا کیا.....“

”آؤ بیٹھو.....“ تمکینے نے تخت کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں ہاں بیٹھو خان گل..... تم سے تھوڑی باتیں ہی ہو جائیں“ کشمالے نے شوفی سے

کہا.....

”باتیں.....“ نواز بیٹھتے ہوئے دونوں کو دیکھنے لگا۔ جو آپس میں شوخ شوخ اشارے کر رہی

تھیں۔

”یہ کیا ایک دوسری کی طرف مسکراہٹیں اچھا رہی ہو۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟“

”تمہیں نہیں پتہ.....“ تمکینے چھپڑنے کے انداز میں بولی.....

”مجھے..... کیا نہیں پتہ.....“ وہ ان کی شوفی سے محظوظ ہو کر بولا۔

”بننے ہو.....“

”نہیں.....“

”جانتے تو ہو.....“

نواز نے بھی شوفی سے کہا ”میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ بھابی تم روز بروز موٹی ہوتی جا رہی

ہو.....“

کشمالے کھلکھلا کر ہنس پڑی..... تمکینے کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ شرما کر بولی ”میں اپنے

متعلق نہیں پوچھ رہی.....“

”تو پھر.....“

”خان گل..... آغا بی بی نے بتایا نہیں آپ کو.....“
”کیا“

”کہ ہم نے تمہارے لئے لڑکی دیکھی ہے۔ دیکھی نہیں۔ ڈھونڈی ہے“
”میرے لئے.....“ وہ چونکا۔

”ہاں نواز خان.....“

”میں کیا کروں گا لڑکی کو.....“ وہ بجنے ہوئے بولا۔ تو دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔
پھر تکینے بولی ”لڑکی کو کیا کرو گے۔ بھی دلمن بنا کر لاؤ گے۔ گھر بساؤ گے“

”تمہارا مطلب ہے..... شادی.....“

”جی ہاں..... شادی.....“

”نہیں بھئی..... شادی واوی کے چکر میں میں نہیں پڑنے کا بھی.....“

”تمہاری کون سے گاخان گل..... لڑکی ہم نے ڈھونڈی۔ پیغام خان بابا نے بھجوا دیا..... بس ان کے جواب کی دیر ہے.....“ کشمالے نے کہا۔

نواز خان اب سنجیدہ ہو گیا۔ جلدی سے بولا..... ”کون ہے وہ۔ کہاں پیغام بھجوا دیا گیا ہے.....“

”کچھ مجھے بھی تو بتاؤ.....“

”کسی نے ابھی تک بتایا نہیں.....“

”آغا بی بی نے سرسری سی بات کی تھی کل..... کہ اب میری شادی ہونی چاہئے۔ لیکن

کہاں؟..... کس کے ساتھ؟“

”خان سعد اللہ خان کی بیٹی رشیدہ کے ساتھ.....“

”کیا؟.....“

”ہاں خان گل.....“

”یعنی میرے دوست عبید اللہ.....“

”ہاں ان کی بہن ہے رشیدہ.....“

نواز چند لمحوں پر چپ رہا..... پھر بولا..... ”وہاں رشتہ کرنے کا آپ سب کو کیسے خیال آگیا؟“

”کیوں..... اچھے لوگ نہیں ہیں کیا.....“

”نہیں یہ بات نہیں۔ لوگ تو بہت ہی اچھے ہیں.....“

”بہت ہی اچھے لوگوں کی بیٹی بھی ظاہر ہے بہت ہی اچھی ہوگی.....“

”مجھے کیا پتہ.....“

”تم ان کے ہاں آتے جا رہے ہو..... رشیدہ کو دیکھا ہو گا“

”نہیں..... میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا.....“

”جھوٹ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے.....“

”سچ کہتا ہوں بھابی.....“

”یقین نہیں آتا۔ وہ لوگ اتنے قدامت پسند تو نہیں۔ پھر ریشمینے تو پشاور پڑھتی رہی

ہے..... کیا تم نے واقعی اسے کبھی نہیں دیکھا۔

نواز نے نفی میں سر ہلایا.....

”جھوٹ نہیں چلے گا.....“ تمکینے نے مسکرا کر کہا۔

”سچ کہتا ہوں بھابی..... وہ لوگ بھی پردے کے پابند ہیں۔ ان کی عورتیں بھی کھلے بندوں نہیں

گھومتی پھرتیں.....“

”اچھا.....“

”ہاں.....“

”ہم تو سمجھتے تھے۔ تم نے رشیدہ کو دیکھا ہو گا..... اس سے مل چکے ہو گے“

”توبہ توبہ.....“

”کیوں اس میں برائی کیا ہے.....“

”برائی تو نہیں۔ لیکن میں بھی تو شریف آدمی ہوں۔ ٹانگ جھانک کی بھی کبھی نہیں سوچ

سکتا.....“

”مان لیتے ہیں تمہاری بات.....“

نواز کو تجسس ہو رہا تھا..... پوچھتے کچھ جھجک بھی آ رہی تھی۔ تمکینے نے مشکل حل کر دی..... وہ

کشمالے سے بولی ”کیوں کشمالے۔ معاملہ ہی چھوٹ..... انہوں نے تو رشیدہ کی جھلک تک بھی نہیں

دیکھی.....“

”کیسی ہے وہ.....“ نواز بے تابی سے بولا.....

”بتا دیں.....“ تمکینے شوخی سے بولی۔

”بتاؤ.....“

”آں..... تو سنو..... اچھی ہے وہ.....“

”بس صرف..... اچھی.....“

”ہاں..... خاندان اچھا ہے شریف ہے۔ دولت مند ہے۔ تعلیم یافتہ ہے“

”میں یہ سب جانتا ہوں۔ تم ریشمین کے متعلق بتاؤ۔ شکل و صورت کی کیسی ہے.....“

کشمالے تعریف کرنے ہی کو تھی۔ کہ تمکینے نے شوشی سے آنکھ کا اشارہ کر کے اسے

چپ رہنے کو کہا..... اور پھر منہ بناتے ہوئے نواز کو دیکھ کر بولی ”نواز خان..... صاف صاف بتاؤں.....“

”کیا.....؟“ نواز کچھ پریشان سا ہوا۔

”ساری خوبیاں میں نے گنوا دی ہیں.....“

”میں اس کا حلیہ پوچھ رہا ہوں.....“

”حلیہ.....“

”ہاں.....“

”سنو..... رنگت میلی میلی سی ہے۔ آنکھیں بھوری ہیں۔ ناک ذرا موٹی ہے۔ ہونٹ باریک

اور دہانہ چوڑا سا ہے..... بات کرتے وقت ذرا سا ہلکاتی ہے.....“

تمکینے بد صورت سی لڑکی کا نقشہ کھینچ رہی تھی۔ کشمالے منہ چھپا چپا کر ہنس رہی تھی.....

نواز خان شوشی و شرارت سمجھ گیا۔ سر ہلاتے ہوئے بولا.....

”بس بھائی.....“

”کیوں“

”یہ تو تم نے اپنا ہی نقشہ کھینچ دیا.....“ وہ شرارت سے ہنس کر بولا۔

”اچھا..... ٹھہر جاتو..... میں ایسی ہوں“ تمکینے نے اسے مارنے کو ہاتھ اٹھایا۔

”تو وہ ایسی ہے“ اس نے تمکینے کا اٹھتا ہاتھ پکڑ لیا..... تینوں خوب ہنسے.....

پھر کشمالے بولی ”خان گل۔ وہ بہت حسین ہے.....“

”میں جانتا ہوں.....“ نواز بولا۔

”اے۔ تم تو کہہ رہے تھے تم نے ریشمینے کو دیکھا نہیں.....“

”قسم کھاتا ہوں نہیں دیکھا.....“

”تو پھر کیسے کہہ دیا.....“

”ایسے کہ ان کا خاندان خوبصورت ہے..... باپ ماں بھائی سب بہت خوبصورت ہیں..... اس

لئے وہ بھی.....“

”تم نے ٹھیک کہاں خان گل.....“ کشمالے نے کہا ”ریشمینہ بیحد خوبصورت شائستہ اور

خوش اخلاق لڑکی ہے.....“

کشمالے اور تمکینے ریشمینے سے اپنی ملاقات کے متعلق تفصیل سے نواز کو بتانے لگیں۔

نواز بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔ یہ رشتہ اس نے دل سے منظور کر لیا تھا۔

ریشمینے نواز خان کے گھر والوں کے من بھاگنی تھی۔ نواز خان ریشمینہ کے والدین کے معیار کی کسوٹی پر پورا اترتا تھا۔ رشتے کی بات چھڑی۔ رسمی سا تکلف برتا گیا۔ پھر دونوں طرف سے برائے نام سی جانچ پڑتال ہوئی۔ طرفین کی ہر طرح سے تسلی ہو گئی۔ تو نسبت ٹھہرا دی گئی۔ لڑکی والوں کی طرف سے صرف ایک شرط رکھی گئی۔ خان سعد اللہ خان نے خوشدل خان سے کہا ”نواز کی کوئی بہن نہیں ہے۔ اور بدلے کی شادیاں ہمارے خاندانوں کا دستور ہے۔“

”تو پھر.....“ خوشدل خان نے خوشدلی سے کہا۔

”میں چاہوں گا۔ کہ میرے بیٹے عبید اللہ کے لئے رشتہ آپ کے خاندان ہی سے چنا جائے۔“

خوشدل چند لمحوں کے لئے سوچ میں پڑ گئے۔

”بدلے کے رشتے ہم لوگ نیک نیتی ہی سے کرتے ہیں۔ اور یہ ایک طرح سے بیٹیوں کے تحفظ کی ضمانت بھی ہوتے ہیں۔“

”بالکل ٹھیک.....“

”تو پھر عبید بھی آپ ہی کا بچہ ہے“

”ٹھیک ہے..... یہ رشتہ ہمیں قبول ہے“

”شکر یہ.....“

”میں چند دنوں میں آپ کو اطلاع دوں گا.....“

”میں ممنون احسان ہوں“

خان خوشدل خان کے ذہن میں اپنی بھانجی شینی کا خیال آگیا۔ وہ ایک اکیلی بیٹی

تھی..... جوان خوبصورت اور جائیداد کی اکیلی وارث..... عبید اللہ کے لئے یہ رشتہ موزوں تھا.....

گھر آکر خوشدل خان نے آغا بی بی سے اس رشتے کا ذکر کیا۔

”کوئی ہرج نہیں۔ بہن سے پوچھ لیں۔ اس کو بھی اعتراض نہیں ہو گا۔ شینی کے رشتے کی

بات ویسے بھی اس نے ہم پر ڈال رکھی ہے.....“

”ہاں..... پوچھ لیتے ہیں.....“

”آج ہی چلتے ہیں ان کے ہاں“

”ٹھیک ہے مجھے یقین تو ہے وہ انکار نہیں کرے گی۔ ویسے اس کے دل میں غصہ ضرور ہو گا“

”کیوں؟“

”بھئی اس کی نظر نواز خان پر تھی.....“

”کبھی ذکر تو نہیں ہوا تھا.....“

”خاندانوں میں رشتے ایسے ہی نظر میں رکھے جاتے ہیں.....“

”شینی بھی ریشمینہ ہی کی طرح ہے.....“

”چلو اب تو بات ہو چکی ہے.....“

”بہن کو راضی کر لیں گے ہم..... رشتہ بہت اچھا ہے۔ پڑھے لکھے خاندان میں جائے گی

شینی“

”آج ہی چلتے ہیں.....“

خان بابا اور آغا بی بی شام بہن کے ہاں گئے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد رشتے کی بات کی.....

بہن کو واقعی گلہ تھا..... بھائی نے گھر کے رشتے کو نظر انداز کر کے غیروں میں رشتہ کر لیا تھا.....

خوشدل خان نے بہن کو پیار کیا۔ تسلی دلا سے دیئے اور پھر عبید اللہ کے متعلق ساری باتیں

تفصیل سے بتائیں..... رشتہ اسے پسند آیا۔ پھر بھی دو تین دن مہلت کے مانگے..... جو خان نے بخوشی دے

دیئے.....

چند دنوں بعد خوشدل خان نے سعد اللہ خان کو پیغام بھجوادیا۔ وہ لوگ شینی کو دیکھنے آ سکتے

تھے.....

عبید اللہ کے لئے اس خوبصورت اور شائستہ سی لڑکی کا انتخاب لاجواب تھا۔ بڑی خوشی سے یہ

رشتہ قبول کیا گیا..... یوں سعد اللہ خان کی شرط پوری ہو گئی۔ اپنی بیٹی دے کر انہوں نے نواز کے خاندان کی بیٹی

حاصل کر لی تھی.....

دونوں مٹگنیاں بڑی دھوم دھام سے ہوئیں..... کئی دن تک خوشیاں منائی جاتی رہیں۔ حجروں میں ریل چل رہی..... دو تین ضیافتیں اڑائی گئیں..... گانے بجانے کی محفلیں رات گئے تک ہمیں۔ ہوائی فائر کئے گئے.....

شادی کے دن مقرر ہوئے۔ عبید اللہ اور شبنی کی شادی تو جلد ہی طے پا گئی لیکن نواز اور ریشمینے کی شادی کے لئے چند ماہ کی مہلت لی گئی.....

تمکینے امید سے تھی..... آغا بی بی چاہتی تھیں۔ کہ وہ خیریت سے فارغ ہو جائے تو شادی کی جائے..... چنانچہ یہی طے پایا۔ سعد اللہ خان کی طرف سے بھی اس تجویز کو بخوشی قبول کر لیا گیا۔ ویسے بھی شادی کی تیاریوں کے لئے وقت درکار تھا۔ اپنی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی کی شادی وہ لمطراق سے کرنا چاہتے تھے۔

عبید اللہ اور شبنی کی شادی کلہا گمہ بھی مہینہ بھر رہا..... بڑی چل چل بڑی رونق تھی۔ شادی کے بعد عبید اور شبنی انگلینڈ چلے گئے..... وہاں عبید کا بڑا بھائی تھا۔ وہ اس کے پاس دو ماہ رہے..... یہ ان کا بہنیاں مومن تھا.....

گاؤں والوں کے لئے یہ خوش کن بات تھی۔ شبنی کی خوش بختی تھی۔ کہ وہ شادی ہوتے ہی سمندر پار گئی تھی..... آدھی دنیا گھوم پھر کر دیکھی تھی..... ان دنوں باہر جانے اور بہنیاں مومن منانے کا تصور ان علاقوں میں عام جو نہیں تھا.....

ان کی دیکھا دیکھی نواز خان نے بھی شادی ہوتے ہی باہر جانے کا پروگرام بنالیا۔ شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں.....

تمکینے کی زچگی کے دن بھی قریب آرہے تھے..... نواز خان چاہتا تھا کہ تمکینے کی ڈیوری پشاور کے ہسپتال میں ہو..... اس نے دبے لفظوں میں آغا بی بی سے بھی کہا۔

”گاؤں میں کوئی خاص انتظام تو ہے نہیں آغا بی بی۔ خدا خواستہ کوئی پیچیدگی ہو گئی تو.....“
”نہیں ہوگی۔ خدا تمہارا ہے۔ تم اب اتنے بھی شری نہ بننے جاؤ..... آخر یہاں بھی تو لوگوں کے بچے ہوتے ہیں.....“

”شہر جانے میں کوئی ہرج بھی نہیں آغا بی بی..... اب تو وہاں اپنا گھر بھی ہے۔ پوری کوٹھی خالی پڑی ہے۔ بھائی کو وہاں رکھا جاسکتا ہے.....“

نواز نے صورتِ خان سے بھی کہا.....

”یار میں کچھ نہیں کہہ سکتا..... آغا بی بی بہتر جانتی ہیں.....“ اس نے مسکرا کر بھائی کے کندھے پر ہاتھ رکھا.....

”وہ تو بھابی کو شہر لے جانے پر رضامند نہیں ہیں.....“

”تو پھر ٹھیک ہے“

”خدا خواستہ کوئی پرابلم پڑ گئی تو.....“

”لیڈی ڈاکٹر کو یہاں بلا رہے ہیں ہم.....“

”جیسے آپ کی مرضی۔ ویسے میری صلاح تو یہی تھی کہ شہر چلتے..... وہاں اب تو رہائش کا

مسئلہ بھی حل ہو چکا ہے.....“

”تم اپنے گھر والوں کو جانتے ہو..... جیسا وہ چاہتے ہیں۔ ویسا ہی ہوتا ہے۔ خیر یہ کوئی بڑی بات نہیں..... ہم تم بھی تو گاؤں ہی میں پیدا ہوئے تھے.....“ صورت نے ہنس کر کہا.....

”ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی..... خدا بھابی کو ہر طرح سے محفوظ رکھے.....“

”آمین.....“

آغا بی بی نے خان بابا سے کہہ کر چار سہ سے لیڈی ڈاکٹر کو بلانے کا اہتمام کر لیا تھا۔ یہ عام سی ڈاکٹر تھی۔ نواز خان نے آغا بی بی سے اس پر بھی بحث کی اور پشاور سے مشہور انگریز لیڈی ڈاکٹر مسز شیٹلے کو بلانے پر اصرار کیا۔ یہ گائیکو جسٹ تھی۔ مسز شیٹلے چیف انجینئر تھا۔ اور اس سے نواز خان کے ذاتی مراسم بھی تھے۔ یوں مسز شیٹلے کو بلانے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا.....

”ٹھیک ہے ضرورت پڑی تو لے آنا نہیں بھی“ آغا بی بی نے بیٹے کی بات مان لی۔

تمکینے کا کیس نارمل ہی تھا..... پھر بھی چار سہ سے بھی لیڈی ڈاکٹر بلائی گئی..... جو پورا دن اور رات اس کے ساتھ رہی..... پہلی بار تھی۔ زچگی کی تکلیف تو ہونانی تھی۔

دوسرے دن نواز مسز شیٹلے کو بھی لے آیا.....

دس بجے کے قریب تمکینے نے ایک صحت مند اور خوبصورت بیٹے کو جنم دیا۔

بیٹے کی خبر سنتے ہی صورتِ خان نے ہوائی فائر کئے۔ یہ خوشی کا اعلان تھا۔

نواز خان اور خوشدل خان نے بھی اس کے بعد اپنی بند و قیں سنبھالیں اور حویلی کے صحن میں کھڑے ہو کر بہت سے ہوائی فائر کئے.....

مبارک سلامت کا شور مچ گیا..... رشتہ دار عورتیں حویلی کی طرف جوق درجوق آنے لگیں۔

مرد حجرے میں جمع ہو گئے..... ہر کوئی خوشی سے سرشار تھا۔ ایک دوسرے کے گلے مل رہا تھا..... خان خوشدل خان

کا پہلا پوتا تولد ہوا تھا۔ یہ سب کے لئے خوشی کی بات تھی..... حویلی کے طویل و عریض صحن میں قریبی رشتے کی

عورتیں اور مرد جمع ہو گئے تھے..... کئی من چلے جوانوں نے ٹنک ڈانس شروع کر دیا..... جس میں تھوڑی ہی دیر

میں مرد عورتیں سب ہی شریک ہو گئے..... نواز خان نے تو اس دن کمال کا ڈانس کیا..... سب نے تالیاں بجا بجا کر داد دی..... صبور خان نے تو بھائی کے اس والہانہ انداز میں خوشی کرنے پر اسے لپٹا کر اس کی پیشانی چوم لی.....

بچے کا نام زرگل رکھا گیا.....

نام رکھنے کی بھی خاصی خوبصورت تقریب تھی..... بچہ خان خوشدل خان کی جھولی میں ڈالا گیا..... انہوں نے بچے کے منہ میں سونے کی چھوٹی سی کانٹک (چچی) سے سچا اور اصلی شمد ڈالا.....

”منہ میٹھا کرو زرگل خان“ خوشدل خان نے کہا۔ سب نے مبارک سلامت کا شور مچا دیا۔

اور صبور خان نے اوپر تلے تین ہوائی فائر نام رکھے جانے کی خوشی میں کئے.....

کئی بکرے صدقے میں اتارے گئے۔ گاؤں کے غریب لوگوں میں پیسے اور کپڑے تقسیم کئے گئے..... مساجد میں کھانے بیچے گئے..... خدمت گاروں کو ہزاروں روپے دیئے گئے.....

تمکینے چند دنوں ہی میں بسترے اٹھنے کے قابل ہو گئی۔ بچے کا حقیقہ بھی بڑی دھوم دام سے ہوا۔ اس تقریب میں تمکینے کے میکے والے بھی شریک ہوئے۔ بیٹی اور بچے کے لئے وہ بہت سے تحائف لائے..... ان تحائف میں سونے چاندی کے زیورات کے علاوہ کچھ زمین بھی تھی۔ جو زرگل کے نام کی گئی تھی.....

کئی دن خوشیاں منائی جاتی رہیں۔ گاؤں کے لوگوں کے لئے پورے دنے روٹ ہوتے رہے۔ امیر غریب کی تشخیص نہ تھی ہر ایک کو کھانے کی کھلی دعوت تھی..... صبح و شام جیسے لنگر جاری تھا..... ہفتہ بھر یہی ہنگامہ رہا۔

تمکینے چھلانا بھی تو آغا بی بی نے نواز خان کی شادی کی تیاریاں زور و شور سے شروع کر دیں۔

”اب ہمیں شادی کی تاریخ مقرر کر دینی چاہئے“ آغا بی بی نے تمکینے سے کہا۔

”جی بالکل.....“ وہ بچے کو دادی کی جھولی میں ڈالتے ہوئے بولی۔

آغا بی بی نے بچے کو پیار کرتے ہوئے کہا..... ”تیاریاں تو ہم نے سب کر لی ہیں.....“

”خان بابا تاریخ کا تعین کریں گے“

”ہاں..... ان کا خیال ہے اگلے ماہ اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں.....“

”ٹھیک ہے.....“ وہ بولی ”زرگل کی آمد کا انتظار تھا۔ سو وہ آ گیا.....“

”تمکینے“

”جی آغا بی بی“

”بچے کو گندخ نہیں کی..... بیٹی اسے یوں کھانا چھوڑا کرو۔ گندخ ضروری ہوتی ہے اس سے

بچے کے کندھے چوڑے ہوتے ہیں..... چھاتی بھی ہموار ہوتی ہے۔ اور ٹانگیں بازو بھی سیدھے رہتے ہیں.....“

”آغا بی بی۔ مجھے ٹھیک طرح سے کرنا نہیں آتی“

”تو سیکھ لو نا مجھ سے۔ تاج برو سے کہا کرو گندخ کیا کرے..... اسے میں نے صرف زرگل کے

کام کے لئے مقرر کیا ہے.....“

”سارے کام وہی کرتی ہے آغا بی بی..... گندخ بھی کر دیتی ہے۔ مجھے ہی کرنا نہیں

آتی.....“

”لاؤ کپڑا میں تمہیں بھی سکھا دوں.....“

تمکینے اٹھی اور پھولدار بننے کا گڑ سوا گڑ عرض کار و مال اور طلحے کی دواڑھائی گزلی بی بی لے

آئی..... بچوں کو کپڑے میں لپیٹ کر پٹی سے باندھنے کا پٹھانوں میں رواج ہے۔ اسے گندخ کرنا کہتے ہیں۔

”آغا بی بی نے رومال کو تہہ کر کے ٹکون سی بنائی..... یہ ٹکون گدے پر بچادی پھر زرگل کو اس

طرح رومال پر لٹایا۔ کہ صرف گردن کا حصہ باہر رہا..... اس کے دونوں بازو اور ٹانگیں سیدھی کیں۔ موٹا لنگوٹ

درست کیا..... فیض برادر کی پھر دائیں ہاتھ کا کوٹا بچے پر الٹ دیا۔ خوب کس کر کپڑا چھاتی سے گزرتی دوسرے

بازو کی طرف لے گئیں۔ اسی طرح بائیں بازو کا رومال کا کوٹا اٹھایا..... اور چھاتی پر سے لپیٹ کر دوسری طرف لے

گئیں۔ پھر پاؤں کی طرف کا کوٹا اٹھا کر ٹانگوں پر الٹ دیا.....

”دیکھ لیا.....“ انہوں نے بچے کو جیسے کپڑے کے لفافے میں اچھی طرح بیک کر دیا۔

”جی.....“

”اب یہ پٹی اس پر باندھ دیتے ہیں.....“ آغا بی بی نے انچ بھر چوڑی اور دو گز لمبی پٹی لی۔ بچے

کے آگے پیچھے گزارتے اس کے دونوں سرے پاؤں کے گرد لاکر سامنے گرہ لگادی..... زرگل سویا ہوا تھا.....

اب پرسکون نیند میں ڈوب گیا۔

”لو اسے پلنگزی میں ڈال دو..... بہت دیر سویا رہے گا.....“ آغا بی بی نے زرگل کی پیشانی چوم

کر اسے تمکینے کے حوالے کر دیا.....

تمکینے اسے سینے سے لگا کر پلنگزی میں ڈالنے لے گئی..... رنگین جنگل والی خوبصورت پلنگزی

میں نرم ساریشی بستر لگاتھا..... چاندی کی گھنٹیاں اور ترے رنگین جنگل سے لٹک رہے تھے۔ سونے کی تھنکھریوں

والا چاندی کا گھنچن بھی وہیں تھکے کے قریب پڑا تھا۔

بچے کو لٹا کر تمکینے آغا بی بی کے پاس چلی آئی..... دونوں شادی کے پروگرام اور پلان بنانے

لگیں.....

دوسرے دن تاریخ مقرر کرنے کے لئے سعد اللہ خان کے ہاں جانے کا انہوں نے پروگرام بنا

لیا.....

نواز خان کی شادی اک یادگار شادی تھی۔ مہینہ بھر پہلے ہی سے خوشیاں منائی جاتی رہیں۔ خوب ہلا گلا رہی۔ پورا گاؤں خوشی کی اس تقریب میں شریک تھا۔ لوگ اکٹھے ہو کر ندی کنارے درختوں تلے بیٹھ کر طنزورہ بجاتے۔ ٹپے گاتے اور خان کی بوائی کی تعریفیں کرتے۔ حجرے میں بھی رات گئے تک گانے بجانے کی محفل جمتی رقص ہوتے۔ خشک ڈانس کئے جاتے۔ حجرے ہوتے۔ دور دور سے ناچنے گانے والے بلائے گئے تھے۔

کئی دن یہی ہنگامہ رہا۔ حوبلی میں دور نزدیک کے رشتہ دار اور قریبی دوست احباب مع اپنے خاندانوں کے جمع تھے۔ عورتیں رنگ برنگ لباس پہنے شاداں و فرمل گھومتی پھرتی نظر آتیں۔ بچے بھی نئے نئے کپڑے پہنے حوبلی کے اندر اور باہر ادھم مچاتے پھرتے۔ یہاں بھی عورتیں رات گئے تک لوبچہ اور پٹے گاتیں۔ خدمت گاریں اور کنیریں کام ختم کرنے کے بعد اس محفل میں شریک ہوتیں پٹھانی ناچ کرتیں۔

صبر خان کی شادی پر جو خوشیاں منانے سے رہ گئی تھیں۔ ان کی کسر نکالی جارہی تھی۔ کچھ ہی سماں تہکال بالا میں بھی تھا۔ ریشیہ ایک اکلوتی بیٹی تھی۔ خوب خوشی منائی جارہی تھی۔

ریشیہ کو کئی دن پہلے ہی مایوں بٹھا دیا گیا تھا مہیلاں ہر وقت اسے گھیرے رکھتیں۔ ہنسی مذاق ہوتا رہتا۔

بارات سے ایک دن پہلے سسرال کی طرف سے مندی آئی۔ مندی کے کئی اہمال سچے ہوئے تھے۔ جن پر گوٹے اور چکیلے کاغذوں کے پھول سجے تھے۔ موم بتیاں جلائی گئی تھیں۔ مندی کے یہ اہمال سسرالی عورتیں لے کر آئی تھیں۔ ان کی خوب آؤ بھگت کی گئی۔ پر تکلف کھانا دیا گیا۔

کھانے کے بعد عورتیں گانے بجانے میں جٹ گئیں۔ ہر ساگن نے مندی کا اہمال اٹھا کر

رقص کیا۔ تمکینے، کشمالے اور خاندان کی دوسری نئی بیاتہاں عورتوں نے خوب بھڑکیلے رواجی لباس پہن رکھے تھے۔ موٹے موٹے زیورات سے لدی تھیں۔ سب نے مندی کے اہمال اٹھا رکھے تھے۔ اور خوشدلی سے ہنسنے مسکراتے رقص کر رہی تھیں۔

آغا بی بی اور دوسری معمر عورتیں ان کے سروں پر سے روپے دار وار کر نوکرانیوں کو دے رہی تھیں۔ میزبان خواتین ان پر پھولوں کی بارش کر رہی تھیں۔ پٹھان پھولوں کے شوقین ہوتے ہیں۔ اپنی محبت اور پیار کے اظہار کے لئے وہ پھولوں کو استعمال کرتے ہیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر ڈھیروں پھول ہاروں کٹھنوں اور سروں کی صورت میں استعمال میں آتے ہیں۔ ہر فرد گلے میں پھولوں کا کٹھا ڈال کر اترتا پھرتا ہے۔

ریشمینے کو مندی لگائی گئی۔ اس کے ہاتھ کلائیوں تک اور پاؤں ٹخنوں تک مندی میں ڈبو دیئے گئے۔ اس نے احتجاج بھی کیا۔

”ہائے اللہ۔ میں اس طرح مندی نہیں لگاؤں گی۔ پورے کے پورے ہاتھ ڈبو دیئے ہیں مندی میں اور پاؤں۔“

”چپہرہ ہوجی۔“ اس کی اک سہیلی نے ہولے سے کہا۔ ”دستور کے مطابق مندی لگائی گئی ہے۔ کل دلہن بیوگی تو ہاتھ پاؤں سرخ ہوں گے کتنے اچھے لگیں گے۔“

”اچھے تو لگیں گے۔ لیکن مندی کا رنگ جلدی اترتا بھی تو نہیں۔“

”اللہ نہ کرے جو جلدی اترے۔ مندی کا رنگ جتنا دیر پا ہوتا ہی اچھا لگتا ہوتا ہے۔“

”رہنے دو۔۔۔ یہ سب تو ہم پرستی ہے۔ پٹا اور میں میری ایک سہیلی ہے۔ اس کے بھائی کی شادی میں میں گئی تھی۔ دلہن کے ہاتھوں پر مندی لگائی گئی تھی۔ لیکن اتنی خوبصورتی سے کہ کیا بتاؤں۔ ہتھیلیوں پر بیل بوٹے بنے تھے۔ ہم لوگوں کو نفاست سے کام لینا تو آتا ہی نہیں۔“

”شہری باتیں شہری میں اچھی لگتی ہیں۔ بی بی۔ ہمارے اپنے رواج ہیں۔ کل دلہن بن کر رواجی لباس بھی پہنوں گی۔ مندی کے ساتھ تمہارا عروسی جوڑا بھی آیا ہے۔“

”کیا ہے۔“ دوسری سہیلی نے شوق سے پوچھا۔

”بہت خوبصورت۔ تم نے دیکھا نہیں۔ دالان میں عورتیں زیور اور کپڑے دیکھ رہی ہیں۔“

”میں ادھر گئی نہیں۔“

”دیکھ لو جا کر..... سرخ کجواب کا جوڑا ہے..... کرتا تو پندرہ بیس گز کے گھیر کا ہو گا..... گھیرے
 پر فیروزی طلحے کی پٹی لگی ہے۔ بنارسی چادر کے چاروں طرف موتی اور ستارے لگے ہیں۔ کرتے کے گربان پر تو
 روپے برابر لگے بھی لٹک رہے ہیں..... عورتیں کہہ رہی ہیں۔ کہ یہ ستارے اور لکے اصلی سونے کے ہیں۔
 ”واہ وا..... کیا کہنے“

”زیور بھی بڑا بھاری بھاری ہے۔ بھی اتنے موٹے موٹے تو کڑے ہیں۔ میرے خیال میں بارہ
 بارہ ایک ایک کلائی میں جیسے گے۔ اور یہ موٹے موٹے سنگلوں جیسے ہار کنڈن کے گلو بند..... پانچ نکوں والی
 سرکی دونی..... کانوں میں لمبے لمبے وزنی وزنی مگھر۔

”بھی کیا کہنے..... بہت بڑے خان ہیں..... اتنا زیور تو چڑھاوے میں آتا ہی تھا۔“

”اور یہ سب پن کر دیشمینے گل نے سرال جانا ہے.....“

”کیا سارا زیور پہننا ضروری ہوتا ہے“

”اور نہیں تو کیا.....“

”اف.....“

”اف تف سے کچھ نہیں ہو گا..... جیسا سلوک تمہارے ساتھ ہو گا چپ چاپ سستی

جانا.....“

”اپنی طرف کا بھی تو زیور بہت ہے“

”کیسے نہیں پنے گی بی بی..... دلہن بنتا ہے مذاق توڑا ہی ہے.....“

ریشمینے سیلیوں کا منہ تکتے لگی۔

بڑی لمبی چوڑی بارات آئی تھی..... اس کا استقبال بھی شان شایان طریق سے کیا گیا..... خوب

ہلا گلا ہوئی..... فارتنگ بھی کی گئی..... ڈھول ڈھمکے بھی پیٹے گئے..... نوجوان لڑکوں نے تو خشک ناچ کر کے اپنا حال
 برا کر لیا تھا.....

شام گہری ہونے سے پہلے پہلے ریشمینے کا ڈولا سسرالی دہلیز پر آن پہنچا تھا..... زیورات اور

پھولوں سے لدی پھندی دلہن حویلی کے اندر لائی گئی۔ عورتیں لڑکیاں اور بچے تو جیسے اس پر ٹوٹ پڑے۔

ریشمینے کا دم بھاری بھاری بلوسات زیوروں اور پھولوں کے سہرے کے اندر گھٹ رہا

تھا..... لیکن اسی حال میں اسی انداز میں اسے بیٹھنا تھا۔ عورتیں ذرا سا سہرا ہٹا کر اس کا چاند جیسا چہرہ دیکھتیں اور

تعریفیں کرتے ہوئے وعائیں دیتیں۔ وہ حسب حیثیت دلہن کی جھولی میں پیسے بھی ڈال رہی تھیں۔

وقت گزر رہا تھا..... لوگ کھانے پینے میں مصروف ہوئے تھکینے اور کشمالے ریشمینے

کو بڑے دالان سے اٹھا کر اندر کمرے میں لے گئیں.....

”بہت تھک گئی ہوگی بیچاری“ کشمالے نے اسے ہلنگ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

”تھوڑی دیر کے لئے یہ سہرا اور چادر اتار ڈالو“ تمکینے بولی۔ میں دروازہ بند کر لیتی ہوں۔

کسی کو اندر نہیں آنے دوں گی.....“

کشمالے نے ریشمینے کے سر پر بندھا سہرا اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ ریشمینے نے
 سکون کا گہرا سانس لیا..... ”یہ چادر بھی اتار دو.....“ کشمالے بولی ”بہت بھاری ہے۔ تھوڑی دیر آرام کر
 لو..... لیٹ جاؤ.....“

”نہیں بس ٹھیک ہوں“ ہلنگ کے چوٹی تکتے سے ٹیک لگاتے ہوئے ریشمینے نے ہولے
 سے کہا۔

”کھانا ادھر ہی منگوا لیتی ہوں.....“ تمکینے بولی ”اسے بھی کچھ کھلا پلا دیں.....“

”مجھے بھوک نہیں ہے.....“ ریشمینے نے آہستگی سے کہا..... تو تمکینے ہنس کر بولی

”بھوک ابھی سے اڑ گئی“

دونوں اسے چھیڑنے لگیں..... ریشمینے نے شرما کر سر گھٹنوں پر رکھ لیا.....

تمکینے نے تاج برو سے کہہ کر کھانے کا خوان ادھر ہی منگوا لیا..... تھوڑا بہت ریشمینے کو

بھی کھلایا..... کشمالے نے بھی کھایا اور اس نے بھی.....

باہر مہمانوں کا شور شرابا تھا۔ اندر باہر مہمان ہی مہمان تھے۔ خدمت گاریں اور دور پار کی رشتہ

دار عورتیں مہمانوں کو کھانا کھلانے میں مصروف تھیں.....

رات خاصی اتر آئی تو کشمالے اون تکینے نے ریشمینے کا بناؤ سنگار کیا۔ چادر اوڑھائی اور

سر پر سہرا باندھ دیا..... زربار اور پھولوں کا گندھا بھاری ساسر باندھنا ضروری تھا۔

پھر

وہ اسے لے کر نواز خان کے کمرے کی طرف آئیں۔

نواز کمرے ہی میں تھا۔

پتہ نہیں کس بات پر ہم تھا..... اونچی اور غصیلی آواز میں کسی کو ڈانٹ رہا تھا.....

”کیا بات ہے نواز خانا.....“ تمکینے نے ایک طرف سے ریشمینے کو تھام رکھا تھا.....

دوسری طرف سے کشمالے پڑے ہوئے تھی۔

”کس پر گرج برس رہے ہو“ تمکینے نے پھر پوچھا۔

تو نواز برس پڑا اسے حمید اللہ پر غصہ آ رہا تھا..... جس نے پوچھے بغیر اس کے کمرے کی ترتیب بدل دی تھی.....

ریشمینے کادل دھک دھک کرنے لگا..... نواز کی درشت مزاجی کا اس نے سن رکھا تھا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی اس کا تجربہ ہوا۔ تو وہ بے طرح گھبرا گئی..... کشمالے کو اس نے مضبوطی سے پکڑ لیا.....

تمکینے نے نواز کو ہولے ہولے سرزنش کی۔ آہستگی سے کہا ”نادے کیا سوچے گی..... خواہ مخواہ گرج برس رہے ہو.....“

نواز مسکراتے ہوئے بولا ”اچھا ہے بھابی اسے میرے مزاج کا پتہ چل جائے گا“

”بری بات ہے“ کشمالے نے اسے گھورا.....

”مگر بہ کشتن روزاول بود“ نواز نے ہولے سے کہا۔

”چل ہٹ۔ بڑا آیا.....“ تمکینے ریشمینے کو لے کر آگے بڑھ گئی۔

دلن کو بڑے سے بھاری چوٹی پٹنگ پر جس پر سرخ ساٹن کی چادر تھی اور سرخ گلابی جیکلے تکتے پڑے تھے..... بٹھایا..... کمرے میں پھول ہی پھول تھے۔ کھڑکیوں پر پھولوں کے لڑی دار پردے تھے۔ پٹنگ پر پھول کھڑے تھے۔ قالین اور گدوں پر بھی پھولوں کے ہار اور سرے لٹک رہے تھے..... گیٹوں اور مشطوں کی روشنی میں کمرہ بڑا خوبصورت لگ رہا تھا..... پھولوں کی منک چار سو پھیلی تھی.....

تھوڑی دیر ہی مذاق کرنے کے بعد ولینس کمرے سے نکل گئیں۔ ریشمینے ڈری سہمی بیٹھی رہی.....

کئی لمحے چپکے چپکے سرک گئے۔ ریشمینے کادل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

نواز خان کچھ دیر پر نے پر بیٹھا رہا.....

پھر

وہ اٹھا..... الماری سے ریشمینہ کو دینے کے لئے تحفہ نکالا۔ یہ ایک خوبصورت جڑاؤ گلوبند تھا۔

اس نے پشاور کے ایک چورلے بطور خاص بنوایا تھا۔

وہ پٹنگ کی پٹی پر آ بیٹھا..... ڈبہ میز پر رکھ دیا.....

ریشمینہ سمٹ سکتی گئی..... تو اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے سر پر پھولوں کا بندھاسر اتارا۔

”تمہارا دم نہیں گھٹ رہا“ اس نے ہولے سے پوچھا..... ریشمینے کچھ نہیں بولی۔

”میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے“ اس نے ملائمت سے کہا..... ریشمینہ ڈر گئی..... کہ شاید

جواب نہ دینے سے نواز کو غصہ آ گیا ہے..... جلدی سے بولی ”گھٹ رہا ہے“

نواز مسکرا کر بولا..... ”پھر تو یہ چادر بھی ہٹا دی جانی چاہئے ہٹا دوں.....“

وہ گھبرا کر بولی ”ہٹا دیں.....“

نواز ہنس پڑا..... اور ایک ہی لمحے میں اس کا زرتار گھونگھٹ الٹ دیا۔ ریشمینے نے جلدی

سے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا.....

نواز نے اس کے خوبصورت ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ ریشمینہ کا جھکا سر اٹھایا۔ اس کا

رخ روشن دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا.....

وہ بیحد حسین تھی..... اس حسن پر معصومیت نے غضب کر رکھا تھا..... تابِ نظارہ مشکل تھی

جیسے..... نواز بہت خوش ہوا.....

”تم بیحد حسین ہو.....“ اس کے لبوں سے نکلا..... پھر اس نے حسن کو نذرانہ عقیدت پیش

کیا۔ رات گزرتی چلی گئی..... نواز ریشمینے پر پیار و محبت کی پھوار برسا رہا تھا۔ ریشمینے اس کیف و سرور

میں بھیگی چلی جا رہی تھی..... لیکن دل میں ایک غیر محسوس سا خوف بیٹھ گیا تھا۔ نواز خان کی دھاک اس خوف میں

نمایاں تھی..... اسے محسوس ہو رہا تھا کہ نواز خان اپنے رعب و داب کے ساتھ اس کی شخصیت پر چھا گیا ہے۔

.....○.....

یورپ اور لندن کی سیر کا پروگرام تو نواز خان نے بنایا ہوا تھا۔ لیکن اس کی تکمیل ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ فیکٹری کا کام آخری مراحل میں تھا۔ مشینری نصب ہو رہی تھی..... دو ایک ماہ تک چالو ہوتا تھی..... نیا کام تھا۔ جب تک وہ خود سر پر نہ ہوتا..... کام تسلی بخش ہونے کی توقع نہ کی جاسکتی تھی۔ اس فیکٹری کے لئے تو وہ دن رات دوڑ دھوپ کر رہا تھا۔ امتحان بھی ملتوی کر دیا تھا۔ تیاری نہ ہو سکی تھی..... ویسے بھی سب کے کہنے کے مطابق جب بزنس ہی کرنا تھی۔ تو ایم اے کرنا ضروری تھوڑا ہی تھا..... باہر جانے کا پروگرام بھی رہ گیا۔

”ریشمینے“ نواز خان نے ایک دن کہا۔

”جی“ وہ زرگل کو گود میں لئے خاموش بیٹھی تھی۔

”تمہیں افسوس تو نہیں کہیں.....“

”کس بات کا“

”باہر سیر و تفریح کے لئے نہیں جاسکیں۔ میں نے تم سے کہا تھا۔ کہ اس ماہ یورپ چلیں گے“

”کام ہی ایسا ہے؟ آپ جاکیسے سکتے ہیں.....“

”وہی تو کہہ رہا ہوں۔ تمہیں افسوس تو نہیں.....“

وہ چند لمحے چپ رہی..... نواز نے اس کی گود سے زرگل کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اور ہوا میں اچھالنے لگا۔ گول مٹول اور بیحد پیار سا زرگل اچھلنے سے پہلے خائف ہوا۔ پھر ہنسنے لگا۔ اس کا منہ کھلا تو رال ٹپک کر نواز خان کے منہ پر گرا.....

”ار۔ غیث“ نواز نے ہنس کر اسے ریشمینے کی گود میں ڈالتے ہوئے رومال نکال کر اپنا

چہرہ پونچھا.....

ریشمینے نے بچے کی پیشانی چوم لی..... بچہ پھر نواز کی طرف ہنسنے لگا۔

”بس بس..... وہیں ٹھیک ہو“ نواز نے جھک کر اس کے سبب ایسے گال پر ہولے سے چٹکی کاٹی ”بت ہو شیار ہوتے جا رہے ہو.....“

ریشمینے نے زرگل کو گود میں کھڑا کر کے اس کے گالوں پر پیار کیا۔ کافی دیر سے وہ اسے پٹنگ پر لئے بیٹھی تھی۔ تمکینے کشمالے کو دیکھنے مگنی ہوئی تھی۔ زرگل کو ریشمینے کے پاس چھوڑ مگنی تھی..... زرگل کو وہ خود ہی اپنے پاس رکھتی۔ حالانکہ اس کی خدمت گار تاج برو تھی۔ جو بخوشی اسے اپنے پاس رکھنا چاہا کرتی.....

”ریشمینے“ نواز نے کہا۔

”جی خان“

”تم نے جواب نہیں دیا.....“

”کس بات کا“

”باہر نہ جانے سے افسوس تو ہوا ہو گا“

”نہیں..... یہاں کا کام زیادہ ضروری ہے..... ویسے یہ افسوس ضرور ہوا ہے۔ کہ آپ نے

امتحان کا ارادہ ملتوی کر دیا.....“

”وہ تو تم نے کروایا ہے“ وہ مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ تو ریشمینے نے حیرانگی سے

آنکھیں پھیلاتے ہوئے اسے دیکھ کر کہا ”میں نے؟“

”تو اور کس نے.....“

”میں نے تو ایسی کبھی صلاح نہیں دی آپ کو“

”صلاح نہ دینے سے کیا ہوتا ہے“

”تو پھر.....“

”پھر یہ کہ.....“ وہ اس کے قریب پٹنگ پر بیٹھتے ہوئے اس پر جھک کر بولا..... ”جنا بہ نفس

نفس مابدولت کے پاس جو آگئیں..... پڑھائی کے لئے وقت ہی نہیں نکالنے دیتیں.....“

ریشمینے اس کی بات اور انداز سے شرمائی..... بچے کی چھاتی میں سر سے گدگدی کرتے

ہوئے بولی ”ایسے ہی“

”جی ہاں ایسے ہی“ نواز نے اس کی کمر کے گرد ہاتھ لیجاتے ہوئے مخمور انداز میں کہا۔

”ہائے..... ہٹے نا.....“ وہ سجائی۔

”نہیں.....“ نواز نے اس کی لٹوں کو ہونٹوں سے چھو کر کہا۔

ریشمینے پرے ہٹ گئی..... پھر زرگل کو ہاتھوں پر اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی ”تمکینے بھابی آگئی ہوں گی.....“

”بہانے نہیں بناؤ.....“ نواز نے اس کی چادر کا کوٹا پکڑ لیا.....

وہ چادر چھڑانے لگی.....

نواز نے چادر کا کوٹا پکڑے رکھا..... جسے ریشمینے نے مسکراتے ہوئے اک جھٹکے سے چھڑا لیا۔

”سنو.....“

”جی.....“

”میں شرجار ہا ہوں.....“

”روزی جاتی ہیں.....“

”تم چلو گی.....“

”کہاں؟ شجر.....“

”نہیں..... تہکال۔ کافی دن ہو گئے۔ تم گئی نہیں۔ عبید کہہ رہا تھا..... تمہارے گھر والے

تم سے بہت اداس ہو رہے ہیں.....“

”جی..... ایک مہینے سے کچھ دن اوپر ہی ہو گئے ہیں..... میں گئی نہیں..... اداس تو ہوں گے

ہی.....“

”تم بھی ہو اداس.....“ نواز نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

”جی تو کرتا ہے نا..... اگر آپ کہیں..... تو.....“ ریشمینے نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”تو پھر تیار ہو جاؤ.....“ وہ جیسے موج میں آگیا۔

”خان بابا اور آغا بی بی سے تو پوچھ لیں.....“ ریشمینے دلی مسرتوں سے ہمکنار ہوتے ہوئے

جلدی سے بولی۔

”ہاں..... پہلے اجازت لے لیں..... ویسے خان بابا خوشی سے اجازت نہیں دیں گے..... وہ تو

اپنی ہوسوں کو دیکھ کر نہال ہوتے رہتے ہیں۔ بھی کیا جاو دیا ہے ان پر.....“

ریشمینے اڑا کر بولی ”یہ ہماری خوش نصیبی ہے۔ خان بابا بہت پیار کرتے ہیں ہم

سے.....“

”بیٹی کوئی نہیں تھی نا..... اب کہتے ہیں گھر میں دو دو بیٹیاں ہیں..... خوشی سے پھولے نہیں

ساتے“

”واقعی.....“

”تم دونوں کو تو ہم سے بھی زیادہ چاہنے لگے ہیں.....“

”بالکل.....“

دونوں چند لمحے خان بابائی کی باتیں کرتے رہے۔ نواز خوش ہو رہا تھا..... ریشمینے اس کے والدین کی قدر کرتی تھی..... بیوی سے وہ ایسی ہی توقعات وابستہ کئے تھا۔

”اچھا..... میں خان بابا اور آغا بی بی سے پوچھتا ہوں.....“ نواز نے مڑتے ہوئے گھڑی

دیکھی۔ ”ٹھیک تین بجے یہاں سے چلنا ہے..... تمہیں تہکال بالا چھوڑ کر میں پشاور چلا جاؤں گا۔ شاید دو تین

دن مجھے وہیں رہنا پڑے..... یہ دو تین دن تم تہکال رہ لینا.....“

”بہت اچھا.....“ ریشمینے خوش ہو کر بولی.....

نواز نے دروازے سے نکلتے نکلتے مڑ کر ریشمینے کو دیکھا..... وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی..... وہ

مسکرایا..... ”میں حجرے میں جا رہا ہوں..... خان بابا سے کچھ لوگ ملنے آئے ہوئے ہیں۔ موقع دیکھ کر تمہارے

تہکال جانے کی بات کروں گا.....“

”بات کروں گا نہیں..... کہنے اجازت لوں گا“ ریشمینے ادائے ناز سے مسکرائی۔

”بہت اچھا جناب..... آپ اپنا سامان تیار کر لیں..... لیکن زیادہ دن کا نہیں صرف تین چار

دن کا.....“ وہ قدرے رعب سے بولا۔

”آپ اجازت تو لیں..... آغا بی بی سے بھی پوچھ لیجئے گا.....“ ریشمینے زرگل کو پیار کرنے لگی۔

”بہتر“

نواز گنگنا تا ہوا کمرے سے نکل گیا.....

ریشمینے دوسرے دروازے سے باہر چلی گئی۔ تمکینے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ کشمالے

کی احوال پر سی کر کے آچکی تھی.....

ریشمینے زرگل کے گال پر پیار کرتے ہوئے اسے تمکینے کی طرف بڑھا دیا۔ جو پچھلے کمرے

میں تھی اور بوے والمانہ پیار سے بچے کو لینے کے لئے ہاتھ پھیلائے ہوئے کہہ رہی تھی

”وہی قربان..... میرا بچہ..... میرا جگر گوشہ..... میرا پیارا.....“

بچہ اس کی بانہوں میں دیتے ہوئے ریشمینے نے پوچھا ”کیا حال ہے کشمالے کا.....“

بڑی بے اختیارانہ محبت سے تمکینے بچے کا منہ سر جو متے اور سینے سے بھینچتے ہوئے بولی

”ٹھیک ہے اب..... زرگل نے تمہیں تنگ تو نہیں کیا؟“

”نہیں بھابی..... کھلتا رہا ہے..... اب اسے شاید بھوک لگ رہی ہے.....“

تمکینے پاس پڑے رنگین پاؤں والے دو اونچے سے ہلکے پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ بچے کو گود میں لٹایا..... بچہ غول کرتے ہوئے اس کی چھاتی میں سر گھسانے لگا.....

ریشمینے بھی اس کے قریب بیٹھ گئی۔ دلچسپی سے زرگل کی حرکتوں کو دیکھنے لگی..... ”دیکھو تو کیا کر رہا ہے“

”بھوک لگی ہے اسے“ تمکینے اسے دودھ پلانے لگی۔

”اب تو اسے ساتھ کچھ اور بھی کھلایا کریں بھابی۔ آپ کے دودھ پر گزارہ ہو جاتا ہے اس

کا.....“

”تمکینے مسکرا کر بولی ”میرا دودھ بہت ہے..... ابھی دو گھنٹے چھوڑا ہے نا اسے۔ تو دیکھو سارا کرنا گیلیا ہو رہا تھا۔ کندھے درد کرنے لگے تھے..... اسی لئے تو میں واپس بھاگی..... میری ماں کہا کرتی ہیں۔ دودھ رگوں میں سرسرا نے لگے تو سمجھ بچے کو بھوک لگی ہے۔ آج میں نے واقعی یہ بات محسوس کی ہے.....“

چند لمحے دونوں یہی باتیں کرتی رہیں.....

کشمالے بھی ان دنوں امید سے تھی۔ طبیعت بہت خراب رہتی تھی۔ ان دنوں کیلئے آئی ہوئی تھی۔

”بہت تکلیف ہے بچاری کو..... ایک لقمہ نہیں کھا سکتی..... دودھ پانی سب الٹ دیتی ہے۔

مجھے تو اس طرح نہیں ہوا تھا.....“

”کسی ڈاکٹر کو کھادیتی.....“

”دکھایا ہے۔ بالکل ٹارل ہے..... بس اپنا اپنا حراج ہوتا ہے نا..... خیر چند مہینے کی بات ہے۔

جب گود میں ایسا چاند اترے گا۔ تو ساری تکلیفیں بھول جائے گی.....“ تمکینے نے سر جھکا کر بچے کا سر جوم لیا.....

ریشمینے مسکرائے لگی تمکینے شوقی سے بولی۔ ”تمہاری باری بھی آجائے گی“

”ہائے بھابی“

”ہائے وائے کیا..... شادی ہو تو بچے بھی ضروری ہیں۔ تمہارے متعلق تو ابھی سے رشتہ داروں

نے پوچھنا شروع کر دیا ہے۔ چھ سات ماہ تو ہو گئے ہیں شادی کو.....“

”لوگوں کو خواہ مخواہ کی فکر شروع ہو جاتی ہے“

”قائدے کی بات ہے نا.....“

”ایسے ہی.....“

”اچھا چھوڑو ان باتوں کو..... یہ بتاؤ نواز کہاں ہے۔ پشاور چلا تو نہیں گیا۔ میں نے زرگل کی دو

تین چیزیں منگوائی ہیں.....“

”حجرے میں گئے ہیں۔ خان بابا سے اجازت لینے“

”اجازت لینے؟“

ریشمینے نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا۔

”کس بات کی.....“

”مجھے تہ کال لے جانے کی“

”تہ کال جاری ہو“

”نہ جاؤں“

”جی تو نہیں چاہتا کہ جاؤ..... کچی بات تمہارے آنے سے تو مجھے ایک اچھی ہنس میسر آگئی ہے۔

کتنا اچھا وقت گزرتا ہے.....“

”وہ تو بے بھابی..... لیکن آپ دیکھیں نا..... مہینے سے اوپر ہو چکا ہے میں گئی نہیں..... میرے

آغا جی اور بی بی جان اداس ہو گئے ہیں..... عیدالہ نے نواز خان کو بیٹا نام دیا تھا.....“

”اچھا ابھی جاؤ..... ضرور جاؤ..... لیکن زیادہ دن نہیں لگاؤ نا.....“

”دیکھیں خان بابا کتنے دن کی اجازت دیتے ہیں..... اور آغا بی بی کیا کہتی ہیں.....“

”آغا بی بی کہاں ہیں..... آج صبح انہیں کچھ حرارت تھی.....“

”مجھے تو نہیں پتہ..... میں ان کے پاس کافی دیر بیٹھی رہی..... بتایا تو نہیں کہ بخار ہے.....“

”وہ اسے معمولی تکلیف گنتی ہیں..... اس لئے بتایا نہیں ہو گا.....“

”میں جا کے پتہ کرتی ہوں.....“

تمکینے نے بچے کو اٹھا کر دوسرے پہلو گود میں لٹایا۔

ریشمینے اٹھی..... چادر ٹھیک سے اوڑھی۔ کلائیوں میں پڑی وزنی چوڑیاں جھٹک انھیں۔

وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی دوسری طرف سے باہر نکل گئی.....

آغا بی بی اپنے کمرے میں نہیں تھیں۔ بڑے دالان میں بھی نہیں تھیں..... زرگل کی آیا تاج

برور آمدے میں مل گئی..... تو اس نے آغا بی بی کا پوچھا.....

”ادھر ہیں.....“ تاج برو نے باورچی خانے کی طرف اشارہ کیا..... ”کھانے کا تیار ہی

پڑا تھا بیٹھی تھیں..... نوکرانیوں کو سبزی اور گوشت الگ الگ کر کے مختلف کھانوں کے لئے دے رہی تھیں.....
بڑے بڑے لگنوں میں ذبح کئے ہوئے مرغ اور گوشت رکھا ہوا تھا.....

”آغا بی بی“ ریشمینے نے پکارا.....

”جی۔ قربان“ وہ بڑے پیار سے بولیں ”تم ادھر کیوں آگئیں.....“

”آپ کو کیسے۔ بھالی نے بتایا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں.....“

”کوئی خاص بات نہیں بیٹی..... زکام ہے.....“

”بخار بھی.....“ ریشمینے نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا پھر گھبرا کر بولی ”آغا بی بی۔ بخار

کافی تیز ہے۔ اٹھئے کمرے میں چلیں.....“

اس نے آغا بی بی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا..... ہاتھ پر بوسہ دیا..... اور بولی ”مجھے بتا دیں میں کھانا بنوا

لوں گی۔ آپ چل کر لیٹ جائیے.....“

آغا بی بی مسکرائیں..... ریشمینے کی پیشانی چومی اور بولیں ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں ماں

صدقے میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ اور کھانے کا بھی فکر نہ کرو..... سب کچھ بتا دیا ہے۔ صدمہ آنے کو..... بنوالے

گی.....“

ریشمینے ان کا ہاتھ پکڑے باہر آگئی..... انہیں ان کے کمرے میں لے گئی..... بستر میں لٹایا.....

آغا بی بی کو بستر میں لیٹتے ہی کپکپی سی لگی..... منہ سر ریشمی لحاف میں لپیٹ لیا۔ ریشمینے انہیں

ہولے ہولے دبانے لگی.....

وہ اس دن خان بابا سے اجازت ملنے کے باوجود تہہ کمال نہ جاسکی۔ دل ہی دل میں مایوس تو

ہوئی..... لیکن بیمار ساس کو چھوڑ کر میکے جانا مناسب نہیں تھا.....

آغا بی بی کی بیماری خاصی طویل ہو گئی..... چار سہ سے ڈاکٹر کو بلا دیا گیا..... کئی دن علاج ہوا۔

لیکن آفاقہ نہ ہوا۔ نواز انہیں پشاور لے گیا..... جہاں وہ ایک ہفتہ لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں داخل رہیں۔ بخار بگڑ

کر پیچیدگی اختیار کر گیا تھا..... جو ڈاکٹروں کی دن رات کی دیکھ بھال کے بعد کہیں اترا۔

ریشمینے نے ان کی بہت خدمت کی۔ نواز خان بہت خوش تھا..... کہ ایسی خدمت گزار

بیوی ملی ہے۔

ریشمینے نے ایک بار بھی میکے نہ جانے کا گلہ نہیں کیا تھا..... نواز نے دل ہی دل میں تہیہ کر

لیا تھا..... کہ آغا بی بی کی صحت یابی کے بعد اسے ہفتہ دو ہفتہ کے لئے تہہ کمال جانے کی اجازت دے دے گا۔ لیکن

اس نے ریشمینے پر یہ بات ظاہر نہیں کی۔ وہ اس پر رعب داب رکھنا بہت ضروری سمجھتا تھا۔ طبیعت کی سخت

ہیں.....“

”طبیعت تو ٹھیک ہے نا ابھی“

”زکام ہے۔ بخار بھی ہے“

”تو پھر کام کیوں کروا رہی ہیں.....“ ریشمینے باورچی خانے کی طرف چل دی۔

حویلی کا باورچی خانہ ایک الگ ہی حصہ تھا۔ بہت بڑے بڑے دو کمروں پر مشتمل باورچی

خانے میں مٹی کے دس بارہ چولے بنے ہوئے تھے..... جن میں موٹی موٹی لکڑیاں جلائی جاتی تھیں..... دو چولوں پر

تو ہر وقت بڑے بڑے تانبے کے چائے جوش رکھے رہتے تھے..... چائے اور قہوے کے لئے پانی تیار رہتا تھا..... دن

میں کئی کئی بار چائے اور قہوہ بنتا تھا۔

دوسرے چولوں پر بھی بڑے بڑے تانبے کے دینگے اور مٹی کی ہنڈیاں دھری رہتیں..... کئی

کئی مہمان صبح و شام دسترخوان پر ہوتے تھے..... دوپہر کا کھانا ختم نہیں ہو پاتا تھا کہ رات کے لئے اہتمام شروع ہو

جاتا۔

برابر والے کمرے میں برتن دھوئے مانجھے جاتے تھے اسی کمرے میں بڑے سے حمام میں پانی

بھرا رہتا..... دو تین خدمت گاریں صرف برتن دھونے پر مامور رہتیں..... بڑا ساموئلے بان کا پٹنگ ایک دیوار کے

ساتھ لگا رہتا۔ برتن دھو کر اس پر الٹے ڈال دیئے جاتے..... سوکھنے پر کپڑے سے پونچھ پونچھ کر طاقوں اور

الماریوں میں رکھ دیئے جاتے۔ آٹا بھی اسی کمرے میں گوندھا جاتا۔ اس کے لئے بھی تین چار عورتیں مامور

تھیں۔ بڑے بڑے لگنوں میں بیسوں سیر آٹا ایک وقت میں گوندھا جاتا۔ روٹی توروں میں لگتی..... اسی کمرے کے

عقب میں بڑا ساتور بنا تھا۔ جس میں دو خدمت گاریں گھنٹہ گھنٹہ بھر روٹیاں لگاتی رہتیں سنہری سنہری خمیری

روٹیاں پٹھے کی بنی بڑی بڑی چنگیروں میں لال پھولوں والے دسترخوانوں میں لپیٹ لپیٹ کر تیسری خدمت گار رکھتی

جاتی.....

خدمت گاروں کی پوری کھپب تھی..... پورے خاندان آباد تھے ان کے بچے اسی حویلی میں پلٹے

بڑھتے اور جوان ہو کر اپنے خاںوں اور ان کے گھر والوں کی خدمت میں جٹ جاتے۔ ان کی خدمت کے عوض

انہیں ضرورت کی ہر چیز مل جاتی۔ خان کا تحفظ حاصل رہتا۔ لکڑی کی الماریوں میں چینی کے برتن بھی رکھے

جاتے۔ جالی لگی لکڑی کی ڈولی نما الماریوں میں سبزی پھل بھرا رہتا..... ان دنوں گاؤں میں بجلی نہیں تھی..... فرتج

وغیرہ بھی نہیں تھے..... اس لئے روز کے روز تازہ گوشت سبزی اور پھل لایا جاتا تھا..... جوان ڈولیوں میں بھر دیا

جاتا۔ دودھ اور لسی کی چائیاں بھی پیس رکھی جاتیں۔

ریشمینے باورچی خانے میں آئی..... تو آغا بی بی بان کے کمرے پٹنگ پر جو دیوار کے ساتھ

گیری اور مزاج کا اکھڑنا ریشمینے پر بھی ظاہر ہونے لگا تھا۔ لیکن وہ بڑی ہوشمند اور صابر عورت تھی۔ اپنا مقام پہچانتی تھی اسی لئے خدمت گزاری شیوہ بنالیا تھا۔ گلہ شکوہ کرتی ہی نہیں تھی۔

دن گزرتے چلے جا رہے تھے۔ کاروبار حیات معمول کے مطابق چل رہا تھا۔ صبور خان زمینوں اور فصلوں میں کھویا تھا۔ زمینوں پر خوب محنت کرتا اور کرواتا تھا۔ فصلیں شاندار تھیں۔ پیسہ مٹن کی طرح برس رہا تھا۔ نواز خان بھی فیکٹری میں جٹا تھا۔ پروڈکشن شروع ہو گئی تھی۔ اپنی مصنوعات کو بہتر سے بہتر بنانے میں دن رات مصروف تھا۔ کئی کئی دن وہ پشاور ہی میں رہتا تھا۔ ریشمینے گاؤں ہی میں رہتی تھی۔ ہمکنے اس کی اچھی دوست تھی۔ آغا بی بی مشفق ہستی تھی۔ خان بابا اور صبور خان بھی بہت پیار کرتے تھے۔ پھر زرگل بھی تو تھا۔ ریشمینے اور زرگل میں بہت دوستی تھی۔ ہمکنے سے زیادہ وہ اس کے پاس رہتا تھا۔ رات کو اکثر وہ اسے پاس ہی سلا لیتی تھی۔ ویسے بھی ہمکنے امید سے تھی۔ ریشمینے نے زرگل کا تقریباً سارا بار اٹھا رکھا تھا۔ ہمکنے کو خوب آرام ملتا تھا۔

زرگل بہت پیارا گول منول اور صحت مند پنجان بچہ تھا۔ اپنی عمر سے بڑا ہی لگتا تھا۔ اب تو پاؤں چلنے لگا تھا۔ گھر بھر کے لئے انمول سا کھلونا تھا۔

”ریشمینے“ ایک دن ہمکنے نے کہا۔

”جی“

”زرگل تمہیں بہت تنگ کرتا ہے“

”ہائے نہیں بھابی۔ یہ کس نے کہا آپ سے“

”کہنا کس نے ہے۔ میں خود نہیں دیکھتی کیا؟ دوڑاتا ہی رہتا ہے تمہیں۔ کبھی ادھر کبھی

ادھر۔“

”تو کیا ہوا..... میں کونسا کاموں میں مصروف ہوتی ہوں۔ اچھا ہے اس کی وجہ سے وقت اچھا

گزر جاتا ہے.....“

”نواز خان تو نیکیری ہی کا ہو گیا ہے.....“

”نیا نیا کام ہے..... دن رات محنت تو کرتا ہی ہے“

”خواہ مخواہ ہی بزنس میں پڑ گیا ہے۔ خدا کا فضل ہے اپنی زمینیں کیا کم ہیں.....“

”شوق کی بات ہے بھابی.....“

”مجھے تو لگتا ہے وہ مستطاً پشاور ہی میں ڈیرہ جمائے گا“

”شاید.....“

”تم بھی جلی جاؤ گی“

”کہاں“

”پشاور اور کہاں۔ آخر وہاں اکیلے تو نہیں رہنا نواز خان نے“

”کیا پتہ.....“

”تم نے کبھی اس سے پوچھا نہیں.....“

”کس بارے میں“

”یہی پشاور میں رہنے کے بارے میں“

اس نے نفی میں سر ہلایا پھر آہستگی سے بولی..... ”میں تو ایسی بات زبان سے نکالتے ہوئے ڈرتی

ہوں بھابی..... کہیں وہ یہ نہ سمجھنے لگیں..... کہ میں ان کے گھر والوں کے ساتھ رہنے سے گریزاں ہوں..... خود

ہی جی چاہے گا تو پشاور لے جائیں گے۔ نہ چاہے گا تو نہ سہی.....“

تمکین نے ہنس کر بولی ”نواز خان کا رعب تم پر پڑ چکا ہے.....“

”مجھے تو ان سے بہت ڈر لگتا ہے.....“

”چھوڑو ریشمینے..... وہ اب ایسا بھی تو نہیں..... بہت پیار کرتا ہے تم سے.....“

ریشمینے نے سر جھکا لیا..... تمکین نے اس مذاق کرنے لگی اور ریشمینے مکرانے لگی۔

وہ باتیں کر رہی تھیں کہ زرگل دوڑتا ہوا اندر آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے تاج برو تھی۔ اندر

آتے ہی بولی ”بی بی گل۔ دیکھو نا..... جوتے نہیں پہنتا.....“

”زرگل۔ ادھر آؤ.....“ تمکین نے بچے کو آواز دی..... جو کھلا گھیر دار نیلا کرتا نیلا بھاری

شلوار اور طلے والی لال ٹوپی پہنے تھا..... پاؤں سے نکلتا کچے محن میں دوڑنے سے پاؤں مٹی س سے بھر گئے

تھے..... قالین پر اس کے ننھے ننھے قدموں سے مٹی کے نشان پڑ گئے۔

زرگل نے اس کی طرف دیکھا۔

”اوھر آؤ.....“ اس نے رعب سے بلایا..... زرگل ماں کی طرف جانے کی بجائے دوڑ کر

ریشمینے کی طرف آگیا اچک کر اس کی گود میں پڑھا اور اس کے گلے میں بانیں ڈال کر سر چھاتی میں چھپا لیا.....

ریشمینے نے ہولے سے اسے تھپکا ”بہت شیطان ہو گیا ہے تو..... سارے پاؤں گندے کر لئے چلو جوتے پہنو پیلے.....“

”اول اول.....“ اس نے انکار کیا.....

ریشمینے نے تاج برو سے کپڑا لانے کو کہا..... وہ کپڑا لائی تو اس نے زرگل کے پاؤں صاف کئے پھر تاج برو سے جوتے لے کر اس کے پاؤں میں ڈال دیئے..... طلے والی پشاور چپل زرگل کے مونے مونے سفید سفید پیروں میں بہت اچھی لگی..... ریشمینے نے اس کے پیروں میں لے۔

”لو اب اسے باہر لے جاؤ..... دھیان رکھنا مٹی سے نہ کھیلے.....“ اس نے بچے کو تاج برو کی

طرف بڑھایا..... لیکن وہ نہ نہ کرتے ہوئے ریشمینے سے لپٹ گیا.....

”تمہیں چھوڑے گا تھوڑا ہی.....“ تمکین نے مسکرا کر ریشمینے سے کہا ”اور کرو لاؤ

پیار.....“

”کیا ہوا..... نہ چھوڑے.....“ ریشمینے نے بچے کے بازو گلے سے نکالتے ہوئے اس کے

سیب ایسے گال پر ہونٹ رکھتے ہوئے کہا ”گلی تو ہمارا بیٹا ہے نا..... کیوں زرگل خانے.....“

تمکین نے خوش ہو کر بولی ”بیٹا تو ہمارا بیٹا ہے..... داماد تمہارا ہو سکتا ہے۔ جلدی سے اک پیاری

پیاری بیٹی لے آؤ..... ہوں.....“

ریشمینے نے اک محبوب سی نگاہ تمکین پر ڈالی پھر بولی ”فی الحال بیٹی لانے کا کام بھی آپ

کا ہی ہے.....“

”وہ تو ظاہر ہے آئے گی ہی.....“ وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی ”لیکن زرگل کے

لئے تمہیں بیٹی لانا ہوگی۔ اب کر ڈالو بہت..... بہت دیر ہو چکی ہے.....“

”میں کیا کروں..... خدا کو ابھی منظور نہیں شاید.....“

”میں نے آغا بی بی سے کہا ہے کہ تمہیں کسی سیانے کو دکھائیں.....“ تمکین نے سنجیدگی

سے کہا ”شادی کو اڑھائی سال ہو چکے ہیں..... اب تو فکر کرنا چاہئے.....“

”ہاں وہ مجھے بھی کہہ رہی تھیں.....“

”نواز کچھ نہیں کہتا.....“

”انہیں فرصت ہی کہاں“

”نہ بھی۔ اب تو علاج ہونا چاہئے۔۔۔۔۔ ویسے پیر بابا کی زیارت پر بھی دعا کرنے جاتے ہیں لوگ۔ تم بھی کسی دن چلو نا۔۔۔۔۔“

ریشمینے چپ ہو گئی۔۔۔۔۔ بچے کی خواہش اسے بھی تھی۔ لیکن شرم و حیا کے باعث وہ کچھ کہتی نہیں تھی۔۔۔۔۔ اس کی ماں بھی فکر مند تھی۔۔۔۔۔ تہکال کی ایک ڈاکٹر کو دکھایا بھی تھا۔۔۔۔۔ وہ بالکل ٹھیک تھی۔۔۔۔۔ بظاہر کوئی نقص نہیں تھا۔۔۔۔۔

تمکینے نے آغا بی بی سے کہا ”آپ اسے چار سہ کی اسی ڈاکٹر کے پاس لے جائیں نا۔ جو ذرا صحت کی پیدائش پر آئی تھی۔ بہت اچھی ڈاکٹر ہے۔۔۔۔۔ ریشمینے کی گود بھی اب ہری ہو جائے تو اچھا ہے۔۔۔۔۔“

”پشاور کیوں نہ دکھلاؤں کسی اچھی ڈاکٹر کو۔۔۔۔۔ اب تو مجھے بھی فکر دامن گیر ہے۔۔۔۔۔“

”وہیں لے جائیں۔۔۔۔۔“

”نواز آئے تو بات کر دوں گی۔ رہنے کو وہاں اپنا گھر بھی ہے۔ چند دن رہ کر علاج کروانا پڑا تو کروالیں گے“

”ٹھیک ہے۔ بس اب شروع کروا ہی دیں علاج۔۔۔۔۔ زیادہ دیر نہیں ہونی چاہئے۔۔۔۔۔“

”ویسے تو کوئی بات نہیں بی بی گل۔۔۔۔۔ میرے ہاں شادی کے چار سال بعد بصورت پیدا ہوا تھا۔۔۔۔۔ اس کے بھی انشاء اللہ ہو ہی جائے گا۔۔۔۔۔“

تمکینے ہنس کر بولی ”جلدی جلدی ہونا۔۔۔۔۔ میں نے اپنے زر گل کو ریشمینے کا داماد بنانا ہے۔“

”اوپچا۔۔۔۔۔ یہ بات ہے“ آغا بی بی ہنس پڑیں پھر دعائیہ انداز میں بولیں ”خدا تمہاری امید برلائے۔ اس سے زیادہ خوشی اور کس بات سے ہوگی۔ خدا تمہارا مراد پوری کرے۔۔۔۔۔“

آغا بی بی انگلی پیچھے ریشمینے کو ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ مایوسی والی کوئی بات نہ تھی۔۔۔۔۔ معمولی ساورم تھا۔ جو علاج سے دور ہو گیا

اور

پھر

تیسرے ہی مہینے ریشمینے کا دامن مراد گل امید سے ہمک گیا۔۔۔۔۔ یہ خبر سب سے پہلے تمکینے کو پتہ چلی۔ ریشمینے کی طبیعت خراب تھی۔۔۔۔۔ تمکینے نے احوال پرسی کی ”کیس دوائی کا اثر تو نہیں۔۔۔۔۔“

”پتہ نہیں“ ریشمینے نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

”کیا محسوس کرتی ہو“ اس نے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔۔۔۔۔“ وہ ہنس پڑی تھکینے نے جلدی سے اس کے کان میں سرگوشی کے انداز میں کئی سوال کر ڈالے۔۔۔۔۔ جواب اثبات میں تھا۔۔۔۔۔ وہ چمک اٹھی ”مبارک۔۔۔۔۔ مبارک۔۔۔۔۔“

”کس بات کی بھابی۔۔۔۔۔“

”اسی بات کی۔۔۔۔۔“ وہ خوشی سے اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر بولی ”میری بہو تشریف لارہی ہے ریشمینے۔۔۔۔۔“

”ہنس بھابی۔۔۔۔۔“ وہ شرما کر سرخ ہو گئی۔

”دیکھو ریشمینے۔۔۔۔۔ تمکینے نے شوخی سے کہا ”خدا کا شکر ہے۔ علاج کارگر ہوا۔۔۔۔۔ میں آغا بی بی کو بتاتی ہوں۔۔۔۔۔“

”نہیں بھابی۔۔۔۔۔ ابھی نہیں۔۔۔۔۔“

”کیوں نہیں۔۔۔۔۔ ایک ہفتہ تو اوپر ہو گیا۔۔۔۔۔ ویسے وہ تمہیں ڈاکٹر کے پاس بھی تولے کر جائیں گی تاکہ پوری تسلی ہو جائے۔۔۔۔۔ میں ان سے بات کرتی ہوں۔ تم خود تو انہیں بتانے سے رہیں۔۔۔۔۔“

”لیکن بھابی۔۔۔۔۔“

”تم چب رہو گی۔ میں تم سے بڑی ہوں جماندیدہ اور تجربہ کار ہوں۔ دوسرے بچے کی ماں بننے والی ہوں“ وہ ہنس ہنس کر کہہ رہی تھی۔۔۔۔۔

ریشمینے مسکرائے گئی۔۔۔۔۔ پھر اس کے منع کرنے کے باوجود تمکینے آغا بی بی کو یہ مژدہ سنانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

آغا بی بی پچھلے صحن میں بان کے موٹے پایوں والے پلنگ پر گھٹے درختوں تلے بیٹھی تھیں پلنگ پر پھولدار سائیں کی چادر بھی تھی اور ریٹھی پھندوں والے گاؤں کے رکھے تھے۔ ان کے سامنے فرش پر آٹھ دس نوکرانیاں بیٹھی تھیں گھسے ہوئے چھینٹ کے بونے بڑے شوخ پھولوں والے گھیردار پشواز نما کرتے۔۔۔۔۔ تنگ موری کی سولہ سولہ گز کی شلواریں۔ بڑی بڑی لمبی چوڑی رنگین چادریں لئے تھیں۔ کچھ جوان تھیں۔ کچھ ادھیڑ عمر۔۔۔۔۔ بڑی عمر کی عورتوں نے سروں پر کالے رومال ٹکون کر کے باندھ رکھے تھے۔ کسی نے صرف ماتھے پر کالی پٹی باندھی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ چند بچے بھی تھے۔ جنہوں نے روایتی لباس پہنے ہوئے تھے۔ لڑکوں نے واسکٹیں اور ٹوپیاں پہنی ہوئی تھیں۔ لڑکیوں نے چادریں سر کے پیچھے کمر بڑال رکھی تھیں۔ اکثر عورتوں نے آنکھوں میں گل خار ڈالا ہوا تھا۔ کچھ بچوں کی آنکھیں بھی گل خار سے لال تھیں۔ معمر عورتوں کے ہاتھ پاؤں مندی سے

کالے ہو رہے تھے۔ چاندی کے موٹے موٹے زیور جو کالے کالے ہو رہے تھے، اکثر نے پہنے ہوئے تھے۔ یہ سب اس وقت فارغ تھیں۔ حویلی میں خدمت گار زیادہ تھے کام کم..... سب اپنے حصے کا کام ختم کر کے فارغ اوقات میں انسٹی بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرتیں..... بچوں کے پھٹے پرانے کپڑے مرمت کرنا۔ اپنے کپڑوں میں پیوند لگانا۔ کنکھی پٹی کر کے مینڈھیاں گوندھنا۔ رنگ برنگی کترے جوڑ کر کُتوں کے گھروں پر سجاوٹ کے لئے لگانے والی پٹیاں بنانا۔ یہ سب کام انہیں فرصت کے اوقات میں ہوتے تھے۔ کبھی کبھی آغا بی بی بھی ان کی فرستوں میں شرکت کرتیں۔ ان کے مسائل سنیں۔ ان کی ضرورتوں کا پوچھتیں۔ اور ان کے بچوں کے رشتے ناٹے جوڑتیں۔

آج بھی وہ پٹنگ پر تنکے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ دُردانے اور صمدانے میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا..... صمدانے باورچی خانے کی انچارج تھی۔ صمدانے کچھ منہ چڑھی سرچڑھی قسم کی خادمہ تھی..... دُردانے نے رو رو کر آغا بی بی سے شکایت کی تھی۔ صمدانے حسبِ عادت ہاتھ لہرا کر باتیں کر رہی تھی..... آغا بی بی کے سامنے بھی اونچی آواز میں بول رہی تھی.....

آغا بی بی کی طبیعت میں شفقت ہی شفقت تھی۔ انہوں نے دُردانے کو پیار کیا، سمجھایا اور صمدانے کو بھی ملازمت ہی سے چپ رہنے کو کہا.....

وہ دونوں میں مصالحت کروانے لگیں..... دونوں سر جھکا کر رہ گئیں۔

”چلو دونوں بنگیر ہو جاؤ۔ تم سب نے ایک ہی جگہ رہنا ہے۔ اس لئے پیار و محبت سے رہا کرو کبھی کسی سے زیادتی ہو بھی جائے تو در گزر کرنے کی کوشش کیا کرو.....“

آغا بی بی انہیں نصیحت کرنے لگیں۔ باقی سب خدمت گاریں بھی اپنے اپنے کاموں سے ہاتھ روک کر ان کی باتیں سنتے ہوئے صمدانے اور دُردانے کی طرف تنکے لگیں۔

”اٹھو..... ملو گلے..... سارے گلے شکوے دور ہو جائیں گے“ آغا بی بی نے پھر کہا۔ تو خدمت گاریں ان دونوں کو تیز اور ناگوار انداز میں دیکھتے ہوئے بڑبڑانے لگیں..... آغا بی بی کے حکم کی تعمیل کرنے میں وہ پس و پیش جو کر رہی تھیں.....

”اشتی کیوں نہیں ہو صمدانے.....“ معر تو روگل نے اٹھ کر صمدانے کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا..... دوسری طرف سے درختی نے دُردانے کو پکڑ کر اٹھایا..... دونوں کو ایک دوسری کی طرف دھکیلا۔

”شاباش“ آغا بی بی نے متانت سے کہا.....

تو روگل اور درختی پیچھے ہٹ گئیں۔ صمدانے اور دُردانے چند لمحوں کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ ایک دوسری کو دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر گلے ملیں.....

آغا بی بی کچھ کہنے ہی والی تھیں کہ برآمدے سے تمکینے تیز قدم اٹھاتی ان کی طرف آئی۔ دوری سے بولی ”آغا بی بی جانے۔ آپ کو میں کمرہ میں تلاش کر رہی تھی.....“

”قربان جاؤں..... کیا بات ہے تمکینے بی بی..... ذرا سنبھل کر قدم اٹھاؤ..... اتنا تیز کیوں بھاگ رہی ہو“

”بس..... بات ہی ایسی ہے آغا بی بی جان.....“ وہ دھم سے پٹنگ پر ان کے پسوں میں بیٹھتے ہوئے خوشی سے لال ہوتے ہوئے بولی۔

”کیا بات ہے۔ صمدنے.....“

”بات بتاؤں“

”ہاں“

”پہلے منہ میٹھا کر انہیں.....“

”ریشمینے کے متعلق کچھ.....“

”ہاں آغا بی بی..... مبارک ہو..... ریشمینے..... ہوں..... جان گئی ناں.....“ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی.....

”سچ.....“ خدمت گاریں جو پٹنگ کے قریب تھیں تمکینے کا اشارہ سمجھ کر بے اختیار انہ کہہ اٹھیں۔

آغا بی بی نے آنکھوں کے اشارے سے انہیں کچھ کہنے سے منع کیا۔ پھر ہولے سے بولیں ”خدا کرے تم نے جو کہا ہے سچ ہو.....“

”سچ ہے آغا بی بی جانے.....“ تمکینے اٹھلائی.....

”پہلے ڈاکٹر کو دکھا کر تسلی کر لیں“

”ہاں میں نے یہ بات ریشمینے سے کہی ہے۔ کل ہی آپ اسے پشاور لے جائیں.....“

”لے جاؤں گی“ آغا بی بی نے تمکینے کے گال پر ہوسہ دیا..... ”ہاں دیکھو۔ جس طرح

بھاگی چلی آ رہی تھیں..... ٹھیک نہیں ہے تمہارے لئے..... ذرا احتیاط کیا کرو.....“

”کچھ نہیں ہوتا آغا بی بی..... آپ فکر نہ کریں.....“

”خدا کرے کچھ نہ ہو..... خدا تمہیں صحت مندر رکھے.....“

تمکینے پٹنگ سے اٹھی اور پھر تیزی سے برآمدے کی طرف بڑھی۔ لیکن جانے پاؤں کسی کیاری میں الجھا..... یا فرش پر پانی گرنے سے پھسلنے کی وجہ سے توازن برابر نہ رہ سکا..... وہ بری طرح گری..... اور

اک چچ اس کے منہ سے نکل گئی.....

آغا بی بی موانے سے بات کر رہی تھیں۔ چچ کی آواز پر گردن گھمائی..... ”اودھاؤندا.....“

وہ سینے پر ہاتھ مار کر اٹھ کھڑی ہوئیں..... دو تین خدمت گاریں ان کے اٹھنے سے پہلے ہی لپک کر تکینے تک پہنچ چکی تھیں.....

باقی بھی آغا بی بی کے ساتھ بھاگیں..... تکینے اٹھ کر بیٹھ چکی تھی.....

”قربان..... ٹھیک تو ہیں آپ“

”کیسے گریں“

”چوٹ تو نہیں آئی“

”پاؤں میں موج تو نہیں.....“

خدمت گاریں اسے اٹھا کر کھڑا کرتے ہوئے سوال پہ سوال کئے جا رہی تھیں.....

آغا بی بی نے آتے ہی اسے سینے سے لگا لیا..... ”میں کہہ رہی تھی سنبھل کر قدم اٹھایا کرو.....“

کیسے گر گئیں کہیں چوٹ تو نہیں آئی..... ذرا چل کر دیکھو..... قدم اٹھاؤ.....“

تکینے نے خدمت گاروں کے سہارے قدم اٹھایا..... دائیں پاؤں میں چوٹ لگی تھی۔ ٹھیک سے فرش پر ٹکایا نہیں گیا..... اضی عورتوں کے سہارے لنگڑا لنگڑا کر چلتے ہوئے وہ اندر آگئی..... آغا بی بی نے اسے پٹنگ پر لٹایا..... عورتیں اس کے پاؤں ملنے لگیں..... صدمانے دوڑ کر گئی اور اصلی گھی گرم کر کے لے آئی..... اس نے ٹخنے اور پاؤں پر گھی کی مالش کی.....

اس وقت تکینے کو چوٹ کا احساس نہیں ہوا..... پاؤں پر مالش ہونے سے بھی بی لگا کر بالکل ٹھیک ہو گیا ہے.....

لیکن رات اس کی کمر میں ایک دم ہی درد اٹھا..... درد پہلے آہستہ آہستہ دبائے سے کچھ کم ہوا..... وہ خود ہی اپنے ہاتھوں سے کمر دبائے گئی..... لیکن پھر ایک دم ہی ٹیسیں اٹھنے لگیں..... تو صبور خان جو دوسرے پٹنگ پر برابر ہی میں سو رہے تھے بولے ”کیا ہو تکینے.....“

تکینے درد کی اذیت سے بلبل اٹھی..... ”خان..... ذرا آغا بی بی کو بلا دو.....“

”اس وقت“

”ہاں..... میری کمر میں بہت درد ہے۔ برداشت نہیں ہو رہا.....“

”آغا بی بی سو رہی ہیں..... رات کا ایک بج رہا ہے..... مجھے بتاؤ..... میں کچھ کروں..... کسی خدمت گار کو بلا دوں؟“

”آغا بی بی کو بلاؤ.....“ وہ آنسو پیتے ہوئے چلائی..... تو صبور خان کو اس کی تکلیف کا احساس ہوا..... جلدی سے اٹھے..... چادر کی بکلی ماری اور کمرے سے نکل گئے.....

آغا بی بی کے آنے تک تکلیف اور بڑھ گئی تھی..... تکینے مائی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ وہ درد زہ میں مبتلا تھی..... لیکن آنسو میں سینے میں تھی..... یہ تکلیف خطرناک تھی..... آغا بی بی نے گاؤں کی معمر دائیہ کو بلا بھیجا.....

جلدی سارا گھر بیدار ہو گیا۔ نوکرانیاں ادھر ادھر بھاگی بھاگی پھر رہی تھیں..... نواز خان اتفاق سے رات پشاور سے آگیا تھا۔ وہ اور ریشمینے بھی اٹھ گئے..... سب کو ہاتھ پاؤں پڑ گئے.....

”خان لالہ بھابی کو پشاور لے جانا چاہئے“ نواز نے خان بابا کی موجودگی میں صبور سے کہا.....

”اس وقت“ صبور نے تشویش سے کہا.....

”تمیں بخیر رہے ہیں“ خان بابا نے گھڑی دیکھی.....

”تو کیا ہوا..... انہیں تکلیف بہت ہے..... یہ نہ ہو..... صبح کے انتظار میں وہ خدا نخواستہ.....“

نواز نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ پھر انہیں کمرے ہی میں چھوڑ کر جلدی سے آغا بی بی کے پاس گئے.....

”آغا بی بی..... بھابی کو پشاور ہسپتال لے جانا ہے..... جلدی کریں..... میں جیب نکالتا ہوں..... کوئی عذر نہیں چلے گا..... بھابی کی جان کی ضرورت ہے تو فوراً لے چلیں انہیں..... دوسری گاڑی بھی لے چلتے ہیں..... آپ بس جلدی سے تیار ہو جائیں.....“

نواز خان نے خان بابا یا کسی دوسرے کی رائے لینا مناسب ہی نہ سمجھا..... کیس کی نوعیت جانتے ہوئے تکینے کو ہسپتال لے جانا تھا.....

جیب اور گاڑی حویلی کے صحن میں لائی گئی.....

تکینے کو گاڑی کی پچھلی نشست پر لٹایا گیا..... آغا بی بی نے اس کا سر گود میں رکھ لیا۔ دو کنیزیں تین محافظ مرد حفاظتی اقدام کے لئے ساتھ جا رہے تھے۔ انہوں نے کار تو سوں کی پٹیاں اور ہسپتال گلے میں ڈال رکھے تھے.....

صبور خان اور نواز خان نے بھی کار تو سوں کی پٹیاں اور ہسپتال گلے میں ڈال لئے.....

تکینے کو بہت تکلیف تھی۔ ریشمینے نے روتے ہوئے اس کی پیشانی چومی اور اس کی سلامتی اور بخیر لوٹنے کی دعا کی خدمت گاریں بھی سو گوار سی شکلیں بنائے دعا گو تھیں.....

ایمر جنسی میں ڈیوٹی پر متعین ڈاکٹر موجود تھی..... تکینے کی حالت تشویشناک تھی.....

سارا اعلیٰ حرکت میں آگیا۔۔۔۔۔ اسے فوراً داخل کر لیا گیا۔۔۔۔۔ نرسیں اسے سڑچر پر ڈال کر لیبر روم میں لے گئیں۔۔۔۔۔ گانا لالو جسٹ کو فون کر کے بلا یا گیا۔۔۔۔۔

صبح تکینے کے ہاں مردہ بچہ پیدا ہوا۔۔۔۔۔ بچہ بہت خوبصورت اور صحت مند تھا۔ لیکن آٹھویں مہینے میں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے زندہ نہ رہ پایا۔۔۔۔۔

دکھ کی اک لہری اہل خانہ کے دلوں کو چھو گئی۔۔۔۔۔ لیکن اس کا اظہار قہل سے ہی کیا گیا۔۔۔۔۔ یہی کافی تھا کہ تکینے بچ گئی تھی۔۔۔۔۔

ریشمینے تو مردہ بچے کی خبر سن کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔۔۔۔۔ خان بابا کو بھی صدمہ پہنچا۔۔۔۔۔ حویلی کے در و دیوار سو گوار ہو گئے۔۔۔۔۔ احوال پر سی اور تعزیت کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔۔۔۔۔ خان بابا کے خوش و خرم گھرانے میں یہ صدمے کا پسلاوار تھا۔۔۔۔۔ تکینے کے میکے والوں کے لئے بھی یہ خبر دکھ بھری تھی۔ اس کے سارے خاندان کے لوگ پشاور ہو شل گئے۔ ماں باپ نے قہقہے کی بلائیں لیں۔۔۔۔۔ بچے کا صدمہ اپنی جگہ لیکن بیٹی کے بچ جانے پر انہوں نے بھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

تہ کال سے ریشمینے کے میکے والے بھی آئے۔ آغا جی اور بی بی جان عبید اللہ اور جینی سہی پشاور تکینے کو دیکھنے بھی گئے اور بچے کے افسوس کے لئے حویلی بھی آئے۔۔۔۔۔

کئی دن سو گوار سی کیفیت رہی۔۔۔۔۔ دو ہفتے بعد تکینے ہسپتال سے گھر آئی تو پھر لوگوں نے آنا شروع کر دیا۔۔۔۔۔ وہ خاصی کمزور ہو گئی تھی۔ اس کے ماں باپ اور کشمالیے نے برقت خان بابا اور آغا جی بی سے اجازت لی اور اسے اپنے ہاں چند دنوں کے لئے لے آئے۔ اسے اس سو گوار ماحول سے نکالنا بہت ضروری تھا۔

”ریشمینے“

”جی خان گل“

”کیسی ہے طبیعت“

”ٹھیک ہوں“

”تو پھر لیٹی کیوں ہو۔۔۔۔۔ دن نکل آیا ہے۔ میں کھیتوں کا چکر بھی لگا آیا ہوں۔۔۔۔۔“

ریشمینے اٹھ بیٹھی۔۔۔۔۔ اک انڈرائی لی دائیں ہاتھ کی الٹی ہتھیلی منہ کے آگے رکھ کر جمائی کو روکا۔۔۔۔۔ پھر خان کی طرف دیکھا جو کار تو سوں کی چٹی اتار کر دیوار سے لگی کھونٹی پر ٹانگ رہا تھا۔

”آپ کھیتوں کا چکر لگانے گئے تھے۔۔۔۔۔“ وہ پٹنگ سے پاؤں لٹکائے ہوئے بولی۔

”جی جی۔۔۔۔۔ نواز خان نے پیار سے اسے دیکھا۔

”آپ اور کھیت؟“

”موقع واردات دیکھنے گیا تھا۔۔۔۔۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ بہت برا ہوا ہے۔۔۔۔۔ خان لالہ خاں پریشان ہیں۔۔۔۔۔“

”پریشانی کیسی۔۔۔۔۔ کسی کی مجال ہے جو آنکھ اٹھا کر بھی ہماری طرف دیکھے۔۔۔۔۔ یہ خوشدل خان کا علاقہ ہے۔۔۔۔۔ یہاں حکم انہی کا چلے گا۔۔۔۔۔ پھر غلطی بھی تو ان لوگوں کی تھی۔ کیوں انہوں نے اپنے جانور کھلے چھوڑ دیئے تھے۔۔۔۔۔ نہ وہ ہمارے کھیتوں میں آتے۔ نہ فصل اجازتے۔۔۔۔۔“

”اس بات پر خون خرابہ تو۔۔۔۔۔“

”ہو نہر۔۔۔۔۔ نجیب خان نے انہیں روکا تو کالو کا تھا۔۔۔۔۔ وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہے تھے۔۔۔۔۔ نجیب

خان کو طیش آگیا۔۔۔۔۔ مار ڈالا ان کے آدمی کو۔۔۔۔۔ پھر کیا ہوا۔۔۔۔۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔۔۔۔۔“

ریشمینے نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا پھر ہولے سے بولی ”خان لالہ خون ناحق کے قاتل نہیں ہیں..... وہ بہت ٹھنڈے دل و دماغ کے آدمی ہیں.....“

”یہ خون ناحق کیسے ہوا..... وہ لوگ ہمارے ہی تربور (کزن) ہیں۔ اور ان کے دلوں میں کھوٹ ہے..... سردی جنگ تو ہمارے ان کے درمیان پیشی سے چلی آرہی ہے..... ہمارا ایک خون ان پر برسوں سے ادھار تھا۔ مجھے تو خوشی ہے۔ کہ انتقام لے لیا گیا..... چاہے نجیب کی گولی ہی سے“

ریشمینے کو نواز کی بات اچھی نہیں لگی..... پٹنگ سے اٹھتے ہوئے بولی ”آپ کی سوچ آپ کے بھائی سے کتنی مختلف ہے..... آپ بہت سخت گیر ہیں.....“

نواز اس کے قریب آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر بولا ”میں سخت گیر ہوں.....“

”تو اور کیا.....“ نواز اس وقت خوشگوار موڈ میں تھا۔ اس لئے ریشمینے یہ بات کہہ گزری۔

”انتقام یوں بھی تو لیا جاسکتا ہے..... کہ معاف کر دیا جائے“ اس نے ملائمت سے کہا۔
”ہا..... ہا.....“ نواز نے ریشمینے کی بات پر اک زور دار قہقہہ لگایا..... ”کیا خوب کیا گمراہی ہے تمہاری بات میں..... لیکن ریشمینے جانی..... مابدولت اس بات میں یقین نہیں رکھتے.....“
ریشمینے نے پاؤں میں مغل طے دار سلیر پہنے اور کھڑکی کی طرف بڑھی۔ سرخ پھولدار ریشی پردہ ہٹا کر اس نے باہر دیکھا.....

نواز بھی اس کی پشت پر آکر کھڑا ہو گیا.....
”اچھا چھوڑو اس قہصے کو“ اس نے اپنا ہاتھ اس کی کمر میں کیا۔ پھر خود ہی ہنس کر بولا ”اوہ خدایا..... کتنی موٹی ہوتی جا رہی ہو.....“

ریشمینے نے شرما کر اک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی.....
”کیا ارادے ہیں.....“ نواز اس کے سامنے آکر مسکراتے ہوئے بولا۔
کیسے ارادے؟“ وہ لجا کر بولی۔

نواز نے شوخی سے اس کے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”کب تک تشریف لا رہی ہیں ہماری پیاری سی بیٹی.....“

”ہائے.....“ وہ کچھ گھبرا کر کچھ لجا کر نواز کو تکنے لگی۔
نواز کھڑکی کی طرف رخ موڑتے ہوئے بولا..... ”ریشمینے..... مجھے بیٹی چاہئے..... مجھے کیا

سب گھر والوں کو بیٹی کی خواہش ہے..... زرگل تو ہے اب زری کی ضرورت ہے.....“
ریشمینے نے منہ لٹکاتے ہوئے ہولے سے کہا ”خواہش تو میری بھی ہے۔ پر پتہ نہیں..... جو خدا کو منظور ہو گا.....“

”خدا کو یہی منظور ہو گا انشاء اللہ..... کہ اک پیاری سی بالکل تمہاری طرح کی بیٹی آجائے گی..... میرے دل میں تو اس کے لئے ابھی سے پیار کا سمندر موجیں مار رہا ہے.....“

”بیٹا ہوا تو اس کو پیار نہیں دیں گے؟“

”اتنا نہیں..... جتنا بیٹی کو دے سکتا ہوں.....“

”یہ کتنی زیادتی ہوگی.....“

”شاید..... لیکن نواز خان اپنی طبیعت سے مجبور ہے.....“ وہ دونوں ہاتھ پھیلائے سرخم کر کے مسکرایا..... ریشمینے اس کی اس حرکت پر مسکرا بھی نہ سکی..... دل میں درد کی ٹیس سی اٹھی..... نواز کی عادتوں اور مزاج سے اب واقف ہو چکی تھی..... اس کی کچھ خصلتیں انتہا پسندی تک پہنچتی تھیں..... وہ جذباتی و حاروں پر بہہ کر جوبات بھی کہتا تھا..... وہی کر گزرتا تھا..... وہ صبور خان سے بالکل متضاد طبیعت رکھتا تھا..... اور باپ سے بھی ایسے جذباتی معاملوں میں چند قدم آگے ہی تھا.....

بیٹی کی فرمائش وہ کئی بار کرچکا تھا..... حالانکہ جانتا تھا..... کہ خدا نے جو دیا ہے وہی دے گا..... یہ تو ایسی شے ہی نہیں تھی..... جو اپنی مرضی کے مطابق خریدی یا بنائی جاسکتی تھی۔

اگر بیٹی نہ ہوئی..... تو

تو.....

ریشمینے اکثر سوچتی اور پریشان ہوتی رہتی۔
بیٹی کی خواہش صرف نواز ہی کو نہیں پورے خاندان ہی کو تھی۔ وجہ صاف تھی۔ نواز اور صبور کی کوئی بہن نہ تھی۔ اور تکینے کے ہاں بھی بیٹے ہی پیدا ہوئے تھے..... خواہش فطری تھی..... تکینے بھی ریشمینے سے اکثر ہی اس خواہش کا اظہار کرتی..... یہ خواہش اک معصوم فطری جذبہ تھی..... لیکن ریشمینے چونکہ نواز سے بہت ڈرتی تھی..... اس لئے اس خواہش کا فطری پہلو اس خوف کی نظر ہو جاتا..... تکینے جب بھی کہتی ”خدا کرے اک خوبصورت بیٹی آجائے.....“ تو ریشمینے کی پریشانی میں اضافہ ہو جاتا.....

اس دن بھی تکینے اس کے کمرے میں بیٹھی ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھی۔ کشمالے کے ہاں بھی دوسرا بیٹا پیدا ہوا تھا وہ اس کی باتیں کر رہی تھی۔

”دیکھو ریشمینے.....“ وہ ہنس کر بولی۔

”جی“ وہ ہولے سے بولی۔

”کشمالے نے دوسری بار بھی میری خواہش کا خیال نہیں رکھا“ تمکینے شوخ لہجے میں بولی
”دوسری بار بھی بیٹائی پیدا کیا۔ ہمارے خاندانوں میں جتنی ہی بیٹی کے لئے خواہش ہو رہی ہے۔ اتنے ہی بیٹے
آ رہے ہیں۔ اب دیکھ لینا جتنی کے بھی بیٹائی ہو گا۔ پہلے بھی بیٹا ہے دوسرا بھی بیٹا ہو گا۔“

”پیش از وقت آپ کیسے کہہ سکتی ہیں۔“

”بس مجھے پتہ ہے۔ شرط لگالو۔“

”آپ کو اتنا یقین ہے بھابی“

”بالکل۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی ”لیکن تم ہمیں بیٹی دو گی۔ سمجھیں۔“

ریشمینے خوف زدہ سی ہو گئی۔

”بیٹی نہ ہوئی۔ تو اپنا زر گل ایسے ہی رہ جائے گا“ وہ بدستور مذاق کے موڈ میں تھی۔

”بھابی“ ریشمینے نے خوف زدہ نظروں سے تمکینے کو دیکھا۔ تو وہ اپنی ہنسی مذاق میں

بھول کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ”کیوں ریشمینے۔ کیا بات ہے؟“

”بھابی“ اس کی آواز گھٹ گئی۔

”کیا ہوا میری بہن۔ پریشان کیوں ہو گئیں۔“

”بھابی۔ اگر بیٹی نہ ہوئی تو۔“

ریشمینے پھک پھک رونے لگی۔ تمکینے پریشان ہو گئی۔ جلدی سے اس کے قریب بیٹھتے

ہوئے اپنا بازو اس کی گردن کے گرد حائل کر کے اس کا چہرہ اپنی طرف گھما کر بولی ”یہ کیا۔ اس میں رونے کی

کیا بات ہے۔ پاگل ہو گئی ہو۔“

”سب لڑکی چاہتے ہیں۔ نواز بھی ہر وقت یہی کہتا ہے۔“ وہ سکتے ہوئے بولی ”جو لڑکی نہ

ہوئی تو۔“

تمکینے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ”بہت بے وقوف لڑکی ہو۔ اتنی سی بات پر رونا

آگیا۔ بھئی لڑکی نہ ہوئی تو کوئی بات نہیں۔ پہاڑ تو نہیں ٹوٹ پڑے گا۔ بیٹا بھی ہم سب کو اتنا ہی پیارا ہو

گا۔“

”نواز۔ کچھ کے گا تو نہیں۔“

تمکینے نے پھر قہقہہ لگایا۔ اور بولی ”وہ پاگل تو نہیں ہے جو کچھ کہے گا۔ ویسے میری طرح

اسے بھی بیٹی کا شوق ہے بس۔ ہو گی تو ٹھیک نہ ہوئی تو نہ سی۔ لگی کہیں کی۔ یوں پریشان نہ ہوا کرو۔ نہ ہی

نواز سے اس طرح خوف زدہ رہا کرو۔ تمہیں تو خوش و خرم رہنا چاہئے۔ ڈاکٹر بھی یہی کہتی تھی نا۔ تم تو خود

پڑھی لکھی ہو۔ ہائے ہائے۔ تم تو مجھ اُن پڑھ سے بھی گئی گزری ہو۔ نواز کو تو تم نے ہوا ہی سمجھ لیا

ہے۔ ارے بھی وہ بہت اچھا ہے۔ اس سے اتنا ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ بس اتنا ہی ڈرا کرو۔ جتنا ہمارے

دستور کے مطابق ایک بیوی کو خاندان سے ڈرنا چاہئے۔“ وہ پھر ہنسنے لگی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“ وہ پھر ہنسی۔ ”بالکل نہ ڈرا کرو۔ تو تو پاگل ہے نری

پاگل۔“

تمکینے اسے ہنسانے کو باتیں کرنے لگی۔ اس کا حوصلہ بندھا یا۔ تسلی دی۔ ”نواز خان تو

بہت اچھا آدمی ہے بس مزاج کا ذرا ٹیکھا ہے۔ لیکن بے وقوف تو نہیں۔ بیٹی کی اسے بھی زبردست خواہش

ہے۔ لیکن یہ تو نہیں۔ کہ بیٹی نہ ہوئی تو تمہارا سر پھاڑ ڈالے گا۔ دیکھ لینا۔ بیٹا ہوا تب بھی بے انتہا خوشی کا اظہار

کرے گا۔“

تمکینے کی باتوں سے وہ وقتی طور پر بہل گئی۔ لیکن نواز کی طرف سے خوف دل میں جاگزیں

رہا۔

دن گزرتے چلے جا رہے تھے۔ ریشمینے کی طبیعت بھی سہجی سی رہتی تھی۔ آغا بی بی اس کی

طرف سے فکر مند تھیں۔ تمکینے کا بچہ ضائع ہو چکا تھا۔ اس سے بھی کچھ وہی سی ہو گئی تھیں۔ ہر وقت دعا کرتی

رہتیں۔

”خداوند! بچی بخیر و عافیت فارغ ہو۔ صحت مند بچے کو جنم دے۔ ماں بچے کی زندگی ہو۔“

وہ باقاعدگی سے ہر مہینے اسے پشاور لے جا کر ڈاکٹر کو دکھا رہی تھیں۔ دودھ پھل زبردستی اسے کھلا

رہی تھیں۔

ریشمینے کی ماں بھی اس کے متعلق فکر مند تھیں۔ وہ جینی کے ساتھ کئی بار اسے دیکھنے

آچکی تھیں۔ بیٹی کی سرخ و پید رنگت خاصی پیلی ہو رہی تھی۔

”ریشمینے تجھے کیا ہو گیا ہے۔“

”کچھ نہیں بی بی جان۔“

”ڈرتی ہے“

”ہاں“

”پگلی۔ پہلی بار ہے نا۔ لیکن ڈر خوف دل سے نکال دے۔ خدا حافظ ہے۔“

”ہاں بی بی جان۔“

”شاید قہقینے کو دیکھ کر ڈر گئی ہے۔ وہ تو گر گئی تھی۔ جس کی وجہ سے بچہ نقصان ہو گیا خدا خیر رکھے..... انشاء اللہ تو بالکل ٹھیک رہے گی..... گھر میں سب تیرا تا خیال رکھتے ہیں.....“

”جی بی بی جان.....“

ماں جب بھی آتی اسے حوصلہ دیتی.....

وہ سردیوں کی ٹھہری ہوئی شام تھی۔ جب ریشمینے کو کمر میں درد محسوس ہوئی۔ تکلیف تو دوپہری سے محسوس ہو رہی تھی..... تمکینے کو اس نے شام ہی کو بتایا..... تمکینے نے اس کا سر منہ چوم کر کہا ”کوئی بات نہیں میں آغابی بی کو بتاتی ہوں۔ شکر ہے آج نواز خان بھی گھر پہ ہے۔ ضرورت ہوئی۔ تو شہرا بھی لے جائیں گے.....“

وہ سیدھی آغابی بی کے پاس گئی..... آغابی بی اور خان بابا بڑے دالان میں بیٹھے تھے دالان میں منکلوں میں کوئلے دیکھ رہے تھے۔ دالان خامہ گرم تھا۔

”آؤ بیٹی“ خان بابا نے خوشدلی سے خیر مقدمی الفاظ کہے۔

”مجھے آغابی بی سے کام ہے خان بابا“ تمکین نے زیر لب مسکراتے ہوئے احترام سے قدرے جھکتے ہوئے بولی.....

”مجھ سے“ آغابی بی نے سینے پر انگلی رکھی۔

”ہاں آغابی بی جانے.....“

”بتاؤ.....“

اس نے جھک کر آغابی بی کے کان میں سرگوشی کی۔ تو وہ سر ہلاتے ہوئے ہولے سے بولیں ”گھبراؤ نہیں رہی..... تم اس کے پاس جاؤ..... میں بھی آتی ہوں.....“

تمکین نے انہی قدموں پر واپس مڑی۔ آغابی بی بھی اپنی گرم چادر سنبھالتے ہوئے اٹھیں۔

”کیا بات ہے؟“ خان بابا بولے۔

”ریشمینے کی طبیعت ٹھیک نہیں.....“ وہ قدم اٹھاتے ہوئے بولیں ”نواز خان شاید

حجرے میں ہے“

”ہاں..... ابھی ادھر ہی گیا تھا..... اس کے کچھ دوست آئے ہوئے ہیں..... بلانا ہے اسے“

”بلادیں“

خان خوشدل خان تخت سے اٹھے۔ گاؤں نکلنے پر رکھی گرم لوٹی اٹھا کر کندھے پر رکھی۔

کار تو سوں والی چینی تخت کے کنارے پر لٹک رہی تھی۔ وہ اٹھا کر دیوار کے ساتھ لٹکادی۔ چٹامسر پر رکھا اور موٹے

چوڑے کی چپل پاؤں میں ڈالی..... اور حجرے میں جانے کے لئے قدم اٹھایا۔

آغابی بی دالان سے جا چکی تھیں.....

ریشمینے خاصی ڈری ہوئی تھی۔ آغابی بی سے پٹ گئی..... آغابی بی نے پیار کیا۔ سر اور

پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرا کر بولیں ”ڈرنے کی کوئی بات نہیں ریشمینے جان..... اللہ تمہارا حافظ و ناصر

ہے..... بچے تکلیف ہی سے ہوتے ہیں..... ماں جب بچے کی پیاری پیاری صورت دیکھتی ہے تو ساری تکلیفیں بھول

جاتی ہے..... حوصلہ بحال رکھو..... تم تو یحییٰ خوف زدہ دکھائی دے رہی ہو۔ خدا رحم کرے گا.....“

آغابی بی نے تسلی دلا سے دیئے..... پھر جا کر وہ تعویذ لے آئیں جو حافظ صاحب سے منگوا یا تھا

تعویذ اس کے بازو پر باندھا..... پیر بابا کی زیارت سے لایا ہوا نمک اسے چکھایا..... خود بھی آیات پڑھ پڑھ کر اس پر

پھونکیں..... بوتل میں رکھا آب زم زم بھی دو گھونٹ پلایا۔

نواز حجرے سے آگیا..... تو آغابی بی نے اسے ریشمینے کے متعلق بتایا.....

”ابھی ہسپتال لے چلتے ہیں.....“ نواز جلدی سے بولا.....

”میرے خیال میں تو رات گھر پہ گزاری جاسکتی ہے..... ابھی تو برائے نام ہی تکلیف ہے پہلی

دفعہ دودن تو.....“

”آغابی بی..... یہ دودن ہسپتال میں کاٹے جاسکتے ہیں۔ گھر پہ خدا نخواستہ تکلیف بڑھ گئی

تو.....“

”جیسے تمہاری مرضی..... ابھی لے چلتے ہیں.....“

”آپ ریشمینے کو تیار کریں..... سامان جو ساتھ لے جاتا ہے وہ بھی نکلوالیں۔ میں جیب

لے آتا ہوں“

”ریشمینے گاڑی میں جائے گی“

”گاڑی ہی لے جائیں گے..... بلکہ دو گاڑیاں لے جائیں گے۔ ساتھ خدمت گاریں بھی

ہوں گی اور سامان بھی.....“

”ہاں۔ حافظ اللہ اور رحیم گل کو بھی ساتھ لے جاتا..... دو آدمیوں کا وہاں ہونا ٹھیک رہے

گا۔“

”آدمی وہاں بست ہیں..... اس دفعہ ہسپتال رہنے کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی آغابی بی.....

اپنا پورا گھر ہے وہاں..... ہر چیز موجود ہے..... خانساں ہے..... کھانے پکانے کوئی مسئلہ نہیں.....“

”وہ تو ہے.....“

”اچھا..... آپ تیار کریں ریشمینے کو.....“

”بہتر.....“

نواز پلٹ گئے..... آغا بی بی ریشمینے کے کمرے میں آگئیں۔

گھٹے بھر بعد پشاور جانے کے لئے ریشمینے گاڑی میں آغا بی بی کے ساتھ بیٹھ چکی تھی۔ دوسری گاڑی میں سامان اور خدمت گار عورتیں اور مرد تھے..... سردی بہت تھی۔ مردوں نے کمبلوں کی بکلیں مار رکھی تھیں..... عورتوں نے بھی چادروں سے جسم پوری طرح لپیٹ لئے تھے۔

تمکینے نے بھی ساتھ چلنے کی پیش کش کی۔ لیکن آغا بی بی نے اسے صبح آنے کا کہہ دیا۔

ہسپتال میں پرائیویٹ کمرہ جس کے ساتھ فیملی کے رہنے کی بھی گنجائش تھی لے لیا گیا..... بیڈ پر

ریشمینے کو ڈالا گیا۔ دوسرے کمرے میں ساز و سامان نوکرائیوں نے فٹ کر دیا.....

ڈاکٹر اور نرسیں آگئیں..... ڈاکٹر نے چیک اپ کیا..... بچے کی پوزیشن دیکھی..... پیٹ پر آلہ رکھ کر دل کی دھڑکن سنی۔ نرس نے ٹیمپچر اور بلڈ پریشر چیک کیا۔ سب کچھ نارمل تھا..... ڈاکٹر ریشمینے کو تسلی دے کر آغا بی بی سے باتیں کرتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

رات بے آرامی سے گزری..... دوسرا دن بھی گزر گیا..... رات تکلیف بڑھی..... اور پچھلے پہر ریشمینے کو لیبر روم میں لے جایا گیا.....

نواز خان آغا بی بی اور نوکر نوکرائیاں رات بھر جاگتے رہے..... کبھی کمرے میں چلے آتے..... کبھی لیبر روم کے ارد گرد منڈلاتے..... کبھی بج بستر آمدوں میں عالم اضطراب میں پھرنے لگتے..... نواز خان آغا بی بی کو کمرے میں جا کر لیٹنے اور آرام کرنے کا کہتے..... آغا بی بی نواز خان سے کہتیں..... کہ جا کر کچھ دیر آرام کر لے۔

صبح بیدار ہو رہی تھی۔

جب ریشمینے نے اک خوبصورت اور صحت مند بیٹے کو جنم دیا..... ڈاکٹر نے بیٹے کی نوید سنائی۔ تو

وہ گہرا کر بولی ”بیٹا ہوا ہے“

”ہاں۔ بہت پیارا اور موٹا تازہ.....“

ریشمینہ رو دی۔

”خوشی کے آنسو ہیں.....“ ڈاکٹر نے نرس سے کہا۔

لیکن جب وہ روئے ہی گئی..... تو ڈاکٹر نے پوچھا ”کیا بات ہے خوش نہیں ہو.....“

اس نے کوئی جواب نہ دیا.....

نرس بچے کے کپڑے لینے باہر آئی..... بیٹے کی خوشخبری سنائی..... تو آغا بی بی اور نواز فرط مسرت سے ایک دوسرے سے پلٹ گئے..... نواز خان نے اسی وقت ہسپتال سے باہر جا کر ہوائی فائر کئے۔ نوکروں نے بھی اپنے طمنچے نکال کر خان کی تقلید کی۔ خوشی کی لہری دوڑ گئی تھی.....

ریشمینے کو جب سڑیچر پر ڈال کر لیبر روم سے نکالا گیا۔ تو آغا بی بی اور دونوں خدمت گاروں نے لپک کر سڑیچر تھام لیا..... مبارکبادیں دیں۔ آغا بی بی نے ریشمینے کا ماتھا کئی بار چوما.....

”خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے..... مبارک ہو بیٹی۔ بہت بہت مبارک“

”آپ اتنی خوش ہیں؟“ نرس نے آغا بی بی سے ہنس کر کہا ”اور یہ تو جب سے بچہ ہوا ہے رو

رہی ہیں.....“

”کیوں قربان“ آغا بی بی ریشمینے پر جھک گئیں۔

”آغا بی بی.....“

”صدے کیا بات ہے“

”بیٹی..... بیٹی نہیں ہوئی..... نواز خان..... خفا تو نہیں ہوں گے.....“

آغا بی بی ہنس پڑیں..... پھر مسکرا کر بولیں ”نواز خان تو بیٹے کی خبر سن کر کھل اٹھا..... ہوائی فائر

کرنے دوڑا پلنگی کہیں کی..... وہ کیوں خفا ہو گا.....“

ریشمینے نے اطمینان کی گہری سانس لی.....

صبح خبر گاؤں میں پہنچی۔ حویلی میں خوشی سے ہنگامہ سا پھا ہو گیا..... مبارک سلامت کا شور تھا ہوائی فائر تھے۔ اور نوکروں نوکرائیوں کا ناچ تھا..... خوش دل خان کی خوشی دیدنی تھی۔ بے دریغ پیسے ان ناپنے والوں پر لٹا رہے تھے۔ صبور خان بھی بڑے خوش نظر آرہے تھے۔ ناپنے والوں کو داد دے رہے تھے۔ بھرپور خوشی کا احساس کر رہے تھے۔

بیٹے کی خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ لوگ جوق در جوق حجرے اور حویلی میں خانوں کی خوشی میں اضافہ کرنے کے لئے آئے گئے۔ ڈھولک اور سرنے والوں کو بھی پتا چلا تو ٹولہوں کی صورت میں حویلی کے صدر دروازے پر خوشی کے گیت گانے بجانے لگے۔

پانچویں دن ریشمینے کو گھر لایا گیا۔

بچے کا نام شہباز خان تجویر ہوا..... نام رکھنے کی رسم بھی بڑے ترک و احتشام سے ہوئی خان خوشدل خان نے بچے کے منہ میں سونے کے چھچ سے شد ڈالا اور بولے ”لو شہباز خان شہد چائو“ مبارک سلامت کا شور مچ گیا۔

کئی دن گھر میں ہلا گلا رہی..... ریشمینے کے میکے والے بھی بڑے ٹھاٹھ سے آئے..... شہباز کیلئے زر نقد زمین اور قیمتی تحائف لائے..... اتفاق ہی سے ریشمینہ کا بڑا بھائی اور بھابی بوکے سے آئے ہوئے تھے..... بچے کے لئے وہ کپڑے اور کھلونے باہری سے لے کر آئے تھے..... بہت خوبصورت اور پیارے پیارے اونٹنی دیئے..... خوبصورت اور ملائم کبیل بچے کو لپٹنے کے لئے لائے تھے..... ایک تو بچہ انتہائی پیارا اس پر خوبصورت کپڑے اور نرم و گرم کبیل..... آغا بی بی تو جیسے اسے چھپا چھپا کر رکھ رہی تھیں..... مبادا نظر نہ لگ جائے..... نہ کہنے بچے کے ماتھے پر کالا خال لگا دیتی تھی.....

شہباز کی پیدائش پر بہت خوشیاں منائی گئیں۔ زر گل تین چار سال کا ہو چکا تھا درمیان میں ایک بچہ ضائع ہو گیا تھا..... خوشی اس لئے بھی زیادہ منائی گئی..... صدقہ خیرات دیئے گئے۔ یوں بھی ریشمینے کے ہاں تین ساڑھے تین سال شادی کے گزرنے کے بعد اولاد ہوئی تھی..... آغا بی بی اور اس کی ماں نے بہت منتیں مانگی ہوئی تھیں۔ یہ چڑھاوے اب چڑھائے جا رہے تھے..... کسی زیارت پر چادر چڑھائی جا رہی تھی۔ کہیں پھول اور دیکیں پکا کر غریبوں میں بانٹی جا رہی تھیں..... کہیں چاندی کا بچہ بھوکا بھیجا جا رہا تھا..... تو کہیں بنارس چادریں دی جا رہی تھیں.....

شہباز کی رسم حقیقتہً بھی بڑے اہتمام سے ہوئی..... حویلی کے سارے نوکر نوکرانیوں کو نئے کپڑے بھوکا کر دیئے گئے..... خدمت گاریں لینن کے شوخ پھولدار لباسوں میں اترا تھیں۔ مرد بھی نئے شلوار کرتوں اور گرم و اسکتوں اور چادروں، طلے والی ٹوپوں اور چلیوں میں پھولے نہ ساتے تھے..... ریشمینے کے میکے والے بھی ان خدمت گاروں کو خوش کر گئے.....

نواز خان بھی خوش تھے..... ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے..... لیکن ریشمینے کو غیر محسوس سے خوف نے گھیر رکھا تھا.....

”کیا نواز بچے کو اتنا پیار دیں گے..... جتنا انہیں دینا چاہئے.....“ وہ سوچتی رہتی.....

”نواز خان کیا کہنا چاہتے ہو..... تم مجھے مخاطب کر کے چپ ہو جاتے ہو..... کوئی خاص بات ہے

کیا؟“

”ہاں گل لالہ خاص بات ہی ہے“

”تو پھر کہو.....“

”ڈرتا ہوں۔ میری جسارت سے آپ برا نہ مان جائیں.....“

”تم اور ڈرو گے..... کیا غلط بات کہہ رہے ہو“

”نہیں گل لالہ..... سچ کہہ رہا ہوں..... خان بابا سے تو کہنے کی ہمت ہی نہیں پڑ رہی..... آپ

سے کہتے ہوئے بھی.....“

”بھئی اتنی لمبی چوڑی تمہید کی کیا ضرورت ہے۔ تم میرے چھوٹے بھائی ہو..... بے دھڑک دل

کی بات کہہ سکتے ہو.....“

”گل لالہ.....“

”ہوں“

”گل لالہ آپ اجازت دیں تو میں شہری شفت ہو جاؤں..... یعنی ریشمینے کو بھی شہری

لے جاؤں.....“

صبر خان نے سنجیدگی سے نواز خان کو دیکھا۔

نواز خان نادم نادم سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولے ”گل لالہ..... برا مان گئے نا

آپ.....“

”تم الگ ہونا چاہتے ہو!“

”اوہ خدایا..... یہ کب کہا میں نے“

”بال بچے کو لے کر شرفٹ ہونے کا جو کہہ رہے ہو“

”دیکھیں گل لالہ..... میرا کاروبار پشاور میں ہے۔ میں کئی کئی دن پشاور ہی میں رہتا ہوں کام

بڑھتا پھیلتا جا رہا ہے..... فرصت اور بھی کم ہوگی..... ہفتے میں ایک دن بھی بمشکل گاؤں آیا کروں گا.....“

”ہوں.....“

”شہباز ہو گیا ہے نا..... جی چاہتا ہے اسے روزی دیکھوں.....“

صبور خان مسکرائے ”باپ بن گئے ہو..... باپ بن کر سوچ رہے ہو“

”جی بالکل.....“

”شاید خان بابا بھی یہی چاہتے ہوں..“

”کیا؟“

”کہ وہ اپنے بیٹے کو روزی دیکھا کریں..... وہ بھی باپ بن کر سوچیں تو.....“

”گل لالہ..... مذاق نہ کریں..... میں تنجیدگی سے کہہ رہا ہوں“

”خان بابا سے پوچھ لو.....“

”وہ میں نہیں آپ پوچھیں گے.....“

”اگر وہ نہیں مانے تو.....“

”تو بھی آپ ہی منائیں گے“

”گو یا تم عزم کر چکے ہو.....“

”یہ میری فطری ضرورت ہے گل لالہ.....“

”ٹھیک ہے۔ میں خان بابا سے بات کروں گا.....“

”صرف بات ہی نہیں..... اجازت بھی لے کر دیں گے.....“

”شاید وہ نہیں مانیں.....“

”آغا بی بی سے بھی کہئے گا نا.....“

”تم اچھی طرح جانتے ہو..... کہ جب خان بابا کی مرضی نہیں ہوتی..... کسی کا دباؤ کام نہیں

کرتا.....“

”ہو سکتا ہے..... وہ خود ہی کہہ دیں.....“

صبور خان مسکرائے..... بھائی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے دبایا..... ”فکر نہ کرو.....“

میں پوری کوشش کروں گا.....“

”خدا آپ کو سلامت رکھے.....“

دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے..... وہ بڑے دالان کے مشرقی گوشے میں بیٹھے تھے۔ سارا

دالان سرخ قالینوں سے ڈھکا تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ گدے اور گاؤں تکتے پڑے تھے ایک طرف دیوار کے

ساتھ تخت بھی پڑا تھا۔ اس تخت پر اکثر خان بابا بیٹھا کرتے تھے..... اس وقت خان بابا حجرے میں تھے۔ اور

زرگل اپنے دو تین دوستوں کے ساتھ جو خدمت گاروں ہی کے بچے تھے تخت پر سے گدوں پر چھلانگیں لگا رہا

تھا.....

نواز نے بچوں کی طرف دیکھا.....

صبور نے زرگل کو بلایا ”زرگل خانہ..... ادھر آؤ.....“

”میں کھیل رہا ہوں بابا.....“ وہ وہیں سے بولا۔

”بات تو سنو.....“

”ابھی نہیں.....“

”زرگل.....“

صبور خان نے غصے سے آواز دی تو وہ ڈر گیا۔

”آؤ بچے..... بابا کا کہنا مانتے ہیں..... تو نواز نے کہا.....“

زرگل قریب آگیا..... صبور خان نے اس کا کان مروڑا..... وہ چیخا..... صبور بولے

”تمہیں کتنی بار منع کیا ہے تخت پر سے چھلانگیں نہ لگایا کرو۔ کسی دن ٹانگ بازو توڑ لو گے.....“

شرارتوں کے سوا تمہیں کوئی کام ہی نہیں..... چلو اپنی ترور سے کہو..... منہ ہاتھ دھوئے تمہارا..... کپڑے بھی

بدلو.....“

زرگل نے منہ بنایا..... نواز کی طرف دیکھا..... چچا کی شہ چاہتا تھا..... لیکن نواز نے بھی کہا

”اچھے بچے فوراً کہنا مانتے ہیں..... جاؤ تاج برو سے کو تمہارا ہاتھ منہ دھو کر کپڑے بدل دے..... شاباش میرا

بچہ..... شاباش.....“

زرگل دالان سے نکل گیا..... اس کے ساتھی بچے پہلے ہی جا چکے تھے.....

صبور خان اسے جاتے دیکھ کر بولے ”اسے ضرورت سے زیادہ لاڈ و پیار نے ضدی اور ڈھیٹ بنا

دیا ہے.....“

”گل لالہ..... بچہ ہے..... لاڈ پیار تو واقعی اسے بہت ملا ہے..... لیکن اب اس کا شریک آگیا ہے

ناہی شراکت بچہ بہت محسوس کرتا ہے..... میں دیکھ رہا ہوں..... جب سے شہباز پیدا ہوا ہے..... زرگل کچھ زیادہ ہی شرارتیں کرنے لگا ہے.....

”اے پیار تو بہت کرتا ہے“

”لیکن اپنی حق تلفی بھی محسوس کرتا ہے.....“

”بے جا ضدیں کرنے لگا ہے..... کہنا نہیں مانتا..... الٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگتا ہے“

”کل لالہ.....“

”ہوں“

”آپ زرگل کو سکول داخل کروادیں..... ساڑھے چار سال کا ہو رہا ہے اب تو ماشاء اللہ“

”گاؤں میں کون سا اچھا سکول ہے.....“

”چار سدہ میں تو ہے نا.....“

”ہاں وہاں ہے کنڈہ گارٹن.....“

”میری مائیں تو داخل کروادیں..... اب اس کی عمر ہے پڑھائی شروع کرنے کی..... مصروف

ہو جائے گا..... تو شوخیاں شرارتیں بھی نہیں کرے گا.....“

”ٹھیک ہے..... چار سدہ جانے آنے کا کوئی مسئلہ نہیں.....“

”میں اگر پشاور سیکل ہو گیا..... تو زرگل کو وہاں داخل کروادوں گا..... بہت اچھے اچھے سکول

ہیں وہاں.....“

صبور خان مسکرا کر بولے..... ”پہلے اپنے لئے تو جگہ بناؤ..... پھر اوروں کی بھی

سوچنا.....“

”وہ تو آپ بتائیں گے ہی“ نواز نے کہا۔

صبور خان بھی مسکرا دیئے.....

”انشاء اللہ..... زرگل کی تعلیم بھی پشاور ہی میں ہوگی“ نواز مسکرا کر بولے۔

”یہ تو ابھی ممکن نہیں ہو گا“

”کیوں“

”آغا بی بی اور تکینے بچے سے جدا ہو سکیں گی..... اور پھر خان بابا..... وہ تو زرگل کو کبھی نظروں

سے اوجھل نہیں ہونے دیں گے“

”بچے کے بہتر مستقبل کے لئے ایسا کرنا پڑے گا کل لالہ.....“

”فی الحال تو چار سدہ سکول ہی ٹھیک ہے۔ ہاں بڑی کلاسوں میں جب جائے گا دیکھیں

گے.....“

”کل ہی سکول کا پتہ کروا لیتے ہیں.....“

”کل تم یہیں ہو..... یہ کام کر ہی دو.....“

”ضرور..... آپ فکر نہ کریں۔ میں خود جا کر سب کچھ پتہ کروں گا..... سکول وہاں

ہے.....“

”سکول تو بہت ہیں..... اچھا سکول.....“

”جی ہاں..... میں بھی یہی کہہ رہا ہوں..... گاؤں سے دو چار بچے وہاں جاتے بھی ہیں.....

میرے خیال میں خان محبت خان کے پوتے اور نواسے وہیں پڑھ رہے ہیں.....“

”شاید.....“

”ان کی گاڑی روز چار سدہ انہیں لے کر جاتی آتی ہے.....“

”ہوں.....“

”میں کل ہی پتہ کر کے سارا بندوبست کر لوں گا.....“

”ضرور کرنا..... اسے واقعی اب سکول بھیجنا چاہئے..... میں رات خان بابا سے یہ بات بھی

کروں گا.....“

”میری بات بھول نہ جائیے گا.....“

”نہ مڑا.....“ صبور خان پیار سے بولے..... ”مڑا پشتونوں کی گفت و گو میں استعمال ہونے والے

عام سلفظ ہے۔ بے تکلفی کا صوفی اشارہ ہے..... جیسے نہ بھی“ کہا جائے۔

صبور خان رات تو خان بابا سے بات نہ کر سکے۔ خان بابا رات گئے تک مصروف تھے۔

دو مخالف پارٹیاں اپنا فیصلہ کروانے کے لئے حجرے میں آئی ہوئی تھیں..... ایک پارٹی کا لڑکا

دوسری پارٹی کی لڑکی کو اغوا کر کے لے گیا تھا..... وہ دونوں تو پتہ نہیں پاکستان کے کس گوشے میں شادی کر کے گم

ہو چکے تھے..... جھگڑا گاؤں میں چل رہا تھا..... فائرنگ بھی ہو چکی تھی دونوں طرف کے کچھ آدمی زخمی بھی ہوئے

تھے.....

مغالہ سنگین اور پیچیدہ نوعیت کا تھا..... خان بابا خاصے متفکر تھے..... اس لئے اس رات نواز

خان کے پشاور شفٹ ہونے کی بات صبور خان نے فوری نہ چھیڑی.....

ہاں اگلے دن صبور خان نے آغا بی بی سے ذکر چھیڑا..... وہ دھوپ میں بان کے پٹنگ پر بیٹھی

تھیں۔

آغا بی نے دھیان سے بات سنی..... پھر سنجیدگی سے بولیں ”صبر بیٹے..... ایک بات پوچھوں
”جی آغا بی..... فرمائیے.....“ صبر پھولوں کی ہری بھری کیاری کے قریب کھڑے کھڑے

بولے۔

”نواز خان بال بچوں کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے..... یا ہم سے الگ ہونا چاہتا ہے.....“

”میں سمجھ نہیں آغا بی..... الگ سے آپ کی کیا مراد ہے.....“

”بھائی بھائی الگ ہوتے ہی آئے ہیں..... میرا مطلب زمینوں اور جائیداد کے بٹارے سے

ہے.....“

صبر خان کچھ کہتے کہتے رک گئے..... پھر سرفنی کے انداز میں ہلاتے ہوئے بولے ”یہ..... یہ

بات تو میں نے نہیں پوچھی..... میرے خیال میں وہ صرف ہیوی بچے کو ساتھ لے جانا چاہتا ہے.....“

”ریشمینے بھی یہی چاہتی ہے؟“

”پتہ نہیں آغا بی..... میں نے یہ بھی نہیں پوچھا.....“

”بابا سے بات کی ہے“

”فی الحال نہیں کر سکا.....“

”ان سے بات کرنے سے پہلے یہ ساری باتیں نواز خان سے پوچھ لینا.....“

”نواز خان آج گھر پہنچے ہیں..... پوچھ لوں گا.....“

”وہ جیپ میں گیا ہے کیس.....“

”چار سدے گیا ہو گا..... زرگل کو سکول داخل کروانا چاہتا ہے..... چار سدے میں سکول کا

پتہ کرنے جانا تھا.....“

”ہاں میں بھی یہی سوچ رہی تھی..... اب زرگل کو سکول میں داخل کروانا چاہئے.....“

دونوں زرگل کی باتیں کرنے لگے..... آج کل وہ بہت شرارتی ہو گیا تھا..... نوکروں کے بچوں

کے ساتھ مل کر خوب ادھم مچاتا تھا..... کل حجرے کے صحن میں لگے درخت پر چڑھ کر چڑیوں کے گھونسلے اتارتا رہا

تھا..... صد خان وہاں نہ ہوتا تو بری طرح کرتا..... شاخ ٹوٹ گئی تھی..... وہ نیچے آ رہا تھا..... صد خان نے دوڑ کر

اپنی چادر پھیلادی تھی..... اور زرگل چادر میں آن پڑا تھا..... تنکینے نے سنا تھا..... تو دل ہول کھا گیا تھا..... زرگل

کی خوب پٹائی کی تھی..... آغا بی نے نہ چڑھتا تھا تو وہ اسے تو مڈالتی..... اس نے زرگل کی ترور (آیا) تاج برو پر بھی

پہلی بار غصہ کیا تھا..... کہ وہ بچے کا پوری طرح دھیان کیوں نہیں رکھتی.....

”نواز کب گیا تھا“ بچے کی باتیں کرتے کرتے صبر نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے ناشتہ کرتے ہی نکل گیا تھا.....“

صبر نے کندھے پر ہڈی چادر ٹھیک کرتے ہوئے آستین چڑھا کر گھڑی دیکھی اور بولے ”اب

تو آنے والا ہی ہو گا..... گیارہ بجنے والے ہیں.....“

”اگر وہیں سے پشاور نہ چلا گیا تو.....“

”پشاور آج نہیں جانا اس نے.....“

”تہ کال بالا.....“

”شاید..... لیکن تہ کال بالا جانا ہوتا تو ریشمینے کو ساتھ لے کر جاتا..... آغا بی کی طبیعت

چند دنوں سے اچھی نہیں.....“

دونوں باتیں کر رہے تھے..... کہ باہر سے جیپ کی آواز آئی.....

”لو آگیا“

”میرا بھی یہی خیال ہے.....“

”زرگل کے داخلے کا بندوبست کر ہی آیا ہو تو اچھا ہے“

”دیکھیں..... کیا اطلاع لایا ہے“

صبر خان ماں کے قریب ہی پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے..... قرافی ٹوپی اتار کر گود میں رکھ

لی..... اور بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگے.....

نواز برآمدوں سے ہوتا ہوا دھڑکی آگیا..... ماں اور گل لالہ کو سلام کیا..... پھر ماتھ میں پکڑے

کاغذات دکھاتے ہوئے بولے ”لیں جی..... زرگل کے داخلے کا بندوبست کر آیا ہوں..... سکول بہت اچھا

ہے..... گئے چنے بچے ہیں..... نیچر بچوں کا بہت خیال رکھتی ہیں..... فیس زیادہ ہے اس لئے عام بچے وہاں

داخلہ نہیں لے سکتے.....“

نواز تفصیلات بتانے لگے.....

”کل زرگل کو داخلے کیلئے لے جانا ہے“ نواز بولے..... ”بھابی کو بھی بتادوں“

وہ مڑے تو صبر خان بھی ٹوپی سر پر رکھتے ہوئے اٹھے..... ماں نے اشارہ کیا..... وہ نواز کے ساتھ

ساتھ چلتے برآمدے میں آگئے.....

”گل لالہ“ نواز قدم اٹھاتے ہوئے بولے۔

”ہوں“

”بات کی تھی خان بابا سے“

”نہیں.....“

”کیوں“

صبور نے خان بابا کے پاس آئے مقدمے کی بات کی..... پھر ملائمت سے بولے ”نواز ایک

بات تو بتاؤ“

”جی گل لالہ.....“

”یہ..... بات یہ ہے..... کہ تم.....“

”کیا بات ہے گل لالہ..... آپ کچھ ہچکچا رہے ہیں.....“

”بھئی..... سنو.....“

”جی.....“

”میں نے آغا بی بی سے بات کی تھی“

”تو.....“

”تو انہوں نے پوچھا..... کہ تم شفقت ہونا چاہتے ہو۔ یا الگ؟“

”کیا؟“

”آغا بی بی جانتا چاہتی تھیں..... کہ تم ہم سے الگ تو نہیں ہونا چاہتے..... یعنی..... ان کا مطلب

تھا اپنی جائیداد اور زمینوں کا حصہ.....“

”گل لالہ.....“ نواز خان نے تیزی سے ان کی بات کاٹی ”بہت افسوس ہے گل لالہ

آپ لوگوں نے یہ کیونکر سوچا..... میں آپ سے الگ ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ بہت دکھ پہنچایا ہے آپ نے

یہ بات کہہ کر.....“

صبور نے آسودگی سے سانس لیا..... پھر مسکرا کر بھائی کو دیکھا..... اس کے کندھے پر شفقت

سے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اپنی طرف گھمایا..... ”نواز خان..... یہ بات میں نے نہیں آغا بی بی نے پوچھی

تھی..... وہ شاید یہ پوچھنے میں حق بجانب بھی ہیں..... جذباتی ہونے کی بات نہیں ہے۔ الگ ہونا کوئی بری بات بھی

نہیں..... حوصلے سے بات سننا دیکھو میرے بھائی.....“

صبور نے نواز کو گلے سے لگا لیا..... چند لمحوں بعد دونوں الگ ہوئے۔ تو نواز نے کہا

”گل لالہ..... میں نے صرف ریشمینے اور شہباز کو پشاور ساتھ لے جانے کی بات کی ہے۔ الگ ہونے کی

نہیں..... الگ ہونے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا..... خان بابا کو خدا زندگی دے ان کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر

رہے..... میں تو ان کے بعد بھی ایسی بات کبھی ذہن میں نہیں لاؤں گا“

”جیتے رہو..... نصیب زور آور ہوں“ صبور بولے.....

”خان بابا سے اجازت لے کر دینی ہے تو صرف اتنی..... کہ میں ریشمینے اور شہباز کو پشاور

اپنے پاس رکھ سکوں.....“

”ٹھیک ہے بھئی ٹھیک ہے“

”گل لالہ..... میرا تعلق اس گاؤں کی مٹی سے ہے..... یہ تعلق نہیں ٹوٹے گا..... میں اسی

طرح آیا کروں گا..... یہ میرا گھر ہے..... میرے رشتے ناٹے ہیں یہاں..... پشاور چلے جانے سے یہ سب ٹوٹ

تھوڑا سی جائیں گے“

”ٹھیک ٹھیک“ صبور خان نے اس کے کندھے پر چھکی دی..... ”بے فکر رہو..... میں اجازت

دلا دوں گا تمہیں.....“

”آغا بی بی سے میں خود ہی بات کرتا ہوں۔ کسی غلط فہمی سے وہ اپنے دل کو رنجیدہ نہ کریں“

نواز نے مڑتے ہوئے کہا.....

صبور مسکرا کر بولے ”جاؤ وہیں بیٹھی ہیں..... تم ٹھیک ہی کہتے ہو..... کہیں وہ غلط فہمی میں رنجیدہ

نہ ہو رہی ہوں“

نواز تیز قدم اٹھاتے واپس ہوئے..... صبور خان برآمدے میں آگے بڑھ گئے۔

خلاف توقع خان بابا نے نواز خان کو شفت ہونے کی اجازت آسانی سے دے دی بلکہ وہ تو شاید خود بھی چاہتے تھے۔ صبر نے بات کی تو وہ ایک دم ہی بولے ”میں تو یہی کہنا چاہتا تھا۔۔۔ بلکہ میں نے تو اس دن سوچ لیا تھا۔۔۔ جس دن نواز بیٹے تم نے فیکٹری لگانے کی سکیم بنائی تھی۔۔۔ اب تم ماشاء اللہ کاروبار سیٹ کر چکے ہو۔۔۔ بال بچے دار بھی ہو گئے ہو۔۔۔ اس لئے مجھے خوشی ہو گی کہ اپنی ذمہ داریاں خود اٹھاؤ۔۔۔ پھر روز روز پشاور سے گاؤں آنا بھی مشکل ہے۔۔۔ ٹھیک ہے لے جاؤ بیوی بچے کو ساتھ۔۔۔ دل تو ہمارا اداس ضرور ہو گا ان کے بغیر۔۔۔ لیکن خیر۔۔۔ عادت ہو ہی جائے گی۔۔۔“

”ہاں خان بابا۔۔۔ تم کہتے ہو بولی ”دل بہت اداس ہو گا ان کے بغیر۔۔۔ ریشمینے میری ویو اپنی نہیں بسن ہے۔۔۔“

”یہ بہنا پہ خدا کرے ہمیشہ قائم رہے“ آغا بی بی دونوں کو پیار سے دیکھتے ہوئے بولیں۔۔۔ نواز اور ریشمینے چپ بیٹھے رہے۔۔۔

رات کافی ٹھنڈی تھی۔۔۔ کھانے کے بعد سب بڑے دالان میں بیٹھے تھے۔۔۔ خان بابا تخت پر گاؤں کتنے کے سارے نیم دراز تھے۔۔۔ چلم سرانے رکھی تھی۔۔۔ کبھی کبھی منہ سے لگا کر کش لے رہے تھے۔۔۔ صبر ان کے قریب ہی گدے پر بیٹھے تھے۔۔۔ نواز پرے ہٹ کر کھڑکی کے قریب زرگل کے ساتھ کھیل میں مصروف تھے۔۔۔ ریشمینے اور تمکین نے آغا بی بی کے دائیں بائیں ویوار کے ساتھ تکیوں کے سارے ٹیک لگائے ہوئے تھیں۔۔۔ شہباز کو اس کی ترور لے گئی تھی۔۔۔ وہ آغا بی بی کی گود میں سو گیا تھا۔۔۔

تمکین نے سامنے ٹرے میں قہوے کی نیلی گروزر کی چینک پڑی تھی۔۔۔ اس نے سب کو قہوہ پیش کیا تھا۔۔۔ سب نے سردی کے پیش نظر دو دو تین پیالیاں قہوہ پیا تھا۔۔۔ دالان کے دروازے کھڑکیاں بند تھیں۔۔۔ تین چار منکلوں (انگلیٹیو) میں کوئلے دہک رہے تھے۔۔۔ جس سے دالان کی فضا خاصی خوشگوار ہو

مکئی تھی۔

خان بابا نے اجازت دی تو نواز کے چہرے پر خوشی کے سائے لہرا گئے۔ زرگل کو گود میں بھر کر پیار کرنے لگے۔۔۔ ”یار تم بہت یاد آؤ گے۔۔۔“

”کیوں چاچا۔۔۔“ زرگل معصومیت سے بولا۔۔۔

نواز نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر اسے گود سے اتار کر گدے پر بٹھا دیا۔ خود اٹھے اور خان بابا کے قدموں میں قالین پر بیٹھے ہوئے بولے ”خان بابا۔۔۔ جی تو میرا بھی نہیں چاہتا کہ آپ لوگوں سے جدا رہوں۔۔۔ لیکن مجبوری ہے۔۔۔ کام بہت بڑھ گیا ہے۔۔۔ اس لئے۔۔۔“

”ٹھیک ہے بچے۔۔۔“ آغا بی بی نے ہاتھ اٹھا کر انہیں دعادی ”خدا کرے تمہارا کام اور پھلے پھولے۔۔۔ وقتی طور پر ہم سب کو بچھڑنے کا دکھ ہو گا۔۔۔ لیکن مصلحت اسی میں ہے۔۔۔ ویسے تم ہر ہفتے ضرور آیا کرو گے۔۔۔ میری بیٹی اور بچے کو لے کر۔۔۔“

آغا بی بی نے ریشمینے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔۔۔ ریشمینے رو ہانسی ہو رہی تھی۔۔۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔۔۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی ”آغا بی بی۔۔۔ آپ کی شفقتیں پانے کی میں ہمیشہ متنی رہوں گی۔۔۔“

”جیتی رہو۔۔۔ خدا تمہیں خوشحال رکھے۔۔۔ جی تھوڑا نہ کرو۔۔۔ ہم لوگ ملتے رہیں گے۔ تم آیا کرو گی۔۔۔ ہم تمہارے پاس آیا کریں گے۔۔۔“

”جی آغا بی بی۔۔۔“ چادر کے کونے سے ریشمینے نے آنکھیں پونچھیں تو تمکین نے کی آنکھوں میں بھی نمی تیر گئی۔۔۔

صبر خان نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولے ”دیکھیں خان بابا۔۔۔ ان دونوں کو دیکھیں۔۔۔“

”یہ قدرتی امر ہے صبر خان۔۔۔ ہم خوش قسمت ہیں۔۔۔ کہ ہماری بہوؤں کا آپس میں اتنا پیار ہے۔۔۔“

سب اس رات کافی دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔۔۔ آغا بی بی اور خان بابا نے فراخ دلی سے ریشمینے اور نواز سے کہا ”جو کچھ ساتھ لے جانا چاہو لے جاؤ۔۔۔ بالکل جھجکا نہیں۔۔۔ یہ گھر بھی تمہارا ہے۔۔۔ ضرورت کی سب چیزیں یہاں ہیں۔۔۔“

نواز سعادت مندی سے بولے ”بابا ہاں بھی سب کچھ آپ ہی کے طفیل ہے۔۔۔ ریشمینے کو اپنے اور شہباز کے کپڑوں کے علاوہ کوئی چیز لے جانے کی ضرورت نہیں۔۔۔ ویسے بھی ہم یہاں آیا کریں گے تو اپنے کمرے میں رہا کریں گے۔۔۔ اس لئے یہ سارا سامان یہاں رہے گا۔۔۔ جیسے پڑا ہے ویسے پڑا رہے گا۔۔۔“

”ریشمینے اپنا زیور لے جاسکتی ہے“ آغا بی بی بولیں۔
 ”نہیں آغا بی بی۔ سارا زیور لے جانے کی ضرورت نہیں“ نواز بولے ”تھوڑا بہت جو پہنے ہوئے ہے وہی کافی ہے۔“

جانے کا فیصلہ ہو گیا۔ دوسرے دن تیاریاں شروع ہو گئیں۔ حویلی کی فضا میں اداسی سی گھل گئی۔ گھر والے تو اداس تھے ہی۔ خدمت گاروں اور نوکروں کو بھی ذہنی تکلیف ہو رہی تھی۔ کچھ خدمت گاروں نے تو ساتھ جانے کے لئے بھی کہا۔

آغا بی بی نے خود ہی پانچ چھ خدمت گاروں کا انتخاب کیا۔ نواز خان کے ذاتی ملازم بھی ساتھ جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔

نوکریاں چاکر وہاں بھی کافی تھے۔ لیکن ان خدمت گاروں کی بات اور تھی۔ یہ تو ان لوگوں کی زندگی کا حصہ تھے۔ ان کے بغیر گھر کی فضا وہ نہیں رہ سکتی تھی۔ جو ان کی عادات کا تقاضہ تھی۔ نواز پشاور میں بھی گھر کا ماحول اور فضا گاؤں کی اسی حویلی کی سی رکھنا چاہتے تھے۔

نوکروں کی کھپ دو تین دن پہلے ہی پشاور پہنچادی گئی۔ جمائی ساز کوٹھی کے عقب میں ان کے لئے کواٹر موجود تھے۔ ہر نوکری فیملی کے لئے ایک کواٹر مختص کر دیا گیا تھا۔

چھٹی کے دن نواز ریشمینے اور شہباز کو لینے آگئے۔ گاؤں والوں کو بھی ان کے شفقت ہونے کا علم ہو گیا تھا۔ ہر کوئی اپنی تعلق داری دکھانے آ رہا تھا۔ دعائیں دے رہا تھا۔ گاؤں سے ٹاٹہ قائم رکھنے کی تلقین کر رہا تھا۔

نواز ہنس بھس کر سب سے تقریباً ایک ہی بات کہہ رہے تھے ”میں آتا جاؤں گا۔ یہ گاؤں میرا ہے۔ آپ سب میرے ہیں۔ یہاں سے میرے مضبوط رشتے ہیں بندھن ہیں۔ میری شناخت یہاں کی مٹی ہے۔ میری پہچان یہاں کے رسم و رواج اور دستور ہیں۔ میں ان سے کٹ کر تھوڑا جی سکتا ہوں۔ آپ میں سے ہوں۔“ آپ میں رہوں گا۔ کچھ لوگ تو واقعی دلی قلق کا اظہار کر رہے تھے۔ بعض دکھاوے کو بڑھ چڑھ کر جتلا رہے تھے۔

لیکن گھر والے بھی رنجیدہ تھے۔ اور تو اور خان بابا جیسے سخت دل انسان نے بھی جب ریشمینے اور شہباز کو گاؤں میں بیٹھنے سے پہلے پیار کیا۔ تو آواز زندہ گئی۔ تکیے اور ریشمینے تو گلے مل کر خوب روئیں۔ آغا بی بی کے دعائیہ جملے بھی بھرائی آواز میں ڈوب گئے۔ بچے کو بار بار بے اختیار آنہ گلے سے لگا لگا کر بچھاؤ اور ریشمینے سے لگی ہو کر اس کا سر ہاتھ پیار سے چوم لیا۔ صورتوں سے ریشمینے اور تکیے کے رونے کا مذاق اڑا رہے تھے وہ بھی اس وقت چپ ہو گئے۔ نواز کو بھی چند لمحوں کے لئے ندامت سی ہوئی۔

یوں لگا جیسے وہ ہی سب کے دکھوں کے ذمہ دار ہیں۔

”خدا حافظ“

”خدا اپنی رحمتوں کے سایہ میں رکھے“

”خوشحال رہو۔“

”عزت بڑھے۔“

”زندگی اور تندرستی ہو۔“

”دونوں طرف خیریت رہے“

خدمت گاروں اور گھر والوں کے دعائیہ فقروں کے درمیان گاڑی سارٹ ہوئی۔ کئی کئی بار خدا حافظ کہا گیا۔ ریشمینے نے نم آلود آنکھوں سے سب کو دیکھا۔ شہباز اپنی ترور کی گود میں تھا۔ ترور نے اس کا ہاتھ ساتھ مانتے پر لگاتے ہوئے دادی دادا کی طرف اس کا رخ کیا۔ سلامتی کی دعائیں دی گئیں۔

یوں نواز ریشمینے کو لے کر پشاور آگئے۔

وسیع و عریض کوٹھی بڑے بڑے اونچے اور سرسبز درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ بہت بڑے بڑے لان تھے۔ جن میں سبز گھاس قالین کی طرح بچھی تھی۔ کیاریوں میں رنگارنگ پھول تھے۔ برآمدوں کے ستونوں کے ساتھ بیلنس لپٹی تھیں جو بڑے پھلتے پھرتی دروں پر بڑی نفاست سے چڑھی تھیں۔ کوٹھی کے پچھلے چمن بھی آراستہ تھے۔ بہت سا کھلا حصہ پھل دار درختوں سے چھایا تھا۔

کوٹھی بڑی کشادہ تھی۔ ہال نما ڈرائنگ روم ملحقہ ڈائنگ روم۔ بہت بڑا کچن پنٹری بڑے بڑے بیڈ روم جن کے ساتھ ہی کھلے کھلے باتھ روم بھی تھے۔ ماسٹر بیڈ روم کے ساتھ ڈرائنگ روم بھی تھا۔ ہر کمرے میں قالین پڑے تھے۔ فرنیچر بھی تھا۔ پردے بھی لگے تھے۔ آرائشی چیزیں بھی تھیں۔ لیکن بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ مرد نوکر ہی تھے یہاں۔ انہیں گھر جانے کا لائقہ تھوڑے ہی آتا تھا۔ ہاں صفائی ستھرائی نواز خان کے کہنے پر خوب کی ہوئی تھی۔

کوٹھی سے ملحقہ مہمان خانہ تھا۔ جسے حجرے کے طور پر نواز خان نے اپنی ضرورت کے مطابق بنوایا تھا۔ گویا گاؤں کا ساجھو نہیں تھا۔ بہت بڑے بڑے دو ہال نما کمرے تھے۔ ایک میں صوفے وغیرہ رکھے تھے۔ کرسیاں تھیں ٹیبل تھے۔ کھانے کی میز اور کرسیاں تھیں۔ گاؤں کے حجروں میں صوفے یا کرسی کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ زمینی نشست ہوتی ہے۔ قالین سے فرش ڈھکا تھا۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ گدے اور گاؤں کے رکھے تھے۔ دیواروں پر طمنچے پستولیں گولیوں کی پٹیاں اور جانوروں کی کھالیں لگی ہوئی تھیں۔

کمروں کے آگے لمبا چوڑا برآمدہ تھا۔ جس میں بان کے پلنگ پڑے تھے۔ برآمدے کے سامنے چمن تھا۔ جہاں کرسیاں بھی رکھی تھیں اور پلنگ بھی کناروں پر رکھے رہتے۔ گاؤں سے آنے جانے والے لوگوں کو اسی حجرے میں ٹھہرایا جاتا۔ فیکٹری میں کام کرنے والے بھی اسی حصے میں آکر نواز خان سے ملتے جلتے کوٹھی کا ڈرائنگ روم تو رشتہ داروں اور ذاتی دوستوں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔

ریشمینے کے ساتھ خدمت گاریں بھی آئی تھیں۔ ان کی مدد سے اس نے کوٹھی کی ساری ترتیب بدلی۔ پڑھائی کے دوران وہ شہر میں رہ چکی تھی۔ شہری طرز تہذیب سے آگاہ تھی۔ پھر یہ اس کا اپنا گھر تھا۔ یہاں اس کی اپنی حکمرانی تھی۔ اسی گھر کو سجانے سنوارنے کا اسے حق تھا۔ شوق تھا۔ وہ خوشی خوشی گھر کی ترتیب بدلنے اور آراستہ پیراستہ کرنے میں لگی تھی۔ فالتو چیزیں اٹھوا کر پچھلے سنور میں رکھوا رہی تھی۔ نئی چیزوں کی لسٹ بنا رہی تھی۔ پردے تو سب کمروں کے لئے نئے بنوانے تھے۔ کچھ میلے ہو رہے تھے۔ اور کچھ اسے پسند نہیں تھے۔ اپنے بیڈ روم کا تو اس نے سارا فرنیچر قالین اور پردے نئے بنوانے کا سوچا تھا۔

اس نے لمبی چوڑی فرسٹ تیار کر چھوڑی۔ نواز نے ایک دن پوچھا ”کسی چیز کی ضرورت ہو۔ تو بتا دینا۔“

ریشمینے جھٹ سے وہ فرسٹ لے آئی۔ ”لیجئے خان۔“

”یہ کیا ہے“

”وہ سب کچھ جو اس گھر کے لئے درکار ہے“

”بھئی اتنی لمبی فرسٹ“

”وہ مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے بولی ”نیا گھر آباد کرتا ہے۔“

”ٹھیک ہے“ نواز نے سرسری سی نظر لسٹ پر ڈالی۔

”تو کسی دن چلیں گے بازار۔“ وہ بولی۔

”تم۔۔۔ بھی چلو گی؟“

”اگر آپ اجازت دیں تو۔۔۔ میں چیزیں اپنی پسند کی خریدنا چاہتی ہوں۔“

نواز خان چپ رہے۔۔۔ پھر ہولے سے سر ہلایا۔۔۔ ریشمینے کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

نواز خان کے خاندان کی عورتیں شاپنگ کرنے کہاں جاتی تھیں۔۔۔ جو مردوں نے لادیا وہی

بخوشی قبول کر لیا۔

”آپ کسی دن وقت نکال کر ساتھ چلیں تو فرنیچر کا آرڈر کر آئیں گے۔ اور دوسری

چیزیں بھی خرید لیں گے۔“

”دیکھوں گا۔۔۔ کسی دن فرصت ملی تو لے چلوں گا۔۔۔“

ریشمینے خوش ہو گئی۔

اگلے ہفتے وہ اسے بازار لے گیا۔۔۔ ریشمینے نے سر سے پاؤں تک اپنے آپ کو لمبی چوڑی چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔۔۔ چہرہ بھی پورا اٹھلا نہیں تھا۔۔۔ ہاتھ سے نیچے تک چادر کی ہوئی تھی۔۔۔ دونوں کرائیاں ساتھ تھیں۔۔۔ نواز خان گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ اور ان کا معتد خاص خدمت گار سمندر خان گاڑی چلا رہا تھا۔

ریشمینے کے لئے پشاور کے صدر اور گور بازار نئے نہ تھے۔۔۔ وہ کئی دفعہ بھائیوں آغاٹی اور بی بی جان کے ہمراہ شاپنگ کے لئے یہاں آچکی تھی۔۔۔ پڑھائی کے دوران ان سیلیوں کے ساتھ بھی کئی دفعہ یہاں شاپنگ کی تھی۔۔۔ جہاں جہاں سے جو چیزیں ملتا تھیں۔۔۔ اسے پتہ تھا۔

”لگتا ہے تم پہلے بھی یہاں آتی رہی ہو۔“ نواز خان نے پردہ کلاتھ دیکھتے ہوئے

ریشمینے سے کہا۔

”جی خان۔۔۔ شادی سے پہلے عبیدلہ اور آغاٹی کے ساتھ آتی رہی ہوں۔“

”پھر تو تم خود ہی پسند کر کے لے لو چیزیں۔“

”آپ بھی تو پسند کریں۔“

”نہیں بھئی۔۔۔ یہ تمہارا ڈیپارٹمنٹ ہے۔“

”فرنیچر تو ساتھ چل کر دیکھیں نا۔۔۔“

”تمہاری پسند ہماری پسند۔“

”بھائو نا تو آپ ہی کریں گے نا۔“

”ٹھیک ہے بھائو نا تو سمندر خان کر لے گا۔ تم فرنیچر کی جو آئٹم چاہے پسند کر لو۔“

”یہ پردے خرید لیں پہلے۔۔۔ سٹلے بھی دینے ہیں۔“

”اب درزی کے پاس بھی جانا پڑے گا۔“

”نہیں خان۔۔۔ یہی سلوا کر بھی دیں گے۔ باپ میں لے آئی ہوں۔“

”بھئی۔۔۔ یہ کام تو خود ہی کرو۔۔۔ میں عادی نہیں ایسی خرید و فروخت کا۔“

نواز خان دکان سے باہر نکل گئے۔ بازار میں انہیں دو تین واقف کار مل گئے۔ وہ ان سے

باتیں کرنے لگے۔

ریشمینے نے پردے خرید کر سلنے کے لئے بھی دیئے..... درزی کو پردوں کی لمبائی چوڑائی کا لکھا ہوا ماپ دے کر ڈیزائن وغیرہ کے متعلق سمجھا دیا.....

پھر اس نے دوسری دکانوں سے بھی کچھ چیزیں خریدیں.....

خدمت گاریں پیکٹ بنڈل لفافے اٹھائے گاڑی کی طرف آگئیں۔

اب فرنیچر کا آرڈر کرنا تھا..... سمندر خان انہیں صدر بازار کی فرنیچر والی دکانوں کی طرف لے گیا..... جہاں گھوم پھر کر فرنیچر دیکھا گیا..... بنانا یا فرنیچر ریشمینے کو پسند نہیں آیا اس لئے ڈیزائن بک سے دیکھ کر اس نے اپنے بیڈ روم کی مناسبت سے بہت خوبصورت اور نفیس فرنیچر بننے کا آرڈر کیا.....

وہ بہت خوش خوش واپس آئی..... کتنی مدت بعد اسے اپنی من پسند شاپنگ کرنے کا موقع ملا تھا..... نواز خان کے لئے بیوی کے ساتھ شاپنگ کرنے کا پہلا موقع تھا۔ وہ خاصے بیزار تھے..... ریشمینے سے بولے ”آئندہ مجھ سے یہ سب نہیں ہو گا“

ریشمینے کا دل دھک دھک کرنے لگا..... ڈر سی گئی حیرانگی سے ان کا منہ تھکنے لگی..... ”خود ہی کیا کرو یہ کام..... اتنا وقت میں ضائع نہیں کر سکتا.....“ نواز خان نے ریشمینے سے مسکرا کر کہا۔ تو ریشمینے نے اطمینان کا گہرا سانس لیا.....

وہ گھر کی سجاوٹ بناوٹ میں منہمک ہو گئی..... ابھی بہت کام کرنا تھا..... وہ گھر کی نوک پلک اپنی پسند کے مطابق سنوارنے لگی اب بازار بھی جانا ہوتا تو نواز خان سے اجازت لے کر نوکروں کے ساتھ چلی جاتی۔

چھٹی کے دن نواز خان اور ریشمینے گاؤں گئے..... پورا دن وہاں گزارا..... ایک ہفتے ہی میں سب ایک دوسرے سے ادا ہو گئے تھے.....

اگلے ہفتے وہ ان لوگوں کو شہر آنے کی دعوت دے آئے.....

یوں گاؤں میں بھی آنا جانا لگا رہا..... اور گاؤں والے بھی شہر آتے جاتے رہے۔ ریشمینے کی جی سبائی کو بھی تھکنے کو بہت پسند آئی..... گاؤں میں اب بجلی آگئی تھی۔ اس لئے تھکنے نے بھی الیکٹرک کی بہت سی چیزیں صبور خان سے کہہ کر منگوائیں۔

ریشمینے اور نواز پشاور میں رہنے لگے تھے..... بہت بڑی آرامتہ پیراستہ کوٹھی تھی..... طرز زندگی کسی حد تک بدل گیا تھا۔ یہاں لمبے فرش نشست والے دالان کی بجائے نرم و گداز صوفوں سے آراستہ ڈرائنگ روم تھا..... کھانا بھی ڈرائنگ ٹیبل پر کھایا جاتا تھا۔ قالین پر دسترخوان بچھا کر کھانا نہیں کھایا جاتا تھا..... لباس بھی تراش خراش میں بدل گئے تھے..... ریشمینے اب پشوا نما گھیرا دار کرتا نہیں پہنتی تھی نہ ہی تنگ موری کی چٹنوں والی بھاری شلوار زیب تن ہوتی..... گھر میں چادر کی جگہ ہلکے پھلکے دوپٹے لے لی تھی۔

لیکن

بہت کچھ بدلنے کے باوجود بہت کچھ نہیں بھی بدلا تھا..... نواز خان کا مزاج وہی حاکمانہ تھا۔ اپنے بزرگوں کے ریت رواج سے منحرف ہونا نہیں سیکھا تھا..... غصہ ویسا ہی تیز تھا۔ مزاج میں اکھڑنے کے ساتھ سختی بھی آتی جاتی تھی۔ وہ تو بابا سے بھی زیادہ دبدبے اور رعب داب کے حامل لگتے تھے..... گھر میں ان کی مکمل حکمرانی تھی..... ہر چیز پانے کے باوجود ریشمینے کو دم مارنے کی مجال نہ تھی.....

شروع ہی کے دنوں کی بات تھی..... ریشمینے کی بی بی گل اور آغا بی بی کا گھر دیکھنے آئے تھے..... ڈھیر ساری چیزیں کپڑے پھول اور مٹھائی لے کر آئے تھے..... سارا دن ہنسی خوشی گزرا..... پچھلے پہر تہکال جانے سے پہلے ریشمینے کی امی بی بی گل نے بازار سے کچھ چیزیں لینا تھیں..... ریشمینے کو بھی تھوڑی سی خریداری کرنا تھی..... آغا بی تو گھر پہ ہی رہے ریشمینے اور بی بی گل بازار چلی گئیں.....

نواز خان گھر پہ آئے تو پتہ چلا ماں بیٹی شاپنگ کے لئے گئی ہیں..... ریشمینے کا ہاتھ پتہ شاپنگ کے لئے جانا نہیں گوارہ نہ ہوا..... ماتھے پر ہل پڑ گئے..... زبان سے تو کچھ نہیں کہاں ہاں آغا بی نے بھانپ لیا..... مصلحتاً انہوں نے بھی خاموشی اختیار کی۔ نواز خان پھر فیکٹری چلے گئے۔

اس رات وہ دیر سے گھر آئے بی بی گل اور آغا بی واپس جا چکے تھے..... آغا بی نے

ریشمینے سے یہ ضرور کہا تھا ”بیٹی تم نواز خان سے پوچھ کر بازار گئی تھیں۔۔۔۔۔“
 ”کیوں آغا جی۔۔۔۔۔ کوئی بات ہوئی“ وہ گھبرا کر بولی۔

”ہوئی تو نہیں۔ لیکن ہوگی ضرور۔۔۔۔۔“
 ”کیا مطلب آغا جی۔۔۔۔۔“

”نواز خان کو برا لگا ہے۔ خیر وہ کچھ کے غصہ کرے تو خاموش ہی رہنا۔ تمہیں اب تک اپنے شوہر کی عادات کا پتہ چل جانا چاہئے تھا۔۔۔۔۔“
 ریشمینے فکر مند ہو گئی۔ نواز آغا جی اور بی بی گل کو خدا حافظ کہنے بھی نہیں آئے تھے۔
 ریشمینے سمجھ گئی تھی۔۔۔۔۔ کہ مزاج برہم ہے۔

رات وہ دیر سے گھر آئے تو ریشمینے ان کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ لیکن نواز اسے نظر انداز کرتے ہوئے سیدھے کمرے میں چلے گئے۔ ان کی خفگی عیاں تھی۔۔۔۔۔
 وہ بیحد خوف زدہ تھی۔۔۔۔۔ سہمی سہمی ڈرتی ڈرتی کمرے میں آئی۔ نواز خان بیڈ کی پٹی پر بیٹھے بوٹوں کے تے کھول رہے تھے۔

ریشمینے آگے بڑھی۔۔۔۔۔ نواز خان کے بوٹ خود اتارنے چاہے۔ لیکن نواز خان نے اک جھٹکے سے پاؤں کھینچا۔۔۔۔۔
 ”رہنے دو۔۔۔۔۔“

وہ چند لمحے چپ رہی۔ پھر روہانسی آواز میں بولی ”معاف کر دیں خان گل۔۔۔۔۔ میں آئندہ آپ کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر قدم بھی نہیں رکھوں گی۔۔۔۔۔“
 ”تمہیں رکھنے بھی دے گا کوئی باہر قدم۔۔۔۔۔“ نواز خان دھاڑے۔۔۔۔۔ ریشمینے ڈر کر رونے لگی۔

”یاد رکھنا ریشمینے۔۔۔۔۔ میں تمہیں شہر ضرور لے آیا ہوں۔ لیکن اپنے ماحول اپنے دستور اپنے طور طریقوں سے الگ ہوتا مجھے پسند نہیں ہے۔۔۔۔۔ تم یہاں شاید مجھے اپنے پڑھے لکھے اور آزاد ہونے کا احساس دلانا چاہتی ہو۔ لیکن ایسا۔۔۔۔۔“

”نہیں خان جی۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔“ وہ بے اختیار ہو کر رونے لگی۔ بار بار معافی مانگی۔۔۔۔۔ نواز خان پھرے ہوئے تھے۔ اس نے اس کے ماں باپ کو بھی برا بھلا کہا۔ آغا جی اور بی بی گل کو مور و الزام ٹھہرایا۔ انہوں نے ہی ریشمینے کو شہہ دی تھی اور وہ ان کی پرواہ کئے بغیر بازار چلی گئی تھی۔ فون پر ہی اجازت مانگ لی ہوتی۔

کئی دن نواز خان کا موڈ بگڑا رہا۔۔۔۔۔ ریشمینے سے سیدھے منہ بات نہ کی۔۔۔۔۔ شہباز کو بھی گود میں نہیں لیا۔۔۔۔۔

ریشمینے کی یہ پہلی اور آخری خطا تھی۔۔۔۔۔ وہ نواز خان سے پہلے بہت ڈرتی تھی اس واقعے نے تو یہی سہی کسر بھی نکال دی۔۔۔۔۔ نواز خان نارمل ہو گئے تب بھی وہ ان سے سہمی رہتی۔ ان کی اجازت کے بغیر تو جیسے قدم اٹھانا بھی گناہ لگنے لگا تھا۔۔۔۔۔ نواز خان کی دھاک تو اس پر بیٹھ گئی۔

لیکن گھر کا ماحول کچھ ٹھنک رہا تھا۔۔۔۔۔ وہ خوشگوار سی چکار نہ رہی۔ جس کی متلاشی ریشمینے شادی کے بعد تھی۔ اور جو چند دن اسے یہاں میسر آئی تھی۔

لیکن وہ سمجھتا رہی تھی۔ اپنا مقام تو بچا پاتی تھی۔ اب تو جیسے مقدر بھی جان گئی تھی اس نے اپنا من مار لیا تھا۔۔۔۔۔ شوہر کے اشاروں پر ناپنے والی کٹہ پتلی بن گئی تھی۔ اس نے میس جینا نہیں مرنے تھا۔۔۔۔۔ تو پھر اپنا آپ کیسا۔ انسان جب مٹ جائے تقسیم ہو جائے تو اپنا آپ رہتا ہی کہاں ہے۔ وہ بھی شوہر بچے اور گھر میں بٹ گئی تھی تقسیم ہو گئی تھی۔ ریشمینے نہیں رہی تھی۔ بیوی بن گئی تھی۔ ماں بن چکی تھی۔

ویسے نواز خان برے انسان نہیں تھے۔ وہ اچھے شوہر اور مشفق باپ تھے۔ بیوی اور بچے کی ضروریات کا خود خیال رکھتے تھے۔ ریشمینے کے لئے دنیا جہاں کی چیزیں اکٹھی کر رکھی تھیں۔ وہ خود جو چیز چاہتی تھی۔ منگوادیتے تھے۔ شاپنگ پر بھی کڑی پابندی نہ تھی۔ ان کی اجازت سے من مانی چیزیں خریدنے جاسکتی تھی۔ وہ تو ریشمینے نے خود ہی اپنے آپ کو حصار میں مقید کر لیا تھا۔ بہت کم باہر نکلتی تھی۔

اس دن تمکینے شہر آئی تھی۔ زر گل اور اس کی ترور تاج برو بھی ساتھ تھی۔ ریشمینے نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی تھی۔ دوپہر کھانے کے بعد دونوں گپ شپ لگانے کمرے میں آ بیٹھی تھیں۔۔۔۔۔ شہباز سو گیا تھا اور زر گل تاج برو کے ساتھ باہر چمن میں کھیل رہا تھا۔

”بھابی آج آپ یہیں رہیں گی“ ریشمینے نے ڈرائی فروٹ کی ٹرے تمکینے کے سامنے رکھ دی

”نہیں بھئی شام کو واپس جانا ہے۔ آغا بی بی اکیلی ہیں۔ اور خان بابا کی طبیعت بھی کچھ اچھی نہیں۔۔۔۔۔“

”خان بابا کی طبیعت اکثر ہی خراب رہتی ہے۔ میرے خیال میں ہم انہیں یہاں لے آئیں اور کسی اچھے ڈاکٹر سے چیک اپ کروائیں۔۔۔۔۔“

”کوئی فرق نہیں پڑتا بھابی..... ہر خواہش تو نواز پوری کر دیتے ہیں.....“
 تمکینے کو یہ بات پسند نہ آئی..... منہ بنا کر بولی ”میں نواز کے کان کھینچوں گی آتو لے.....“
 ریشمینے گھبرا کر جلدی سے بولی ”نہیں بھابی..... کچھ نہیں کہنا..... وہ سمجھیں گے میں نے
 ان کی شکایت آپ سے کی ہے..... الٹا مجھ پر برسیں گے..... میں ٹھیک ٹھاک رہ رہی ہوں..... اپنے آپ کو ان کی
 مرضی کے مطابق ڈھال رہی ہوں..... مجھے کوئی شکایت نہیں۔ کچھ برا نہیں لگتا..... ان کی خوشی میری خوشی
 ہے.....“

”تم تو لگتا ہے کھاتی پتی اوڑھتی پہنتی انٹھی بیٹھتی بھی اسی کی مرضی کے مطابق ہو.....“ تمکینے

بولی۔

”تو برا کیا ہے بھابی“ ریشمینے گہری سانس لے کر مسکرا دی..... ”جو حکم حاکم کا

چلے.....“

تمکینے نے گھور کر اسے دیکھا..... پھر وہ بھی مسکرائے لگی.....

”آغا بی بی“

”جی پچیا.....“

”آغا بی بی..... بڑی دیر ہوئی ہے..... کوئی خوشی نہیں منائی..... ہلا گلا نہیں ہوئی گھر میں..... جی
 چاہتا ہے..... کوئی قریب منعقد کریں..... سب اکٹھے ہوں..... سچی بہت جی چاہتا ہے.....“
 ”خدا کوئی خوشی دے گا..... تمہاری گود جیتے جاگتے بچے سے آباد ہوگی..... توجی کھول کر خوشی

منائیں گے قربان جاؤں..... خدا خیر کا وقت لائے.....“

تمکینے ہنس کر بولی ”مجھ سے پہلے تو ریشمینے کی گود آباد ہوگی آغا بی بی.....“

”خدا اس پر بھی اپنا سایہ رحمت رکھے..... تم دونوں کو اللہ زندگانی والے بچے عطا فرمائے“

”بچے نہیں آغا بی بی جانے..... پچیاں.....“ وہ ہنس پڑی..... ”نواز خان کو تو ضروری بچی

چاہئے..... اسے تو شہباز خان کی جگہ بھی بچی چاہئے تھی..... اور اب..... صبور خان کو بھی بھائی کی دیکھا دیکھی بیٹی کی

خواہش ہونے لگی ہے.....“

”جو بھی اللہ دے..... اس کی عنایت ہے.....“

”ویسے آغا بی بی.....“

”ہوں“

”مجھے بھی بیٹی اچھی لگتی ہے..... دعا کریں ہم دونوں کے بیٹیاں ہی ہوں.....“

”اللہ تمہاری خواہش پوری کرے.....“

”بیٹی ہوئی تو پھر..... جشن تو نہیں منایا جائے گا.....“

”آغا بی بی ہنس دیں.....“ ”تم جشن منانا چاہتی ہو.....“

”بس یونہی..... جی چاہتا تھا کچھ ہلا گلا ہو..... ریشمینے نے شہباز کی سالگرہ کی تقریب کی تھی
تا..... کتنا مزہ آیا تھا..... سارا خاندان اکٹھا ہوا تھا.....“

”تم بھی زر گل بچے کی سالگرہ کرو..... خوشی ہی کرنا ہے نا.....“

”پہلے تو کبھی کی نہیں.....“

”کیا ہوا.....“

”نہیں آغا بی بی..... یہ سالگرہ والگرہ شروالے ہی کرتے ہیں.....“

”ہم پر کوئی پابندی ہے.....“

”یہ بات نہیں.....“

”پھر.....“

”اچھا نہیں لگتا..... فحالی لگے گی“

آغا بی بی پھر مسکرا دیں..... تمکینے ان کے قریب ہی گدے پر گاؤ تکتے سے ٹیک لگائے بیٹھی

تھی.....

ریشمینے کے شہر جانے سے تمکینے کو ایک نقصان ہوا تھا..... کہ وہ ایک اچھی اور مخلص
دوست سے محروم ہو گئی تھی..... وہ یہاں تھی تو وقت گزرتے پتہ بھی نہیں چلتا تھا..... سارا دن گپ شپ
رہتی..... اب تمکینے بور ہو جاتی تھی..... کام کاج کرنے کو ہوتا نہیں تھا..... بیسویوں نوکرانیاں نوکرتے..... بچے
کی ساری ذمہ داری تاج برو پر تھی..... صورت خان تڑکے گھر سے لگتے تو زمینوں اور حجرے تک ہی محدود ہو جاتے
رات گئے واپس لوٹتے..... ان دنوں خان بابا کی طبیعت خراب رہتی تھی..... ان کی ذمہ داریاں بھی صورت خان کے
ذمہ تھیں..... لوگوں کے مسائل پنپانے پڑتے تھے..... ان کی خوشیوں غمیوں میں شریک ہونا پڑتا تھا..... یوں وہ
بے طرح مصروف ہو گئے تھے.....

تمکینے اور آغا بی بی ہی اب وہ سکھ کی ساتھی تھیں..... لیکن عمروں کا قفاوت..... کہاں تک
ساتھ خوشگوار کے احساس سے بوجھل رہ سکتا تھا..... پھر آغا بی بی کی بھی اپنی مصروفیات تھیں..... حویلی کے اندران
کا حکم حکمرانی تھی..... سارا انتظام انہی کے ہاتھ میں تھا..... نوکر نوکرانیوں کی ذمہ داریوں سے لے کر رشتہ داروں
سے ملنے ملانے اور مسائل سے پنپنے کے لئے وہی تھیں.....

آج بھی گھنٹہ بھر حویلی کے عقب میں بنے نوکر گھروں میں گزار کر آئی تھیں..... صدمانے کی ہو
بیمار تھی..... اس کی احوال پرسی کی تھی..... اس کے علاج کی باتیں کی تھیں..... ڈاکٹر کے پاس بھجوا یا تھا.....

ابن جان اب کافی عمر رسیدہ تھی..... اس کے پاس بیٹھی رہی تھیں..... اس کی جگہ اب اس کی

بڑی بہو حویلی میں کام کرتی تھی..... ابی جان کو حج پہ جانے کی لگن تھی..... آغا بی بی نے اسے حج پر بھجوانے کا وعدہ کیا
تھا.....

نوبت خان کے چھوٹے بیٹے کو سکول میں داخل کروانے کی بھی انہوں نے اس کی بیوی کو صلاح

دی تھی.....

کچھ خدمت گاروں کے بچے وہ پہلے بھی گاؤں کے پرائمری سکول میں پڑھنے کے لئے بھجواتی

تھیں.....

آغا بی بی کو تو ایسی بے شمار مصروفیات تھیں..... لیکن تمکینے پر بہو ہونے کے ناطے تاحال کوئی

بوجھ نہ تھا.....

وہ تو کبھی باورچی خانے میں بھی جاتی تو آغا بی بی پیار سے اس کی پیشانی چوم کر کہتی ”چچا..... میں

جو ہوں..... تمہیں ان خجاولوں میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے..... ابھی عمر بڑی ہے..... تمہیں ہی ذمہ داریاں

سونپوں گی..... فی الحال تو میں ہوں نا..... تم جاؤ..... آرام کرو.....“

تمکینے آرام کر کر کے موٹی ہوتی جا رہی تھی..... ویسے بھی امید سے تھی..... خوراک کا بھی

خاص خیال رکھا جا رہا تھا..... جسم بآرام بہ فرہی تھا..... سارا دن وہ لیٹی ہی رہتی..... پڑھنے کا سے کچھ خاص شوق

نہیں تھا..... ریشمینے کے بھیجے ہوئے رسالے وہ زیادہ شوق سے نہیں پڑھتی تھی..... ہاں ریڈیو جب سے گھر

میں آیا تھا..... وہ سننا اچھا لگتا تھا..... ایک شوق باغبانی ضرور تھا..... صبح وہ کھدائیوں میں کچھ دیر ضرور اپنے آپ کو

مصروف رکھتی..... صحن میں رنگارنگ پھولوں کی بھاری سی وجہ سے تھی.....

”ہاں تو آغا بی بی“ اس نے پاس بیٹھی آغا بی بی کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی بچے.....“

”کوئی ہلا گلا کریں!“

”کیا کرنا چاہتی ہو..... تمہاری ہر خوشی ہمارے لئے خوشی کا باعث ہے بچے.....“

”سالگرہ نہیں کروں گی..... یہ ہمارے دستور کے مطابق نہیں ہے نا.....“

”تو پھر.....“

”زر گل نے پہلا سیپارہ دو ایک دن میں ختم کرنا ہے۔ اس کی خوشی نہ کر لیں.....“

”ضرور ضرور..... یہ تو ہے بھی خوشی کی بات..... بہت مبارک ہے..... میرا بچہ ماشاء اللہ

بہت ذہین ہے..... دوسری جماعت میں بھی چلا گیا ہے اور سیپارہ بھی ختم کرنے والا ہے“

”تو پھر کریں بندوبست دعوت کا.....“

”ضروری بی..... ضرور.....“

”سارا خاندان اکٹھا کریں گے“

”تمہاری خوشی.....“

”ریشمینے کو تو دو تین دن یہاں رکھوں گی..... کشمالے اور جیتی کو بھی.....“

آغا بی بی ہنس کر بولیں ”اکیلی اداس ہو جاتی ہے میری بچی..... خدا کرے گا وہ اسی دور ہو جائے گی..... بچہ گود میں آجائے گا تو مصروف ہو جاؤ گی.....“

”آغا بی بی..... مجھے بڑا ڈر لگتا ہے..... پچھلی بار.....“

”خدا رحم کرے گا..... اس دفعہ اسی لئے تو کہتی ہوں احتیاط بہت ضروری ہے..... فکر نہ کیا کرو

اللہ مالک ہے.....“

دونوں کچھ دیر یہی باتیں کرتی رہیں..... پھر آغا بی بی اٹھنے لگیں.....

”کہاں جا رہی ہیں..... تمہارے بچے نے پوچھا.....“

”تمہارے خان بابا کا پتہ کرواؤں..... شر سے آئے ہیں کہ نہیں.....“

”نواز خان کہہ رہے تھے انہیں دو تین دن وہیں رکھیں گے..... جاتے جاتے کہہ گئے تھے“

تمہارے بچے نے کہا.....

”اچھا؟“ آغا بی بی پھر کتنے کے سہارے بیٹھ گئیں.....

”جی آغا بی بی..... وہ ان کا چیک اپ کروائیں گے..... بابا کی طبیعت اکثر ہی خراب رہنے لگی ہے

اب تو.....“

”ہاں..... کبھی پیٹ خراب ہو جاتا ہے..... کبھی کھانسی زکام..... بخار بھی اکثر ہی ہو جاتا

ہے“

”صحت کتنی گرتی جا رہی ہے..... اب تو چاک و چوبند بھی نہیں رہتے.....“

”ہاں کتنے ہیں چلنے پھرنے سے بھی تھکاوٹ محسوس ہوتی ہے“

”اچھا ہے خان گل کسی ایسے ڈاکٹر کو دکھا دیں..... علاج ٹھیک طرح سے ہو گا تو انشاء اللہ جلد

اچھے ہو جائیں گے“

”بظاہر بیماری تو کوئی نہیں..... ہاں گرمی بہت ہے..... اب ان سے گرمی برداشت نہیں

ہوتی.....“

”آغا بی بی.....“

”جی“

”آغا بی بی وہ جو نواز خان نے اپنے ایک کمرے کو ٹھنڈا رکھنے کے لئے خس خس کی ٹٹیاں اور

پتکھا لگوا یا ہے ناہم بھی نہ لگوائیں..... خس خس پر پانی پڑتا ہے تو پتکھا ٹھنڈی ہوا کرے میں پھینکتا ہے..... پچھلے ہفتے

میں وہاں گئی تھی نا..... یقین کریں باہر سخت گرمی تھی..... لیکن کمرے میں خشکی محسوس ہوتی تھی..... میں تو چادر پلیٹ

کر لیتی تھی.....“

”صبر خان سے کہوں گی..... ایک کمرے میں لگوا ہی لے..... دپہر تو آرام سے گزرا کرے

گی“

”خاص کر بابا کے لئے.....“

”ہاں اب وہ پہلے کی طرح گرمیاں درختوں کی چھاؤں اور چشموں کے کنارے نہیں گزار سکتے

اب تو دریا پر سیر و تفریح کے لئے بھی نہیں جاتے..... پچھلے ہفتے صبر خان اور اس کے بہت سارے دوستوں نے سیر

ڈالی تھی..... لیکن تمہارے بابا نہیں گئے.....“

”گرمی کی وجہ سے؟“

”ہاں.....“

”شہروں میں گرمی سے بچنے کی چیزیں نکل آئی ہیں..... اب یہ کپڑے ہی دیکھیں.....

ریشمینے نے وائل کے یہ جوڑے سلوا کر بھیجے ہیں کتنے ہلکے پھلکے ہیں..... ہائے سکون ملتا ہے پن کر..... آغا

بی بی آپ بھی کم از کم گرمیوں میں ایسے ہی لباس پہنا کریں..... سیدھے سادے کرتے اور ہلکی پھلکی

شلواریں..... یہ جو آپ نے پٹو از پن رکھا ہے نا..... جتنا کپڑا اس پر لگاہے اس میں کم از کم تین جوڑے ایسے نکل

آتے ہیں.....“ اس نے اپنے وائل کے سوٹ کی طرف اشارہ کیا..... آغا بی بی مسکرائے لگیں.....

”یہ پہنا وہ اب گاؤں میں بھی رواج پکڑتا جا رہا ہے“ آغا بی بی نے اپنی چادر سر کے پیچھے ڈالتے

ہوئے تمہارے لباس کو دیکھا.....

”اچھا تو ہے..... کم خرچ بالائین..... میں تو اب سردیوں میں بھی ایسے ہی کپڑے سلواؤں گی“ آغا

بی بی نے سر ہلایا.....

تمہارے کتنے سے ٹیک لگائے لگائے پہلو بدلتے ہوئے بولی ”آغا بی بی میری ایک بات مانیں

تو.....“

”کیا ہے“

”یہ خدمت گاریں جو ہیں نا..... ان کے لئے بھی ایسی فیضیں اور شلواریں بنوایا کریں.....“

آسانی سے دھو کر بدل تو لیا کریں..... مینوں تو وہ دھوتی نہیں ہیں کپڑے..... اتنے بھاری جو ہوتے ہیں..... کم از کم صاف ستھری تور ہا کریں گی”

”کتنی ٹوٹھیک ہو..... لیکن یہ لوگ عادی ہوتے ہیں“

”ان کی عادتیں سنواری جاسکتی ہیں..... سردیوں میں تو خیر بھاری پسنائے پہنتی ہی ہیں گرمیوں میں تو ایسے لباس پہنا کریں..... جو ہفتے میں ایک دو بار دھو لیا کریں.....“

دونوں شری اور دیراتی پسنائے کی باتیں کرنے لگیں.....

آغابی بی ہنس کر بولیں ”ریشمینے کی دیکھا دیکھی تمہیں بھی شری آداب و تہذیب بھاگے ہیں“

”نہیں آغابی بی..... سارے آداب نہیں۔ بس کچھ باتیں اچھی ہیں..... اور انہیں اپنانے میں کوئی ہرج بھی نہیں.....“

”یہ تو ہے“

دونوں ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف تھیں..... کہ خدمت گار چائے کا پوچھنے آگئی۔

”ہیں لے آؤ.....“ آغابی بی نے کہا۔

”خان جی بھی آئے ہیں.....“

”کون مصور خان“

”ہاں جی.....“

”آج اس وقت کیسے آگئے“ تمکینے نے خود کلامی کے انداز میں کہا.....

”ان کے لئے بھی لے آؤ بیس..... ادھر ہی آجائیں وہ بھی چائے.....“ آغابی بی کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی مصور خان دالان میں آگئے..... پسینے سے کپڑے بھیگر رہے تھے..... چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا..... قراقی ٹوپی ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی.....

”آؤ بیجے..... ادھر آؤ پکھنے کے نیچے بیٹھو.....“ آغابی بی نے کہا۔

”آپ تو پسینے سے شرابور ہو رہے ہیں.....“ تمکینے نے ان کے ہاتھ سے ٹوپی لے کر کونے میں پڑی تپائی پر رکھ دی..... مصور خان نے کندھے سے کار تو سوں والی چٹنی اتار کر بھی تمکینے کو دی..... ہولسٹر میں لٹکا پتوئل تمکینے نے چھو کر دیکھا اور اٹھ کر چٹنی دیوار کے ساتھ لگی کھوٹی پر لٹکا دی..... مصور خان نے فیض کے شکن کھول دیئے اور ماں کے قریب بٹکنے پر سر رکھ کر نیم دراز ہو گئے.....

”کہاں سے آرہے ہو..... اتنی دیر ہو.....“

”آغابی بی..... وہی قتل والا معاملہ.....“

”چکنی گئے ہوئے تھے.....“

”ہاں.....“

”کیا بنا.....“

”وہ لوگ زمین لئے بغیر صلح کرنے پر آمادہ نہیں.....“

”خان بابا سے مشورہ کر لو.....“

”یہ تیسرا قتل ہے.....“

”توبہ..... توبہ..... کب عقل آئے گی ان لوگوں کو.....“

”جہالت ہے آغابی بی.....“

خدمت گار چائے لے کر آگئی..... ٹرے میں چینی کی پیالیاں اور چائے دانی رکھی تھی..... چینی دان اور دودھ دان بھی تھا..... وہ پلیٹوں میں تمکین قلعچے اور پیٹھے خرے بھی رکھے تھے.....

تمکینے نے ٹرے اپنے سامنے کر لی..... خدمت گار کو اس نے واپس بھیج دیا.....

تمکینے نے آغابی بی اور مصور خان کو چائے بنا کر دی..... قلعچے اور خرے کی پلیٹیں ان کے سامنے رکھ دیں پھر اپنی چائے بھی بنا لی.....

”زر گل کہاں ہے“ مصور خان نے پکھنے تلے سکون محسوس کرتے ہوئے پوچھا.....

”جان صاحب آئے ہوئے ہیں سیپارہ پڑھ رہا ہے.....“

”اچھا“

”جی ہاں.....“ تمکینے اتر کر بولی..... ”اور جناب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اس

کے سیپارہ ختم کرنے کی خوشی میں بہت بڑی تقریب ہو رہی ہے کیوں آغابی بی ٹھیک؟“

”بالکل بالکل.....“ آغابی بی نے پیالی ہونٹوں سے لگائی۔

”کر لیں نا..... خان جی“

”مجھ سے کیا پوچھتی ہو..... آغابی بی جانیں اور تم.....“ مصور خان نے قلعچہ اٹھا کر منہ میں ڈالا.....

”سب کو اکٹھا کروں گی..... ان شروالوں کو تو تین چار دن یہاں رکھوں گی..... ہاتھ لگانے

آتے ہیں بس..... ادھر آئے ادھر گئے..... فرصت ہی نہیں ہوتی ان کے پاس.....“ تمکینے پیار بھرے شکی

انداز میں بولی۔

”نواز خان نے کچھ زیادہ ہی ذمہ داریاں اپنے سر ڈال لی ہیں..... فرصت ہی نہیں ملتی اسے بہت کام کرتا ہے.....“

”دولت بھی تو بہت کملا رہا ہے“ آغا بی بی نے آدھا شیر خرمدہ توڑا..... ”ماشاء اللہ.....“
 ”خدا کا فضل ہے آغا بی بی..... دولت کی پہلے کون سی کی تھی..... میں تو ڈرتا ہوں اتنا کام کرنے سے کہیں صحت خراب نہ ہو جائے اس کی..... اچھا ہے تقریب کریں آپ لوگ..... میں بھی چاہتا ہوں نواز خان چند دنوں کے لئے یہاں آکر آرام کرنے..... شکار کا پروگرام بنا رہے ہیں ہم لوگ..... اسے بھی میں نے مدعو کرنا تھا..... اب اس تقریب میں شرکت کے لئے آئے گا..... تو.....“
 ”اتفاق نکال لیں گے وہ.....“

”شکار کا سیما ہے..... ضرور نکالے گا.....“

باتیں ہوتی رہیں..... چائے کی دو دو پیالیاں سب نے پی لیں..... تھکنے نے خالی برتن ٹرے میں اوپر تلے رکھ کر ٹرے ایک طرف کر دی.....
 تقریب منعقد کرنے کا پروگرام بن گیا..... تھکنے نے جن جن لوگوں کو مدعو کرنا تھا انہیں انگلیوں پر گنتے لگی.....

صبر خان اور آغا بی بی کچھ ضروری مسائل پر بات چیت کرنے لگے.....

”مبارک ہو بیٹے۔ خدا نے تمہاری خواہش پوری کر دی“ آغا بی بی نے نواز خان سے کہا جو ہوسپتیل کے لیے برآمدے کو تیز تیز قدموں سے عبور کرتے انہی کی طرف چلے آ رہے تھے۔
 ”جج..... جج آغا بی بی.....“ نواز خان نے ماں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹا بنہ خوشی سے کہا۔

”ہاں..... بیٹی ہوئی ہے.....“ آغا بی بی نے مسکرا کر سر ہلایا.....
 ”اوہ آغا بی بی جانے.....“ وہ خوشی سے جیسے جج اٹھے..... آغا بی بی نے ان کے کندھے پر تھپکی

دی۔

”مبارک مبارک خان جی مبارک“ آغا بی بی کے ساتھ آئی خدمت گار قریب آتے ہوئے بولی۔ ”لوکی ہوئی ہے“
 نواز خان نے جیب میں ہاتھ ڈالا..... اور جتنے پیسے مٹھی میں بھر سکے نکال کر شہزادگی کی طرف مسکراتے ہوئے بڑھا دیئے۔

”مہربانی خان جی مہربانی.....“ وہ خوشی سے چمک اٹھی..... ”خدا زندگانی دے“
 نواز خان نے ہولسٹر میں لٹکے پستول پر ہاتھ مارتے ہوئے آغا بی بی کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولے ”میں اپنی بے پناہ خوشی میں فائر کروں آغا بی بی.....“
 آغا بی بی نے مسکرا کر سر نفی میں ہلایا.....
 ”کیوں“
 ”بیٹیوں کے لئے کوئی فائر نہیں کرتا.....“

”یہی تو غلط روایت ہے ہماری۔ میں تو ضرور کروں گا۔ خدا نے میری دلی مراد پوری کی ہے۔ مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے تھیں سکتا۔“

”یہ خوشی خدا تمہیں مبارک کرے۔“

”خوشی کے موقع پر ہم لوگ فائز کرتے ہیں نا۔“

”نہیں بیٹے اس موقع پر نہیں۔ اور جتنی چاہے خوشیاں منانا۔“

وہ ہنس کر بولے ”آغا بی بی۔ گھر جا کر ضرور کروں گا۔ کسی بہانے سی۔“

”مان لیتے ہیں بڑوں کی بات۔“

”اوں۔“ نواز خان نے چھوٹے بچے کی طرح منہ بنا کر ماں کے گلے میں بائیں ڈال دیں۔ آغا بی بی نے ان کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ ”بڑے موقعے ہیں فائز کرنے کے۔ فی الحال تو تم اس پستول کو بھول جاؤ۔ اور کمرے میں چل کر بیٹھو۔ ریشمینے کو تھوڑی دیر تک کمرے میں پنچا دیا جائے گا۔“

”بچی کیسی ہے۔“

”بہت پیاری۔۔۔۔۔ یہ گول منوں سی۔“ شہزاد گئی جھٹ سے بولی۔

”ماشاء اللہ بہت خوبصورت ہے۔“ آغا بی بی نے کہا۔

”ریشمینے ٹھیک ہے نا۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے۔“

نواز خان نے دونوں ہاتھ پھیلا کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”خدا یا تیرا شکر ہے۔“

پھر وہ مڑے اور زبرد آمدہ عبور کر کے دوسری طرف چلے گئے۔ ریشمینے کو اسی طرف لے جایا جاتا تھا۔ کمرہ کل ہی بک کر والیا گیا تھا۔

ریشمینے کو کوئی پون گھنٹے کے بعد کمرے میں لایا گیا۔ اس پر غنودگی طاری تھی۔ ساری رات جاگ کر کئی تھی۔ اب اس پر نیند کا غلبہ ہو رہا تھا۔ بچی کو خوبصورت کبل میں لپیٹے زس اٹھائے ہوئے تھی۔

کمرے میں آتے ہی نواز خان نے بچی کو ہاتھوں پر اٹھالیا۔ واقعی بچی بیحد خوبصورت تھی۔ وہ چند لمبے حیرت زدہ خوشی سے بچی کو تکتے رہے۔ پھر آغا بی بی کی بھولی میں ڈال کر بیڈ کی طرف متوجہ ہوئے۔ جہاں نرسوں نے ریشمینے کو لٹا دیا تھا۔

”ریشمینے۔۔۔۔۔ ٹھیک ہونا۔۔۔۔۔“ نواز خان لوہے کے پلنگ کے تکتے پر بازو رکھتے ہوئے قدرے جھکے اور ہونٹوں پر مسکاتی ہنسی سیٹنے کی کوشش میں بولے ”خدا نے ہماری خواہش پوری کر دی۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ وہ غنودگی میں بولی۔

”بیحد پیاری ہے۔ بہت خوبصورت ہے۔“

”ہوں۔۔۔۔۔“ ریشمینے نیند سے بوجھل آواز میں بولی۔ نرس پاس ہی کھڑی تھی جلدی سے بولی ”خان صاحب بیگم صاحبہ کو نیند آرہی ہے۔ سونے دیجئے۔ رست ان کے لئے بہت ضروری ہے۔۔۔۔۔“

”سو جاؤ۔۔۔۔۔ سو جاؤ۔“ نواز خان نے ہاتھ ریشمینے کے ریشمی بالوں میں پھیرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ بیڈ سے ہٹ کر آغا بی بی کی طرف آگئے۔ جن کی بھولی میں بچی پڑی تھی۔ اور شہزاد گئی ان کے قدموں میں بیٹھی پیار سے بچی کو تنک رہی تھی۔ شہزاد گئی کے ذمہ بچی کی دیکھ بھال تھی۔ آغا بی بی نے ہی اس کا انتخاب کیا تھا۔ شہزاد گئی کا شوہر طور سم نواز خان کا ڈرائیور تھا۔ شہزاد گئی سمجھدار عورت تھی۔ اپنے دو بچے تھے۔ جو بڑے ہو چکے تھے۔ نواز خان تو بچی کے لئے کسی ٹرینڈ آیا کا بندوبست کر رہے تھے۔ لیکن آغا بی بی نہیں مانی تھیں۔ اپنے دستور اور رسم و رواج سے نا بلد عورت کی گود میں وہ اپنے خاندان کا بچہ پلنے کے لئے دینے کے حق میں نہیں تھیں۔۔۔۔۔

پانچویں دن ریشمینے ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آئی۔ بچی کا نام دادا ہی نے شہناز رکھا۔ نواز خان نے بہت بڑی تقریب منعقد کی۔ خوشیاں منائی گئیں۔ آغا بی بی نے بچی کے گلے میں انتہائی خوبصورت اور موٹے موٹے گلوں والا سونے کا تعویذ ڈالا۔ بچی کا حقیقہ بھی بڑی دھوم دھام سے کیا گیا۔ کئی بکرے ذبح ہوئے۔ پوری برادری اور سارے ملنے جلنے والے جمع ہوئے۔ نواز خان خوشی سے پھولا نہیں سارے تھے۔ تقریب کا سماں تو بچی جب سے پیدا ہوئی تھی گھر پہ ہوتا تھا۔ لیکن رسم حقیقہ پر تو کسی شادی کی تقریب کا گمان ہوتا تھا۔ وہ تو آغا بی بی نہیں مانی تھیں۔ ورنہ نواز خان تو ساز و آواز کا پروگرام بھی بنا رہے تھے۔ لختیوں کو بھی نچانا چاہتے تھے۔ اور ڈھولک مرنے والوں کو بھی بلانا چاہتے تھے۔

شہناز گھر میں کیا آئی کہ بہاریں آگئیں۔ نواز خان تو جیسے والہ و شیدا تھے۔ شہنو شہنو پکارتے رہتے۔ شہناز کو تو بالکل ہی بھلا دیا۔ بچہ تھا ماں اور خصوصاً باپ کی توجہ اس ننھے کھلونے کی طرف زیادہ پاتا تو اپنی حق تلفی کے احساس سے چیختے چلائے لگتا۔ اس دن بھی وہ بلاوجہ ضد کر رہا تھا۔ شہزاد گئی شہنو کو سرخ خواب کی گندخ کر کے لائی تھی۔ سر پر طلے کی ٹوپی رکھی تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں میں سرمہ ڈالا تھا۔ ماتھے پر کالا تنک لگا دیا تھا۔ تاکہ نظر بد سے محفوظ رہے۔ بچی اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ ریشمینے نے ہاتھوں

پر لیتے ہوئے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ نواز پلنگ پر نیم دراز اخبار دیکھ رہے تھے۔ جلدی سے رخ موڑا۔ اور شہنو کو ریشمینے کے ہاتھوں سے لے کر پیار کرنے لگے۔

شہباز دونوں کو شہنو کی طرف متوجہ پا کر چند لمحے توجہ تیز نہ سادھ سکا۔ پھر ایک کر باپ کے پلنگ پر چڑھا۔ اور بازوؤں سے شہنو کو دھکیلتے ہوئے باپ کی گود میں گھسنے کی کوشش کی۔

”اوہو۔۔۔“ جب بھی شہنو کو اٹھا تا ہوں۔ یہ ذات شریف گھس آتے ہیں۔۔۔“

”ادھر آؤ شہباز۔۔۔“ ریشمینے نے کہا۔

”نہیں آتا۔۔۔“

”بری بات کہتا ہے۔۔۔“

”اس کو پرے پھینکو۔۔۔ دور پھینکو بابا۔۔۔“ تین سالہ شہباز نے شہنو کی ٹوپی کھینچی۔

”ارے۔۔۔ یہ کیا کیا۔۔۔ دفع ہو جاؤ۔۔۔ بد تمیز کہیں کے۔۔۔“ نواز نے ٹوپی اس کے ہاتھ

سے چھین کر بچی کے سر پر جمادی۔

شہباز رونے لگا۔

ریشمینے نے اٹھ کر اسے پکڑ لیا۔ لیکن وہ ماں کے پاس جانے کی بجائے باپ کے پاس بیٹھنے کے لئے پھلا۔ زور زور سے چیخا۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر رویا۔ نواز خان نے پیار کرنے کی بجائے ایک تھپڑ اسے جڑ دیا۔ ”اتنا بد تمیز اور ضدی ہو گیا ہے۔ کہاں ہے اس کی ترور۔ اسے بلاؤ آکر لے جائے اسے۔۔۔“

ریشمینے نے اسے ہتیرا ہار کیا چکارا۔ لیکن وہ چپ نہیں ہوا۔۔۔ ریشمینے نے اس کی ترور کو آواز دی۔۔۔ وہ اسے زبردستی اٹھا کر لے گئی۔ نواز خان شہنو سے کھیلنے لگے۔

شہباز قدرتی طور پر شہنو سے چلا پاموس کر تا تھا۔ نواز خان کے قریب رہنا چاہتا تھا ان کا پیار پانے کے لئے ہسکتا تھا۔ لیکن نواز خان کو تو بچی کے سوال اور کوئی نظر ہی نہیں آتا تھا۔ وہ تو خداوندی عطیے کو پا کر جیسے سارا کچھ بھول گئے تھے۔ شہباز کی چھوٹی سی دنیا میں کیا کیا سلام اٹھتے تھے۔ ان کے متعلق نہ انہوں نے کبھی سوچا نہ جاننے کی کوشش کی۔

شہباز شہنو سے متفر ہو رہا تھا۔ وہ اکثر اس سے کہتا۔

”بی بی گل اسے باہر پھینک دو۔۔۔“

”یہ گندی ہے۔۔۔ تھو ہے۔۔۔“

”میں اسے ماروں گا۔۔۔“

”اس کا خون نکالوں گا۔۔۔ ڈنڈا ماروں گا۔۔۔“

ایک دن اس نے نفرت کا اظہار کر ہی دیا۔ شہنو رنگین جھولے میں پڑی تھی۔ شہباز ایک کر جھولے میں چڑھا شہنو پر جھکا اور اس کے ننھے منے ہاتھ کو کاٹ لیا۔ شہنو ایک دم ہی چلائی۔ نواز برآمدے سے دوسرے کمرے میں جا رہے تھے۔ شہزاد گئی اور ریشمینے سے پہلے وہی پالنے کے قریب پہنچے۔ نواز نے شہباز کو جھولے میں بیٹھے دیکھا تو فوراً ہی سمجھ گئے۔ کہ اسی نے بچی کو کچھ کیا ہے۔

شہباز ڈر گیا سم کر رہ گیا۔ نواز نے بچی کو دیکھنے سے پہلے ہی خشمنا ک لہجے میں کہا۔

”سو۔۔۔ تو نے مارا ہے شہنو کو۔۔۔“ شہباز کا دل دھک سے رہ گیا۔ نواز جلدی سے بچی پر جھکے۔

پھر بچی کو اٹھا کر سینے سے لگالیا۔ اس کے ہاتھ پر نگاہ پڑی تو دانتوں کے نشان نظر آئے۔ اک زناٹے وار تھپڑ شہباز کے مارا۔ پھر اس کی گردن پکڑ کر جھولے سے نیچے پھینکا۔ وہ چیخنے لگا۔ نواز بھڑک اٹھے۔

”کیا ہوا۔۔۔ کیوں مار رہے ہیں اسے“ ریشمینے نے بچی ان کے بازوؤں سے لیتے ہوئے کہا۔ نواز نے شہباز کے بالوں کو مٹھی میں بھر کر اس کے سر کو جھٹکے دیتے ہوئے چیخ کر کہا ”اب تو نے اسے ہاتھ لگایا تو جان سے مار ڈالوں۔“ شہزاد گئی نے آگے بڑھ کر شہباز کو پکڑ کر دوسری طرف کر لیا۔ ”خان جی بچہ ہے۔ اسے اس طرح نہ ماریں۔۔۔“

ریشمینے نے بچی کو جھولے میں ڈالتے ہوئے شہباز کو گود میں لے لیا۔ اسے سینے سے لگاتے ہوئے وہیں بیٹھ گئی۔ ”ہائے ہائے۔۔۔ اتنا پیٹ ڈالا۔۔۔“

”تم چپ رہو“ نواز دھاڑے۔ ”یہ خبیث کسی دن مار ڈالے گا شہنو کو۔۔۔“

ریشمینے تھرا گئی۔ شہباز کو پیار کرتے ہوئے خود بھی رونے لگی۔

نواز خان کا شہنو سے پیار ریشمینے کے لئے ایک مسئلہ بنتا جا رہا تھا۔ شہباز بے حد ضدی اور بد تمیز ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن نواز خان کی عادت بتاتی تھی۔ اس سلسلے میں کچھ کہنے کی جرأت بھی نہ کر سکتی تھی۔ نواز خان انسانی کے سر ہو جاتے تھے۔ رو دھو کر خود ہی چپ ہو جاتی ایسا ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ ہو چکا تھا۔ شہباز شہنو کی وجہ سے کئی دفعہ نواز خان سے پٹ چکا تھا۔ اور اب تو اس کے دل میں باپ کا خوف اسی طرح بیٹھ چکا تھا۔ کہ نواز اسے پیار بھی کرتے تو بھی اس کی تسکین نہ ہوتی۔ وہ سما سمار ہوتا۔ لیکن جب بھی موقع ملتا۔ شہنو کے دانت کاٹ لیتا۔ چٹکی بھر لیتا۔ جو چیز ہاتھ میں ہوتی اس پر پھینک دیتا۔ شہزاد گئی کو ہر وقت بچی کی پہرہ داری کرنا پڑتی۔ شہباز شہنو سے پیار بھی کرتا تھا۔ لیکن جب وہ پیار بھی کرنا چاہتا۔ تو شہزاد گئی پر ہٹا دیتی۔ ایک دن اس نے شہزاد گئی کو بھی کاٹ لیا۔ اس نے اسے شہنو کے قریب جانے

سے روک دیا تھا۔

اس دن ریشمینے بہت پریشان ہو گئی..... شہباز کو مارا بھی سمجھایا بھی..... لیکن بچے کی نفیات کو باپ نے نہیں سمجھا..... اس دن نواز نے بھی شہباز کی خوب مرمت کی..... ”بالکل جنگلی ہوتا جا رہا ہے“

ریشمینے نے ڈرتے ڈرتے کہا ”آپ اس کی طرف بھی توجہ دیا کریں.....“

”تم خاموش رہو۔ تمہاری یہ طرفداری ہی اسے بد تمیز بنا رہی ہے“

”میں کب طرفداری کرتی ہوں۔ پیٹا ہے میں نے بھی اسے سمجھایا بھی ہے۔ پر.....“

”لااتوں کے بھوت باتوں سے نہیں سمجھتے.....“

شہباز روتے روتے سو گیا..... ریشمینے کا دل بہت دکھا۔ سوئے ہوئے بچے کو چوم چوم

کر روتی رہی..... مارنے پر دکھ بھی ہوا..... نواز خان نے بھی سوئے ہوئے شہباز کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

”بہت گنوار ہو گیا ہے۔ کتنا توانہائی نہیں.....“

”شہنو کی وجہ سے“

”شہنو اس کی بہن ہے۔ تم نے شہباز کو تربیت ہی نہیں دی۔ کہ بہن سے پیار

کرے.....“

”پیار بھی بہت کرتا ہے.....“

”جی ہاں..... بہت کرتا ہے..... جان نہ لے لے کسی دن اس کی.....“

”بچہ ہے خان جی.....“

”لڑکا ہے۔ اسی لئے میں اس کی طرف سے فکر مند ہوں.....“

”ٹھیک ہو جائے گا..... آپ اسے مارا نہ کریں.....“

”غصہ آجاتا ہے اس کی حرکتوں پر..... مار کر افسوس بھی ہوتا ہے۔ لیکن.....“

”وہ شہنو کو برداشت نہیں کر سکتا..... اسے آپ کا پیار چاہئے.....“

”میں اس کا دشمن تو نہیں ہوں.....“

”میں نے یہ تو نہیں کہا.....“

”اس کو سیدھا کرنے کا کوئی علاج سوچو..... بگڑتا جا رہا ہے..... سب تمہاری وجہ سے“

ریشمینے چپ ہو گئی.....

شہباز کی وجہ سے اب وہ بہت پریشان رہنے لگی تھی۔ وہ الٹی پلٹی شرارتیں بھی بہت کرنے لگا

تھا..... نوکروں کے بچوں کی تو شامت آئی رہتی..... کسی کو مارتا۔ کسی کے دانت کاٹتا۔ کسی کی چیزیں توڑ پھوڑ دیتا.....

شہنو سے تین چار ماہ بعد تکینے کی بھی بیٹی پیدا ہوئی۔ خان بابا نے اس کا نام زر نگار رکھا..... صبور خان کو بھی بیٹی کی خواہش تھی..... خدا نے پوری کر دی..... لیکن ان کے ہاں بچوں کا کوئی مسئلہ نہیں بنا..... ایک تو زر گل اب کچھ سمجھدار ہو چکا تھا..... دوسرے صبور خان بے تکینے نے بچی کی وجہ سے زر گل کی حق تلفی نہیں کی تھی..... بچی کے پیار میں زر گل کو بھول نہیں گئے تھے..... بلکہ صبور خان تو اب اس پر زیادہ ہی توجہ دینے لگے تھے.....

ریشمینے ان کو دیکھتی تو رشک محسوس ہوتا..... صبور خان ویسے بھی نرم خو آدمی تھے..... نواز طبعاً جو شیلے اور اکھڑتے..... بچاری خوف زدہ ہی رہتی..... کاش نواز خان کا حراج بھی صبور خان کا سا ہوتا..... وہ اکھڑ سوچا کرتی..... گھر کے کھٹن زدہ ماحول سے اکھڑ پریشان رہتی۔

وقت گزرتا چلا گیا.....

२०

.....

“.....”

”خان بابا کی طبیعت بہت خراب ہے..... رات کو اچانک ہی بیہوش ہو گئے۔ آپ جلدی

..... روئے پر ہونا عورتوں کے رہا تھا۔

”آئیں۔۔۔“

”اوہ میرے خدا۔۔۔“

”بڑے خان صاحب نے مجھے چار سہدہ بھیجا ہے۔ تاکہ آپ کو خبر کر سکوں جی۔۔۔ آپ ابھی آجائیں۔۔۔ خان بابا۔۔۔ کل آپ کو بہت یاد۔۔۔ کر رہے تھے۔۔۔ آپ بس آنے کی کریں۔۔۔“

نواز کے ہاتھ سے فون چھٹ گیا۔۔۔

ریشمینے لپک کر آئی۔۔۔ گھبرائے ہوئے لمبے میں پوچھا ”خیر ہے نا۔۔۔“

نواز نے حواس مجتمع کئے اور بولے۔۔۔ ”جلدی سے تیار ہو جاؤ۔۔۔ گاؤں جانا ہے۔“

”اس وقت۔۔۔ وہاں خیر۔۔۔“

نواز نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”خان بابا کی طبیعت پھر زیادہ ناساز ہو گئی ہے صبر لالہ نے ابھی بلا یا ہے۔۔۔“

ریشمینے بیڈ کے کنارے پر ہی بیٹھ گئی۔۔۔ ہاتھ سینے پر رکھ لیا۔۔۔ پریشانی چہرے سے ہویدا تھی۔۔۔

”جلدی سے تیار ہو جاؤ۔۔۔“ نواز اٹھتے ہوئے بولے۔۔۔ میں طور سم کو جگاتا ہوں اتنی دیر میں تم کپڑے و پڑے بیگ میں رکھ لو۔۔۔ شاید کچھ دن وہاں رکنا پڑے۔۔۔“

”بابا تو ہنہل گئے تھے۔۔۔ اب۔۔۔“

”خدا انہیں سلامت رکھے۔۔۔ ان کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم رہے۔۔۔“

”آمین۔۔۔“

نواز نے اٹھ کر کرسی پر رکھا سواتی چند پہنا۔ گرم سواتی ٹوپی سر پر رکھی۔ پاؤں میں جوتے پہنے اور دروازہ کھول کر باہر آگئے۔۔۔ سروٹ کو اثر کی تیل کاٹن دبا یا۔۔۔ پھر برآمدے میں نکل آئے۔۔۔ دونوں چوکیدار برآمدے کے دونوں کناروں پر لحافوں میں سرمنہ لپیٹے چار پائیوں پر سو رہے تھے۔۔۔ قدموں کی آواز سن کر دونوں اٹھ بیٹھے۔

”خان جی آپ۔۔۔“

”اس وقت باہر۔۔۔ موسم بہت خراب ہے خان جی۔۔۔“

”طور سم ابھی ادھر آ رہا ہے۔۔۔ اسے کہنا چپ نکالے۔“

”جی خان صاحب۔۔۔“

”کہیں جانا ہے خان جی“ نور علی کسبل کی بکلی مارتے ہوئے ان کے قریب آگیا۔

”ہاں گاؤں جانا ہے“

”اس وقت“

”خان بابا کی طبیعت خراب ہے فون آیا ہے۔۔۔“

”یا خدا۔۔۔ خیر۔۔۔“

نواز اندر چلے آئے۔۔۔ ریشمینے نے شہزاد گئی کو جو شہنو کے کمرے میں سو رہی تھی جگایا فون کے متعلق بتاتے ہوئے کہا ”شہنو کی چیزیں اکٹھی کر لو۔۔۔ شہباز خان کی ترور کو بھی جگادو۔۔۔ وہ بھی شہباز کے کپڑے اور بستہ وغیرہ رکھ لے۔۔۔ جلدی کرو۔۔۔ ہمیں ابھی روانہ ہونا ہے۔۔۔“

”شہزاد گئی اٹھ گئی۔۔۔ اس نے ترور کو جگایا۔۔۔ گھڑی بھر میں سارا گھر جاگ اٹھا خدمت گاریں نوکر چاکر سب اٹھ گئے۔۔۔ ہر کوئی پریشان تھا۔۔۔ خان بابا کی صحت و سلامتی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔

خان بابا کی صحت ایک عرصے سے خراب تھی۔۔۔ لیکن پچھلے دو تین ماہ سے تو حالت سدھ رہی نہ رہی تھی۔۔۔ علاج ہو رہا تھا۔۔۔ لیکن دواؤں میں اثر نہیں تھا۔

دن بدن لا غری ہو تے جا رہے تھے۔۔۔ ابھی پچھلا پورا ہفتہ حالت اتنی خراب رہی تھی کہ لگتا تھا۔۔۔ کہ اب گئے کہ گئے لیکن سنبھالا لے لیا تھا۔۔۔ ریشمینے گاؤں میں ان کے پاس ہی رہی تھی۔۔۔ نواز بھی صبح کام پر جاتے اور رات گاؤں ہی میں باپ کی خدمت میں گزارتے۔

طبیعت سنبھلنے پر خود ہی خان بابا نے کہا تھا ”اب میں بہتر ہوں۔۔۔ تم لوگ اپنے گھر جاؤ۔۔۔ تمہارے لئے روز آنا جانا مشکل ہے اور شہباز خان بھی سکول جانے لگا ہے۔ اتنی چھٹیاں نہیں کرواؤ اسے۔۔۔“

نواز خان بیوی بچوں کو لے کر آگئے تھے۔

اور

اب

اچانک ہی خان بابا کی طبیعت اتنی بگڑ گئی تھی۔۔۔ کہ آدھی رات کو نواز خان کو مطلع کرنا پڑا تھا۔۔۔ یہ خبر وحشت ناک تھی۔۔۔ نواز کا دل سینے میں بیٹھتا جا رہا تھا۔۔۔ تشویش سے کچھ سوچا سوچا ہی نہ رہا تھا۔۔۔ جانے کیسے وہ نوکروں کو ہدایتیں دے رہے تھے۔۔۔ کس کس کو ساتھ جانا تھا۔۔۔ کس کس کو یہاں رہنا تھا۔۔۔ وہ بتا رہے تھے۔۔۔

ریشمینے نے اپنا سامان بھی سوٹ کیس میں ڈالا۔۔۔ بچوں کی چیزیں ان کی خدمت گاروں نے رکھیں۔۔۔ جیپ اور ایک گاڑی جاری تھی۔۔۔ سامان رکھا گیا۔۔۔ بچوں کو اپنی اپنی ترور نے اٹھالیا۔۔۔

ریشمینے نے بیڈروم کے کھڑکیاں دروازے خود چیک کئے..... سب بند تھے..... اس نے بیڈروم کو لاک کیا..... چابیاں بٹوں میں رکھیں..... موٹی اونچی چادر سے اپنے آپ کو سر تاپا لپیٹا اور گاڑی میں آ بیٹھی.....

نواز خان بھی آگئے..... کار تو سوں کی بیٹی اور ہسپتال ان کے ہاتھ میں تھا..... ساتھ جانے والے خدمت گار بھی اپنے کندھوں پر پٹیاں اور ہسپتال لٹکائے تیار ہو گئے تھے..... سب نے لوہیوں کی بکلیں مار لی تھیں۔

تیار ہونے اور راستہ طے کرنے میں بھی وقت لگا..... سفر خاموشی سے ہی کٹا..... نواز خان اور ریشمینے کے دل جیسے حلق میں اٹکے تھے.....

حویلی کے صدر دروازے پر نجیب اللہ کھڑا تھا..... گاڑی رکتے ہی نواز نے پوچھا۔
”کیا خبر ہے.....“

”حوصلہ رکھیں خان جی.....“

”خان بابا.....“

”ابھی تک انہیں ہوش نہیں آیا.....“

گاڑی کی آواز سن کر حویلی کی طویل و عریض ڈیوڑھی میں سوتے جاگتے ملازمین بھی اٹھ بیٹھے..... خان کو سلام کیا..... رسمی خوش آمدیدی الفاظ کہے۔ نواز اور ریشمینے گاڑی سے اتر کر تیزی سے اتر کر صحن کرتے سامنے والے طویل برآمدے میں چلے گئے۔ جہاں خدمت گاریں آ جا رہی تھیں.....

صہور خان اور تنکینے خان بابا کے کمرے ہی میں تھے..... آغا بی بی کو تھوڑی دیر پہلے وہ بستر میں لٹا آئے تھے..... ساری رات جاگنے سے ان کی طبیعت بھی بوجھل ہو رہی تھی.....

صہور خان اور نواز خان گلے گلے گئے..... تنکینے ریشمینے سے گلے ملی..... مدتوں کی آنکھیں نم ہو گئیں.....

”بابا کی پھر طبیعت.....“ نواز نے گلوگیر آواز میں کہا..... پٹنگ پر خان بابا بے سدھ پڑے تھے..... بہت ہی نجیف و نزار تھے.....

”ہاں نواز خان..... رات ایک دم ہی بگڑ گئی طبیعت..... جب نجیب اللہ کو فون کرنے بھیجا اس وقت تو بس.....“

”اب.....“

”سائس پہلے سے بہتر طریقے سے لے رہے ہیں..... ڈاکٹر فرید اللہ نے انکیشن دیا تھا.....“

نواز خان پٹنگ کے قریب گئے..... نکلے اور دو زانو قالمین پر بیٹھتے ہوئے بابا کے بازو پر سر رکھ دیا۔ وہ آبدیدہ ہو گئے.....

”حوصلہ رکھو نواز.....“ کئی لمحوں بعد صہور خان نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا..... چند قدموں کے فاصلے پر ریشمینے اور تنکینے کھڑی تھیں..... وہ بھی بابا کو دیکھ کر آنسو بار بار پونچھ رہی تھیں..... نواز اٹھ کر کھڑے ہو گئے..... پھر بھائی کو مخاطب کرتے ہوئے آہستگی سے بولے ”گل لالہ شہر سے کسی اور بڑے ڈاکٹر کو لا کر نہ دکھاویں.....“

صہور نے سر ہلایا.....

”میں نے کتنا کہا کہ ہسپتال داخل کروا دیتے ہیں بابا کو..... لیکن کسی نے مانی نہیں میری بات بڑے سے بڑا ڈاکٹر وہاں موجود ہے..... میں تو کہتا ہوں صبح انہیں لے چلتے ہیں شہر.....“

صہور نے ان کے کندھے کو ہولے ہولے دبا دیا..... بابا کو اب اتنی زحمت دینے کی مہلت نہ تھی۔ صبح نواز نے چار سدے جا کر پشاور فون کیا..... ڈاکٹر ہمدانی سے ان کے دوستانہ مراسم تھے..... ڈاکٹر پیرزادہ سے بھی دوستی تھی..... انہوں نے ہمدانی کو فون کر کے بابا کی حالت بتائی ”تم آسکو تو میرا بی بی ہوگی پیرزادہ سے بھی کہنا آکر دیکھ لیں بابا کو ہماری تسلی کی خاطر.....“

”ضرور ضرور نواز..... ہم دونوں آ جائیں گے..... فکر نہ کرو.....“

ڈاکٹر آئے..... ڈاکٹر فرید اللہ بھی آ گیا تھا..... تینوں نے باہم صلاح و مشورہ کیا۔

ہمدانی نے انہیں ہسپتال داخل کروانے کی صلاح دی۔ لیکن پیرزادہ اس کے حق میں نہ تھے..... آغا بی بی اور خاندان کے وہ تین بزرگ بھی آمادہ نہیں تھے..... وقت رخصت قریب نظر آ رہا تھا..... اب دواؤں نہیں دعاؤں کے سہارے اس کٹھن مرحلے سے گزرنے کی ضرورت تھی.....

سارا دن موت و زیست کی کشمکش میں گزرا۔ کبھی خان بابا ہوش میں آ جاتے کبھی بیہوشی طاری ہو جاتی..... ہوش میں ہوتے تو لڑکھاتی زبان سے کبھی کسی بیٹے کو پکارتے کبھی آغا بی بی کو..... خاندان کے ارد گرد کھڑے لوگوں کو بھی دیکھتے..... احوال پر سی بھی کر لیتے۔ دوایک بار بستر میں بٹھانے کے لئے بھی صہور خان اور نواز خان نے اپنی چھاتی سے ان کی کمر لگا کر سہارا دیا۔ اور وہ کچھ دیر بیٹھے اپنے پیارے پوتے پوتیوں سے پیار کرتے رہے.....

شام اتر رہی تھی..... پوری حویلی پر اک سو گوار سی کیفیت طاری تھی..... لوگ احوال پر سی کو آ جا رہے تھے..... حجرے میں لوگ جمع تھے..... منٹ منٹ کی کیفیت سے انہیں حکمت خان آگاہ کر رہا تھا.....

حویلی میں بھی قریبی رشتہ دار آ جا رہے تھے.....

”اللہ رحم کرے“

”حالت خراب ہے“

”بس کوئی دم کی بات ہے“

”بیاری نے چھوڑا نہیں.....“

”خدا مشکل آسان کرے“

سب دھکی اور سسے سے انداز میں باتیں کر رہے تھے۔

گھر کے سبھی افراد خان بابا کے کمرے ہی میں تھے۔ صبور خان کھڑکی کے پاس سر جھکائے کھڑے تھے دورانِ فتنہ پر ڈوبتے سورج کو دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے۔ دن میں کتنا پر زور اور چار سو روشنی پھیلانے والا سورج اب کتنی نقاہت اور بے بسی سے مغرب کی گمراہیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے..... بالکل اسی طرح خان بابا بھی.....

”کل لالہ“ خان بابا کے سر ہانے بیٹھے نواز خان نے انہیں آواز دی۔ تو خیالوں سے چونک کر وہ تیزی سے پلٹے اور پٹنگ کی طرف آئے۔

”خان بابا آپ کو بلارہے ہیں.....“ نواز بولے۔

”ہوش میں ہیں.....“

”ہاں.....“

صبور خان قریب آئے..... پٹنگ پر خان بابا چپ پڑے تھے۔ چہرہ زرد اور کمزور ہو گیا تھا..... ہونٹ خشک تھے۔ ریشمی لحاف سینے تک پڑا تھا..... سر ہانے رومال اور تولیہ رکھا تھا.....

”صبور خان!.....“ کمزوری آواز میں خان بابا نے کہا۔

”جی باباجان“ وہ ان پر جھک گئے۔

”بیٹھو.....“ خان بابا نے اشارہ کیا..... وہ پٹنگ کی پٹی پر بیٹھ گئے۔

خان بابا کمزور آواز میں دونوں سے باتیں کرنے لگے..... کبھی توان کی آواز اتنی ڈوب جاتی کہ دونوں کو کان ان کے منہ کے قریب کرنا پڑتے..... خان بابا انہیں جائیداد کے متعلق کچھ بتانے کی کوشش کر رہے تھے..... دونوں بھائی حلق میں اتارتے آنسوؤں کی نمی محسوس کرتے ہوئے ان کی نصیحتیں سن رہے تھے.....

”تمہیں اور ریشمینے کہاں ہیں.....“ خان بابا نے متلاشی نظروں سے ارد گرد دیکھا آغا بی بی نے دونوں کو قریب بلایا۔

”جی باباجان.....“ دونوں قریب آگئیں..... خان بابا نے ایک ڈوبتی مسکراہٹ سے انہیں

دیکھا..... پھر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے..... کبھی رک جاتے..... گہری سانس لیتے..... کبھی لڑکھرائی زبان سے بولتے.....

”صبور..... نواز.....“ چند لمحے لمبے لمبے سانس لینے کے بعد کمزوری آواز میں ہائے پکارا.....

”جی بابا.....“ دونوں ان پر جھکے ہوئے تھے.....

”میری..... ایک..... دلی خواہش ہے..... پوری..... کرو گے..... بابا کے لمحے میں انکساری تھی“

”آپ حکم دیں..... ہم تابعدار ہیں.....“ نواز نے کہا صبور بھی بولے..... ”حکم کریں خان

بابا.....“

”میری خواہش ہے..... کہ تم..... دونوں..... بھائی..... میرے بعد.....

سلوک اور اتفاق سے رہو..... تمہاری محبت مضبوط ہو..... لوگ خوشدل خان کے بیٹوں کے اتفاق کی مثال

دیں..... اس کے لئے.....“ وہ ٹوٹے لمحے میں بولتے بولتے چپ ہو گئے.....

”فرمائیے خان بابا.....“ دونوں نے بے تابی سے کہا۔

”اس اتفاق..... اور..... اتحاد کے لئے رشتوں کے بندھن..... بڑے مستحکم ہوتے ہیں..... تم

دونوں اپنے بچوں کے رشتے آپس میں کر لو..... ان کی نسبتوں کا..... اعلان..... کر دو..... ابھی.....“

ریشمینے نے تمکینے اور تمکینے نے ریشمینے کو دیکھا..... صبور اور نواز نے جلدی سے

کہا ”ہم آپ کی خواہش کا احترام کرتے ہیں..... آپ بیس چاہیں ویسا ہی ہو گا باباجان.....“

”زر گل تمہارا بیٹا اور شہباز تمہارا.....“ خان بابا نے نواز اور صبور کی طرف دیکھا ”سمجھ گئے ہو

نا۔“

”جی بابا.....“ دونوں نے بابا کے ہاتھ چوم لئے.....

”میری..... بیٹیوں سے بھی..... پوچھو انہیں کوئی اعتراض..... تو نہیں.....“ بابا بولے۔

”نہیں باباجان.....“ تمکینے آگے کوچکی..... ریشمینے نے بھی سر جھکا دیا..... ”آپ کی

خواہش سر آنکھوں پر..... ہم تو پہلے ہی یہی چاہتے تھے باباجان..... آپ نے خود ہی فیصلہ کر دیا..... اپنے مبارک

ہاتھوں سے یہ نسبت خود ہی مضبوط کر دیں باباجان.....“

تمکینے نے پاس کھڑی کشمالی اور جینی سے کہا ”جلدی سے چاروں بچوں کو لے آؤ.....“

وہ دونوں دوڑیں..... تھوڑی دیر بعد چاروں بچے آگئے تمکینے نے انہیں پٹنگ کے قریب کر

دیا۔

خان بابا نے زر گل کا ہاتھ شہنو اور شہباز کا ہاتھ زر نگار سے پیار سے زری کہتے تھے دے کر

وعدای..... آغا بی بی نے بھی بہ چشم تر بچوں کے اس نئے بندھن کی استواری کی دعا کی یہ ان کی خواہش بھی تھی۔
صبر نواز سے اور بیکینے ریشمینے سے گلے ملی..... ایک دوسرے کو رندھی آواز میں
مبارک بادوی.....

بچے کچھ سمجھ نہیں پائے سو گوار ماحول میں سسے سسے کھڑے رہے۔ پھر زرگل شہنوا اور شہباز
زری کا ہاتھ پڑے کمرے سے باہر نکل گئے..... وہ کس بندھن میں باندھ دیئے گئے تھے انہیں علم نہ تھا۔
ماحول بیحد سو گوار ہو گیا تھا..... ریشمینے اور بیکینے کی آنکھیں نم تھیں..... صبر اور نواز
نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام رکھے تھے..... اور وہ بابا کے پلنگ کے دونوں طرف پٹی پر بیٹھے تھے۔
”اس..... بندھن..... سے سب خوش ہونا.....“ خان بابا نے کافی دیر آنکھیں
بند کئے پڑے رہنے کے بعد پوچھا.....

”جی بابا خان.....“ تقریباً تھیں نے کہا۔

”خوش رہو..... خوش رہو..... اب میں..... چین سے..... دنیا سے جاؤں
گا.....“

”بابا جان.....“ دونوں نے باپ کے سینے پر سر رکھ دیا..... دونوں سکے لگے..... خان بابا
نے آنکھیں بند کر لیں.....

آغا بی بی بھی رد دیں..... اور ریشمینے اور بیکینے آنسو بھری آنکھوں سے یہ رقت بھر امنظر
دیکھنے لگیں۔ کمرے میں موجود ہر فرد کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

اور کوئی وقت ہوتا..... تو خان بابا کی اس خواہش کو پورا کر کے خوب خوشی منائی جاتی۔ جشن
ہوتا..... دھوم دھڑکے سے رسم کی جاتی..... لیکن اب بستر مرگ پر پڑے خان بابا کی خواہش پر صرف اثبات کی مر
ہی خاموشی سے لگائی جاسکتی تھی..... یہ مری مستند تھی اسی لئے یہ خبر پورے خاندان کیا پورے گاؤں میں پھیل
گئی.....

دو دن ڈوبتے ابھرتے گزرے..... لیکن سفینہ بھنور میں بھنس جائے تو ڈوب کر ہی رہتا ہے۔
خان بابا نے تیسرے دن..... جب پوچھت رہی تھی۔ اندھیرے روشنی کا پیغام دے رہے تھے..... اور رات کا
سکوت مرگ دن کی آمد سے ٹوٹ کر زندگی کا روپ دھار رہا تھا..... آخری ہنگامی بی..... ان کے سر ہانے بیٹھے
تلاوت کرنے والوں کی آواز گھٹ گئی..... بزرگوں نے بلند آواز میں کلمہ طیب پڑھنا شروع کر دیا..... حکمت
خان نے اٹھ کر ان کے بازو سیدھے کئے..... محبت اللہ نے ان کی آنکھیں بند کر دیں۔

آغا بی بی کے صبر و ضبط کے باوجود ایک دلدوز گھٹی گھٹی چیخ فضا میں بکھر گئی..... چار وہابیوں کا
ساتھ ایک جھٹکے سے ٹوٹ گیا..... صبر اور نواز بابا سے لپٹ کر چیخ اٹھے..... عورتیں مرد زور زور سے رو دیں.....
ریشمینے اور بیکینے تھوڑی دیر ہی پہلے اپنے کمروں میں گئی تھیں..... رونے دھونے کی آوازیں سن کر ننگے
پاؤں دوڑی آئیں..... خان بابا..... ہمیشہ کیلئے پھڑپھڑاتے تھے..... وہ دونوں آغا بی بی سے لپٹ کر چیخیں مار مار کر رونے
لگیں..... گھڑی بھر میں کمرہ لوگوں سے بھر گیا۔ رشتہ دار جو پہلے ہی حویلی میں آچکے تھے لپکے آئے۔
خدمت گاریں نوکر چاکر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ اک کرام بچ گیا.....

گاؤں کا بے تاج بادشاہ..... حویلی کا بلا شرکت غیرے حاکم جس کے رعب و دبدبے کے آگے
کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی..... جس کے مزاج کی گھن گرج سے درو دیوار لرز اٹھتے تھے..... جس کا حکم قانون
کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ جس کے فیصلے اٹل ہوتے تھے۔ جو دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن تھا..... اس
وقت پلنگ پر مٹی کے بے جان ڈھیر کی صورت پڑا تھا..... چیخ و پکار آہ وزاری تڑپ و کک سے بے نیاز سفر آخرت
پہ جاچکا تھا..... بہت کچھ تھا..... اب کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

خان کے فوت ہونے کی خبر چاروں اور پھیل گئی..... دن نکلنے تک پورا گاؤں حجرے اور حویلی کے
اندہر باہر جمع تھا۔ تہکال بالا سے آغا جی بھی اپنے سارے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ پہنچ گئے تھے..... بیکینے

کے میکے سے بھی کبھی خان بلند خان کی ہمراہی میں آچکے تھے۔ جدھر نظر جاتی سرہی سر نظر آتے۔ گلی میں دور تک بان کے پلنگ بچھادیئے گئے تھے۔ لیکن لوگ بہت زیادہ تھے۔ چھجوں پر چڑھے تھے۔ دیواروں سے لگے تھے بند دکانوں کے تھڑوں پر بیٹھے تھے۔ جڑو بھر گیا تھا۔ حویلی بھر گئی تھی۔ گلی میں تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ اپنے گاؤں کے علاوہ ارد گرد کے گاؤں سے بھی لوگ آ رہے تھے۔ پشاور سے جیپیں اور کاریں آ رہی تھیں۔ خان خوشدل خان کے آخری دیدار کے لئے لوگ بے چین تھے۔ ان کے جنازے کو کندھا دینے کی خواہش تھی۔

میت منلانے اور کفنانے کے لئے کمرے سے اٹھائی گئی۔ تو جیسے قیامت کا شور مچ گیا۔ عورتیں دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ آغا بی بی تھکینے اور دیشمینے سے لپٹ لپٹ کر رو دیں۔

مردوں نے خان کا خالی پلنگ کمرے سے نکال دیا۔ آغا بی بی کا من خالی خالی ہو گیا۔ وہ عورتوں میں گھری بیٹھی تھیں۔ آنسو تو ترسے بہہ رہے تھے۔ عورتیں آنسو بہاتے ہوئے خان کی بیماری کے متعلق پوچھ رہی تھیں۔ آغا بی بی رکھتے رکھتے لمبے میں ان کی باتوں کا جواب دے رہی تھیں۔ دیشمینے اور تھکینے بھی ان کے پاس بیٹھی تھیں۔ آنکھیں متورم اور چہرے سرخ ہو رہے تھے۔ وہ بیٹوں سے بار بار آنکھیں ناک پونچھ رہی تھیں۔

اس وقت خاندان کے معمر اور بزرگ حشمت خان جو خوشدل خان کے رشتہ دار بھی تھے۔ ہاتھوں پر سفید چادر اٹھائے اندر آئے۔ ان کے ہمراہ دو تین اور بزرگ بھی تھے۔ خان صبور خان نواز خان حیدر عبید اللہ اور ہمیشیں گل کا کامرحوم کے دونوں بیٹے عظمت اور رحمت خان بھی تھے۔ سفید چادر دیکھ کر عورتیں دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ مردوں کے آگے آنے کے لئے کھسک کھسک کر جگہ بنائی۔ حشمت خان آگے بڑھے۔ آغا بی بی کے قریب آئے۔

”حیرا نصیب میری بہن۔۔۔۔۔“ حشمت خان نے گلو گیر آواز میں کہا اور سفید بے داغ چادر کھول کر آغا بی بی پر ڈال دی۔ بیوی کی سفید چادر میں آغا بی بی کا وجود ڈھانپ دیا گیا۔ یہ منظر اختارت انگیز تھا۔ کہ عورتیں تو عورتیں مرد بھی آنسو نہ روک سکے۔ نواز اور صبور تو بے اختیار اندھ آگے بڑھ کر ماں سے لپٹ گئے۔ دھاڑیں مار مار کر رو دیئے۔

”بس بیچے۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔“ حشمت خان نے نواز اور صبور کے سروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”اللہ کی بی رضی تھی۔۔۔۔۔“ دوسرے بزرگ اپنے کندھے پر ہڈی چادر کے کونے سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولے۔

”تمہارا باپ شیر تھا شیر۔۔۔۔۔ تیسرے بزرگ نے کہا۔

”موت کے آگے کسی کا بس نہیں چلتا۔۔۔۔۔ میرے بچو۔۔۔۔۔ حوصلہ کرو۔۔۔۔۔ رونے دھونے سے

کچھ نہیں ہو گا۔ اپنی ماں کو سہارا دو۔۔۔۔۔ بہت سے کام لو۔۔۔۔۔ تم ایک بہادر باپ کے بیٹے ہو۔۔۔۔۔“ حشمت خان بولے۔

عبید نے نواز کو اور حیدر نے صبور کو کندھے سے پکڑ کر اٹھایا۔ وہ واسکٹ کی جیبوں سے رومال نکال کر آنکھیں پونچھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

آغا بی بی بے حال اور مذہال ہو رہی تھیں۔ حشمت خان نے ان کے سر پر بھی ہاتھ پھیرا اور شفقت سے بولے ”جوان بیٹوں کی ماں کبھی بیوہ نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ خدا نے تمہیں دو جوان بچے دیئے ہیں بہن۔۔۔۔۔ یہ فرمانبردار ہیں تابعدار ہیں۔ تمہارے رستے، عزت و احترام میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔۔۔۔۔ حوصلہ کرو۔۔۔۔۔ اور انہیں بھی حوصلہ دو۔۔۔۔۔“

وہ کچھ دیر تسلی دلا سے کی باتیں کرتے رہے۔ پھر نواز اور صبور کو ساتھ لے کر دوسرے لوگوں کے ہمراہ کمرے سے باہر چلے گئے۔

سہ پہر کو خان کا جنازہ اک شان سے اٹھا۔ جس شان سے وہ بنے تھے۔ اسی شان سے قبر تک بھی پہنچے۔ گاؤں سے باہران کا آبائی قبرستان تھا۔ جہاں بے شمار قبریں تھیں۔ کچی قبریں۔ جن پر گول گول بڑے بڑے پتھر جوڑے ہوئے تھے قبروں کی ساری مٹی پتھروں سے ڈھکی تھی۔ سرہانے کی طرف لمبوترے پتھر لگے ہوئے تھے۔ ان قبروں میں آج ایک اور قبر کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس قبر پر پھولوں کے ڈھیر لگا دیئے گئے۔ فارغ ہو کر لوگ واپس مڑنے لگے۔ نواز اور صبور بھی سر جھکائے افسردہ افسردہ سے دوسرے لوگوں کے ساتھ واپس ہوئے۔ رشتوں کی اہمیت کا احساس شاید اس وقت نہیں ہوتا جب وہ معمول کی ڈور میں بندھے ہوتے ہیں۔ دھچکا تو اس وقت لگتا ہے۔ جس وقت موت کے بے رحم ہاتھ اس ڈوری کو کاٹ کر رشتوں کا بندھن توڑ دیتے ہیں۔ صبور اور نواز اس دھچکے سے بے حال ہو رہے تھے۔ اب احساس ہو رہا تھا۔ کہ باپ بیٹوں کا رشتہ کتنا اہم اور تومند تھا۔

کئی دن جمرے اور حویلی میں ماتی کیفیت رہی۔ لوگ تعزیت کے لئے آ جا رہے تھے۔ خان بابا کی یاد میں آنسو بہائے جا رہے تھے۔ ان کی خوبیاں اور صلاحیتیں سراہی جا رہی تھیں۔ وہ کئی قیاموں کی سرپرستی کر رہے تھے۔ کئی بیواؤں کی اعانت کر رہے تھے۔ کئی غریبوں کی مدد کرتے تھے۔ یہ لوگ خان کے مرنے کے بعد اپنے آپ کو بے سہارا اور لاوارث سمجھ رہے تھے۔

لیکن

آغا بی بی نے انہیں تسلی و تشفی دی۔ ”تم لوگ بے فکر رہو۔ تمہارا اسی طرح خیال رکھا جائے گا۔ خان کے بیٹے زندہ ہیں۔ وہ باپ کے نقش قدم پر چلیں گے ان کے ہاتھ تم لوگوں کے سروں پر قائم

رہیں گے۔۔۔۔۔

یہ لوگ جھولی پھیلا پھیلا کر آغا بی بی اور ان کے خان بیٹوں کو دعائیں دیتے رخصت ہوتے تھے۔۔۔۔۔

کئی دن یہی ہنگامہ رہا۔۔۔۔۔

زندگی زندہ تھی۔ مرنے والوں کے ساتھ کوئی نہیں مرجاتا زندگی سے بندھن صرف مرنے والے کے ٹوٹتے ہیں۔۔۔۔۔ زندہ لوگوں کو زندگی گزارنا ہوتی ہے۔۔۔۔۔ اپنی ساری ذمہ داریوں اور چل چل پھل کے ساتھ۔

کئی دنوں کے بعد جب حویلی میں گئے پنے قریبی عزیز و اقارب ہی رہ گئے تھے۔ زندگی معمول پر آگئی تھی۔۔۔۔۔ سو گواری صرف گھر والوں تک ہی رہ گئی تھی۔۔۔۔۔ آغا بی بی نے دونوں بیٹوں اور بہوؤں کو اپنے کمرے میں بلایا۔۔۔۔۔

وہ دیوار کے ساتھ لگے تکتے سے ٹیک لگائے سفید چادر کی بکلی مارے بیٹھی تھیں۔ سردی کے پیش نظر کھڑکیاں دروازے بند کر کے آگے پردے سرکا دیئے گئے تھے۔ اور دو ایک منکلیں (چٹنی انگلیٹھیاں) بھی تھیں۔ جن میں راکھ میں دبے کوئلے کمرے کو گرم کئے ہوئے تھے۔۔۔۔۔

”جی آغا بی بی“ صبور خان گدے پر ماں کے قریب بیٹھتے ہوئے بولے۔۔۔۔۔ ”آپ نے

بلایا۔۔۔۔۔

”ہاں۔۔۔۔۔“

”کوئی خاص بات تھی آغا بی بی۔۔۔۔۔“ نواز نے ان کے قریب دوسری طرف بیٹھتے ہوئے اپنا بازو ان کی پشت پر لجاتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔

”ہاں۔۔۔۔۔“ وہ متانت سے بولیں۔

”کئے“ صبور خان نے ٹوپی اور کارتوس والی پٹی اتار کر گاؤ تکتے کے قریب رکھ دی۔

”تمکینے اور ریشمینے کو بھی آئیے دو۔۔۔۔۔“ آغا بی بی نے شفقت سے کہا۔

ریشمینے اور تمکینے آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئیں۔ تمکینے نے پھولدار لنن کا اپنا روائی لباس پہن رکھا تھا۔ جبکہ ریشمینے گرم سوٹ پر سویٹر پہنے اور کالی گرم کڑھائی والی شال اوڑھے تھی۔۔۔۔۔

دونوں آغا بی بی کے سامنے سرخ قالین پر تعظیم سے بیٹھ گئیں۔۔۔۔۔

”ادھر بیٹھو“ آغا بی بی نے دونوں کو گدوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”بس ٹھیک ہیں آغا بی بی جان۔۔۔۔۔“ تمکینے بولی۔۔۔۔۔ ریشمینے نے بھی ہاتھ سے اشارہ کیا ”ٹھیک ہوں“

”ہاں تو فرمائیے۔۔۔۔۔“ صبور خان چند لمبے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد بولے۔

”بچو“ آغا بی بی نے سکی طرف دیکھا۔

”جی“

انہوں نے ایک آہ سرد کھینچی۔ کچھ آگے کو جھکیں اور پھر اداس لہجے میں بولیں ”آج تمہارے والد ہم میں نہیں ہیں۔۔۔۔۔ لیکن ان کے ترکے میں چھوڑا ہوا جو کچھ ہے۔۔۔۔۔ میں نے اس کے متعلق تم سے بات کرنے کو تمہیں بلایا ہے۔۔۔۔۔“

سب سر جھکا کر خاموش بیٹھے تھے۔ آغا بی بی نے اک نگاہ ان پر ڈالی پھر بولیں ”تمہارے بابا کی دلی خواہش تھی۔ کہ ان کے بعد بھی اس خاندان کا شیرازہ نہ نکھرے۔۔۔۔۔ تم دونوں بھائی اسی طرح پیار محبت اور سلوک اتفاق سے رہو“

”ایسا ہی ہو گا انشاء اللہ۔۔۔۔۔“

”ہم دونوں بھائی ایک دوسرے پر جان دیتے ہیں آغا بی بی۔۔۔۔۔ اب ان جہزوں میں کی نہیں

آئے گی۔“

”جیتے رہو“

کچھ دیر خان بابا کی باتیں یاد کی گئیں۔ انہیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ وہ اک بے مثل باپ تھے۔ بہوؤں کے لئے شفیق سر تھے۔ ان کے سایہ تلے سب بے ٹمکری کی زندگی گزار رہے تھے۔ سخت گیر ہونے کے باوجود بچوں کا تین محبتوں کی پھوار سے بگوائے رکھتے تھے۔ بات سے بات ٹکلی چلی گئی۔ گھنٹہ بھر کی باتیں ہوتی رہیں۔۔۔۔۔

پھر آغا بی بی نے چابیوں کا گھما سب کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ ”اس الماری میں سب کاغذات زیور اور نقدی جو کچھ تمہارے بابا نے چھوڑا ہے پڑا ہے۔۔۔۔۔ صبور خان تم سب چیزیں نکال لاؤ“

”کس لئے آغا بی بی“ صبور بولے۔

”تم لاؤ تو سہی۔۔۔۔۔ کتنا اثاثہ ہے دیکھ لو۔۔۔۔۔“

”نہیں آغا بی بی۔۔۔۔۔ آپ اب ہمارے لئے خان بابا کی جگہ ہیں۔۔۔۔۔ جو کچھ ہے آپ کا

ہے۔۔۔۔۔“

”ہاں آغا بی بی۔۔۔۔۔ ہم دیکھ کر کیا کریں گے۔ جیسے پہلے تھا ویسے اب بھی رہنے دیں۔“

”جیتے رہو میرے بچو۔ خدا تمہیں زندگی دے۔ یہ تمہاری سعادت مندی ہے۔ لیکن میں یہ بوجھاب نہیں اٹھا سکتی۔ تم دوہی تو بھائی ہو۔ اس سارے ترکے پر تم دونوں کا ہی حق ہے۔ جیسا مناسب سمجھتے ہو کر لو۔“

صبر خان بمشکل الماری سے چیزیں نکالنے کے لئے اٹھے۔ لال بڑی سی مٹلی صندوقچی کاغذات اور نوٹوں کی گھٹیاں سب کچھ نکال لائے اور ماں کے سامنے رکھ دیا۔

”یہ سب کاغذات ہیں۔ زمینوں، شہر کی جائیداد اور نواز خان والی کوٹھی کے فیصلہ تم دونوں بھائیوں نے کرنا ہے۔“ آغا بی بی نے سب چیزوں پر نگاہ ڈالی ”میں دخل نہیں دوں گی۔ تم خود ہی جو چاہو کرو۔“

”اوه آغا بی بی۔ فیصلے کی کیا ضرورت ہے۔ گل لالہ زمینوں کی دیکھ بھال کرتے ہی ہیں۔ میں اب شہر سے گاؤں تھوڑا ہی آؤں گا۔ جیسے کام چل رہا ہے چلتا رہے گا۔“

آغا بی بی نے دونوں کو سمجھایا۔ انہیں بخوارہ کرنا ہی تھا۔ چاہے کام اسی طرح چلتا رہے۔ دونوں چپ چاپ ماں کی باتیں سنتے رہے۔ ”یہ قانون اور شرع دونوں طرح سے تم دونوں کا حق ہے۔ آپس میں انہماں و تقسیم سے معاملے طے کر لو۔ جو فیصلے اب کرو گے وہ ہمیشہ کے لئے ہوں گے۔ میں تمہیں اس بات کی بخوشی اجازت دے رہی ہوں۔“

”بہتر۔“ صبر خان نے سارے کاغذات اٹھا کر ایک طرف رکھ دیئے۔ ”یہ ہم دونوں پر چھوڑ دیں کیوں نواز۔“

”جیسے آپ مناسب سمجھیں۔“

آغا بی بی نے زور کی صندوقچی اپنے سامنے رکھی۔ اسے کھولا۔ وہ طلائی موٹے موٹے زیورات سے بھری تھی۔

”یہ بھی تمہارا ہے۔“ وہ بھوسوں کو دیکھ کر بولیں۔

”نہیں آغا بی بی۔“ تمکینے نے کہا ”یہ سب آپ کا ہے۔ ہمیں ہماری شادیوں پر آپ ڈھیر سا زیور دے چکی ہیں۔“

”بھائی ٹھیک کہتی ہیں آغا بی بی۔“ ریشمینے بولی۔

آغا بی بی کے اصرار کے باوجود دونوں نے زیور لینے سے انکار کر دیا۔ صبر خان بولے ”آغا بی بی اسے اپنے پاس ہی رکھیں۔“

”میرے کس کام۔ میں نے پہننا توڑا ہی ہے۔“

”بہت کام آئے گا۔ ابھی تو آپ نے اپنی پوتیوں پوتوں کی شادیاں کرنی ہیں۔“ نواز خان نے ماں کے ہاتھ پر ہارسے بوسہ دیا۔

صبر خان مسکرائے اور بولے ”بالکل آغا بی بی۔“

”یہ ٹھیک بات ہے آغا بی بی۔ تمکینے بولی۔“ خدا آپ کو ہمارے سروں پر سلامت رکھے ان بچوں کے لئے رکھ چھوڑیں زیور۔“

صبر خان ہنس کر بولے ”زیادہ میری ہوشہنوں کے لئے رکھے گا۔“

”آہا ہا۔“ نواز ہنسے ”گل لالہ۔ عجیب نہیں لگتا۔ چھوٹی سی بھو۔“

”بڑی بھی ہو جائے گی“ آغا بی بی بولیں۔

”خدا ان رشتوں کو استقامت بخشنے۔“ تمکینے بولی۔

”آمین۔“ ریشمینے نے کہا۔

پھر ان بچوں کی باتیں ہونے لگیں۔

”تمہارے بابا کی بڑی خواہش تھی۔ کہ یہ رشتے طے کرنے کی خوشی میں بہت بڑا جشن منائیں موت نے مہلت ہی نہیں دی۔“

”انشاء اللہ ہم ان کی خواہش پوری کریں گے آغا بی بی۔“ صبر نے کہا۔

وہ سب دیر تک اکٹھے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ بہت بڑے فیصلے ہو گئے۔ جائیداد کی تقسیم بھی

زبانی زانی ہو گئی۔ گاؤں کی ساری زمینوں کی دیکھ بھال صبر خان کے ذمہ ہی رہی۔ سالانہ پیسے کی تقسیم کا

مسئلہ بھی طے کر لیا گیا۔ نقدی کی صورت میں جو روپیہ تھا۔ وہ آغا بی بی نے خود ہی دونوں میں بانٹ دیا۔ گھر کا

اہتمام و انصرام آغا بی بی کے ہاتھ ہی میں رکھا گیا۔ حویلی کے اخراجات جیسے پہلے ان کے ہاتھ میں تھے اب بھی

رہے۔ ساری تقسیم اور بانٹ زبانی زبانی ہوئی۔ ورنہ سلسلے جیسے پہلے چل رہے تھے ویسے ہی رکھے گئے۔ پھر بھی

بہت بڑا بار آغا بی بی کے سر سے اتر گیا۔ صبر خان نے ساری چیزیں واپس الماری میں رکھ دیں۔ اور چابیاں آغا

بی بی کی جھولی میں ڈال کر کہا۔ ”جب جب ضرورت ہو کرے گی۔ آپ سے لے لیا کر دوں گا۔ فی الحال یہ

چابیاں آپ کی ذمہ داری ہیں۔“

”جیتے رہو میرے بچو۔ خدا تمہیں شاد و آباد رکھے۔“ آغا بی بی نے دعا دی۔

وہ بولے ”خدا آپ کو سلامت رکھے۔“

تھوڑی دیر بعد صبر خان اور نواز اٹھ کر چلے گئے۔ حجرے میں کچھ لوگ بخوں سے آئے بیٹھے تھے۔

خان بابا کی فاتحہ خوانی کے لئے۔

دونوں بھائی حجرے کی طرف چل دیئے..... ریشمینے اور تکینے آغا بلی کے پاس ہی بیٹھی رہیں تینوں دیر تک خان بابا کی باتیں کرتی رہیں.....

ریشمینے اپنے کمرے میں تھی۔ درزی سے آئے کپڑے بیڈ پر رکھے تھے۔ وہ انہیں چیک کر رہی تھی۔ ان کپڑوں میں تین جوڑے تکینے کے بھی تھے..... تکینے اب ریشمینے کی طرح شہری طرز کے کلمے ہوئے کپڑے پہنے لگی تھی۔ یہ کپڑے ریشمینے ہی سلواتی تھی.....

ریشمینے نے اس کے تینوں جوڑے الگ کئے۔ درزی کے فراق اور شلوار کرتے بھی سل کر آئے تھے..... ریشمینے اس کے لئے اپنی پسند کے فراق بنواتی تھی..... پیاری سی بچی ان پھولے پھولے فراقوں میں بیحد خوبصورت لگتی تھی..... لیکن ایک بات ریشمینے کو پسند نہ تھی..... فراقوں کے ساتھ تکینے اسے شلواریں پہنایا کرتی تھی.....

”بھابی آپ تو فراق کا ستیاناس مار دیتی ہیں..... شلوار ہی پہنانی ہوتی ہے تو فراق کیوں سلواتی ہیں۔ اپنی روایتی پٹو اڑا اور شلوار ہی پہنا دیا کریں.....“ ریشمینے اکثر کہتی۔

”کیا کروں ریشمینے۔ صبور پسند نہیں کرتے..... لڑکی ہے نا..... نگلی ٹانگیں.....“ وہ کہتی۔

”اے ہے۔ اتنی سی بچی ہے ابھی.....“ ریشمینے ہنس کر کہتی۔

”ہم لوگ گاؤں میں رہتے ہیں ریشمینے.....“ وہ سنجیدہ سناخواب دیتی۔

”لیکن میری بیٹی نے تو شہر میں رہنا ہے“ ریشمینے ہموکے ناٹے سے کہتی۔

”جب شہر میں رہے گی۔ تو شہری آداب سیکھ لے گی.....“

”خان لالہ شہنو کو تو کچھ نہیں کہتے..... اسے تو میں نے ہمیشہ فراق ہی پہنائے ہیں۔ نگلی ٹانگیں لئے وہ بھی تو یہاں آتی ہے.....“

”اسے تو دیکھ کر مت خوش ہوتے ہیں..... یہ پابندی درزی ہی کے لئے ہے.....“

”حد ہو گئی.....“

”کیا کیا جائے..... ویسے ہرج بھی تو کوئی نہیں.....“

”ہرج ہے نا.....“

”کیسے.....“

”ایسے کہ میں اس کے لئے اتنے پیارے پیارے فراک سلواتی ہوں۔ انہیں جاتکئے کے ساتھ پنہ تو کتنی پیاری لگے.....“

”اس طرح پیاری نہیں لگتی.....“

”یہ کب کہا میں نے.....“

”تو پھر.....“

”پھر“ ریشمینے ہنس دیتی۔

بات آئی گئی ہو جاتی..... لیکن کبھی کبھی ریشمینے کی سوچیں مستقبل تک پھیل جاتیں۔ وہ کچھ فکر مند سی ہو جاتی شہزی اور دیہاتی تہذیب میں بہت واضح فرق تھا..... گو وہ لوگ بھی ابھی تک دیہات سے منسلک تھے۔ رسم و رواج ادب آداب سے کئے نہیں تھے۔ لیکن اس کے باوجود اس کے بچے زر گل اور زری سے مختلف ماحول میں تربیت پا رہے تھے۔ یہ اختلاف یہ فرق وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا پھیلتا جائے گا..... پھر یہ رشتوں کا بندھن؟

بات یہ نہیں تھی۔ کہ ریشمینے کو رشتوں کا یہ بندھن پسند نہیں تھا۔ اسے فکر کبھی کبھی لگ جاتی تو اسی بات کی تھی..... کہ بچوں کا ماحول بالکل مختلف ہے۔ کیا شہری تربیت یافتہ بچے گاؤں میں اور گاؤں میں پلے بڑھے بچے شہریں فٹ ہو جائیں گے۔

اب بھی وہ زری کے فراک دیکھتے ہوئے یہی بات سوچ رہی تھی۔

اچانک اس کی سوچ کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ پرلے کرے سے شہباز کے چیخنے اور رونے کی آواز آ رہی تھی..... نواز بھی کچھ بول رہے تھے۔

وہ جلدی سے فراک بیڑ پر ہی پھینک کر اٹھی۔ دروازہ کھول کر کوریڈر میں آئی..... اور تیزی سے اس کمرے کی طرف لپکی.....

شہنو نواز کی گود میں تھی۔ اس نے شہباز کا ہوائی جہاز پکڑ رکھا تھا..... شہباز اپنا کھلونا اس کے ہاتھ سے لینے کے لئے ضد کرتے ہوئے روتے جا رہا تھا۔ نواز ٹس سے مس نہ ہو رہے تھے۔ بلکہ شہباز کو دھکا دے کر پرے ہٹا رہے تھے۔ اسے الٹاؤنٹ بھی رہے تھے۔

”کیا ہوا.....“ ریشمینے نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

”بی بی گل.....“ شہباز الٹی ہتھیلی سے ٹاک آکھیں پوچھتے ہوئے بولا ”شہنو میرا جہاز نہیں

دیتی.....“

”تو کیا قیامت آگئی.....“ ریشمینے کی بجائے نواز غصے سے بولے ”چھوٹی بہن ہے جہاز

لے لیا تو کیا ہوا.....“

”دے دو شہنو.....“ ریشمینے نے بیٹی سے کہا۔ شہنو جہاز سینے سے لگائے باپ

کے کندھے سے چٹ گئی.....

”نہیں دوں گی.....“ وہ چلائی..... ”بابا..... بابا.....“

ریشمینے نے اک جھٹکے سے اس سے جہاز چھیننا چاہا..... نواز نے اس کا ہاتھ جھٹک کر غصے

سے کہا..... ”خبردار..... جو شہنو سے چھینا..... اسے سمجھاؤ..... اتنا بڑا ہو گیا ہے۔ ضد کرنے لگتا ہے خواہ مخواہ.....“

”کھلونا تو اس کا ہے نا.....“ ریشمینے بولی۔

”اپنے کھلونوں کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتی.....“ شہباز چیخا اور پھر غصے سے اس پر چھٹا۔

نواز نے بازو سے اسے دھکا دیا وہ کرسی کے ہتھر پر جا گرا.....

”خان جی..... آپ.....“ ریشمینے کے چہرے سے غصہ عیاں تھا..... اس نے

آگے بڑھ کر شہباز کو اٹھایا اور گلے سے لگا کر پیار کرتے ہوئے بولی..... ”چپ ہو جا میرے بچے میں لے دوں گی تمہیں شہنو سے جہاز.....“

”شہنو نہیں دے گی.....“ نواز غصے سے بولے ”اس کی ضدیں پوری کر کر کے تم بگاڑ

رہی ہو اسے.....“

پھر وہ شہباز کی طرف خشکیں نگاہوں سے دیکھ کر بولے ”چپ ہو جا۔ ورنہ جان نکال لوں

گا..... آئندہ تو نے شہنو سے کوئی چیز لینے کی کوشش کی تو یاد رکھنا..... برا پیش آؤں گا“

شہباز سہم کر باپ کو دیکھنے لگا.....

ریشمینے کا دل کٹ کے رہ گیا.....

یہ کوئی پہلی بار نہ تھی.....

ایسا ہوتا ہی رہتا تھا۔ نواز شہنو اور شہباز دونوں کے باپ تھے۔ لیکن ان کو شہنو ضرورت

سے زیادہ ہی عزیز تھی۔ دونوں بچوں میں پیار بانٹنے میں بہت نمایاں فرق رکھتے تھے۔ شہنو کو تو ہتھیلی کا چھالنا

رکھتا تھا۔ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ اس کے منہ سے جوابات نکل جاتی اسے پورا کرنے میں لمحوں کی کوتاہی نہ

کرتے تھے۔

پچھلے ہی ہفتے کی بات تھی رات کے دس بج رہے تھے۔ شہزاد گئی شہنو کو اس کے کمرے میں سلائے کے لئے گئی تھی۔ اس کے کپڑے بدل کر رات کا لباس پہنا تھا۔ شہنو اپنی بڑی سی سونے جاگنے والی گڑیا کو ساتھ لے کر سویا کرتی تھی۔ اس دن جاگنے کیلئے وہن میں آئی۔ شہزاد گئی سے پوچھا ”اسی جان..... یہ گڑیا باتیں کیوں نہیں کرتی.....“

”یہ گڑیا ہے۔ گڑیا باتیں نہیں کیا کرتی.....“ شہزاد گئی نے جواب دیا۔

”کرتی ہے..... رنجوی گڑیا باتیں کرتی ہے“ اس نے ڈاکٹر اسلم کی بیٹی کی گڑیا دیکھی تھی وہ

کہیں سے یاد آگئی۔

”کرتی ہوگی۔ تمہاری گڑیا صرف سوتی اور جاگتی ہے۔“

”مجھے بابائے باتیں کرنے والی گڑیا کیوں نہیں لے کر دی“

”مجھے کیا پتہ..... بچے اب گڑیا کو رکھو اور سو جاؤ..... بی بی گل آگئیں تو غصہ کریں گی۔

تمہارے سونے کا وقت ہو گیا ہے“

”میں باتیں کرنے والی گڑیا لوں گی“

”اچھا ابھی لے لیتا۔ اب تو سو جاؤ.....“

”نہیں سوتی..... مجھے گڑیا چاہئے“

”اس وقت“

”ہاں.....“

”بچیا..... اس وقت کہاں سے لے دیں تمہیں گڑیا.....“

”بازار سے“

”بازار بند ہو جاتے ہیں اس وقت.....“

”رنجیو سے لے کر دو.....“

”پاکل ہو..... دوسروں سے کیسے لے دیں.....“

”بس لے دو.....“

شہنو ضد کرنے لگی۔ شہزاد گئی نے بڑا ہلایا پھسلا یا۔ اس کے کھلونوں کا ڈھیر سامنے لگا

دیا۔ چلنے والا بھالو..... اچھلے والا بندر..... چوں چوں کرنے والی چڑیاں بہت سی گڑیاں رہو پلاسٹک اور لکڑی کے بہت سے کھلونے تھے۔

شہنو نے لاتیں مار مار کر کھلونے پٹنگ سے نیچے گرا دیئے۔ اور چیخ چیخ کر رونے لگی.....

”رنجوی گڑیا لوں گی..... بولنے والی گڑیا چاہئے.....“

شہزاد گئی اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ پیار کیا۔ باتوں میں لگانے کی کوشش کی۔

ڈانٹا بھی..... تھپڑ بھی لگایا..... لیکن وہ اس کی سنتی کہاں تھی۔

اس کے رونے کی آواز سن کر نواز شب خوابی کے لباس میں ہی دوڑے آئے۔ بچی کو اٹھا کر

گلے سے لگالیا..... ریشمینے بھی چادر کی بکلی مارے آگئی۔

”کیا ہوا.....“ انہوں نے اسے چکارتے ہوئے پوچھا۔

شہزاد گئی نے بتایا ”بولنے والی گڑیا کیلئے ضد کر رہی ہیں.....“

”بولنے والی گڑیا چاہئے ہمارے بیٹے کو“ نواز نے پوچھا۔

”ہاں بابا..... میری گڑیا بولتی نہیں ہے رنجوی بولتی ہے۔ مجھے بھی ویسی گڑیا چاہئے.....“ وہ

مٹھیاں آنکھوں میں گھسا گھسا کر رونے لگی.....

”صبح لے دیں گے اپنے بیٹے کو جتنی گڑیاں کہے گی لے دیں گے“

”ابھی چاہئے.....“

”ابھی.....“

”ہاں ابھی.....“ وہ رونے لگی تو ریشمینے نے اسے تھپتھپایا ”شہنو بچے۔ اس وقت

قوتی رات ہو چکی ہے۔ صبح لے لیتا.....“

”نہیں..... ابھی لوں گی.....“ وہ جیٹی تو ریشمینے نے ہولے سے اس کی پشت پر تھپڑ لگایا۔

وہ زور سے چیختے لگی۔

”کیا کر رہی ہو.....“ نواز بولے ”پہلے ہی رو رہی ہے وہ تم اسے اور مار رہی ہو.....“

ریشمینے نے جلدی سے شہنو کو نواز سے لینے کو اس کا کندھا پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

بچی باپ کے کندھے سے چٹ گئی۔ نواز نے ریشمینے کا ہاتھ پرے کرتے ہوئے کہا ”تم تو

اس کی دشمن ہو.....“

”بگاڑ رہے ہیں آپ بچی کو“ ریشمینے نے کہا۔ تو نواز بچی کے بالوں میں پیار سے انگلیاں

پھیرتے ہوئے اس کے سرخ انکارہ سے گالوں کو چومتے ہوئے مسکرا دیئے..... پھر بولے ”پیار بگاڑنا نہیں سنواریا

ہے میڈم.....“

”بے جالاڈ پیار بگاڑ دیتے ہیں.....“ ریشمینے نے جل کر غصے میں پہلی بار زبان کھولی۔

نواز اس وقت اچھے موڈ میں تھے ہنس دیئے۔ شہنو ضد کے جارہی تھی۔ روئے جارہی تھی۔ چپ کرانے پر بھی چپ نہ ہو رہی تھی..... نواز لاڈ کے جارہے تھے ریشمینے کو غصہ آ رہا تھا۔ چچی اس کے پاس ہوتی تو اس نے اب تک اسے ہلکا بھی لیا ہوتا.....

لیکن شہنو بھی جانتی تھی کہ بابا اس کی بات مان لیتے ہیں۔ اسی لئے مسلسل روتے ہوئے ضد کے جارہی تھی.....

اس کی ضد نواز کیسے ٹالتے۔ کسی طرح بات نہ بنی تو بولے ”چلو تمہارے لئے گڑیا لے آئے ہیں.....“

”اس وقت“ ریشمینے اور شہزاد گئی نے کہا۔
”کیا ہوا..... ابھی دس ہی بجے ہیں..... بازار کھلا ہو گا..... نہ کھلا ہوا۔ تو اسلم کے ہاں چلے جائیں گے رات بھر کے لئے گڑیا مانگ لائیں گے.....“

”اوہ خدایا“ ریشمینے نے ماتھے پر ہاتھ مارا.....
نواز کپڑے بدلنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ریشمینے نے شہنو کو ڈانٹ پلائی۔ چٹکی بھی کاٹی۔ سو جانے کے لئے کہا۔ لیکن بیسود.....

نواز آگئے..... شہنو کو فر کا کوٹ اور ٹوپی پہنائی..... ریشمینے کو بھی ساتھ جانا پڑا..... گورا بازار اور صدر کی دکانیں اکاد کا کھلی تھیں۔ مطلوبہ گڑیا کہیں سے نہ ملی۔ تو نواز گاڑی اسلم کے ہاں ریشمینے کے منع کرنے کے باوجود لے گئے۔

ریشمینے اور شہنو گاڑی ہی میں بیٹھے رہے نوازی اتر کر اندر گئے۔
جب وہ رنجو کی گڑیا لے کر لوٹے تو شہنو ماں کی گود میں سوچتی تھی۔
”یہ واپس ہی کر آئیں شہنو سو گئی ہے“ ریشمینے نے کہا۔
”نہیں صبح اس کی گڑیا لے آئیں، تب واپس کریں گے۔ رات کو جو اٹھ گئی تو پھر ضد کرے گی“

ریشمینے چپ ہو گئی۔

کھلونے نواز شہزاد کو بھی دلاتے تھے۔ اسے بھی باہر گھمانے لے جایا کرتے تھے۔ لیکن اس کی ضد ان سے برداشت نہیں ہوتی تھی..... اور جب بھی وہ کسی چیز کے لئے ضد کرتا۔ وہ غصے میں آجاتے..... اس کی ضد کی ساری ذمہ داری ریشمینے پر دھرو دیتے.....

”تم اسے خراب کر رہی ہو۔ یہ لڑکا ہے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ ذرا اسی بات پر

روئے لگتا ہے۔ بے کاری ضدیں کرتا ہے۔ اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔ لڑکے کو اس طرح نہیں پالنا چاہئے.....“

ریشمینے چپ ہو جاتی۔ ان کی باتوں کے جواب تو اس کے پاس ہوتے تھے۔ لیکن نواز کے سامنے کھل کر بولنے کی اسے کبھی ہمت نہ ہوئی تھی۔

شہزاد باپ کے شہنو سے ترجیحی سلوک کو اب سمجھنے لگا تھا۔ کئی بار وہ دانستہ بد تمیزی کرتا۔ باپ کا کہنا نہ مانتا ڈھیٹ بن کے کھڑا رہتا..... مار بھی کھاتا..... پھر بھی ڈھٹائی نہ چھوڑتا..... شہنو سے تو اب چڑنے لگا تھا۔ موقع ملتا تو اس کی خوب پٹائی بھی کر دیتا..... اس کے کھلونے توڑ دیتا شہنو داویلا چاتی اور اس وقت تک چائے رکھتی..... جب تک بابا اس کی پٹائی یا کھلونے ٹوٹنے کا بدلہ شہزاد کے کان کھینچ کر یا ڈانٹ ڈپٹ کرنے لے لیتے۔

ریشمینے بچاری کڑھتی رہتی۔ کبھی کبھی نواز کا موڈ اچھا دیکھتی تو شکی انداز میں کہہ دیتی
”آپ شہزاد سے اچھا سلوک نہیں کرتے.....“
”پاگل ہو..... کیا وہ میرا بیٹا نہیں.....“
”سو تیلے بیٹی کی طرح.....“
”بکو اس مت کرو..... شہزاد میرا بیٹا ہے مجھے پیارا ہے۔ صرف اس کی ضد اور ہٹ دھرمی پر غصہ آتا ہے“

”کبھی جاننے کی کوشش بھی تو کریں وہ ایسا کیوں کرتا ہے“
”جانتا ہوں۔ شہنو سے حسد کرتا ہے“
”شہنو کو آپ بہت سرچڑھا لیتے ہیں“
”بیٹی ہے وہ..... پرانی ہو جائے گی..... پرانی تو ہو بھی چکی ہے۔ کتنے سال اور رہے گی ہمارے پاس۔ شہزاد تو کہیں نہیں جائے گا۔ یہاں ہے اور یہیں رہے گا.....“
”وہ ضدی اور سرکش ہوتا جا رہا ہے“

”سب تمہاری وجہ سے.....“

”آپ کی وجہ سے“

”میں اس کا ہر طرح خیال رکھتا ہوں.....“

”بالکل بھی نہیں.....“

”تو تمہارا کیا خیال ہے اسے گود میں لئے پھرا کروں..... سکول جاتا ہے وہ اب بڑا ہو گیا

”ہے۔“

”آپ۔۔۔۔۔“

”تمہارے وہم کو میں دور کیسے کروں۔۔۔۔۔ وہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ ہٹ وھرم اور ضدی ہے ذرا۔۔۔۔۔ ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔۔۔ شہنو سے جلتا ہے بس۔۔۔۔۔ حالانکہ میں اسے بھی جو چیز کتا ہے لے کر دیتا ہوں۔ سائیکل نہیں لے کر دی کل؟ ایک بار اس نے کہا۔ اسی وقت ولادی میں نے۔۔۔۔۔“

ریشمینے کو خاموش ہونا پڑتا۔۔۔۔۔ نواز کا موڈ بدلتے دیر بھی تو نہ لگتی تھی۔ ہنستے ہنستے غصے میں بھی بھر جایا کرتے تھے۔۔۔۔۔ سیدھی سادی باتیں کرتے کرتے اچانک ہی بھڑک بھی اٹھتے تھے۔ مزاج کے خلاف زیادہ باتیں سننے کے عادی نہیں تھے۔ رعب اور دبدبہ ان کی سرشت میں تھا۔ گھر میں ان کی حیثیت حکمران کی سی تھی۔ ان کے اصولوں سے ٹکر لینے کی کسی میں نہ تو جرأت تھی۔ نہ ہی اجازت۔ ان کا حکم قانون کی سی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ کبھی کبھی بڑی موج یا رنگ میں ہوتے تو ریشمینے کو کھل کر بات کرنے کی رعایت دے دیتے۔۔۔۔۔ عام حالات میں تو وہ کچھ کہنے سننے کی جرأت ہی نہ کر پاتی تھی۔

وقت کے ساتھ ساتھ ان کی سخت خوئی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔۔۔۔۔ ریشمینے ان سے بہت ڈرتی تھی۔۔۔۔۔ شہباز سما اور خوف زدہ ہوتا جا رہا تھا۔۔۔۔۔ نوکروں چاکروں کو تو سپیل ہی دم مارنے کی مجال نہ تھی۔۔۔۔۔ گھر کی فضا کبھی کبھی تو بڑی گھٹن زدہ ہو جایا کرتی تھی سب ان سے دبتے تھے۔

ہاں

اک شہنو تھی۔۔۔۔۔ جس کے سامنے انہیں دم مارنے کی مجال نہ تھی۔۔۔۔۔ چھوٹی سی بچی کا حاکمانہ رویہ بھی انہیں بے پناہ خوشیاں دیتا تھا۔۔۔۔۔

شہنو کی ہر فرمائش پوری ہوتی۔

شہباز اس سے واقعی جلتے لگتا۔۔۔۔۔

اور ریشمینے بچوں کے باہمی رویے سے خوف زدہ ہو جاتی۔۔۔۔۔ اگر یہی جذبے پر دان چڑھتے گئے تو کیا ہو گا۔۔۔۔۔؟

ایک دفعہ اس نے اسی خوف کو نواز کے سامنے بھی ظاہر کیا تھا۔ تو وہ ہنس دیے تھے۔

”خواہ خواہ کے فکروں میں نہ رہا کرو۔۔۔۔۔ دونوں بہن بھائی ہیں۔۔۔۔۔ لڑتے جھگڑتے ہیں تو بیار بھی بہت کرتے ہیں۔۔۔۔۔ اس دن دیکھا نہیں تھا۔ شہنو گر گئی تھی۔ تو شہباز کس طرح چیخ چیخ کر رو دیا تھا۔۔۔۔۔ اس کے پاؤں سے جہاں خون نکلا تھا۔۔۔۔۔ چوم چوم کر بے حال ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ اور پچھلے مہینے جب شہباز کو بخار آ گیا تھا تو شہنو اس کے پلنگ سے دور نہ ہوئی تھی۔۔۔۔۔ کتنا پیار کرتی تھی اسے۔۔۔۔۔ یہ سب بچپن کی باتیں ہیں۔ خون

کے رشتوں میں پیاری کا تو بندھن اٹوٹ ہوتا ہے۔۔۔۔۔“

نواز نے بھی ٹھیک ہی کہا تھا۔ ریشمینے کیا کہتی۔

پھر

نواز کا رویہ تبدیل تھوڑا ہی ہوا تھا۔۔۔۔۔ لاڈلی بیٹی کی ناز برداریاں کرنا ہی تھیں۔۔۔۔۔ انہیں کون منع کر سکتا تھا۔۔۔۔۔ ناز برداریاں کرتے وہ شہباز کی حق تلفی بنا احساس کئے کر جاتے تھے۔۔۔۔۔ آج بھی یہی ہوا تھا۔۔۔۔۔ شہنو اس کا جہاز سینے سے لگائے مزے سے باپ کی گود میں چڑھی بیٹھی تھی۔۔۔۔۔ شہباز اپنے کھلونے کے پیلے رو رہا تھا۔ جھپٹ رہا تھا۔۔۔۔۔ اور الٹا ڈانٹ کھا رہا تھا۔۔۔۔۔

ریشمینے شہباز کا ہاتھ پکڑے باہر چلی آئی۔ نواز سے ٹکرا کر نے کا فائدہ بھی تو کوئی نہیں تھا۔۔۔۔۔ بچے ہی کو ہسلا پھسلا کر چپ کرانا تھا۔۔۔۔۔

موٹے موٹے زیور پہنے ہوئے تھے۔ کانوں میں بڑے بڑے بالے..... کئی کئی زنجیروں والے ہار..... جوان عورتوں نے تو ماتھے پر بھی چاندی کی داؤنیاں (ماتھے پر لگانے والا چوڑی پٹی کی طرح کا زیور) پہنی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں گل خار ڈالا ہوا تھا۔ اور تھوڑی ماتھے گالوں پر کھدے سبز سبز توڑے نمایاں کئے ہوئے تھے۔

بہت گہما گہمی تھی۔

بڑی ہلا کلا تھی۔

بیحد شور شرابا تھا۔

برسوں بعد حویلی میں اتنی چل پھل اور رونق دیکھنے میں آئی تھی۔ تمنا تو خان خوشدل خان مرحوم کی تھی۔ لیکن وہ زندگی میں یہ نہ دیکھ سکے۔ اب انہی کی آخری خواہش پوری کی گئی تھی..... ان کی فتیدگی کا ماتی سال گزارنے کے بعد آغا بی بی نے یہ تقریب منانے کا سوچا تھا۔

انہوں نے اس خواہش کا مصور خان اور تکینے سے اظہار کیا تھا.....

”میں چاہتی ہوں۔ جیسا تمہارے بابا چاہتے تھے..... بچوں کی معنی کی تقریب دھوم دھام سے کروں..... تمہارا کیا خیال ہے.....“

تکینے جھٹ سے بولی ”جی آغا بی بی..... میں بھی یہی چاہتی ہوں..... ویسے بھی اک عرصہ ہو گیا حویلی میں کوئی ہلا کلا نہیں ہوئی.....“

مصور خان نے مسکرا کر بیوی کو دیکھا اور بولے ”تمہیں تو سوائے ہلا کلا کے اور کچھ سوجھتا ہی نہیں.....“

”وہ حق بجانب ہے بیٹے..... گاؤں میں رہنے والوں کے لئے ایسی تقریبیں ہی توفیق کا باعث ہوتی ہیں.....“

”اب تکینے تو یہ بات نہیں کہہ سکتی نا آغا بی بی.....“

”کیوں خان جی.....“

”بھی تم اب آئے دن شہر گئی ہوتی ہو..... وہاں شادیوں میں پارٹیوں میں ریشمینے کے ساتھ جاتی رہتی ہو..... تم نے تو خیر سے سینا بھی دیکھ لیا ہے۔ اور اس دن مینا بازار بھی گئی ہوئی تھیں.....“

تکینے مسکرا کر بولی ”ہائے ہائے..... کیسے ایک ایک چیز نوٹ کر رکھی ہے.....“

”میں تو آغا بی بی کی بات کا جواب دے رہا تھا..... گاؤں کی اور عورتوں کے لئے یہاں تقریب تفریح ہوتی ہوگی۔ تمہارے لئے نہیں.....“

”تو پھر نہ کی جائے معنی کی تقریب.....“

حجرے اور حویلی میں بڑی گہما گہمی تھی۔ حجرے میں آدھی رات تک گانا بجانا ہوتا رہا تھا۔ خشک ڈانس ہوا تھا۔ لوہو اور ٹپے گائے گئے تھے۔ لختیاں ناچی تھیں..... ڈھولک سرنٹے والوں نے ساں باندھا تھا..... شہر سے بہت سے لوگ آئے تھے۔ اپنے اور دوسرے گاؤں سے خان ٹوائین مدعو ہوئے تھے..... خاصی بڑی تقریب تھی۔ مہمانوں کی خاطر تواضع میں کوئی کمی نہ رکھی گئی تھی۔

سج کئے جن پر چربی کی ہلکی سی تہہ چڑھی تھی اور روسٹڈ دنبے ضیافت میں پیش ہوئے تھے..... ساری رات خوشبودار قہوے کے دور چلتے رہے تھے..... بڑھیا تمباکو چلموں میں بھر بھر کر مہمانوں کو پیش کیا جاتا رہا تھا.....

حویلی کے اندر بھی ڈھولک بجی تھی..... خدمت گاروں نے ڈھولک کی تھاپ پر رقص کیا تھا۔ خوب ہلا کلا ہوئی تھی..... پھول برسائے گئے تھے..... شور شرابا چلتا تھا۔ اہل خانہ مہمانوں کی خاطر تواضع میں مصروف تھے.....

ریشمینے اور تکینے خوبصورت ریشمی لباسوں میں ملبوس بھاری بھاری طلائی زیورات پہنے ادھر ادھر پھر رہی تھیں..... ایک ایک مہمان عورت کی احوال پرسی کر رہی تھیں۔

”خیر سے آئیں“ وہ اپنا مخصوص روانہ خیر مقدی جملہ ہر مہمان عورت سے کہہ رہی تھیں۔

”خیر ہو.....“ جو ابائیں کہتیں۔

خدمت گاریں بھی دونوں بیبیوں کے ساتھ مہمانوں کی احوال پرسی اور دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ کسی کو چائے کسی کو قہوہ پیش کر رہی تھیں۔ آج خدمت گاروں نے بھی پھولدار لٹن کی پشتوازیں گلابی زر گوت لگی کالی چادریں سروں پر ڈالی ہوئی تھیں..... بالوں میں تیل ڈال کر مینڈھیاں کی ہوئی تھیں۔ چاندی کے

”یہ کب کہا میں نے.....“

”یہ تمہارے باپ کی خواہش تھی بیٹے.....“

”تو ضرور پوری کیجئے.....“

”نواز خان سے بھی صلاح کر لیں.....“

”آپ کا حکم سر آنکھوں پر آغالبی بی..... اسے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی ایک بڑی

دعوت کا اہتمام کرنا ضروری ہے آغالبی بی.....“

”کیوں تمکینے نے پوچھا۔“

”بہت سے لوگوں کو مدعو کرنا چاہتا تھا میں..... چلو اسی تقریب میں اکٹھا کر لیں گے سب

کو.....“

”آپ کس خوشی میں لوگوں کو مدعو کرنا چاہتے تھے.....“ تمکینے نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

خان نے پیار بھری نگاہ اس پر ڈالی اور پھر کچھ شوخ سے لہجے میں بولے..... ”تمہاری طرح میرا

دل بھی ہلا گلا کرنے کو چاہ رہا تھا.....“

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستے ہوئے جھک گئی..... ”جگ کما خان جی..... میرا دل واقعی کچھ کچھ دقنوں

کے بعد ہلا گلا کرنے کو جھل اٹھا ہے..... بہت مزہ آتا ہے سب کو اکٹھا کر کے کتنی سرور سی گما گئی ہوئی

ہے..... ہیں نا آغالبی بی.....“

”جی بیچے..... ٹھیک کستی ہو..... زندگی کی نعمی منی خوشیاں سینٹے کا تمہیں پورا حق ہے“

”کیوں خان.....“

”جو کوسوچ.....“

”تو پھر ہو جائے نادھوم دھڑکے سے بچوں کی مگنی کی تقریب.....“

”گلتا ہے آغالبی بی کو تم نے ہی.....“

”نہیں بیچے.....“ آغالبی بی ان کی بات کاٹتے ہوئے بولیں..... ”یہ تجویز میں نے ہی

سوچی تھی۔“

تمہارے بابا کی خوشی اور خواہش تھی..... پھر میں نے بھی یہی سوچا کہ یہ خوشی دیکھ ہی لی

جائے..... ان بچوں کی شادیوں تک کیا خبر میں بھی ہوتی ہوں یا.....“

”اللہ..... آغالبی بی جانے.....“ تمکینے ان سے لپٹ گئی ”ایسی باتیں منہ سے نہ

نکالیں خدا آپ کو اتنی لمبی زندگی دے کہ آپ ان بچوں کے بچوں کی بھی خوشیاں دیکھیں.....“

”آمین.....“ صبور خان بولے۔

آغالبی بی نے پیار بھری نگاہ ان دونوں پر ڈالی..... ان کی باتوں میں خلوص اور پیار کی منک

تھی..... وہ خوش ہو گئیں..... عقیدت و احترام کی جس سطح کی ان کی شخصیت متقاضی تھی انہیں مل رہا تھا.....

فرمانبردار اور تابعدار اولاد جن والدین کا مقدر ہوتی ہے۔ وہ خوش بختی کی انتہاؤں کو چھو لیتے ہیں۔ ان کے بغیر خرو

انبساط سے زمین پر نہیں نکلتے وہ جھلکے جھلکے خوش رنگ پرندوں کی طرح فضائے بسیط میں اڑتے پھرتے ہیں۔

بچوں کی مگنی کی باقاعدہ رسم کرنے کا فیصلہ آغالبی بی نے کیا تھا۔ صبور کی طرح نواز بھی راضی بہ

رضا ہوئے تھے.....

”جو آپ چاہیں کریں آغالبی بی..... ہم سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ اس

طرح ہمیں گناہ گار نہ کیا کریں.....“

”تمہاری سعادت مندی ہے جو یوں سوچتے ہو قربان جاؤں“ آغالبی بی نے دعائیں دیتے ہوئے

کہا۔

”یہ ہمارا فرض ہے آغالبی بی..... آپ نے ہمیں پالا پوسا جوان کیا۔ شادیاں کیں۔ پاؤں پر

کھڑا کیا۔ ہم نے جو کچھ سیکھا ہے آپ ہی سے سیکھا ہے.....“

”جیتے رہو..... جیتے رہو.....“

بات طے ہو گئی..... مگنی کا دن مقرر کر کے آغالبی بی تمکینے اور ریشمینے تیار یوں میں

مصروف ہو گئیں.....

دونوں بچوں کیلئے خوبصورت روایتی لباس تیار کروائے گئے۔ سبز رنگ کی بناری پٹو اڑیں جن

کی آستینوں اور گھیروں پر سچے طلے کی شرے کی پٹیاں لگائی گئی تھیں..... اور جن کے گریبانوں پر سونے کے

پترے نما گول گول نکلے گئے تھے۔ سرخ گھیردار تنگ موری کی کھواب کی شلواریں اور سروں پر ڈالنے کے لئے

گوشی طلے سے بھری اوڑھنیاں بنوائی گئی تھیں..... طلے دار جوتیاں منگوائی گئی تھیں..... لڑکوں کے لئے بھی روایتی

لباس ہی بنے تھے..... کھلے کھلے پائینچوں والی گھیردار شلواریں..... کھلے گھیر والے کرتے..... طلے کی ڈوری

والی مٹلیں و اسکٹیں اور ٹوپیاں بطور خاص بنوائی گئی تھیں..... گلے میں ڈالنے کے لئے مصنوعی کارٹوسوں اور

پتوں والی چڑے کی پیشیاں بھی بنوائی گئی تھیں.....

بچوں نے یہ لباس پہنے تو خوشی سے پھولے نہ سہائے..... زر گل تو کچھ سمجھدار تھا شہباز بھی نا سمجھ

نہیں تھا..... لیکن زری اور شہنو بالکل ہی معصوم بچیاں تھیں..... ایسے چمکیلے بھڑکیلے لباس پہن کر اترا تھی پھر رہی

تھیں..... انہیں ریشمینے نے سجایا سنوارا تھا..... زری کے بال لہے تھے۔ ریشمینے نے اس کی بہت سی

مینڈھیاں نما چوٹیاں گوندھی تھیں..... جو اس کے خوبصورت چہرے پر بہت اچھی لگ رہی تھیں..... بالوں ہی کے ساتھ اس نے سونے کے بالے لٹکا دیے تھے۔ ننھے ننھے کان یہ بار نہ اٹھا سکتے تھے۔

شہنو کے بال کٹے ہوئے تھے۔ اس نے زری کی چٹیاں دیکھیں تو ہند کرنے لگی۔

”بی بی گل میری بھی مینڈھیاں بنائیں.....“

”تمہارے بال لمبے نہیں ہیں نائیٹ.....“

”کیوں نہیں ہیں.....“

”کٹے ہوئے ہیں.....“

”کیوں کٹے تھے.....“

”اودہ خدایا.....“

وہ ہند کر رہی تھی..... تمکینے اودہ آگئی تو پوچھا ”کیا ہوا۔ کیوں تنگ کر رہی ہو ریشمینے

میری بیٹی کو“

”بھابی۔ آپ اس کی اس طرح طرفداری نہ کریں۔ بہت ضدی ہے.....“

”بھی یہ ہماری بیٹی ہے ہم کیوں نہ اس کی طرفداری کریں.....“ وہ پٹنگ پر ریشمینے کے

برابر بیٹھ گئی اور شہنو کو اپنی طرف کر کے دونوں ٹانگوں کے درمیان کھڑا کر لیا۔

”اب بتاؤ..... کیا چاہئے.....“

”چٹیاں..... ویسی.....“ اس نے پٹنگ کے پائے کے ساتھ کھڑی زر نگار کی طرف اشارہ کیا

”زری کی طرح.....“ تمکینے نے پوچھا۔

”ہاں.....“

”لیکن تمہارے بال بہت چھوٹے ہیں بچے.....“

”بس میں بھی ویسی چٹیاں کر دوں گی.....“

”اچھا ٹھہرو میں کرتی ہوں.....“

تمکینے انھی اور دوسرے کمرے سے کالی سائٹ اور قینچی لے آئی۔ اس نے سائٹ کی پٹیاں سی

کاٹ کاٹ کر پراندے بنائے..... اور پھر جتنے تھوڑے تھوڑے بال ہاتھ میں آسکتے تھے..... ان کی چٹیاں بنا کر

پراندے ڈالتی گئی۔ پراندوں کے سرے اس نے بالوں میں اچھی طرح گوندھ دیئے تھے اور لمبی لمبی چٹیاں سائٹ کی

پٹیوں سے گوندھ کر بنادی تھیں۔ شہنو خوش ہو گئی اب اس کے سینے پر بھی چٹیاں لہرا رہی تھیں..... تمکینے نے

اس کا منہ سر جو ما اور بولی ”بس اب خوش.....“

ریشمینے مسکراتے ہوئے بولی ”اس کی ضدیں یوں پوری کرنے لگیں ناتو.....“

”تو کیا.....“ تمکینے نے پھر بچی کو باریا کیا..... ”اتنی پیاری بیٹی کی ضدیں پوری کرنے میں

بھی اک مزہ ہے.....“

”زری اس سے بالکل مختلف ہے“ ریشمینے نے پاس کھڑی زری کو بازو کے حلقے میں لے

کر اس کا سر سینے سے لگاتے ہوئے کہا ”شکر ہے میری بیٹی اس جیسی ضدی نہیں.....“

”یہ تو بالکل ہی گائے ہے“ تمکینے نے پیار بھری نظر بچی پر ڈالی..... ”اور جو بچ پوچھو نا

ریشمینے تو میرا جی بھی چاہتا ہے کہ زری بھی شہنو کی طرح ہو..... شوخ شرارتی ضدی..... الٹو.....“

”ہائے بھابی..... بس کریں..... میری بیٹی زری جیسی ہے نا اسے ایسا ہی رہنے دیں.....“ اس

نے زری کی پیشانی چوم لی..... ”کبھی ضد نہیں کرتی۔ بے جاشوئے بھی نہیں۔ ابھی سے اتنی سنبھلی سنبھلی ٹھہری

ٹھہری سی ہے.....“

تمکینے کے دونوں بچے یحسد سلجھے ہوئے تھے..... ریشمینے انہیں دیکھتی تو رشک آتا.....

زرگل بہت تہذیب یافتہ بچہ تھا..... زری بھی بڑی اچھی عادتوں والی بچی تھی..... صبور خان تعلیم یافتہ تھا نہ تمکینے

کوئی خاص پڑھی لکھی تھی۔ اس کے مقابلے میں وہ دونوں پڑھے لکھے تھے۔ لیکن بچوں کی تربیت ویسی نہیں ہو

رہی تھی جیسی ان دیہاتی بچوں کی تھی..... فرق اتنا واضح اور نمایاں تھا..... کہ ریشمینے کبھی کبھی سوچ میں پڑ جایا

کرتی تھی.....

اب بھی وہ تمکینے سے یہی باتیں کر رہی تھی.....

تمکینے نے ہنس کر کہا ”جامزہ..... مجھے تو تمہارے بچے اچھے لگتے ہیں.....“

”یہ بھی اچھی بات ہے دونوں کا پالا آپ ہی سے پڑتا ہے۔ اسی بات پر قائم رہئے گا..... کل کو

کوئی شکایت نہ سنوں میں“ وہ ہنس کر بولی۔

”ایسا کبھی نہیں ہو گا ریشمینے.....“

”خدا کرے.....“

دونوں بچیاں ایک دوسری کا ہاتھ پکڑے باہر نکل گئیں۔ ریشمینے اور تمکینے بھی انھیں۔

سمان آرہے تھے..... وہ ان کا استقبال کرنے لگیں۔

رات کھانا کھانے سے پہلے مگنی کی رسم ادا کی گئی۔

شہنو کو زرگل کے پہلو میں بٹھایا گیا اور زری کو شہباز کے۔ آغا بی بی نے بڑے بڑے سونے

کے ہار دونوں بچیوں کے گلے میں ڈالے۔ زرگل اور شہباز کی انگلیوں میں لال لال ادھچے گلوں والی موٹی موٹی

انگوٹھیاں پہنائیں..... انگوٹھیاں کھلی تھیں۔ انہیں دھاگے پیٹ پیٹ کر ان انگلیوں کے لئے فٹ کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہ اب بھی خاصی کھلی تھیں..... لیکن یہ شکن تھا بطور نشانی یہ انگوٹھیاں انہیں پہنانا تھیں.....

بچے بہت خوش تھے۔ عورتیں اور خاندان کے مرد گھر والوں کو مبارکباد دیتے ہوئے بچوں کو سلامیاں بھی دے رہے تھے..... شور مچا ہوا تھا..... ڈھولک بج رہی تھی۔ خدمت گاریں ناچ رہی تھیں.....

حویلی سے باہر آتش بازی چھوڑی جا رہی تھی۔ اور ڈھولک سر تنے والے لوگ دھنیں بجا رہے تھے۔ ایک طرف لختیاں ناچ رہی تھیں۔

آغا بی بی نے دونوں جوڑوں کی پر مسرت زندگی کے لئے دعا کی..... سب نے آمین کہا بچے اب نچلے نہیں بیٹھ پارے تھے..... پٹاخوں کی آواز پر تو شہباز اٹھ دوڑا..... شہنوں نے بھی زری کا ہاتھ پکڑا اور زر گل کو کندھے سے پکڑ کر بولی ”آؤ باہر چلتے ہیں“ وہ سب باہر بھاگ گئے۔ نواز اور صبور خان گلے ملے۔ ہمکنینے اور ریشمینے نے دوپٹے بدلے..... رشتہ داروں کے اصرار پر ہمکنینے، ریشمینے نے ڈھولک کی ڈاؤم پر خشک ناچ کیا۔ جس میں ہتے ہتے نواز اور صبور خان بھی شریک ہو گئے۔

”ہلا.....“

”لوٹے“

”شاباب.....“

ارد گرد کھڑے لوگ تالیاں بجا بجا کر انہیں داد دے رہے تھے۔ خوشی کا موقع تھا۔ من آپوں آپ ناچ اٹھے تھے..... آغا بی بی ان پر سے ویلیں دار وار کر خدمت گاروں کی جھولیاں بھر رہی تھیں۔ دوسرے رشتہ دار بھی ان کی تقلید کر رہے تھے۔

.....

ہوں.....“

ترور نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا ”سیدو اشرف ہمکنینے گل ہری کو کوار ٹروں سے بلا لاتی

”نہیں میں ان کے ساتھ کھیلوں گی“ وہ محلے کی بچیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

ترور اسے اندر لے جانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ ڈانٹا

بھی..... لیکن وہ اپنی سیلیوں کی طرف بھاگی.....

لیکن

۲۴

زری اپنی ہم عمر بچیوں سے گلی میں کھیل رہی تھی۔ اس کی ترور کچی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے

کھڑی تھی۔

”زری جانے“ اس نے کہا۔

”کیوں ترورے“ زری نے دوڑتے ہوئے پوچھا۔

”بس بی بی..... اب کھیل بند کرو.....“

”کیوں“

”آغا بی بی نے کہا تھا جلدی واپس آ جانا.....“

”تھوڑی دیر اور.....“

”وہ مجھ پر غصہ کریں گی.....“

”نہیں کرتیں..... میں ابھی کھیلوں گی“

”حویلی کے صحن میں چل کر کھیلو.....“

”کس کے ساتھ کھیلوں.....“

پھر کچی سرک کے پتوں بچ کھڑی ہو گئی۔ دور سے اس نے گاڑی آتے دیکھ لی تھی۔

”ترورے اور ترورے“

”کیا ہے.....“

”چاچا کی گاڑی آئی ہے“

ترور نے آنکھوں پر ہاتھ کاچھا سبایتا کر ادھر دیکھا اور بولی ”ہاں انہی کی گاڑی لگتی ہے خان آئے ہوں گے..... وہ علی گل خان قتل ہو گیا ہے..... اس کے جنازے کے لئے آئے ہوں گے.....“

زری اس کی بات سے بغیر گاڑی کی طرف دوڑی.....

ترور نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ کر سرک کے درمیان سے ہٹا کر اپنی طرف کر لیا۔

زری نے دور ہی سے دیکھ لیا نواز ریشمینے اور بچے بھی گاڑی میں تھے۔ وہ خوشی سے تالیاں بجاتے ہوئے چلائی ”آپا..... شہنو اور شہباز لالہ بھی آئے ہیں.....“

ترور نے مسکرا کر اسے دیکھا اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی گاڑی حویلی کے پھانک کے آگے

جاری.....

زری اپنا ہاتھ چھڑا کر ادھر بھاگی.....

”شہباز لالہ“ اس نے شہباز کو آواز دی۔ جو سب سے پہلے دروازہ کھول کر باہر نکل رہا

تھا.....

زری دوڑ کر اس سے لپٹ گئی..... پھر شہنو کا ہاتھ پکڑ لیا.....

وہ ان کے آنے سے بہت خوش تھی۔

”چاچا چاچی کو سلام نہیں کرو گی“ نواز خان نے زری کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے مسکرا کر

کہا۔

زری دوڑ کر ان سے لپٹ گئی..... ریشمینے نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ جھک کر پیشانی پر

بوسہ دیا۔

زری ان کے آنے سے بہت خوش ہوئی..... بھاگی بھاگی حویلی کے اندر آئی۔ دوڑتے ہوئے صحن

عبور کیا اور ان کے آنے کی خوشخبری سب سے پہلے آغا بی بی کو سنائی۔

تمکینے پچھلے صحن میں تھی۔ زری نے اسے بھی بتایا.....

”شکر ہے“ تمکین نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”شہنو اور شہباز بھی

ساتھ آگئے..... تیرے ساتھ کھینے کیلئے.....“

”چلو نا بی جان چاچا اور چاچا بھی آئے ہیں.....“

”چلو“

تمکین نے زری کے ساتھ چلی آئی۔ سب بڑے دالان میں آغا بی بی کے پاس آچکے تھے۔ بشگیر ہو کر

احوال پرسی کر رہے تھے۔

”پہ خیر..... پہ خیر.....“ تمکین نے آتے ہی خوش آمدیدی الفاظ کہے۔

نواز اور ریشمینے نے اسے سلام کیا۔ ریشمینے سے وہ گلے ملی۔ پھر بچوں کو پیار کیا

تھوڑی دیر بعد نواز باہر چلے گئے۔

”زری کی تو عید ہو گئی.....“ تمکین نے ہنس کر کہا..... ”بہت یاد کرتی ہے شہنو اور

شہباز کو.....“

”ہم بھی بہت یاد کرتے ہیں بی بی جان“ شہنو زری سے لپٹ گئی۔

”میں تو کوئی نہیں کرتا.....“ شہباز نے کندھے اچکائے۔

”پھر آئے کیوں ہو“ شہنو نے جلدی سے کہا۔

”بس آیا ہوں“ وہ رعب سے بولا.....

”بڑے آئے۔ روز بابا سے کہتے تھے گاؤں جاؤں گا.....“

”میں نہیں کہتا تھا.....“

”بھی تم لو نہیں.....“ آغا بی بی نے پیار سے دونوں بچوں کی طرف دیکھا۔

”یہ ہے ہی لڑا کا.....“ شہنو بولی۔

”کم تو تم بھی نہیں ہو“ ریشمینے نے مسکرا کر کہا۔

”شہباز لالہ.....“ زری نے آگے بڑھ کر شہباز کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”پھر شہباز لالہ کتنی ہے مجھے.....“ شہباز نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”تو کیا کہوں.....“ زری سسم گئی۔

”خالی شہباز.....“

”کیوں“

”بس“

”شہنو بھی تو ہمیں شہباز لالہ کہتی ہے“

”میں اس کا لالہ ہوں۔ وہ میری بہن ہے“

”اور میں تمہاری بہن نہیں ہوں“

”نہیں.....“

”کیوں نہیں.....“ زری نے منہ بسورا۔

”تمہاری مجھ سے شادی ہوگی۔ تم میری نادے (دلہن) ہو.....“

شہباز کی بات پر آغا بی بی ہنسنے اور ریشمینے سب کھلکھلا کر ہنس دیں..... تو شہباز نے شرما کر سر جھکا لیا۔

زری نے خوش ہو کر تالی بجائی..... ماں کی طرف دیکھا اور بولی ”بی بی جان..... میں ناوے ہوں گی..... جیسے گل ماں کی ناوے.....“

ہفتہ بھر پہلے ہی زری کے گل ماں کی شادی ہوئی تھی..... دلہن ماں سے بہت اچھی لگی تھی.....

”چلو جاؤ سب کھیلو جا کر..... ایسی باتیں نہیں کرتے.....“ ریشمینے نے بچوں سے کہا۔

”آؤ زری“ شہنو نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

”تم بھی آؤ نا.....“ زری نے شہباز سے کہا۔

”میں تم سے نہیں کھیلوں گا.....“ وہ غصے اور رعب سے بولا۔

”اس کا مزاج کیوں بگڑا ہوا ہے“ آغا بی بی نے ریشمینے سے پوچھا۔

”بس..... کیا بتاؤں آغا بی بی جانے۔ باپ کی طرح اس کے مزاج کا بھی تو پتہ نہیں چلتا..... اچھا

بھلا آیا ہے گھر سے..... شہنو سے راستے میں لڑائی ہو گئی تھی۔ اس سے موڈ خراب ہو گیا..... چلو بچو جاؤ باہر جا کر کھیلو.....“ بچے باہر چلے گئے تو کھینے نے کہا۔

”نواز نے کچھ کہا ہو گا.....“

”آپ تو جانتی ہیں شہنو اور شہباز کی لڑائی ہو۔ تو مورد الزام کون ہو گا۔ شہنو باپ کی

شہ پر اکثر اس سے زیادتی کر جاتی ہے۔ اسے بھی موقع ملے تو بدلہ لے لیتا ہے۔ میں تو سمجھ نہیں پاتی کہ ان کا کیا کروں.....“

”ٹھیک ہو جائیں گے۔ بچے ہیں ابھی“ تمکینے بولی۔

”آپ کے بھی تو بچے ہی ہیں.....“

”وہ کون سا کم ہیں..... آغا بی بی سے پوچھو..... وہ بھی بہت لڑتے ہیں.....“

”ان کی طرح نہیں ہیں..... انہیں تو باپ کی.....“

آغا بی بی نے ریشمینے کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”نواز خان کو بیٹی کا برا ارمان تھا۔ دراصل

اس کی اپنی بہن کوئی نہیں تھی..... لڑکیاں اسے شروع ہی سے پسند ہیں چھوٹا تھا تو ہمیشہ ضد کیا کرتا تھا آغا بی بی ہمیں بھی چھوٹی سی بہن لادو.....“

آغا بی بی نواز خان کے بچپن کی باتیں بتانے لگیں.....

بچے دالان سے باہر نکل گئے تھے۔ زرگل بھی آگیا تھا..... چاروں کھیل کود میں لگ گئے.....

چاروں بہت خوش تھے۔ شہباز کا موڈ بھی اب ٹھیک ہو گیا تھا۔ نوکر گھروں سے بھی بہت سارے بچے ان کے ساتھ کھیلنے کو آگئے تھے۔ خوب خوب ادھم مچایا سب نے۔ حویلی کے طویل و عریض صحن میں آگے پیچھے بھاگتے دوڑتے پھرے۔ زرگل اور شہباز نے درختوں پر چڑھ کر کچے پھل توڑے۔ چڑیوں کے گھونسلوں میں سے انڈے نکالے۔ حجرے میں بھی جا پہنچے اور آنکھ پھولی کا کھیل کھیلے رہے۔

”بس اب گھر چلتے ہیں.....“ زرگل نے کہا۔

”کیوں“ شہنو بولی۔

”میں نے سکول کا کام کرنا ہے.....“

”کھیلو گے نہیں ہمارے ساتھ.....“

”کام کر کے کھیلوں گا.....“

”چلو.....“

”میں نہیں جاؤں گا.....“ شہباز بولا۔

”تم اکیلے حجرے میں کیا کرو گے“

”زری کے ساتھ کھیلوں گا.....“

”زری بھی گھر چلے گی“ زرگل نے کہا۔ تو شہباز ترائخ سے بولا۔ ”زری میرے ساتھ

ادھر ہی کھیلے گی.....“

”نہیں کھیلے گی“

”کھیلے گی“

اسی بات پر دونوں لڑ پڑے..... حکمت کا کانے جلدی سے دونوں میں بیچ بچاؤ کر اویا اور نہ مکہ

بازی کا عمل شروع ہونے ہی والا تھا۔

حکمت کا کانے دونوں کو پیار کرتے ہوئے کہا ”اچھے بچے لڑتے جھگڑتے نہیں ہیں“

”تو پھر کیا کرتے ہیں حکمت کا کا“ زری نے معصومانہ سوال کیا۔

”ہنستے مسکراتے ہیں۔ اچھی اچھی باتیں کرتے ہیں.....“

”آؤ شہباز“ زری نے مسکراتے ہوئے شہباز سے کہا ”گھر چل کر ابھی ابھی باتیں کرتے ہیں۔ میرے پاس اچھے اچھے کھلونے ہیں۔ ان سے کھیلتے ہیں۔“

”میں بھی کھیلوں گی“ شہنو بولی۔

”ہاں تم بھی کھیلو گی“ زری نے کہا۔

”یہ تو بہت لڑا کا ہے۔“ زرگل نے شہباز کی طرف دیکھا ”اے ہم اپنے ساتھ نہیں کھلائیں گے۔“

”میں اپنے گھر چلا جاؤں گا۔ تمہارے گھر نہیں رہوں گا“ شہباز نے رعب دیا۔ زری جھٹ سے بولی ”شہباز لالہ۔۔۔۔۔ نہیں جانا اپنے گھر۔۔۔۔۔ ہم سب اکٹھے کھیلیں گے۔۔۔۔۔ زرگل لالہ آپ شہباز لالہ سے پیار کریں نا۔۔۔۔۔“

زرگل شہباز سے لپٹ گیا۔ شہباز نے بھی زور سے جپھی ڈالی۔۔۔۔۔ دونوں میں پھر سے دوستی ہو گئی۔

جبرے سے سب جوبلی میں آ گئے۔

”زرگل لالہ“ شہنو نے زری سے اپنا ہاتھ چھڑا کر کہا۔

”کیا ہے“

”مجھے اٹھا لو۔۔۔۔۔“

”نہیں“

”میں تھک گئی ہوں“

”تھک گئی ہو تو میں کیا کروں“

”اٹھا لو نا زرگل لالہ۔۔۔۔۔“ وہ جیت سے بانہیں اونچی کرتے ہوئے بولی تو زرگل کو اس پر ترس

آ گیا۔

”آؤ“ وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ شہنو اچک کر اس کی پشت پر چڑھ گئی۔ اپنے بازو اس

کی گردن میں ڈال کر ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لئے۔ زرگل بمشکل اٹھا۔ شہنو کی ٹانگیں اس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیں۔ اور بمشکل قدم قدم آگے بڑھا۔

شہنو کی دیکھا دیکھی زری بھی شہباز سے بولی ”مجھے بھی اٹھا لو“

”چل ہٹ۔۔۔۔۔ اتنی موٹی ہے تو تو۔۔۔۔۔“

”زرگل لالہ مجھے اٹھایا کرتے ہیں۔۔۔۔۔“

”تو کہہ نا زرگل لالہ سے مجھے کیوں کہتی ہے۔۔۔۔۔“

”شہنو کو لالہ نے اٹھایا ہوا ہے۔۔۔۔۔“

”تو میں کیا کروں۔۔۔۔۔“

”مجھے اٹھاؤ نا شہباز لالہ۔۔۔۔۔ دیکھو نا شہنو کیسے سواری کر رہی ہے۔ مجھے بھی اٹھا لو“

”چل آ۔۔۔۔۔“ شہباز بیٹھ گیا۔ زری اچک کر اس کی پشت پر چڑھی۔ اپنے بازو اس کی گردن

میں جمائے گئے۔

”اٹھو نا اب“ زری بولی۔

شہباز نے اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن کمر پر موٹی تازی زری کا بوجھ تھا اس سے اٹھانہ گیا۔

”اٹھو بھی“ زری نے پاؤں زمین پر زور سے مارے۔

”نہیں اٹھا جاتا۔۔۔۔۔“ شہباز بولا ”تم اتنی بھاری ہو۔ پرے ہو۔۔۔۔۔“ اس نے دھچکے سے اسے

پرے ہٹایا۔۔۔۔۔ زری رو ہانسی سی ہو گئی۔

”اٹھا لو نا اے“ زرگل نے رک کر شہباز کی طرف دیکھا۔ شہباز اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

گھور کر زری کو دیکھا۔۔۔۔۔ کندھے اچکائے اور منہ چڑاتے ہوئے بولا۔۔۔۔۔ ”موٹو کہیں کی۔۔۔۔۔ نہیں اٹھا سکتا۔۔۔۔۔ جا

پرے ہٹ۔۔۔۔۔“

زری رو دینے کو تھی۔ زرگل کو بسن بیخود پیاری تھی۔ اس کے آنسو وہ کب دیکھ سکتا تھا۔

شہنو کو جھٹ سے وہیں اتارا۔۔۔۔۔ وہ چیخنے لگی۔ لیکن زرگل نے پرداہ نہیں کی زری کی طرف آیا۔۔۔۔۔ اور اسے اپنی

پشت پر لا کر بولا ”میری اچھی بسن۔۔۔۔۔ میں جو ہوں۔ جتنی دیر کہے گی اٹھائے رہوں گا۔۔۔۔۔“

شہنو نے غصے سے زرگل کو دیکھا۔۔۔۔۔ ”میں تم سے نہیں بولوں گی۔۔۔۔۔“

”نہ مڑے۔۔۔۔۔“ زرگل پیار سے بولا۔ ناراض نہیں ہونا۔ زری کو کمرے میں چھوڑ آؤں پھر

تمہیں اٹھا کر لے جاؤں گا۔۔۔۔۔ میں کوئی شہباز جیسا تھوڑا ہی ہوں۔۔۔۔۔“

”تم بڑے بھی تو ہونا۔۔۔۔۔“ شہباز کو اپنی سبکی منظور نہ تھی۔۔۔۔۔ ”میں تم جتنا ہوں گا تو زری اور

شہنو دونوں کو اٹھایا کروں گا۔۔۔۔۔“

بچے لڑتے جھگڑتے، ہنستے کھیلتے اندر چلے آئے۔

شام جب نواز خان اور ریشمین بچوں کے ساتھ واپس جانے لگے۔ تو چاروں بچے دنگیر ہو

گئے۔ شہنو زری سے لپٹ گئی اور زرگل نے شہباز کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ شہنو اور شہباز زری اور

زرگل کو ساتھ لیجانا چاہتے تھے۔ اور وہ دونوں انہیں ہمیں رہنے کے لئے کہہ رہے تھے۔

”وہ لندن میں جا بے ہیں.....“

”کیوں“

”پڑھنے گئے تھے۔ وہیں کے ہو رہے۔ کبھی کبھار آجاتے ہیں ملنے.....“

”جو پڑھنے جاتا ہے۔ وہ وہیں کا ہو رہتا ہے۔ بی بی گل زرگل بھی فیصل آباد پڑھنے گیا ہے۔ وہ

وہیں کا ہو رہے گا.....“

ریشمینے نے مسکراتے ہوئے شہنو کے گال پر ہاتھ مارا..... ”تجھے زرگل ہی کی پڑی

رہتی ہے.....“

”زرگل چلا جو گیا ہے“

”وہ پاکستان ہی میں ہے۔ تمہیں پتہ نہیں۔ کہ فیصل آباد پاکستان کا ہی شہر ہے..... وہاں

زرعی یونیورسٹی ہے۔ زرگل نے وہاں داخلہ لیا ہے..... چھٹیوں میں آ جایا کرے گا.....“

”شہباز لالہ بھی وہیں جا کر پڑھے گا.....“

”وہ لاہور جائے گا۔ انجینئرنگ کرنے کے لئے..... سول انجینئر بنے گا.....“

”وہ بھی چلا جائے گا.....“

”ہاں..... لیکن ابھی نہیں۔ ایف اے تو ہمیں کرے گا.....“

”ہوں.....“

ریشمینے شہنو کے قریب کھڑی تھی۔ شہنو میز پر جھکی ہو م ورک کر رہی تھی۔ وہ

پانچویں جماعت میں تھی۔ پڑھائی میں کچھ زیادہ لائق نہیں تھی۔ پھر بھی ہر سال پاس ہو جاتی ہے..... ہو م ورک

باقاعدگی سے کیا کرتی تھی۔

”کیا لکھ رہی ہو“ شہنو پھر کاپی پر جھکی تو ریشمینے نے پوچھا۔

”مضمون.....“

”کس چیز پر.....“

”مس نے کہا تھا ”ہمارا گاؤں“ پر مضمون لکھ کر لانا.....“

”لکھ لیا.....“

”ابھی پورا نہیں لکھا.....“

”دکھاؤ تو کیا لکھ رہی ہو.....“

شہنو نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے کاپی ہاں کی طرف بڑھا دی۔

۲۵

”کیا ہو رہا ہے شہنو“

”ہوم ورک کر رہی ہوں بی بی گل“

”کیوں“

”تہکال نہیں جانا..... تمہاری نانوں نے بلا بھیجا ہے.....“

”ہاں بڑے خان ماما آئے ہوئے ہیں نا۔ ان کی بیٹی روزی میری پکی سیہلی بن گئی ہے.....“

”بڑی پیاری بچی ہے“

”انگریزی فر فر بولتی ہے بی بی گل.....“

”لندن میں جو رہتی ہے۔ وہیں پیدا ہوئی وہیں رہتی رہی.....“

”لندن میں سب انگریزی بولتے ہیں.....“

”ہاں بیٹی۔ لندن انگریزوں کا ملک ہے۔ انگریزوں کی زبان ہی وہاں بولی جاتی ہے“

”خان ماما بھی انگریز ہیں.....“

”شہنو کی بات پر ریشمینے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”کیوں بی بی گل“

”خان ماما انگریز نہیں شہنو..... وہ پاکستانی ہیں۔ پٹھان ہیں۔ تہکال بالامیں ان کا گھر

ہے.....“

”اچھا.....“

”ہاں.....“

”تو پھر وہ تہکال بالامیں کیوں نہیں رہتے.....“

”شہنو“ ریشمینے نے کاپی لیتے ہوئے کہا۔

”جی“

”تمہاری لکھائی اچھی نہیں ہے۔“

”بس ایسی ہی ہے۔“

”احتیاط سے لکھا کرو تا۔۔۔۔۔ جلدی کاہے کی ہوتی ہے۔ ایک ایک لفظ الگ الگ اور سنوار سنوار

کر لکھا کرو۔۔۔۔۔“

”جی اچھا۔۔۔۔۔“

”ہمارا گاؤں“ ریشمینے نے مضمون پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتے پڑھتے اسے ہنسی آگئی۔

”شہنو۔۔۔۔۔ یہ مضمون لکھا ہے؟“

”ہاں تو۔۔۔۔۔“

”مضمون ایسے لکھتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ مضمون لکھا ہے یا زرگل کا قصیدہ۔۔۔۔۔“

”بس مجھے ایسے ہی لکھنا آتا ہے۔“

”بہدوقف لڑکی۔۔۔۔۔“ ریشمینے مسکرا رہی تھی۔ کاپی اس کے ہاتھ میں تھی۔ شہنو

نے لکھا تھا ”ہمارا گاؤں بہت اچھا ہے۔ وہاں زرگل رہتا ہے۔ زرگل بہت اچھا ہے۔ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔

زری بھی اچھی لگتی ہے۔ لیکن زرگل سب سے زیادہ اچھا لگتا ہے۔ وہ میرے ساتھ آنکھ پھولی کھیلتا ہے۔ مجھے کچے

امروہ توڑ کر دیتا ہے۔ درختوں پر چڑھ کر میرے لئے چڑیا کے گھونسلے سے ننھے ننھے بچے نکالتا ہے۔۔۔۔۔ میں گاؤں

جاتی ہوں تو وہ بہت خوش ہوتا ہے۔ اب وہ گاؤں سے چلا گیا ہے۔ پڑھنے کے لئے۔۔۔۔۔ مجھے اب گاؤں جانا اچھا

نہیں لگتا۔ زرگل کے بغیر میں اداس ہو جاتی ہوں۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔“

ریشمینے نے کاپی میز پر رکھتے ہوئے کہا ”شہنو مضمون اس طرح نہیں لکھتے۔“

”تو پھر کس طرح لکھتے ہیں۔۔۔۔۔“

”یہ صفحہ پھاڑ ڈالو۔۔۔۔۔ میں تمہیں بتاتی ہوں کیسے لکھتے ہیں۔“

”اتنا اچھا تو لکھا ہے“

”یہ مضمون نہیں ہے“

”تو کیا ہے۔“

ریشمینے نے خود ہی احتیاط سے کاپی سے یہ صفحہ پھاڑ کر نکال دیا۔۔۔۔۔ اور پھر شہنو کو

سمجھانے لگی۔۔۔۔۔ کہ مضمون کیسے لکھا جاتا ہے۔ شہنو غور سے ماں کی باتیں سننے لگی۔

”بی بی گل“ اس نے ساری باتیں سننے کے بعد کہا۔

”کیا ہے“

”آپ ہی لکھ دیں تا۔۔۔۔۔ مجھ سے اتنا کچھ نہیں لکھا جائے گا۔۔۔۔۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ آرام سے بیٹھ کر لکھو۔۔۔۔۔ اور ہاں آدھ گھنٹے میں سارا کام ختم کر لو۔

تہہ کال جاتا ہے۔ شاید رات بھی وہیں رہ جائیں۔۔۔۔۔“

”کل سکول سے چھٹی؟“

”نہیں مس صاحبہ۔۔۔۔۔ صبح واپس آجائیں گے تمہارے سکول جانے سے پہلے۔۔۔۔۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ میں ابھی لکھ لیتی ہوں مضمون۔۔۔۔۔“

”شہباز کہاں ہے اس نے کام کر لیا۔“

”وہ نوید اور انجم کے ساتھ کھیل رہا ہے۔“ شہنو نے ہمسایہ لڑکوں کے نام لئے۔

”کھیل سے جی نہیں بھرتا اس لڑکے کا۔۔۔۔۔“

”ہاکی کاپلیئر ہے بی بی گل۔۔۔۔۔“

”لیکن ہر وقت کھیل۔۔۔۔۔ پڑھائی کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتا۔۔۔۔۔“

”اتنا لائق تو ہے میرا بھائی۔۔۔۔۔“

”بڑی تعریف ہو رہی ہے بھائی کی۔۔۔۔۔“

شہنو مسکرا کر بولی ”نہ کروں تعریف۔۔۔۔۔“

”حیرانی کی بات ہے۔ تم اور شہباز کی تعریف۔۔۔۔۔ ہر وقت لڑتی ہی رہتی ہو اس سے۔۔۔۔۔“

”کیوں تنگ کرتا رہتا ہے مجھے۔“

”تو اس سے کونسا اچھا سلوک کرتی ہے۔ بابا سے ڈانٹ ڈپٹ نہ کروالے تو تجھے چین ہی نہیں

آتا۔۔۔۔۔ تیری اسی بات سے تو اس کی جان نکلی رہتی ہے بابا کے سامنے۔۔۔۔۔ بہت ڈرتا ہے ان سے“

”ویسے ہی کرتا ہے بی بی گل کوئی نہیں ڈرتا اور تا۔۔۔۔۔“

”چل بس کر۔۔۔۔۔ اب تو بڑی ہو گئی ہے۔ اسکی شکایتیں بابا سے نہ کیا کر۔۔۔۔۔“

”تنگ کرے گا تو کیا کروں گی۔۔۔۔۔“

”تجھے اپنا بھائی اچھا نہیں لگتا؟“

”بہت اچھا لگتا ہے۔۔۔۔۔“

”پھر۔۔۔۔۔“

”پھر یہ کہ.....“ شہنو کی بجائے شہباز بولا۔ جو چند لمحے پہلے ہی کمرے میں آیا تھا۔ ہاکی ہوا میں اترتے ہوئے بولا..... ”اس کا دماغ خراب ہے.....“

”دیکھا بی گل۔ آتے ہی لڑائی کی بات کرنے لگا ہے“ شہنو نے احتجاج کیا۔

”اس میں لڑائی کی کیا بات ہے“ شہباز پھر ہاکی اہراتے ہوئے بولا ”جو حقیقت ہے وہی بات کہہ رہا ہوں“

”یعنی میرا دماغ خراب ہے“

”بالکل.....“

”اور تمہارا.....“

”ایک دم ٹھیک ٹھاک“

”لبو سُکچا.....“ شہنو نے اسے چڑانے کے لئے کہا۔

جواباً

شہباز نے جھپٹ کر اس کے بالوں کو مٹھی میں بھر کر اس کے سر کو جھٹکے دیئے وہ چیخی.....

چلائی.....

”او کم بختو“ ریشمینے نے آگے بڑھ کر ایک تھپڑ شہباز کے لگایا اور شہنو کو کندھا پکڑ کر زور سے جھٹکادیا..... بشکل شہنو کے بال شہباز کی مٹھی سے چھڑائے..... شہباز نے گال سہلاتے ہوئے خوشخوار نظروں سے شہنو کو دیکھا.....

ریشمینے پریشان ہو کر بولی ”ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن جاتے ہو تم

دونوں.....“

”اس نے میرے نام ڈالے ہوئے ہیں.....“ وہ غرایا ”اسے کیوں نہیں کچھ کہتیں۔ سر چڑھا

رکھا ہے اسے۔ آج کس سے شکایت کرے گی.....“

”بابا جاپان سے آجائیں تو تمہیں سیدھا کراؤں گی“ شہنو روتے ہوئے بولی۔

”پھر نام ڈال کے دیکھ میرا.....“

”ڈالوں گی ڈالوں گی..... لبو..... سُکچا.....“ وہ غصے سے بھڑکی..... شہباز لال

پٹا ہوتا اس پر جھپٹنے کو تھا۔ کہ ریشمینے درمیان میں آگئی..... اب اس نے شہنو کو اک تھپڑ لگایا اور کوسے ہوئے بولی ”باز تو بھی نہیں آئے گی.....“

”اب میرے دل میں ٹھنڈ پڑی ہے“ شہباز نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو ریشمینے نے اسے

جھڑک دیا..... ”بک بک بند کر۔ ہر وقت لڑتے ہی رہتے ہو..... زرگل اور زری بھی تو ہیں نا..... کتنے اچھے ہیں دونوں..... زرگل تو زری پر جان دیتا ہے زری بھی کتنا پیار کرتی ہے بھائی سے..... دیکھا تھا جب وہ فیصل آباد جا رہا تھا..... زری کتنا دور ہی تھی.....“

”زری کی مثال نہ دیا کریں بی بی گل“ شہباز کھاجانے والی نظروں سے شہنو کو دیکھتے ہوئے

بولا..... ”وہ اس کی طرح کی تھوڑی ہے..... جواب نہیں اس کا.....“

”اور زرگل بھی تمہاری طرح تھوڑا ہے.....“ شہنو شاکل لہجے میں بولی۔ ”اتنا اچھا ہے

وہ..... بہن سے کتنا پیار کرتا ہے“

”اس کی بہن تمہاری طرح کی بدتمیز نہیں۔ سو سونا م نہیں ڈالتی بھائی کے“

شہنو کچھ جواب دیئے والی تھی کہ ریشمینے نے ڈانٹ کر کہا ”بس شہنو..... چپ رہو..... اور ہاں سنو آئندہ تم نے بھائی کو لبو یا سُکچا کہا تو یاد رکھنا برا پیش آؤں گی..... اور تم بھی کان کھول کر سنو شہباز..... شہنو کو تنگ کیا تو بھائی کر دوں گی.....“

شہباز بڑبڑ کر تا ہر نکل گیا..... شہنو میز پر بکھری اپنی کاپیاں کتابیں سمیٹنے لگی۔ ریشمینے نے کاپی سے چھڑا ہوا مضمون والا صفحہ اٹھایا اور کمرے سے باہر چلی آئی.....

شہنو بڑبڑا رہی تھی ”بابا آلیں سیدھا کراؤں گی ان سے..... ہر وقت لڑتا رہتا ہے.....

ہو نہ ہو.....“

”یہ چادر آغابی بی کے لئے.....“ زرگل نے سوٹ کیس میں سے پھولدار چادر نکال کر زری کے ہاتھوں پر رکھ دی۔
”اور یہ“ زری جو سوٹ کیس پر جھکی بیٹھی تھی۔ تمہ کے ہوئے خوبصورت کپڑے کو دیکھ کر بولی۔

”یہ“ زرگل نے کپڑے پر انگلی رکھ کر پوچھا۔
”ہاں“

”یہ بی بی جان کے لئے سوٹ ہے.....“ اس نے کپڑا نکال کر زری کو دکھایا ”اچھا ہے نا“
”بت اچھا.....“

”دراصل زری۔ مجھے پتہ ہی نہیں تھا۔ کہ کس کے لئے کیا چیز خریدوں۔ ایک دوست میرے ساتھ بازار گیا..... اسی نے یہ چیزیں لے دیں..... میں نے پہلے کبھی ایسی خریداری کی جو نہیں.....“
زری سوٹ کیس کی چیزیں ادھر ادھر کرتے ہوئے بولی ”زرگل لالہ میرے لئے کیا لائے ہیں“

زرگل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پرے ہٹاتے ہوئے شوخی سے کہا ”اوہ تمہارے لئے بھی کچھ لانا چاہئے تھا..... تت تت بڑی بھول ہو گئی..... چلو پہلی بار تھی نا..... تم یاد ہی نہ رہیں۔ اگلی دفعہ آؤں گا تو تمہارے لئے ڈھیر ساری چیزیں لاؤں گا۔ ہاں یہ لوبابا کے لئے“

”خود ہی دے ویں سب کو“ زری روہانسی آواز میں بولی اور ہاتھ میں پکڑے آغابی بی اور ماں کے تحائف پھر کس میں رکھ دیئے۔

”کیا ہوا.....“ زرگل نے اس کے لمبے سنہری بال جو دو چٹیاؤں کی صورت بندھے تھے ہاتھ

میں پکڑ کر پوچھا۔

”کچھ نہیں“ وہ ہشکل آنسو پیتے بولی..... اس کی سبزی مائل بھوری آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

تھی۔

”اے“ زرگل نے اس کی چوٹی ہو لے سے کھینچی۔
وہ بال چھڑاتے ہوئے اٹھنے لگی..... تو زرگل نے ہنس کر کہا ”یہ ایک دم ہی موڈ کیوں خراب ہو گیا.....“

”بس رہنے دیں.....“ وہ روٹھ گئی.....

زرگل کھلکھلا کر ہنس پڑا.....

”کیا ہو رہا ہے“ تمکینے دوپٹے کی کئی سے ہاتھ پونچھتے اندر آ گئی۔

”پتہ نہیں بی بی جان“ زرگل شوخی سے نظریں گھماتے ہوئے بولا.....

آغابی بی ان کے قریب ہی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں ارغوانی قالین پر پلنگ کے قریب بیٹھے تھے.....

”کیا بات ہے زری“ تمکینے نے پیار سے کہا ”اے ہے یہ تو رورہی ہے.....“
”میں کیوں روؤں.....“ زری نے الٹی ہتھیلی سے آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے ہنسنے کی کوشش کی.....

”اور کیسے روتے ہیں بی بی گل..... دیکھیں نا اے۔ اچھی بھلی تھی..... میں نے آپ کے لئے لائی ہوئی چیزیں اسے دیں۔ بس دکھ کے مارے.....“ زرگل نے اس کے سر پر چپت ماری۔

”مت کریں زرگل لالہ.....“ وہ رندھی آواز میں بولی۔

”کیوں چھڑ رہے ہو اے“ تمکینے نے زرگل سے کہا..... وہ تھوڑی ہی دیر پہلے فیصل آباد سے آیا تھا..... زری یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا..... ایک مہینہ ہی میں گھر والوں سے اداس ہو گیا تھا۔ دو چٹیاں تھیں بھاگا چلا آیا تھا گھر.....

زرگل کو اپنا گھر اپنا گاؤں بہت پیارے تھے۔ گھر والے بھی بہت عزیز تھے۔ زری سے تو وہ بہت پیار کرتا تھا..... لیکن کبھی کبھی اسے چھیز کر بھی بہت محظوظ ہوتا تھا۔ نوک جھونک ان دونوں میں ہوتی تھی۔ یہ نوک جھونک بد تمیزی پر کبھی منجنہ ہوا کرتی تھی۔

”بی بی جان“ زرگل نے مسکراتے ہوئے زری کو دیکھ کر ماں سے کہا۔
”کیا ہے“

”یہ مجھ سے خفا ہو گئی ہے۔“

”لگتا تو ایسا ہی ہے۔ تو نے کچھ کہا ہو گا۔“

”بالکل کچھ نہیں کہا۔“

”تو پھر کیا ہوا ہے زری بیٹی۔“

”کچھ نہیں ہوا نا۔“ زری ایک دم ہی رو پڑی۔

زرگل نے اک قہقہہ لگاتے ہوئے اس کے گلے میں بازو ڈال کر اسے اپنے ساتھ لگالیا اس کے بالوں پر شفقت سے بوسہ دیتے ہوئے بولا۔ ”بڑی تھوڑی ہو۔۔۔۔۔ اے لگی میں تو آیا ہی تمہارے لئے نہیں۔ سب سے زیادہ تو ہی تو مجھے یاد آتی تھی وہاں۔۔۔۔۔ ایک مہینہ تمہارے بغیر گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔“

”ہائیں زرگل لالہ۔“ وہ آنکھیں ملتے ہوئے ہنس دی۔

”تمہارے لئے تو سب سے پہلے تحفہ خرید ا تھا میں نے۔“

”اچھا تو یہ اس بات پر خفا تھی۔۔۔۔۔ تمہارے مسکراتے ہوئے بولی۔

”ایسے ہی چھوڑ رہا تھا اسے۔“ زرگل مسکرایا۔

”اس طرح مت چھیڑا کریں مجھے۔“

”لو بھی معاف کر دو۔“ زرگل نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

زری نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے پیارے ہاتھوں میں لے لئے۔۔۔۔۔ انہیں بوسہ دیا اور پھر آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولی ”معاف کیا زرگل لالہ۔“

دونوں ہنس پڑے۔

تمہارے دونوں کے پیارے بڑی متاثر ہوئی۔

”تمہارے چلے جانے سے بہت اداس تھی زرگل۔“

”میں کیا کم اداس تھا۔“

”تمہیں ہی وہاں داخلہ لینے کا شوق تھا۔ پشاور ہی میں جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیتے۔“ تمہارے لئے

کہا۔۔۔۔۔ ”تمہارے جانے سے گھر بالکل سونا سونا ہو گیا ہے۔“

”بی بی گل۔۔۔۔۔ میرا مستقبل اپنے گاؤں اور زمین سے وابستہ ہے۔ زراعت میرا پیشہ ہو گا۔ اسی

لئے زراعت میں انجینئرنگ کرنے گیا ہوں وہاں۔۔۔۔۔ میں پڑھائی ختم کر کے جب واپس آؤں گا تو پھر دیکھنے گا۔

اپنی زمینوں میں کیسے کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ گاؤں کا نقشہ ہی بدل ڈالوں گا۔“

”اور جو تجھے شہر میں رہنے کی ہی عادت پڑ گئی تو۔۔۔۔۔ تمہارے ہنس کر بولی۔

”نہیں بی بی جان۔۔۔۔۔ ایسا نہیں ہو گا۔ مجھے اپنی مٹی سے پیار ہے۔“

”چل جا۔۔۔۔۔ نواز خان بھی جب پڑھنے گیا تھا۔ تو یہی کہا کرتا تھا۔ شہر ایسا گیا کہ شہری کا ہو کر

رہ گیا۔۔۔۔۔“

”اب تو مہینہ مہینہ بھر آتے ہی نہیں وہ لوگ۔۔۔۔۔“ زری بولی ”اتنا جی چاہتا ہے شہنوں سے

ملنے کو۔“

”میرے جانے کے بعد وہ آئی نہیں؟“

”اوں ہوں۔ آئی تھی صرف ایک دفعہ۔۔۔۔۔ دو گھنٹے بھی نہیں ٹھہری۔ واپس چلی گئی۔“

”جی بی بی جان۔۔۔۔۔“ زرگل نے تمہارے سے پوچھا۔

”بھئی اس نے سکول کا کام کرنا تھا۔ شہباز کا دوسرے دن ٹٹ تھا۔ اسے تیاری کرنا تھی اس

لئے واپس چلے گئے۔ تمہارے نے کہا۔

”اور پھر آئے ہی نہیں۔“ زری کا لہجہ شکا تھا۔

”وہ نہیں آئے تو تم کو سنا گئی ہو ان کے ہاں۔۔۔۔۔ آغا بی بی ہفتہ بھر کے لئے وہاں گئیں۔ تمہیں

بھی کتنا کہا چلے کو۔۔۔۔۔“

”بی بی جان۔ میں کیسے جاتی۔ سکول سے ہفتے بھر کی چٹیاں لیتی؟“

”سکول کا مسئلہ شہنوں اور شہباز کا بھی ہے نا۔۔۔۔۔ ویسے تو شہنوں یہاں آکر بہت خوش ہوتی

ہے۔۔۔۔۔ تمہارے نے زرگل سے کہا ”تمہاری طرح اسے بھی شہر سے زیادہ گاؤں پسند ہے۔ اسے یہاں کی کھلی

فضا۔۔۔۔۔ لہجہ تہمت اور اپنے روایتی لباسوں میں ملبوس لوگ بہت اچھے لگتے ہیں۔“

”واقعی؟“ زرگل بولا۔

”ہاں بیٹی۔۔۔۔۔ اس دفعہ وہ سب لوگ عید گاؤں میں کریں گے۔ اور شہنوں نے تو خاص طور

سے آغا بی بی سے کہا ہے کہ عید پر اس کے لئے وہ گاؤں والا لباس بنوائیں۔“

”اچھی بات ہے۔۔۔۔۔“

”آغا بی بی نے دونوں کے ایک جیسے لباس بننے بھی دے دیئے ہیں۔“

”دونوں؟“

”زری اور شہنوں کے لئے۔“

چند لمبے وہ سب یہی باتیں کرتے رہے۔ زرگل نے سب شہر والوں کی خیر و عافیت دریافت کی

شہباز اور شہنوں کا بطور خاص پوچھا۔

”سب ٹھیک ٹھاک ہیں.....“

”ان دونوں کی لڑائی کا کیا حال ہے“ زرگل ہنسا۔

”آپ بھی تو لڑتے ہیں مجھ سے.....“ زرگی منہ پھلائے بیٹھی تھی۔

”توبہ توبہ..... میں اور اپنی جان سے پیاری بہن سے لڑوں گا..... اے نگلی اب تو تجھ سے اتنی

دور چلا گیا ہوں۔ اب تو ہمیں بعد صورت دیکھا کرو گی میری..... لڑنا جھگڑنا کیسا؟“

زرگل کی باتوں پر زرگی کی آنکھیں جھلملانے لگیں تو زرگل نے پھر اسے ساتھ لپٹا کر پیار کر لیا.....

”چلو روٹا دھونا بند.....“ زرگل اسے الگ کرتے ہوئے بکس پر جھکا..... ”یہ لو اپنا تحفہ جو میں

نے سب سے پہلے خریدا تھا.....“

زرگل نے ایک خوبصورت ڈبہ اس کی طرف بڑھایا۔

زرگی کی خوبصورت آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔

”اس میں کیا ہے“ وہ بولی۔

”کھول کر دیکھو.....“

”زرگی ڈبہ کود میں رکھ کر کھولنے لگی تو ہمیں نے اٹھتے ہوئے مسکرا کر کہا ”اے

زرگل.....“

”جی بی بی جان.....“

”تو سارے پیسے تحفوں پر ہی خرچ کرتا رہا..... کچھ اپنی جان پر بھی خرچ کیا؟ ہو سٹلوں میں گھر کا

سا کھانا نہیں ملتا..... الگ سے کچھ کھایا یا کر۔ صحت کا دھیان رکھنا.....“

وہ مسکرا کر ماں کو دیکھنے لگا.....

زرگی نے ڈبہ کھولا..... اس میں خوبصورت نازک اور نفیس رنگارنگ چوڑیوں کے سیٹ تھے

کانوں میں ڈالنے کے ننھے ننھے کئی طرح کے ٹاپس اور آدیزے تھے۔ گھٹکی زنجیریں تھیں۔ نیل پالش کی دو تین

شیشیاں اور چینی کڑھائی کے ننھے ننھے دستی رومال تھے۔

زرگی چیزیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی..... ایک ایک چیز نکالتی اور کہتی ”ہائے کتنی پیاری ہے“

”یہ تو بہت خوبصورت ہے“

”ان چوڑیوں کا مجھے بہت شوق تھا.....“

”اس رومال کو تو میں سنبھال کر رکھوں گی“

”ہائے زرگل لالہ یہ چین کتنی نفیس ہے“

”اور یہ ٹاپس تو بالکل میرے سبز کپڑوں کے ساتھ جاتے ہیں.....“

زرگل بہن کے چہرے پر خوشی کے رنگ بکھرتے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا..... زرگی اسے واقعی بہت

عزیز اور بڑی پیاری تھی.....

زرگل نے ہمیں بابا اور آغا بی بی کے لئے لائی چیزیں ماں کو پکڑا دیں..... ہمیں نے خوش ہو

کر دعائیں دیں۔

”اچھا اب اٹھو..... نہادھو کر کپڑے بدل لو..... رات بھر کا سفر رہا ہے..... تھوڑی دیر کو سو

جاؤ.....“

”نہیں بی بی جان.....“ زرگل بکس سے نکالے ہوئے اپنے کپڑے اور چیزیں واپس رکھتے

ہوئے بولا۔

”نہادھو کر میں باہر جاؤں گا..... حجرے میں لوگوں سے ملوں گا۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے ایک

مدینہ نہیں ایک سال گزارا کر آیا ہوں.....“

”زرگل“ زرگی اس کے بکس پر جھکی جھکی ایک دوسرے ڈبے کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی

”یہ کیا ہے“

”یہ.....؟“

”ہاں..... یہ والا ڈبہ..... اس میں کیا ہے.....“

”اس میں بھی کچھ ہے“

”کچھ کیا؟“

”بس تمہاری طرح ہی کی چیزیں.....“

”یہ کس کے لئے ہے.....“

”بوجھ لو.....“

”ہاں۔ سمجھ گئی..... شہنوں کے لئے لائے ہوں گے.....“

زرگل مسکراتے لگا.....

دونوں کو باتیں کرتے چھوڑ کر ہمیں باہر چلی گئی.....

”دکھائیں ناز زرگل لالہ..... ماں کے جانے کے بعد زرگی نے کہا۔

”ضروری ہے.....“

”ہر ج بھی کیا ہے“

”کچھ خاص نہیں بس تمہارے ایسی ہی چیزیں ہیں.....“

”شہباز کے لئے بھی کچھ لائے.....“

”ہاں..... وہ ٹیل ٹینس کھیلتا ہے نا..... اس کے لئے ریکٹ اور بال لایا ہوں“

”یہ ڈبہ مجھے دکھائیں نا.....“

”لودیکھ لو.....“ زرگل نے خوبصورت سا ڈبہ نکالا.....

زری نے ہاتھ میں لے کر دیکھا..... لیکن کھولا نہیں..... اسے واپس کرتے ہوئے بولی ”کب

دیں گے اسے“

”جب وہ آئے گی..... یامیں شر جاؤں گا.....“

”آپ کی تو چھٹی ہی تھوڑی سی ہے“

”کل رات کی خیبر میل سے واپس جانا ہے.....“

”ہائے اتنی جلدی.....“

”تو اور..... دو ہی تو چھٹیاں تھیں..... پرسوں صبح کان لچکا ہے.....“

”خیبر میل فیصل آباد جاتی ہے.....“

”نہیں..... لالہ موسیٰ سے ٹرین بدلنا پڑتی ہے..... چناب ایکسپریس سیدھی جاتی ہے“

”تو اسی پر کیوں نہیں جائیں گے آرام سے سیدھے فیصل آباد۔ گاڑی بدلنے سے تکلیف ہو

گی“

زرگل مسکرایا..... ہولے سے بہن کے گال پر تھکی دی اور بولا..... ”میری پیاری پیاری بہن

میرے لئے اتنا فکر مند نہ ہوا کر..... چناب ایکسپریس چار بجے شام یہاں سے چلتی ہے اور خیبر میل آٹھ بجے

رات..... تجھے اچھا نہیں لگے گا..... کہ میں چار گھنٹے اور تمہارے ساتھ گزار لوں..... کل دوپہر کو شہر چلیں

گے..... پھر رات کو وہیں سے خیبر میل پکڑ لوں گا.....“

زری نے سر ہلایا..... پھر اپنا اسٹیشنل جیولری کا ڈبہ اٹھا کر بولی ”میں چلتی ہوں۔ آپ نما

دھو کر کپڑے بدل لیں.....“

وہ کمرے سے نکل گئیں۔ زرگل نے بکس میں سے شلوار کرتا نکالا..... اور بکس بند کر کے اٹھ

کھڑا ہوا.....

بابا نے شہباز کو اس کی ساگرہ پر کمرہ دیا تھا۔ شہباز بہت خوش تھا۔ سارا دن فونو گرافی کرتا پھرتا تھا..... شہنوں سے بھی ان دنوں صلہ تھی۔ اس کی کئی تصویریں اتاری تھیں۔ آج بھی وہ کمرہ لئے شہنوں کے ساتھ لان میں تھا۔ اور شہنوں کی تصویریں اتار رہا تھا۔ پھولوں کے کنج میں بٹھا کر چھتار درختوں کے نیچے کھڑا کر کے کیلوں کے درمیان بٹھا کر اس نے کئی تصویریں لی تھیں.....

”شہباز لالہ“ شہنوں نے پتھر لے کر پر نیم دراز ہو کر تصویر اتروانے کے بعد کہا۔

”ہوں“

”ساری تصویریں میری کھینچ ڈالیں.....؟“

”تو.....“

”لایئے میں اب آپ کی تصویریں بناتی ہوں.....“

”تمہیں نہیں آتا تصویر کھینچنا“

”کیوں نہیں آتا..... کمرہ دیں تو سی“

”اوں ہوں“

”نہیں لالہ آپ کی تصویر بھی ہونی چاہئے.....“

”بی بی کل کو بلاؤ..... وہ ہم دونوں کی تصویریں کھینچیں گی۔“

”یہ ٹھیک ہے.....“

شہنوں نے سر ہلایا۔ پھر برآمدے کے ستون کے ساتھ کھڑی شہزادگنی کو آواز

دی ”تورے“

”بی بی..... وہ جلدی سے بولی۔“

”ذرا گل بی بی کو بلاؤ.....“

”اچھا جی“

شہزاد مگنی بنگلی کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی..... تھوڑی دیر بعد ریشمینے اس کے

ساتھ باہر آئی۔

”کیا ہے شہنو“ ریشمینے نے دور ہی سے پوچھا۔

”بی بی گل ادھر تو آئیں.....“ وہ ہاتھ سے اشارہ کر کے اسے بلاتے ہوئے بولی۔

”یہ فوٹو گرانی کا شوق ختم نہیں ہوا.....“ ریشمینے بولی۔

”ابھی سے بی بی گل“ شہباز ہنس کر بولا..... پھر اس نے کمرہ آنکھ سے لگاتے ہوئے کہا ”بس

بس۔ بی بی گل ایک منٹ بیس ٹھہریں بالکل اسی طرح گلاب کی جھاڑی کے پاس کھڑی رہیں.....“

”تصویر لے رہا ہے۔“

”ہاں“

”حد ہو گئی.....“

”بہت اچھی آئے گی..... بس..... ون..... ٹو..... اینڈ.....“

”تھری.....“

”ٹھینک یو مما.....“

”لو اب بی بی گل سے ملان گئی ہیں.....“ ریشمینے نے ہنس کر کہا اور آگے بڑھ کر شہباز

کے گلے میں بازو ڈال کر بولی ”میرے لال میری جان۔ اب یہ کمرہ مقتل کر دو.....“

”کیوں“

”بہت ہو گیا شوق..... فضول خرچی ہے یہ.....“

”نہیں بی بی گل جانے“ شہنو نے ماں کے بازو سے جھولتے ہوئے کہا۔ ”شہباز لالہ کی اپنی

ٹو کوئی تصویر اتری نہیں۔ آپ کو کسی لئے تو بلا یا ہے۔ کہ ان کی تصویر کھینچیں..... الگ الگ بھی اور میرے ساتھ

بھی.....“

”ہاں مام.....“ شہباز نے ہنس کر کہا۔

”یہ ماما اور مام کہاں سے سیکھا.....“

”مدم اور یاسر اپنی ماؤں کو ماما اور مام کہتے ہیں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے“

”بی بی گل کہنا چھانیں لگتا.....“

”اوں..... سچ کوں.....“

”کو.....“

”بی بی گل کہنا کچھ دیہاتی سا لگتا ہے۔ اور ممالیک دم فیشن.....“

شہباز کی بات پر ریشمینے ہنس دی اور شہنو نے بھی تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کرتے

ہوئے کہا ”بس مما۔ شہباز لالہ ٹھیک کہہ رہے ہیں.....“

تینوں ہنسنے لگے.....

”چلیں اب تصویریں اتار لیں.....“ شہباز نے کمرہ دونوں ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے کہا۔

”شہنو تم ماما کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو جاؤ.....“

”ماما کے بچے.....“ ریشمینے نے کہا ”مجھے بی بی گل ہی کہا کرو..... نئی نئی باتیں ہی سوچتی

ہیں تمہیں.....“

”ہرج بھی کیا ہے مما..... پیار ہی سے تو کہہ رہے ہیں شہباز لالہ.....“ شہنو نے بھائی کی

طرفداری کی۔ ”تو ریشمینے نے اس کا کان پکڑ کر کہا ”بڑی طرفداری ہو رہی ہے بھائی کی۔ لڑنا کب ہے.....“

”اب نہیں لڑوں گی.....“

”تصویریں اتروانے کی رشوت ہے یہ.....“

”نہیں بی بی گل..... اب ہم دونوں نے پوری پوری صلح کر لی ہے.....“

”خدا کرے اس پوری پوری صلح پر دونوں قائم رہو.....“

”اس نے اگر مجھے لبوادر کچا نہ کہا تو سمجھیں کہ ہمیشہ اس بات پر قائم رہیں گے“

شہباز کمرے کے ساتھ آنکھ لگاتے ہوئے بولا۔

”اور اس نے بھی مجھے بد دماغ اور لڑا کا نہ کہا تو میں بھی اس صلح پر قائم رہوں گی.....“

”یہ تم دونوں ملی کتوں کی طرح غرانے کیوں گئے ہو..... باز نہیں آتا تم نے لڑنے سے“

ریشمینے نے ان کے لمبوں پر ٹوکا.....

”چھوڑیں بی بی گل یہ باتیں۔ پہلے تصویر بنوالیں.....“ شہباز بولا۔

”بنائی تو ہے ابھی.....“

”اب اس لڑا کا پڑیل کے ساتھ بھی ایک ہو جائے.....“

”دیکھا بی بی گل.....“

”اے مذاق کر رہا ہوں۔ تو تو میری پیاری پیاری اچھی اچھی نٹ کھٹ سی بہن ہے۔ چل بی بی گل کے ساتھ لپٹ کر کھڑی ہو جا..... ہاں یوں..... بی بی گل آپ ذرا ادھر ہو جائیں۔ ہاں..... بس ٹھیک دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائیں.....“

شہباز نے فوس کیا اور ملک کی آواز کے ساتھ بولا..... ”یو.....“

”شہباز لالہ“ شہنو ماں سے الگ ہوتے ہوئے بولی ”اب آپ کی ہو جائے۔ کمرہ بی بی“

گل کو دیں“

شہباز نے کمرہ ماں کو دیتے ہوئے کچھ ضروری باتیں بتائیں۔ ”یہ بیٹن دبانے ہے۔ میاں سے“

فوس کرنا ہے.....“

”مجھے معلوم ہے صاحب زادے.....“ ریشمینے نے کمرہ لیتے ہوئے کہا۔ ”چلو کھڑے“

ہو جاؤ سامنے اس کیاری کے پاس.....“

شہباز کیاری کی طرف گیا..... شہزاد گئی اور نوکروں کے کچھ بچے ادھر آگئے تھے۔ تصویریں

اترتے دیکھ رہے تھے.....

”تم لوگ بھی اترو آؤ گے تصویریں“ شہباز نے پوچھا۔

بچے شرمائے شہزاد گئی بولی ”ہاں خان جی..... اتارو نا ہماری بھی تصویریں.....“

”بہت اچھا۔ ٹھہرو تم سب۔ بی بی گل میری تصویر لے لیں پھر تہااری باری.....“

”جیتے رہو خان.....“

شہباز نے ہاتھ ہلایا..... پھر ماں کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا..... بی بی گل نے اس کی تصویر

لے لی۔

”ایک اور“ شہنو نے ماں سے کہا۔

”چلو تم دونوں کھڑے ہو جاؤ..... ادھر آکر..... چلو حوض کی منڈیر پر بیٹھو۔ بیک گراؤنڈ بہت

اچھی ہے.....“ ریشمینے بھی بچوں کے ساتھ گل ل کر محظوظ ہو رہی تھی.....

شہنو اور شہباز کی اس نے تین تصویریں کھینچیں۔

”اب اس درخت کے پاس کھڑے ہو جاؤ.....“ ریشمینے نے کہا۔

شہباز اور شہنو ساتھ ساتھ کھڑے ہو گئے..... شہباز نے اپنا بازو شہنو کے کندھے پر رکھا،

شہنو نے اپنا ہاتھ شہباز کے ہاتھ پر رکھ دیا.....

ریشمینے نے انہیں فوس کیا۔ لیکن بیٹن دبانے سے پہلے ہی شہنو نے شہباز کا بازو کندھے سے ہٹا دیا اور چھلانگیں لگاتی گیٹ کی طرف بھاگی ”آغا بی بی آئیں..... آغا بی بی آئیں“

”بیوقوف.....“ ریشمینے نے کہتے ہوئے کمرہ ہاتھ میں لیا۔

شہباز نے بھی جھلا کر گیٹ کی طرف دیکھا۔

واقعی صبور چاچا کی گاڑی گیٹ کے اندر آرہی تھی..... ڈرائیور کے ساتھ اسے زرگل بیٹھا نظر

آیا۔

وہ بھی اسی وارفتگی کے انداز سے گاڑی کی طرف بھاگا.....

گاڑی دونوں بہن بھائیوں نے پورچ تک بھی پہنچنے نہ دی..... وہیں سرخ بھری والی سڑک پر

روک لی..... ڈرائیور نے ہاتھ اٹھا کر کے دونوں کو سلام کیا۔

زرگل آگے بیٹھا تھا۔ اور پچھلی سیٹ پر آغا بی بی زری اور اس کی خدمت گار تھیں۔

ریشمینے بھی قدم قدم چلتی ادھر آگئی..... دونوں بچوں اور ریشمینے نے آغا بی بی کو

سلام کیا خدمت گار نے بھی سب کو سلام کیا

”زرگل آپ..... آپ.....“ شہباز نے کہا۔

زرگل مسکراتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ شہنو

کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا..... زرگل شہباز سے الگ ہوا تو وہ اس کے بازو سے جھول گئی۔

”زرگل لالہ..... میں آپ سے بہت اس ہو گئی تھی..... آپ اتنی دور چلے گئے ہیں.....“ وہ

سادگی سے بولی۔

”پہ خیر آغا بی بی جانے.....“ ریشمینے نے آغا بی بی کا ہاتھ تھام کر بوسہ دیا۔ آغا بی بی نے

جواباً ریشمینے کے ماتھے کو چوم کر عادی۔ پھر شہباز کو لپٹا کر پیار کیا۔ اس نے بھی دادی کے ہاتھ پر بوسہ

دیا۔ ریشمینے زرگل اور زری کو پیار کرنے لگی۔ شہنو دادی سے لپٹ گئی۔

”آغا بی بی..... زرگل لالہ آگئے ہیں۔ میں کتنی خوش ہوں.....“

ریشمینے نے زری کو ساتھ لگائے لگائے زرگل سے پوچھا ”ٹھیک ٹھاک رہے نا..... دل لگ

گیا ہاں.....“

”دل لگانا ہی پڑے گا.....“ زرگل مسکرا کر بولا..... ”ابھی تو..... ایک مہینہ ہی گزار کر

بھاگ آیا ہوں“

”کتنی چھٹی ہے..... زرگل.....“ شہباز نے پوچھا۔

”آج رات کی خیر میل سے واپس جا رہا ہوں.....“ وہ بولا۔

”نہیں.....“ شہنو بے ساختہ بولی۔

سب مسکرانے لگے.....

”آئے کب ہو“ شہنو نے جلدی سے پوچھا۔

”کل آیا تھا.....“

”کل..... اور یہاں آج آئے..... کل ہمارے ہاں سے ہو کر کیوں نہیں گئے گاؤں۔ میں اور

شہباز لالہ بھی آپ کے ساتھ چلتے.....“ شہنو نے حیرانگی سے کہا۔

”اوہ..... غلطی ہو گئی.....“ زرگل زیر لب مسکرایا۔

”ہوں۔ جاییں میں آپ سے نہیں بولتی.....“ وہ منہ پکا کر کے برآمدے کی طرف بھاگ

گئی۔ زرگی اس کے پیچھے لپکی.....

زرگل مسکرانے لگا.....

ریشمینے اور آغا بی بی ایک دوسری کی احوال پر سی کرتیں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتیں برآمدے

کی طرف بڑھنے لگیں.....

خدمت گار نے بیک اٹھائے اور ڈرائیور گاڑی ایک طرف کر کے مردان خانے کی طرف چلا

گیا۔

چائے کے بعد چاروں بچے باہر لان میں چلے آئے۔ شہباز زرگل سے باتیں کرنے لگا۔ کالج اور

ہوسٹل کی باتیں۔ نئے دوستوں کی باتیں.....

زرگی اور شہنو بھی ان کے ساتھ تھیں..... شہنو کو زرگل پر ابھی تک غصہ آ رہا تھا۔ کہ وہ

کل آیا اور آج چلا جائے گا۔ کل یہاں سے ہو کر جاتا تو وہ بھی اس کے ساتھ گاؤں ہو آتی۔ دودن اکٹھے گزارتے

تو کتنا مزہ آتا.....

”اے شہنو“ زرگل نے درخت کے تنے پر بیٹھ بیٹھے کہا۔

وہ جواب دیے بغیر زرگی سے بولی ”تم نہیں رہو گی نا.....“

”میں تمہیں بلارہا ہوں شہنو.....“ زرگل نے اونچی آواز میں کہا۔ تو وہ منہ پھلائے بولی

”نہیں بولتی میں تم سے“

شہباز نے ہنس کر کہا ”بت زہریلی ہے یہ۔ بچ کے رہنا اس سے.....“

”تم کیوں بچ میں بولے.....“ شہنو نے دانت پیس کر کہا۔

”لڑنے کے موڑ میں ہے کھیانی ملی.....“ شہباز نے چڑایا..... تو وہ اس پر چھپنے کو دوڑی.....

زرگل نے جلدی سے اس کا کندھا تھام کر اسے روک لیا اور ہنس کر بولا..... ”ناراض مجھ سے ہو..... الجھتی شہباز

سے کیوں ہو.....“

”آؤ زرگی ہم ادھر چلتے ہیں.....“ شہباز نے خاموش کھڑی زرگی سے کہا..... ”میرے پاس

کیمرہ ہے..... آؤ تمہاری تصویر اتاروں.....“

وہ زرگی کو ساتھ لے کر دوسری طرف چلا گیا۔

شہنو منہ پکا کئے کھڑی رہی..... زرگل نے پیار سے اسے دیکھا اور بولا ”ویسے شہباز ٹھیک سی

کہتا ہے“

”کیا؟“ وہ غرائی

”اب میں اس کے الفاظ دہراؤں گا۔ تو مجھ پر بھی جھپٹ پڑو گی..... نہ بابا۔ میں کچھ نہیں

کہتا..... میری توبہ.....“

زرگل نے کانوں کو ہاتھ لگائے..... تو شہنو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”شکر ہے۔ ہنسی تو سی.....“ زرگل نے اس کے گال پر پیار سے چھکی لگائی..... وہ اس کے

کندھے سے جھول کر بولی ”زرگل لالہ..... تم فیصل آباد کیوں داخل ہو گئے..... یہاں پشاور ہی میں نہیں رہ سکتے

تھے..... میں تم سے بہت اداس ہو گئی تھی۔ ایک دفعہ گاؤں گئی۔ تو تمہارے بغیر وہاں جی ہی نہیں لگا..... اتنا دل

چاہا..... کہ تم ہوتے اور درخت سے چڑیا کے بچے اتار کر دیتے۔ مجھے۔“

”شہنو..... پڑھائی کے لئے جانتی تھا مجھے.....“

”چار سال وہیں رہو گے“

”آنا جاتا رہوں گا نا..... ہاں یاد آیا۔ آؤ تمہیں ایک چیز دوں.....“

”کیا؟“

”تمہارے لئے لایا ہوں فیصل آباد سے“

”کیا“

”تحفہ.....“

”لیکن ہے کیا.....“

”دیکھ لینا.....“

دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے اندر چلے آئے۔ شہباز اور زرگی وہیں تھے۔ شہباز اس کی تصویریں

اتار رہا تھا.....

زرگل نے خوبصورت سا ڈبہ بیک میں سے نکال کر شہنو کو دیا..... شہنو اچک کر کھڑکی میں بیٹھ گئی..... ڈبہ گود میں رکھ کر بڑے پیار اور شوق سے کھولا.....

زرگل قریب ہی کھڑا سے تکر رہا تھا۔

شہنو نے ڈبہ کھولا۔ اس میں چوڑیاں جیولری اور رومال دیکھ کر خوشی سے چلائی ”ہائے کتنے اچھے ہیں..... یہ چوڑیاں..... مجھے بہت اچھی لگتی ہیں چوڑیاں..... زرگل لالہ آپ کو پتہ تھا کہ یہ رنگ مجھے پسند ہیں؟..... اور یہ ٹاپس..... یہ ہار..... اف کتنے پیارے ہیں.....“

”پسند آگئے“

”بہت“

”شکر ہے“

”شکریہ.....“

وہ ایک ایک چیز اٹھا کر دیکھنے لگی..... پھر بولی ”زری کے لئے کیا لائے تھے.....“

”یہی چیزیں“

”بالکل ایسی ہی“

”ہاں۔ صرف اس کی چوڑیوں کا رنگ فرق ہے.....“

”زرگل لالہ.....“

”ہوں“

”یہ چوڑیاں مجھے پسند ہیں.....“

”میں.....“

”ہاں“

”مجھے نہیں آتا چوڑیاں پسنانا..... شہزاد گئی سے کہو..... یا بی بی گل سے..... ہاں آغا بی بی سے

کو زری کو بھی انہوں نے ہی پسنائی تھیں.....“

”نہیں.....“ وہ ٹانگیں ہلاتے ہوئے بسوری..... ”آپ پسنائیں نا.....“

”بھئی کمانا..... ٹوٹ جائیں گی..... کیسے ہاتھ زخمی ہو گیا تو.....“

”تو کچھ نہیں ہو گا..... میں تو آپ ہی سے پہنوں گی.....“ وہ ضد کرنے لگی..... تو زرگل نے آگے

بڑھ کر اس کے ہاتھ سے چوڑیاں لیں۔

”لاؤ ہاتھ.....“ زرگل نے کہا۔

شہنو نے اپنا گلابا سفید سفید ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا.....

”ٹوٹ گئیں۔ یا ہاتھ زخمی ہو گیا تو میرا زخم نہیں ہو گا.....“

”نہیں ہو گا بس..... لیں پسنائیں.....“

زرگل نے ایک ایک چوڑی اس کے ہاتھ میں ڈالنا شروع کی۔ پہلی چوڑی ٹوٹ گئے دوسری

سلامت رہی۔ تیسری پھر ٹوٹی..... ہاتھ میں چبھ بھی گئی..... اور نہ ہی سرخ خون کی بوند سفید ہاتھ پر ابھر آئی۔

”دیکھنا..... خون نکل آیا.....“ زرگل بولا..... پھر اس نے انگلی کی پور سے خون کی بوند صاف

کی۔

”خیر ہے۔ آرام سے پسنائیں..... آپ تو توڑے جا رہے ہیں چوڑیاں۔ اس نے جھولی میں

پڑے چوڑیوں کے ٹکڑے دیکھے۔

زرگل نے احتیاط سے کام لیا۔ تب بھی بہت سی چوڑیاں ٹوٹ گئیں..... جو کلائی تک زندہ

سلامت پہنچ گئیں..... شہنو نے انہیں پیار سے بوسہ دیا.....

اس لمحے وہ زرگل کو بہت ہی اچھی لگی..... اور وہ اس کی کلائی میں پھنسی پھنسی رنگین چوڑیوں پر

کسی لاشعوری جذبے کے تحت ہاتھ پھیرنے لگا۔

شہنو عمر کے اس دور میں ان جذبوں کی شدتوں سے شناسا نہیں تھی۔ اسی لئے اپنی کلائی

چھڑائی۔ کھڑکی سے کود کر اتاری اور خوشی سے چمکتے ہوئے بولی..... ”میں بی بی گل کو دکھاؤں یہ چوڑیاں.....“

زرگل کے اثبات و نفی کے اشارے کو دیکھے سمجھے بغیر وہ کمرے سے اچھلتی کودتی باہر نکل گئی۔

ہندو کش کی بریلی ہواؤں کی یلغار نے موسم کو بخ بستہ کر دیا تھا۔ آسمان پر بادلوں کے بے ہنگم تودے ادھر ادھر لڑھکتے پھر رہے تھے۔ سورج کی لہریں لیتی روشنی کچھ چندھیائی چندھیائی سی تھی۔ جس سے فضا ٹھنڈی ٹھنڈی لگ رہی تھی۔ کئی دنوں سے یہی عالم تھا۔ بارش پڑنے کے امکان تو تھے۔ لیکن ہواؤں کا زور بادلوں کو گتہ جوڑ کرنے نہیں دیتا تھا۔ کہیں گھل مل جاتے تو تیز طوفانی ہواؤں انہیں بکھیر کر رکھ دیتیں۔ بارش نہ ہونے سے فضا کچھ زیادہ ہی بخ بستہ ہو رہی تھی۔ سردی کے ان دنوں میں صبح دیر سے بیدار ہوتی اور شام جلد ہی اتر آتی تھی۔ سورج ڈھلتے ہی چرند پرند ٹھکانوں کو لوٹ آتے۔ لوگ گھروں میں دیک کر بیٹھ جاتے۔ بازاروں کی رونق سرشام ہی ماند پڑ جاتی۔ خرید و فروخت کے سلسلے بیدم سے ہو جاتے۔

شہروں سے کہیں زیادہ بے رونق کی گاؤں کی فضا میں اتر آتی تھی۔ شام ڈھلنے تک ہی آدم زاد اور ڈھور ڈھگر کھیتوں کھلیانوں میں نظر آتے کچے گھروں سے اٹھنے والے گور اور لکڑی جلنے کے دھوئیں معدوم ہو جاتے۔ کھائی کر لوگ کو ٹھڑیوں والاؤں میں گھس جاتے۔ چراغ کہیں جلنے کہیں بجھ جاتے۔ جلتے چراغوں کی مدہم روشنی لکڑی کی فرسودہ کھڑکیوں کی درزوں سے لکیر کی صورت میں باہر پڑتی دکھائی دیتی۔

جھروں میں البتہ ان دنوں رونق رہتی۔ لکڑیوں سے لاؤروشن رہتا۔ منکلوں میں کوئلے دہکتے۔ لمبے چوڑے والاؤں میں چلم اور قوسے کے دور چلتے۔ گاؤں کے خوش گلوں جو ان لوہے اور پٹے گاتے۔ فضا کو مسور کرتے۔

خان خوشدل خان مرحوم کا جبرہ اب بھی اپنی اسی شان سے قائم و دائم تھا۔ خان صبور خان نے باپ کی گدی سنبھالی تھی۔ حجرے میں ہر خاص و عام کو آنے کی اجازت تھی۔ کھانے کے وقت اب بھی لمبا دسترخوان بچھتا تھا۔ خوشبودار قوسے کے دور اب بھی چلتے تھے اور ملازمین اب بھی چلمیں مٹگے تنباکو سے بھر بھر کر سب کو پیش کرتے تھے۔ بلکہ اب تو کچھ زیادہ ہی اہتمام ہوتا تھا۔ صبور خان اپنے باپ کی نیک نامی کو مزید بڑھانا

چاہتے تھے۔ مرنے والے کانام امر کرنا چاہتے تھے۔ اور وہ اس میں کامیاب بھی تھے۔ لوگ اب بھی خان کا نام احترام سے لیتے تھے۔ ان کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ اور ان کی خوبیوں کے گن گاتے تھے۔

خان کے بعد اہل خانہ کی طرح گاؤں والوں نے بھی خان صبور کو اپنا سرپرست تسلیم کر لیا تھا۔ سرکردہ شخصیت مان لیا تھا۔ ہر چھوٹے بڑے کام کے لینے وہ انہی سے رجوع کرتے تھے۔ فیصلے جرگے کی صورت ہوتے تھے۔ اور یہ جرگے اب بھی اسی حجرے میں خان صبور کی سربراہی میں بیٹھتے تھے۔

فیصلہ تو خان صبور خان ہی کیا کرتے تھے۔ لیکن فیصلہ کرنے سے پہلے وہ بزرگوں سے مشورہ ضرور کرتے۔ گاؤں کے معتبر لوگوں کی رائے لیتے اور اپنے بھائی خان نواز خان سے بھی ضرور پوچھتے۔ وہ کئی فیصلے نواز خان کی رائے سے کر چکے تھے۔ اور یہ فیصلے عوام نے خوشدلی سے قبول کئے تھے۔

ان دنوں بھی ایک مقدمہ زیر غور تھا۔

گاؤں کے دو گھرانوں کی آپس میں ٹھن مٹی تھی۔

گل پروشے خان صبور خان کی اکلوتی اور بیحد حسین بیٹی تھی۔ صمد خان صبور خان کا حزرار تھا۔ شریف اور غیور آدمی تھا۔ گل پروشے کی مکتبی اس نے اپنے بھتیجے دریا خان سے کی ہوئی تھی۔ لیکن گل پروشے کو دریا خان پسند نہیں تھا۔ وہ اپنے ہی کندی (محلے) میں رہنے والے اجمل خان سے محبت کرتی تھی۔ اجمل خان بڑا خوبصورت جوان تھا۔ لکڑی کاٹنے اور ڈھونے کا کام کرتا تھا۔ کچھ عرصہ پشاور میں رہ کر چوکیداری بھی کی تھی۔ ڈرائیوری بھی کر چکا تھا۔ ٹرک چلاتا رہا تھا۔ چار پیسے کما کر گاؤں واپس آ گیا تھا۔ اب لکڑی کاٹنے کا کام کرتا تھا۔ بڑا لیلیا بڑا رنگین مزاج تھا۔

گل پروشے اس کے ساتھ کھلی بڑھی تھی۔ چند سال گاؤں سے غیر حاضر رہ کر جب وہ لوٹا تو گل پروشے جو بند کلی تھی۔ گل کر پھول بن چکی تھی۔ وہ اس کے تیر نظر کا گھائل ہو گیا۔ جذلوں نے جذلوں کو جانا پہچانا۔ گل پروشے دریا خان کی بجائے اس میں دلچسپی لینے لگی دلچسپی بڑھی۔ چھپ چھپ کر ملاقاتیں ہونے لگیں۔

لیکن

آگ لگے تو دھواں نکلتا ہی ہے۔ خوشبو کی مہک پھیلی ہی ہے۔ گندگی کا ذہیر ہو تو تعفن کا

احساس ہو ہی جاتا ہے۔

گل پروشے اور اجمل کی ملاقاتوں کے سائے بھی لہانے لگے۔ بات نکلی۔ بڑھی اور پھیل گئی۔ تب اجمل نے گل پروشے کا رشتہ مانگا۔ جو صمد خان نے درشتی تخی اور مار ڈالنے کی دھمکی دے کر مسترد کر دیا۔ اجمل اپنی محبت سے کب دستبردار ہو سکتا تھا۔

گاؤں میں پرانے دفتوں میں دستور تھا کہ جب لڑکائی سے پیار کرتا اور اسے حاصل کرنا چاہتا..... اور حاصل کرنے میں وقت دشواری ہوتی۔ تو وہ جان پر کھیل کر لڑکی کے بالوں کی لٹ کاٹ لیتا..... یہ لٹ اس لڑکی کو حاصل کرنے میں یوں مسکے بند معاون ثابت ہوتی۔ کہ اس کے بعد کوئی دوسرا لڑکی کی طرف بڑھ نہیں پاتا تھا۔ ایسا کرنے میں اسے جان سے ہاتھ دھونا پڑتے تھے..... لٹ کاٹنے والے کے سوا لڑکی پر کسی دوسرے کا حق رہتا ہی نہیں تھا۔ ایسی صورت حال دوستانہ پر ختم ہوا کرتی تھی۔ یا تو لٹ کاٹنے والا لڑکی حاصل کر لیتا۔ یا لڑکی کے باپ بھائیوں کے ہاتھوں قتل ہو جاتا.....

اجمل نے بھی یہ متروک طریق پھر سے چگایا..... وہ صد خان کے گھر گیا۔ اپنا مطالبہ بڑی انکساری سے دہرایا۔

لیکن

جب صد خان غصے سے لال پلایا ہو کر منغلاٹ بکنے لگا۔ تو وہ بھی جوش میں بھر گیا..... سامنے ہی کچی کوٹھڑی کے صدیوں پرانے کواڑ کے پیچھے گل پروشے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اجمل آگے بڑھا اور برق کی سی تیزی کے ساتھ اس کے سر سے لمبے بالوں کی لٹ جب میں رکھی قینچی نکال کر کاٹ لی۔

گل پروشے نے بے طرح گھبرا کر چیخ ماری..... صد دیوار پر لٹکی بندوق اتارنے کو لڑکا لیکن اجمل لٹ لہرا کر صد کو دکھاتے ہوئے چلایا ”اب گل پروشے کی طرف جو ہاتھ بڑھاؤ کاٹ دوں گا..... گل پروشے میری ہے۔ میری ہے۔ میری ہے۔“

بندوق اتار کر نشانہ لینے سے پہلے ہی اجمل بھاگ گیا.....

صد خان شور مچاتا گلی میں نکل آیا۔ لوگ گھروں سے نکل آئے۔ کھیتوں سے بھاگے آئے اک ہنگام مہیا ہو گیا..... شور شرابہ طوفانی صورت اختیار کر گیا..... بچے بوڑھے جوان اکٹھے ہو گئے۔ لٹ کاٹنے کی رسم نوجوانوں کے لئے بنی تھی..... وہ دلچسپی سے اس بارے میں بزرگوں سے پوچھ رہے تھے..... کچھ لوگ اجمل کی دلیری کی داد دے رہے تھے۔ کچھ اسے برا بھلا کہہ رہے تھے۔ دریا خان اور اس کا باپ بھی رائفلیں لے کر آگئے تھے..... غصے اور طیش میں اجمل خان کے اگلوں پچھلوں کو کوس رہے تھے..... گالیاں دے رہے تھے..... اس کے خاندان کا صفایا کر دینے پر قتل گئے تھے۔

لوگ بڑی مشکل سے انہیں روک رہے تھے..... قابو کر رہے تھے۔ سمجھانے کی کوشش میں لگے تھے۔

صد خان تلملارہا تھا..... غصے میں اسے اور کچھ نہیں سوچا تو گل پروشے کو ہی جان سے مار دینے کے لئے اندر پڑکا۔

لیکن

وہ تو خیر ہوئی جو گل پروشے کو پچھلے گھر والی ہمسائی معاملہ بھڑکنے دیکھ کر گھر سے نکال کر لے گئی تھی۔ اور چھت سے چھت پر دوڑاتی چوتھے گھر کی کچی سیڑھیوں سے نیچے انگرخان صبور خان کی حویلی کے پچھلے پھاٹک سے نوکر گھروں میں اپنی چاچی کے پاس چھپا آئی تھی.....

دریا خان بھی بے طرح مشتعل تھا۔ معاملہ غیرت کا بن گیا تھا..... وہ غریب تھا لیکن غربت اور غیرت کا تو چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ لوگوں کے سمجھانے بھانے پر بھی اسے قرار نہیں آ رہا تھا۔ وہ اجمل خان کی تنک بوٹی کر دینا چاہتا تھا۔ چلا چلا کر اعلان کر رہا تھا۔ کہ جب تک وہ اجمل خان کے خون سے ہاتھ نہ رنگ لے گا۔ چین سے نہ بیٹھے گا۔

لوگوں نے سمجھا بھا کر صد خان اور دریا خان کے غصے کو بھڑکنے سے بچا تو لیا۔ لیکن جب چنگاری بھس میں پڑے تو آگ کا بھڑک اٹھنا یقینی ہوتا۔ چنگاری بھس کے سینے میں ہے تنکے ہوئے ہوئے آگ پکڑتے ہیں۔ آگ تنکے سے تنکے کو لپیٹ میں لیتی ہے۔ اور پھر ہوا کا ہلکا سا جھونکا اس آگ کو شعلہ بنا دیتا ہے۔ شعلے بھڑکتے ہیں۔ اور جو چیز سامنے آئے اسے لپیٹ میں لے لیتے ہیں.....

صد خان اور دریا خان کا بھی یہی حال تھا..... وقتی وبال۔ تو تھا۔ لیکن ختم نہیں ہوا تھا۔ اجمل خان نے گل پروشے کی لٹ کاٹی تھی۔ دشمنی پہلے ہی کیا کم تھی۔ اس حرکت نے تو سوائے ہونے شیر کو جگا دیا تھا..... صد خان اجمل خان کے خون کا پیاسا تھا..... دریا خان اور اس کے بھائی اس بے عزتی کا انتقام لینے کے لئے بے تاب تھے۔

لیکن

اجمل خان اس دن کے بعد گاؤں میں کیس نظر نہیں آیا تھا..... سب کا خیال تھا کہ وہ یقیناً شہر چلا گیا ہے..... اور اپنی ٹرک کی نوکری پھر سے شروع کر دی ہے۔ دریا خان نے پشاور جاکر ٹرکوں کے ہرڑے پر اسے تلاش کیا تھا..... لیکن ویدہ دلیری سے یوں لٹ اڑانے والے اپنے تعاقب کا سراغ تھوڑا چھوڑتے ہیں۔

دن مہینے گزرتے چلے گئے.....

اجمل خان کا تہہ بہہ کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔

صد خان نے اس کی عدم موجودگی میں گل پروشے کو دریا خان کے ہاتھ سوچنے کا منصوبہ بنایا دریا خان بھی خوش ہو گیا۔ گو اس کے گھر والے ماننے سے انکاری رہے۔ وہ جانتے تھے کہ جس لڑکی کی لٹ کٹ چکی ہو..... وہ لٹ کاٹنے والے کے سوا کسی دوسرے کی نہیں ہو سکتی۔ اس بات پر تو خون کی ندیاں بہہ جاتی

ہیں۔۔۔۔۔

سب نے دریاخان کو سمجھایا۔ لیکن وہ گوہر مقصود پانے کے لئے بے چین تھا۔
شادی کا فیصلہ ہو گیا۔

لیکن شادی سے چند دن پہلے دریاخان اور اس کا بھائی جب کھیتوں سے واپس گھر آ رہے تھے۔ شام کے دھندلے پھیل چکے تھے۔ کہ ترتر گولیوں کی آواز گونجی۔۔۔۔۔ دریاخان توجہ گیا لیکن اس کا بھائی مارا گیا۔۔۔۔۔

قاتل کا پتہ نہیں چل سکا۔

لیکن سب سمجھتے تھے۔ کہ یہ سنناتی گولیاں صرف اجمل خان کی بندوق سے نکل سکتی ہیں۔۔۔۔۔
جوان بھائی کی موت نے دریاخان کے ہوش و حواس چھین لئے۔ انتقام کی آگ نے اس کی سوچ سمجھ خاستر کر ڈالی۔ اس نے بھائی کی موت کا بدلہ اجمل خان کے خاندان کے دو بچوں کو قتل کر کے لے لیا۔۔۔۔۔

پھر ایک سال کے اندر ہی دریاخان پر تین قاتلانہ حملے ہوئے۔ جن میں وہ توجہ گیا۔ لیکن ایک بار چچا دوسری بار دوست اور تیسری بار بھانجا مجروح ہوئے۔۔۔۔۔ یوں اس معاملے میں کئی لوگ ملوث ہو گئے۔

معاملہ بیحد سنجیدہ ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ قتل و قتل عام کا یہ سلسلہ اسی طرح ختم ہو سکتا تھا۔ کہ دونوں متحارب گروہوں کی صلح صفائی کروادی جائے۔۔۔۔۔ دونوں طرف کے بزرگوں نے اپنے طور پر بہت کوششیں کیں۔

اب اجمل خان بھی سامنے آ گیا تھا۔۔۔۔۔ اور اپنی حفاظت کے ساتھ ساتھ دریاخان کی ہلاکت کے منصوبے علی الاعلان بنا رہا تھا۔۔۔۔۔

یوں معاملہ بگڑ گیا تھا۔۔۔۔۔

بہادری اپنی جگہ مستحسن تھی۔ لیکن جس بہادری کو خون ناحق میں نہلایا جائے۔ وہ بہادری نہیں رہتی۔۔۔۔۔ زیادتی بن جاتی ہے۔ اور پھر اس زیادتی کے سامنے سینہ سپر ہونے والے ہی بہادر ہوتے ہیں۔۔۔۔۔
دونوں طرف سے زیادتی ہو رہی تھی۔ اس لئے خاندان کے معمر اور معتبر لوگ دونوں مشتعل جوانوں کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔۔۔۔۔ اور صلح صفائی کی امکانی کوششوں کے لئے مصبور خان سے رجوع کیا۔۔۔۔۔

جرگے کا انتظام کیا گیا تھا۔۔۔۔۔ یہ جرگہ خان مصبور خان کے حجرے میں بیٹھنا تھا۔۔۔۔۔ خان نے اس سلسلے میں دونوں طرف کے ہوشمند لوگوں سے بات کی تھی۔ صلاح مشورہ کیا تھا۔ کل فیصلہ کرنا تھا۔۔۔۔۔ اس لئے انہوں نے خان نواز خان کو بھی بلا بھیجا تھا۔۔۔۔۔

نواز شام ڈھلے گاؤں پہنچے تھے۔ دو تین ملازم بھی ساتھ آئے تھے۔ اور شہباز بھی آیا تھا۔ سردی شدت اختیار کئے ہوئے تھی۔ اس وقت دالان میں کئی منکلیں رکھی تھیں۔ جن میں کوئلے دہک رہے تھے۔ کچھ کوئلے سپید سپید راکھ میں دبے تھے۔ منکلیں بڑے بڑے تانبے کے تھاواں میں رکھ کر قالین پر رکھی تھیں۔ کھڑکیاں دروازے بند تھیں۔ پردے گرائے ہوئے تھے۔ پھر بھی جن بستہ ہوائیں کسی درز سے چوری چوری اندر گھس آتی تھیں۔ اور بدنوں میں کچکی پیدا کر دیتی تھیں۔

آغا بی بی اور مصبور خان دالان ہی میں تھے۔ نواز خان بھی ان کے پاس بیٹھے تھے۔ آغا بی بی نے سندلی ڈالوائی تھی۔ سردی جب شدت اختیار کر جاتی تو سندلی ڈالی جاتی تھی۔ اس کے لئے لمبا چوڑا لحاف ضروری ہوتا۔ ڈیزھ فٹ اونچی لمبوتری میز کے نیچے منکل رکھ دی جاتی جس میں راکھ میں دبے کوئلے تمازت بکھیرتے۔ میز پر لحاف ڈال دیا جاتا۔ اور میز کے چاروں طرف گاؤں گئے رکھ دیئے جاتے۔ اہل خانہ تکیوں سے ٹیک لگا کر لحاف گھٹنوں پر ڈالے گرماہٹ سے لطف اندوز ہوتے۔ رات کو اکثر سو بھی اس سندلی میں جاتے تھے۔ کھانا پینا بھی یہیں ہوتا۔

اس وقت آغا بی بی گرم چادر سے ماتھا سر پیٹے سندلی میں نیم دراز تھیں۔ میز پر لحاف کے اوپر سرخ پھولدار دسترخوان بچھا تھا۔ جس پر چائے کی ٹرے ڈرائے فروٹ اور خرے وغیرہ رکھے تھے۔ مصبور خان سندلی سے باہر بیٹھے تھے۔ سوائی گرم چنچہ پہنا ہوا تھا۔ گردن کے گرد ادنی مظر تھا اور سر پر گرم سوائی ٹوپی تھی۔
نواز خان نے بھی سردی سے بچاؤ کر رکھا تھا۔ گرم ملیشینے کا جوڑا پہنا ہوا تھا۔ اس پر موٹی ادنی جرسی اور اس پر چمڑے کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ ٹوپی انہوں نے اتار کر دائیں ہاتھ پڑے تکتے پر کار تو سوں کی چوٹی کے ساتھ اتار کر رکھ دی تھی۔۔۔۔۔

مصبور خان نے نواز خان کو جس مقصد کے لئے بلا یا تھا وہ ان پر واضح کر دیا تھا۔ سارا قصہ نواز پہلے بھی جانتے تھے۔ پھر بھی مصبور نے مختصر آدوٹوں طرف کے حالات انہیں بتائے تھے۔۔۔۔۔ نواز خان سوچ میں ڈوبے ماں کے قریب بیٹھے تھے۔

آغا بی بی نے اپنی کاکنارہ اٹھا کر ان کے گھٹنوں پر ڈال دیا۔

”کیا خیال ہے۔۔۔۔۔“ مصبور خان نے ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”خان لالہ۔۔۔۔۔“ وہ سراٹھا کر بھائی کو دیکھتے ہوئے بولے۔

”ہوں“

”زیادتی اجمل خان کی ہے۔ گل پروشے کارشتہ صمد خان نے دریاخان سے طے کر دیا تھا۔ یہ بات میرے علم میں ہے۔۔۔۔۔ صمد خان نے یہ بات خود مجھے بتائی تھی۔ اس رشتے سے وہ خوش بھی تھا۔۔۔۔۔ دریاخان

”نہیں تم یہ ذکر درمیان میں لاؤ ہی نہیں.....“

دونوں میں جوش و خروش سے مباحثہ ہونے لگا۔ آغا بی بی دونوں کو آرام اور سہج سے باتیں کرنے کی کبھی کبھی تلقین کر رہی تھیں..... لیکن نواز خان جو شیے اور غصیلے انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ اجمل خان

”تو پھر خان لالہ سے کہیں فیصلہ دریا خان کے حق میں کریں..... اور اجمل خان کو دریا خان کے ہاتھوں عبرت ناک انجام تک پہنچنے کی کھلی چھٹی دے دیں.....“

صبر خان نے گہری نظروں سے بھائی کو دیکھا..... متفکر اور پریشان سے ہو گئے..... انجام سے خوف نے ان کے من کو گھیر لیا۔ انہوں نے دل سے دعا کی..... کہ خان بابا کے ہاتھوں سرانجام دیئے رشتے بخیر و عافیت انجام کو پہنچ جائیں۔ خدا نخواستہ ایسا نہ ہوا تو.....

تو

یہ نواز خان.....

یقینی تباہی کا سوچ کر انہیں جھرجھری سی آگئی.....

”یار اتنی دیر سے تمہیں بلارہے ہیں۔ گھر میں گھسے کیا کر رہے تھے“

اصغر نے بھی یہی بات کہی..... ”نہیں آنا تھا تو جواب بھجوا دیتے.....“

ندیم نے ہنس کر کہا ”تمہیں تو گھر سے بلانا مشکل ہو جاتا ہے۔ لڑکیوں کی طرح گھر ہی میں گھسے رہتے ہو.....“

شہباز دوستوں کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا..... سب میچ کھیلنے کے موڈ میں تھے۔ ہاکی ان کا پسندیدہ کھیل تھا۔ شہباز ان کی ٹیم کا بہترین کھلاڑی تھا۔ اس کے بغیر کھیل جاندار نہیں ہوتا تھا۔ اسی لئے تینوں باقی ساتھیوں کو گراؤند ہی میں چھوڑ کر اسے بلانے آئے تھے۔ یہ تینوں اس کے بہترین دوست اور سکول کے ساتھی بھی تھے..... ان کے ساتھ کھیلنے سے وہ خوش ہوا تھا۔ پڑھائی بھی وہ اکثر اکتھے بیٹھ کر ہی کرتے..... کبھی شہباز ان کے ہاں چلا جاتا اور کبھی وہ اس کے ہاں آ جاتے..... شہباز کے بابا جب گھر پہ ہوتے تو وہ اس کے ہاں آنے سے گریز کرتے۔

وہ ہنس کر کہتے ”بھئی تمہارے بابا تو نرے ہٹلے ہیں.....“

”ان کی شکل دیکھ کر ہی مجھے تو ڈر لگنے لگتا ہے۔ اتنا رعب داب ہے ان کا.....“

”یار تم اپنے بابا سے باتیں کیسے کر لیتے ہو..... ڈر نہیں لگتا.....“

”بڑے خونخوار قسم کے والد محترم ہیں تمہارے.....“

”غصہ تو لگتا ہے ناک پہ دھرا رہتا ہے.....“

”میرا تو کبھی ان سے سامنا ہو جائے تو جان ہوا ہو جاتی ہے..... حالانکہ مجھے پتہ ہے وہ مجھے کچھ

کہتے نہیں..... پیار ہی سے پکارتے ہیں.....“

”لیکن ان کا پیار بھی تو جیسے سنگین کی نوک پہ دھرا ہوتا ہے“

”شہباز ان سب کی باتوں پر مسکرانے لگا۔ دوستوں کی بے تکلفی اسے بری نہیں لگتی تھی۔ وہ اپنے بابا کے متعلق ایسی باتیں سنتا۔ تو اسے اک ٹھٹھن کا احساس ہوتا۔ بابا اتنے بڑے تو نہیں تھے۔ پھر بھی ان کا رعب داب اور گھر میں رہنے کا انداز کچھ ایسا ہی تھا۔ سوائے شہنو کے ان کے ساتھ کوئی کھل کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ حتیٰ کہ بی بی گل بھی نہیں۔ اور یہ بات شہباز کو کھلتی تھی۔ کئی بار وہ بی بی گل سے اس بارے میں بحث و تکرار کر چکا تھا۔ لڑچکا تھا۔ لیکن بی بی گل کو خدا نے جانے کس مٹی سے بنایا تھا۔ کہ وہ راضی یہ رضا تھی۔ سر جھکا کر جینے کی عادت اپنائی تھی۔ زیادتی بھی سہہ لیتی تھی۔ اپنے حقوق کا دائرہ اس نے محدود کر رکھا تھا۔ اور اب تو وہ اس ماحول کی عادی ہو چکی تھی۔ شہباز کے لڑنے جھگڑنے سے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ وہ الٹا اسے ہی مزے لے کر تھیں۔ باپ کے متعلق شہباز کے خیالات و جذبات سے آگے اسے فکر مند بنا دیتی۔ جب شہباز چھوٹا تھا۔ تو وہ اس کے حق کے لئے کئی دفعہ نواز خان کے سامنے دھیمے انداز میں آواز اٹھا چکی تھی۔

لیکن پھر میں چونک لگائی نہیں جاسکتی۔ نواز خان کی اپنی سوچ و فکر تھی۔ اپنے رویے تھے۔ اپنا مزاج تھا۔ بیٹے کی پرورش اٹھان اور تربیت وہ اپنے نظریے کے مطابق کرنا چاہتے تھے۔ اسے وہ بنانا چاہتے تھے جو وہ خود تھے۔ بلکہ اس میں وہ باتیں بھی دیکھنا چاہتے تھے جو ان میں نہیں تھیں۔ اور ان باتوں میں پلک نہیں سختی تھی۔

خنتی

جو

شہباز کے مزاج میں پنپ نہیں رہی تھی۔ اس کے اندر اک الجھاؤ تھا۔ وہ نواز خان کی زندگی نہیں جینا چاہتا تھا۔ اس کا اپنا آپ بھی تھا۔ اور یہ اپنا آپ قدم قدم پر نواز خان سے ٹکرا رہا تھا۔ جس طرح کے حالات جارہے تھے۔ لگتا تھا۔ شہباز نہ تو نواز خان بن سکے گا اور نہ ہی شہباز رہے گا۔ دونوں کے ٹکراؤ سے وجود و شخصیت کی کوئی اور ہی شکل بن جائے گی۔

رائیڈنگ شہباز کو پسند تھی۔ نواز چاہتے تھے وہ رائیڈنگ کے ساتھ تیراکی بھی سیکھے شانہ بازی میں اس نے تربیت حاصل کر لی تھی۔ لیکن گولیوں کا کھیل اسے پسند نہیں تھا۔ نواز چاہتے تھے وہ گاؤں جا کر باقاعدگی سے اب بھی پریکٹس کیا کرے۔ کہیں گھونے پھرنے جائے۔ تو دو تین خدمت گاڑیوں لے کر جائے۔ حتیٰ کہ ہاکی کھیلنے بھی جائے تو خدمت گار ساتھ ہوں۔ شہباز اس تکلف کو اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ یہ اور اسی قسم کے کئی دباؤ تھے۔ جو غیر محسوس طریق سے شہباز کی شخصیت کو سوج کر رہے تھے۔

اس کے علاوہ گھر میں دونوں بہن بھائیوں کے درمیان باپ کی محبت اور پیار کا غیر مساوی رویہ بھی تھا۔ بظاہر کچھ نہیں تھا۔ لیکن بہت کچھ تھا۔ کبھی کبھی اس بات پر شہباز کے اندر باغیانہ سی لہر دوڑ جاتی

تھی۔ لیکن یہ لہر کناروں سے ٹکرا کر لوٹ جانے والی تھی۔ ابھی اس کی عمر اتنی نہیں تھی۔ کہ وہ اس کا پوری آگہی اور شعور سے احاطہ کر پاتا۔ وہ چاہتا بھی نہیں تھا۔ کہ یہ لہر شوریدہ سر ہو جائے۔ اسے اپنے بابا سے محبت بھی تھی۔ اس محبت میں ڈر اور خوف بھی شامل ہو گیا تھا۔ اور محبت میں جب ڈر اور خوف شامل ہو جائے تو وہ احترام بن جاتی ہے۔ احترام کی اس اونچائی تک باغیانہ لہر کے پھنچنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اسی لئے شہباز نہ چاہنے کے باوجود بھی بابا کے ہر حکم پر سر جھکا دیا کرتا تھا۔ کسی جسارت کی سوچ بھی محال تھی۔

اصغر ندیم اور انجم نے آج بھی اس کے ساتھ ویسی ہی باتیں کی تھیں۔ جیسے اکثر کرتے تھے۔ بابا کی اسیری کے طنز بھی کئے تھے۔ وہ چپ سی رہا تھا۔

”کیا بات ہے۔“ لگتا ہے آج پھر مرمت ہوئی ہے تمہاری“ انجم نے اس کے چہرے پر کچھ ناگواری کے اثرات محسوس کئے۔

”نہیں یار۔“ شہباز بولا۔

”تو مزاج گرامی کو کیا ہوا۔“ اصغر نے ہاتھ سے اس کے چہرے کی طرف اشارہ کیا۔

”میں ہاکی کھیلنے نہیں جاسکوں گا آج۔“

”کیوں“

”گاؤں جانا ہے“

”اس وقت“

”ہاں۔“

”کوئی ضروری کام ہے۔“

”وہاں کل صبح شانہ بازی کا مقابلہ ہے اور بابا کا آرڈر ہے کہ میں اس میں حصہ لوں۔ صرف

حصہ ہی نہ لوں بلکہ پہلی پوزیشن لے کر آؤں۔“

”تو منہ کیوں لٹکا رکھا ہے۔“

”مجھے یہ اسلحہ کا کھیل قطعاً پسند نہیں اور بابا چاہتے ہیں۔ کہ۔۔۔۔۔“

”شان اور وقار قائم رکھنا تمہارے لئے ضروری ہے۔ ایسے ایسے لیبل اپنی شخصیت پر نہیں

چپکاؤ گے۔ تو تمہیں خان خوشدل خان کا پوتا ہونے کا اعزاز۔“

”بس کرو یار۔“ شہباز نے اصغر کو ٹوک دیا۔ وہ لگتا تھا شہباز کا تسخیر ازار ہے۔

”تو پھر ہم جائیں۔“ ندیم نے کہا۔ ”کھیلنے کا موڈ تھا۔ خیر تمہارے بغیر ہی سی۔ تم تو

ابھی جارہے ہو نا۔“

”ہاں.....“

”کل کی چھٹی بھی گاؤں کی نذر.....“

”ہوں.....“

”چلو جی.....“

”وش یو میٹ آف لک.....“

”خدا کرے جیت کے آؤ.....“

”چلتے ہیں.....“

”خدا حافظ.....“

”خدا حافظ.....“

تینوں دوست گیٹ سے ہی واپس ہو گئے..... شہباز ہولے ہولے چلتا ہوا آمدے میں آگیا..... وہ اس وقت جھنجھلایا ہوا تھا۔ اپنے ان دوستوں کی طرح وہ بھی آزادی سے جینے کا متنی تھا۔ کتنے خوش نصیب لگ رہے تھے وہ اسے۔ انجم ندیم اور اصغر بھی کے ابو تھے۔ لیکن بالکل دوستوں جیسے..... ان کی رہنمائی وہ بھی کرتے تھے۔ لیکن رعب داب اور غصے سے نہیں..... پڑھائی کے وقت پڑھتے تھے۔ کھیل کے وقت کھیلنے تھے۔ کوئی قدر غن نہیں تھی۔ کوئی پابندی نہیں تھی..... اپنے حسابوں اپنی زندگی جی رہے تھے.....

”شہباز بچے“ بی بی گل کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

”جی بی بی گل“

”تیار ہو؟ چیپ لے کر آ رہا ہے..... زرین خان.....“

”تیار ہوں“

بی بی گل دروازے سے نکل کر اس کے قریب آتے ہوئے بولیں ”یہ منہ کیوں بنا رکھا

ہے.....“

”میں بتاتا ہوں“ کمرے سے نواز خان کی آواز آئی۔ شہباز نے سہم کر ماں کی طرف دیکھا نواز

دروازے میں آتے ہوئے بولے ”شایدہ گاؤں جانا نہیں چاہ رہا.....“

”نہیں بابا جان.....“ وہ ڈر کر بولا..... ”جار ہا ہوں۔ تیار ہوں میں تو.....“

”پھر کیا بات ہے“

”کچھ بھی تو نہیں.....“

”کچھ چاہئے“ ریشمین نے ہولے سے پوچھا.....

”شہنو کو بھی میرے ساتھ بھیج دیں“ وہ بولا.....

”پوچھ لو اس سے۔ جاتی ہے تو لے جاؤ..... کل چھٹی تو ہے..... وہ آگئی.....“ برآمدے کی گولائی گھومتے شہنو ادھر ہی آ رہی تھی۔

”جار ہے ہو شہباز لالہ.....“ اس نے آتے ہی پوچھا۔

”تم بھی چلو میرے ساتھ“ وہ بولا.....

”میں کیوں“

”بس..... اکٹھے جائیں گے۔ کل واپس بھی تو آتا ہے.....“

”میں نہیں جاتی۔ تم تو شانہ بازی کے لئے چلے جاؤ گے میں کیا کروں گی.....“

ریشمین نے جلدی سے بولی ”شہنو۔ وہاں زری بھی تو ہے۔ تم اس کے ساتھ کھیل لینا بہت یاد کرتی ہے وہ تمہیں.....“

شہنو نے منہ بتاتے ہوئے کہا..... ”زرگل کے بغیر تو مجھے وہ گھر بالکل اچھا نہیں لگتا۔“

”زرگل کی بچی“ شہباز نے باپ کی نظروں سے بچ کر اس کا کندھا پکڑ کر جھکا دیا۔

”اوئی.....“ اس نے روٹی سی آواز نکالی۔

”کیا ہوا؟“ نواز جلدی سے باہر آگئے.....

”کچھ نہیں.....“ جھٹ سے ریشمین نے کہا..... ”شہباز شہنو کو بھی ساتھ لے جانے

کا کہہ رہا ہے.....“

”شہنو جانا چاہے تو چلی جائے.....“

”میں نہیں جاتی بابا.....“ وہ باپ سے لپٹ گئی.....

شہباز نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا..... نواز شہنو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے

کھلکھلا کر فحش دیئے..... ”بھئی زری دستی تھوڑا ہی ہے۔ نہیں موڈ بن رہا ہماری بیٹی کا تو کیوں مجبور کر رہے ہو

اسے.....“

شہباز کا جی چاہیچ چیخ کر کے کہ موڈ تو میرا بھی نہیں بن رہا مجھے کیوں مجبور کر رہے ہیں خان

بابا.....“

لیکن وہ یہ الفاظ زبان پر نہیں لاسکا..... سر جھکائے ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر

چلا گیا.....

جیب ڈرائیوے پر آگئی تھی۔ زرین خان اور دو خدمت گار اس میں بیٹھے تھے۔ دونوں کے

ہاتھوں میں بند و قیس تھیں۔ اور زرین خان بھی کارتوسوں والی پٹی اور ہولسٹر میں پستول لگائے ہوئے تھا۔

ملازم نے شہباز خان کا بیگ اور دوسری چیزیں جیب میں رکھیں۔

شہباز تھوڑی دیر کے بعد باہر آیا۔ اس نے ہلکے براؤن رنگ کی شلوار قیض پر چڑے کی گمرے براؤن رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر سواتی ٹوپی تھی۔ اور گلے میں کارتوسوں کی پٹی۔ ملازم شہباز کو دیکھتے ہی جیب سے اتر کر مودبانہ کھڑے ہو گئے۔

ریشمینے اور نواز خان اس کے ساتھ باہر آئے۔ ریشمینے نے اس کی پیشانی چوم کر دعا دی۔ ”کامیاب ہو کر آؤ۔“

نواز خان نے بھی اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ ”شہباز خانا۔۔۔ میں جانتا ہوں تمہارا نشانہ بہت اچھا ہے۔ مجھے امید ہے تم کل مقابلہ جیت جاؤ گے۔ یہ اعزاز ہمارے گھر ہی میں رہے۔ تم سے پہلے زرگل نے یہ اعزاز حاصل کیا تھا۔ شاباش بچے۔۔۔ وقت ملا۔۔۔ توکل صبح میں خود بھی آ جاؤں گا۔“

”میں بھی چلوں گی باباجان۔۔۔“ شہنو دروازہ کھول کر ان کے قریب آ گئی۔

”چلو ٹھیک ہے“ خان بابا نے شہباز سے ہلکے پوٹے کہا ”کل میں شہنو اور تمہاری ماں گاؤں پہنچ جائیں گے“

شہباز نے سر ہلا کر خوشی کا اظہار کیا۔ پھر ماں اور باپ کو سلام کر کے جیب کی طرف بڑھا۔

شہنو کا اس نے منہ چڑایا۔۔۔ جواب اس نے ایسا ہی کیا۔

دونوں کی اس حرکت پر نواز اور ریشمینے مسکرا دیے۔ شہباز فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

جیب کی ڈرائیونگ سیٹ پر زرین خان آ بیٹھا۔ خان اور بیگم کو سلام کیا۔ دونوں ملازم بھی پیچھے بیٹھ گئے۔

گاڑی چلی تو شہباز نے پھر شہنو کا منہ چڑایا۔ نواز خان اور ریشمینے نے ہاتھ ہلایا۔

اور جب گاڑی گیٹ سے نکل گئی تو وہ سب واپس کرے میں چلے گئے۔

شہباز زرین سے باتیں کرنے لگا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد شہباز بولا ”زرین خان۔۔۔ جیب میں چلاؤں گا۔“

”نہیں چھوٹے خان۔۔۔“ زرین خان جلدی سے بولا۔ ”آج نہیں خان صاحب نے سختی سے منع کیا ہے۔ ابھی آپ اٹھارہ سال کے نہیں ہوئے۔ اور بلا لائن گاڑی چلانا ٹھیک نہیں۔“

گاڑی چلانا تو آتی ہے مجھے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے پر چھوٹے خان۔۔۔ ابھی ہم جو ہیں خدمت کیلئے۔“

شہباز نے بہت کہا۔۔۔ لیکن زرین خان نے گاڑی اسے چلانے نہیں دی۔ شہباز چپ ہو کر بیٹھ گیا۔ گاؤں پہنچنے تک اس نے زرین خان سے پھر کوئی بات نہیں کی۔

”میں ان کا حدود اربعہ نہیں پوچھ رہا.....“

”تو..... تو کیا پوچھ رہے ہو.....“

”یہ کہ وہ یہاں کیوں آئے تھے.....“

”کیوں آئے تھے۔ یہ کیا بات ہوئی..... وہ جب بھی گاؤں آتے ہیں..... یہاں بھی آتے

ہیں..... دولت تو بہت ہی اچھا ہے۔ اتنا ہنساتا ہے کہ کیا بتاؤں..... بس باتیں ہی اس طرح کرتا ہے کہ ہنسی.....

اے شہباز لالہ..... کیا بات ہے.....“

”کچھ نہیں.....“

”ناراض ہو گئے؟“

وہ چپ رہا۔ لیکن گھورتی نگاہوں سے زری کو دیکھا تو اس کا ہنسا دل سینے میں دھک دھک

کرنے لگا۔

”کیا ہوا شہباز لالہ.....“

”مجھے ان لڑکوں کا تہارے کمرے میں آنا اچھا نہیں لگا.....“

”کیوں“

”پتہ نہیں کیوں“

”یہ کیا بات ہوئی“

”بس کہنا.....“

”وہ بہت اچھے ہیں۔ کبھی ان سے ملونا.....“

”مجھے ان سے ملنے کی ضرورت نہیں“

”تم..... تم تو لڑنے لگتے ہو ہر بات پر.....“

”بس جو بات مجھے اچھی نہیں لگتی۔ مجھے غصہ آ جاتا ہے.....“

”صداقت اور دولت کا یہاں آنا اچھا نہیں لگا.....“

”تمہارے کمرے میں آنا اچھا نہیں لگا..... ضروری تو نہیں کہ تم ان کے ساتھ دوستی

کرو.....“

”ہاں..... ضروری تو نہیں.....“

”تمہارا دوست صرف میں ہوں.....“

”ہاں..... تم ہی ہو شہباز لالہ..... لیکن وہ بھی بہت اچھے ہیں.....“

”زری“

”ہوں.....“

”یہ.....“

”کیا ہے کہو نا..... کیا کہنا چاہ رہے ہو“

”یہ لڑکے کون تھے.....“

”کون سے لڑکے.....“

”وہ جو تھوڑی دیر پہلے تمہارے کمرے میں تھے۔ ایک تمہاری کاپیاں دیکھ رہا تھا۔ دوسرا وہ

بڑی والی گڑیا کو سلا جگا رہا تھا.....“

”ہا..... تم نہیں جانے انہیں شہباز لالہ“

شہباز نے نفی میں سر ہلایا۔ تو زری اپنی خوبصورت آنکھیں حیرانگی اور معصومیت سے جھپکاتے

ہوئے بولی ”جی.....“

”جی“ وہ سنجیدہ تھا۔

بارہ تیرہ سالہ زری کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی ”اپنے رشتہ داروں کو بھی نہیں جانتے یہ

حشمت ماما کے بیٹے ہیں۔ چار سہ میں رہتے ہیں.....“

”حشمت ماما کے بیٹے.....“

”ہاں ہاں..... صداقت اور دولت خان.....“

شہباز کو ان کے کاموں سے جیسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بولا ”یہاں کیوں آئے تھے۔“

”ان کے دادا کا گھر یہیں ہے نا..... وہ گلی کے آخری موڑ پر جو جلی.....“

شہباز کو غصہ آگیا۔ چہرہ لال بھبھو کا ہو گیا۔ ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا..... ”دوستی مجھ سے رکھنی ہے یا ان سے کرنی ہے.....؟“

زری نے حسین آنکھوں کو پھیلاتے ہوئے شہباز کو دیکھا اور پھر سادگی اور معصومیت سے ڈرتے ڈرتے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولی ”تم سے شہباز لالہ..... صرف تم سے۔ سب ترپوروں (کزنوں) میں تم مجھے سب سے اچھے لگتے ہو۔ تم نہیں چاہتے تو میں صداقت اور دولت سے کبھی بولوں گی بھی نہیں..... میں.....“

زری کی آواز بھرا گئی۔ اس کی خوبصورت پھیلی پھیلی آنکھوں میں غمی تیر گئی..... شہباز نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر اپنی مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھا.....

چند لمحوں کے بعد دونوں سائیکس سے لکھنؤ کی جکڑ میں آ گئے..... دونوں کو کچھ پتہ نہیں چلا کہ کیا ہوا ہے۔ لیکن دونوں ہی اک انوکھی انجانی اور ان کسی سی کیفیت سے سرشار ہو گئے۔ اس کیفیت سے دونوں ڈر گئے۔

شہباز نے زری کا ہاتھ چھوڑ دیا اور زری شہباز پر اک پر مسرت اور خوف زدہ سی نگاہ ڈالتے وہاں سے دوڑ گئی.....

شہباز چند لمحوں کے بعد کھڑا ہوا۔ پھر پچھلے برآمدے میں چلا گیا۔ جہاں آغا بی بی اور زرگل بیٹھے تھے۔ زرگل چھٹیوں میں گھر آیا ہوا تھا۔ اس نے واپس توکل جانا تھا۔ لیکن خاندان میں شادی تھی..... سبکدوشی نے اسے زبردستی روک لیا تھا۔

”اوشہباز آؤ..... کہاں تھے صبح سے.....“ زرگل نے اسے خوشگوار انداز میں پکارا۔

”میں کھیتوں پر چلا گیا تھا..... پھر کچھ دیر حجرے میں بیٹھا رہا..... گل زمان اور حیدر خان آگئے تھے.....“

”وہ..... وہ تمہارے بچپن کے ساتھی.....“

”ہاں.....“

”خوش ہوئے ہو ان سے مل کر“

”ظاہر ہے.....“

”وہ کیا کرتے ہیں۔ پڑھ رہے ہیں.....“

”اول ہوں..... کھیتی باڑی کرتے ہیں اپنے باپوں اور بڑے بھائیوں کے ساتھ.....“

”تمہاری پڑھائی کیسی جارہی ہے“

”بس ٹھیک ٹھاک“

شہباز آغا بی بی کے پہلو میں تخت پر بیٹھ گیا.....

”بارات دو اڑھائی بجے روانہ ہوگی..... تیار ہو جانا تم دونوں.....“ آغا بی بی نے دونوں پوتوں سے کہا۔

”بارات کے ساتھ جانا ضروری ہے آغا بی بی.....“ زرگل بولا.....

”ہاں..... اپنی گل پری کے بیٹے کی شادی ہے۔ اتنے قریب کا رشتہ ہے۔ نہ گئے تو خفگی ہو گی۔ اب رک ہی گئے ہو تو بارات کے ساتھ جانے میں کیا اعتراض.....“

”زری بوریٹ“ شہباز بڑبڑایا.....

”کیا“ آغا بی بی نے پوچھا۔

”کچھ نہیں آغا بی بی“ شہباز زرگل کو دیکھ کر مسکرایا.....

”نہیں یا بوریٹ کیسی.....“ زرگل نے کہا ”خوب مزہ کریں گے..... اپنوں میں مل بیٹھنے کے یہی تو موقعے ہوتے ہیں.....“

”عجیب آدمی ہو“

”کیوں“

”ابھی تو کہہ رہے تھے کہ بارات کے ساتھ جانا ضروری تھوڑا سی ہے“

”میں نے تو پوچھا تھا..... بارات کے ساتھ جانا ضروری ہے؟“

”بات تو ایک ہی ہوئی.....“

”سمجھنے کی بات ہے.....“

”ہاں ہے تو.....“ شہباز نے آنکھیں گھما کر منہ بنایا۔ تو زرگل ہنس پڑا۔

”نواز چاچا نہیں آئے ابھی تک“

”جی چاہے گا تو آجائیں گے۔ نہیں چاہے گا تو.....“

”اے چل“ آغا بی بی نے پیار سے ڈانٹا..... ”آئے گا کیوں نہیں..... وہ گاؤں والوں کی خوشی میں غم میں ہمیشہ شریک ہوتا ہے۔ اور یہ تو اس کی بھوپھی زاد کے بیٹے کی شادی ہے.....“

”کل ہی آجاتے.....“ شہباز بولا..... ”خود بھی نہیں آئے اور بی بی گل کو بھی نہیں آنے دیا۔ حالانکہ بی بی گل کا دل چاہ رہا تھا میرے ساتھ ہی آنے کو..... لیکن وہ جو چالاک لومڑی ہے.....“

”کون.....؟“ زرگل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”وہ بابا کی لاڈلی.....“

”شہنو کی بات کر رہے ہو“ زرگل نے پوچھا۔
 ”اسی کا ذکر اس انداز سے کرتا ہے“ آغا بی بی بولیں۔
 ”یاد تم دونوں بہت لڑتے ہو۔ میں اور زری بھی تو ہیں۔ کبھی لڑائی ہوئی نہیں۔“
 ”زری اچھی ہے۔ ورنہ تم۔“
 ”میں اچھا ہوں۔ مجھے اپنی منی سی بہن بہت پیاری ہے۔ ویسے ہم دونوں ہی جھگڑا لو نہیں ہیں۔“

”جھگڑا تو یہ بھی نہیں۔“ آغا بی بی نے اس کے گال کو تھپکا۔
 ”دیکھا۔“ شہباز نے دادی کی شہد پر زرگل سے کہا۔ ”وہ شہنو کی بچی ہے نا۔ وہ بہت لڑا کا ہے۔“
 ”نہیں۔ وہ بالکل لڑا کا نہیں۔ مجھ سے تو کبھی نہیں لڑتی۔“
 ”تم سے کیوں لڑے گی۔ تم تو اسے ساری دنیا سے زیادہ اچھے لگتے ہو۔ دشمنی تو میرے ساتھ ہے اس کی۔“

”اے ہٹ۔“ آغا بی بی نے ٹوکا۔ ”بہن بھائی ہو دشمنی کیسی۔“
 ”آغا بی بی آپ نہیں جانتیں۔ اس کی وجہ سے بابا کا مجھ سے کتنا ناروا سلوک ہوتا ہے۔“
 ”تیری سمجھ کا الٹ پھیر ہے یا۔“ زرگل ہنسا۔ ”ورنہ ماں باپ اولاد کو ایک سا ہی پیار کرتے ہیں۔“

”تم اپنے ماں باپ کی بات کرتے ہوتا۔“
 ”نہیں سب کی۔“
 ”میں نہیں مانتا۔“
 ”شہباز بچے۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ نواز شہنو سے لاڈ ضرور کرتا ہے لیکن تم سے بھی بہت پیار ہے اے۔ ایک ہی ایک تو ہو تم۔ اس کی تو خواہش اور کوشش ہے۔ کہ تم ایک بہترین انسان بنو۔“
 ”ہو نمہ۔“ اس نے منہ بنایا۔

”تم تو بڑے بدگمان ہو اپنے بابا سے شہباز۔“ زرگل نے اسے چھیڑا۔
 ”بدگمان ہو کر کیا کروں گا۔ میری تو جان جاتی ہے ان سے۔ خوف ہی خوف بیٹھا ہوا ہے دل میں۔“
 ”تت۔“

”یہ مذاق نہیں حقیقت ہے زرگل۔ میں یہاں آتا ہوں نا۔ تو رشک سا محسوس ہوتا ہے۔“
 خان بابا اور بی بی جان تم سے کتنا پیار کرتے ہیں کتنا مان دیتے ہیں۔“
 ”اوہو۔۔۔ تم سے کوئی پیار نہیں کرتا کیا؟“ زرگل اب بھی شوخی سے بولا۔
 ”کیا پتہ۔“
 ”پگلا۔“ آغا بی بی نے اس کی پشت پر ہاتھ مارا۔ ”تم اپنے ماں باپ کو کتنے پیارے ہو میں جانتی ہوں۔“

شہباز دھیمی سے مسکراہٹ سے آغا بی بی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ماں کو کتنا پیار ہوں۔ اس کا مجھے کچھ احساس ہے۔ لیکن باپ۔۔۔ باپ رے۔“
 اس نے شوخی سے کانوں کو چھوا۔ ”تو زرگل ہنس کر بولا۔“ مسخرا کہیں کا۔۔۔ خواہ خواہ کی باتیں بنانا سیکھ گیا ہے۔“
 ”تمہیں میرے باپ جیسا باپ ملتا۔ تو عقل ٹھکانے آ جاتی۔ ہر وقت شامت آتی رہتی۔ حکم کے غلام بنے ہوتے۔ اپنی مرضی سے جینے کی اجازت نہ ہوتی۔“

زرگل کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ آغا بی بی کے چہرے پر تھکر کے سائے لہرانے لگے۔
 ”شہباز بچے۔ قربان جاؤں۔ ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔“ آغا بی بی نے پیار سے کہا۔
 ”نواز کی عادتیں بالکل اپنے بابا پر لگی ہیں۔ تمہارے دادا بھی تو بالکل ایسے تھے۔ گھر میں کوئی ان کے سامنے اونچی آواز میں بات نہیں کر سکتا تھا۔ سب کے متعلق وہی سوچنے اور وہی فیصلے کرتے تھے۔ کوئی دم نہیں مار سکتا تھا۔ نواز بھی ویسا ہی ہے۔ اور اس میں۔“ ”یہ اچھی بات ہے کوئی۔“ شہباز نے منہ بنایا۔
 ”بری بھی کیا ہے۔“ زرگل نے کہا۔ ”بیڑوں کی برتری کو تسلیم کر لینے میں ہرج تو کوئی نہیں۔ تمہاری باتوں سے مابعد دولت کو بغاوت کی بو آتی ہے۔ بغاوت۔ انجام جاننے ہو اس کا۔“
 زرگل نے شوخ انداز میں کہا۔ ”تو شہباز نے ہنسنے پر ہاتھ کی مٹھی ہٹا کر بازو بلند کرتے ہوئے کہا۔“ جانے ہیں عالم پناہ۔“

”پھر بھی دماغ میں فور ہے۔“
 ”نہیں عالی جاہ۔“ شہباز نے سینے پر ہاتھ باندھ کر سر جھکالیا۔
 ”چلو معاف فرمایا۔“ زرگل نے سینہ تان کر کہا۔ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔
 آغا بی بی بھی مسکراتے لگیں۔
 ”آغا بی بی“ زرگل نے جبکہ کر دادی کے گال پر پیار کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کی باتیں

اس کان سے سن کر اس کان سے اڑا دیا کریں..... بک بک کرنا اس کی عادت بن چکی ہے۔ بات بے بات خان چاچا سے اختلاف پر الجھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

”اور بچے دو یار.....“ شہباز نے کہا۔

”اور نہیں تو کیا..... وہ جو بات اس کے بھٹے کی کرتے ہیں۔ وہ اس کی الٹی کھوپڑی میں اور ہی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔“
”کیسے؟“

”ایسے کہ جب تم گاؤں آئے ہو۔ یا شہر ہی میں کہیں جاتے ہو تو چاچا چاہتے ہیں۔ ایک دو محافظ تمہارے ساتھ ہوں.....“

”ہاں۔ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا..... خار آتی ہے مجھے.....“

”خار کی بات نہیں قربان.....“ آغا بی بی بولیں ”حفاظت ضروری ہے۔ جب سے گل پروشے اور دریا خان کے مقدمے کا فیصلہ ہوا ہے۔ اجمل خان ہمارے خاندان سے دشمنی پراتر آیا ہے۔“
”یہ فیصلہ بابا کے ذہن کی پیداوار تھی نا.....“ شہباز بولا..... ”حالانکہ اجمل خان نے گل پروشے کی لٹ کاٹی تھی..... وہی اس کی.....“

”لیکن یہ بات بھی قومنہ بھولویا..... کہ گل پروشے دریا خان کی بچپن کی منسوبہ تھی.....“

”منسوبہ تھی تو کیا ہوا..... محبت تو اجمل خان اور گل پروشے میں تھی.....“

”لیکن فیصلے ہو چکے تھے۔ انہیں روندنا یا رو کرنا کسی فریق کو.....“

”جائے دو ان باتوں کو.....“ آغا بی بی نے جلدی سے کہا..... وہ نہیں چاہتی تھیں۔ کہ اس بات پر دونوں بحث مباحثے میں الجھیں..... لاشعوری طور پر وہ شاید کسی انجانے خوف سے پریشان تھیں..... شہباز کا نقطہ نظر اس خوف کو ہوا دے سکتا تھا۔

”او یاد آیا.....“ زر گل بولا..... پھر گھڑی دیکھی۔

”کیا.....“

”مجھے ماما نے بلایا تھا..... چلو چلتے ہو میرے ساتھ.....“

”چلو.....“

شہباز اٹھ کھڑا ہوا.....

”آغا بی بی..... ہم دوپہر تک آجائیں گے..... ماما نے بلایا تھا میں تو بھول ہی گیا تھا.....“
”کیا بات تھی خیر تو ہے نا.....“

”وہ آغا بی بی..... شاید شکار کا پروگرام بنا رہے تھے ماما..... اسی لئے بلایا ہے۔ شکار پر گئے تو شہباز تم بھی چلو گے نا.....“

”ضرور..... میری چار چھٹیاں ابھی باقی ہیں..... ان چار چھٹیوں میں میں بالکل آزاد اور خود مختار ہوں۔“

”کیا کہنے.....“ زر گل نے نعرہ سا لگایا۔ پھر شہباز کا کان پکڑتے ہوئے بولا..... ”تمہارے شکار کے لئے جانے پر تو تواز چاچا خوش ہوں گے..... وہ ایسی ایکٹو میز تو چاہتے ہیں تمہارے لئے.....“
”بس کرو..... اور چلو سیدھے سیدھے“ شہباز نے اپنا کان چھڑاتے ہوئے کہا.....

دونوں آغا بی بی کو سلام کر کے وہاں سے چل دیئے.....

آغا بی بی نے بارات کی روانگی تک واپس آ جانے کی تاکید کی۔

مٹی تھی..... بے تکلفی تکلف کی زد میں آئی۔ تو زرگل کے لب متبسم ہو گئے۔ نگاہوں نے شہنوں کے چہرے پر شرم اور جھجک کی ساری سرخیوں کو جذب کر لیا.....

”کیسی ہوشہنو“

”اچھی ہوں زرگل لالہ.....“ وہ ہولے سے بولی۔

”پھر لالہ.....“ زرگل نے پیار سے دھمکایا۔

وہ ہنس پڑی.....

زرگل نے آگے بڑھ کر اس کے بالوں کو مٹھی میں بھر کر کہا..... ”کتنی بار کہنا پڑے گا۔ کہ

مجھے لالہ نہ کہا کرو.....“

”چھوڑیں میرے بال.....“ وہ دونوں ہاتھوں سے زرگل کا ہاتھ پرے ہٹاتے ہوئے بولی.....

زرگل کے ہاتھ سے اس کا ہاتھ چھوا..... تو لگا ہاتھ بجلی کے ننگے تاروں سے چھو گیا ہے۔ جھٹکے کی سی کیفیت میں وہ لہرائی..... زرگل نے بازو کے سارے اسے تھام لیا۔

”شہنو.....“ زرگل کے لبوں سے بڑی مسکراہٹ نکلی اور گھمبیری آواز نکلی۔

شہنو نے اپنی سیاہ پھیلی پھیلی آنکھوں سے زرگل کو دیکھا.....

”زرگل.....“ وہ ہولے سے صرف یہی کہہ سکی.....

قربتیں وجودوں پر سحر طاری کر دیتی ہیں..... اور جب یہ قربتیں لس سے بھی آشنا ہو جائیں تو مسکراہٹ کیفیت بھی اور ڈھنگ کی ہو جاتی ہے۔ رگوں میں دوڑتا سیال خون برقی رو بن جاتا ہے۔ اور یوں لگتا ہے مثبت منفی رو میں ٹکرا کر شعلوں کی لپک پیدا کر گئی ہیں..... الاؤ سے بھڑکنے لگتے ہیں..... اس الاؤ میں جلتی ٹھنڈی مٹھی آگ روشنی اور نور کے سانچوں میں ڈھل جاتی ہے..... پھر اس روشنی میں وجود پکھل جاتے ہیں..... علیحدگی کی شناخت ختم ہو جاتی ہے..... میں..... میں نہیں رہتا۔ ہم میں بدل جاتے ہیں۔ دودل دور میں ایک بن جاتی ہیں.....

شہنو زرگل کو پسند تھی۔

زرگل شہنو کو اچھا لگتا تھا۔

لیکن

آج قربتوں نے اس پسند اور اچھا لگنے کے اسرار ظاہر کر دیئے تھے۔ چاہتوں کا نیاروپ سامنے

آیا تھا۔ دونوں کو یہی احساس ہوا تھا۔ کہ وہ دونوں دو نہیں ایک ہیں اور ان کا نام

زرگل نہیں

شہنو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے سٹول پر بیٹھی اپنے تراشیدہ بالوں میں برش کر رہی تھی۔ اس نے پیاز رنگ کے پھولدار کپڑے پہن رکھے تھے۔ جو اس کے سیاہ بالوں اور پیازی گالوں سے بڑی حسین سی مناسبت رکھتے تھے..... وہ برش پھیرتے ہوئے آئینے میں اپنی بڑی بڑی گہری گہری نیلی نیلی سیاہ آنکھوں کو بھی تک رہی تھی..... ان آنکھوں میں کتنے خوبصورت کتنے البیلے اور کیسے سمانے خوابوں کے عکس لہرا رہے تھے۔ یہ خاموش آنکھیں شوخی پہ اتڑی ہوئی تھیں اور بے زبانی کی زبان میں اتنا کچھ بولے جا رہی تھیں۔ کہ شہنو کے سرخ سرخ بھرے بھرے لب آپ آپ متبسم ہو جاتے تھے۔ جوانی خوابناک سی سرگوشیاں کرتے ہوئے بولے پیکر میں اتر رہی تھی۔ خمار آلودہ برشیاں سی انگ انگ سے پھوٹ رہی تھیں۔ محبتوں کے مفہوم سے شناسائی ہو رہی تھی..... رشتوں کی لطافتیں اور نزاکتیں شعور میں داخل ہو رہی تھیں۔ احساس باگ رہا تھا..... یہ سب کچھ شہنو آئینے میں اپنی آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوب ڈوب کر دیکھ رہی تھی..... محسوس کر رہی تھی۔

ان سامنے سپنوں خوابناک سرگوشیوں اور خمار آلودہ ہوشیوں میں زرگل کا وجود لہر لے رہا تھا..... زرگل جواک خور و اور نومند جوان کے روپ میں ڈھل چکا تھا۔ شہنو کا منتہائے مقصود تھا..... رشتوں کی پہچان نے سوچوں میں بڑے بڑے رنگ بھر دیئے تھے..... شوخ و شنگ شہنو کبھی کبھی جان بوجھ کر رشتوں اور محبتوں کی شناسائی میں نا آشنا کی کارنگ بھر کر زرگل کو چھیڑتی تو زرگل پلٹ اٹھتا.....

کل ہی کی بات کا سرور اس کی آنکھوں میں مسک رہا تھا۔

زرگل آخری سال کی آخری چھٹیوں میں چند دنوں کے لئے آیا ہوا تھا..... وہ یہاں بھی آیا تھا۔

شہنو اسے دیکھ کر پھول کی طرح کھل اٹھی تھی..... لپک کر اس کی طرف مٹی تھی۔ لیکن کرچھے ہٹ

شہنو نہیں

صرف

پیار ہے

محبت ہے

سچائی ہے

حقیقت ہے۔

دونوں کئی لمحے گم سم سے کھڑے رہے۔

پھر

شہنو نے آنکھوں پر پکوں کی چلمنیں گراتے ہوئے اپنا آپ زرگل کے بازو سے پرے

ہٹایا۔

زرگل نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

شہنو کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ باہر درگاہ تک پھیلے آسمان کو تکتے لگی لیکن اسے تو

آسمان نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو اپنے اندر کی پھیلی وسعتیں دیکھ رہی تھی۔ یہ ذہنک رنگ وسعتیں کتنی خوبصورت لگ رہی تھیں۔

زرگل چند لمحے جہاں کھڑا تھا۔ وہیں کھڑا رہا۔ پھر مسکراتے ہوئے شہنو کی پشت پر نگاہ

ڈالی۔

کل کی چھوٹی سی بچی آج ایک بھر پور جوان لڑکی کے روپ میں اس کے سامنے تھی۔ شوخ و شنگ

الہلا پرواہ اور معصوم سی شہنو اک باشعور اور ذمہ دار دوشیزہ لگ رہی تھی۔ یہ خوبصورت تبدیلی زرگل کو لگ رہا تھا۔ گزرنے والے اس لمحے ہی عمل میں آئی تھی۔ جب قربت نے لمس کو جذب کیا تھا۔

اچانک

اور

بالکل ہی اچانک

شہنو بڑی ہو گئی تھی۔

وہ ایک خوبصورت نگاہ اس کی پشت پر مرکوز کئے کھڑکی کے قریب آ گیا۔

اس کا جی شہنو سے بہت سی باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا۔ ڈھیری باتیں۔

”شہنو.....“ اس نے قریب آ کر پکارا۔

”جی.....“ وہ ہولے سے بولی۔

”وہ شہنو.....“ زرگل نے کچھ کئے کو لب کھولے۔

”جی.....“ وہ ہمہ تن گوش تھی۔

”میں..... میں..... آؤ باہر چلتے ہیں..... لان میں..... بڑا خوشگوار موسم ہے“

زرگل سمجھ نہ پا رہا تھا۔ کہ بات کہاں سے شروع کرے اور کیا کرے۔

”ہاں..... بڑا خوشگوار موسم ہے..... لان میں سب بیٹھے ہیں..... چلیں ہم بھی چلتے ہیں“ وہ

مڑتے ہوئے بولی۔

”نہیں..... وہاں نہیں جاتے.....“

”تو پھر.....“

”یہیں ٹھیک ہے“

”آپ کی مرضی.....“

وہ پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

زرگل اس کی پشت پر کھڑا اسے تنکنا رہا۔ کوئی بات ہی نہ سوچ رہی تھی اسے۔ حالانکہ وہ اس

سے ڈھیر ساری باتیں کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔

شہنو بڑے مطمئن انداز میں کھڑی تھی۔ قربت کے لمس نے سب سے بڑی بات سب بڑی

سچائی اور سب سے بڑی حقیقت از خود بیان کر دی تھی۔ اس لئے وہ نہ تو اور باتوں کی ضرورت محسوس کر رہی

تھی۔ نہ ہی چاہت۔

بھلا ہوا جو ملازمہ چائے کا کفنہ آگئی۔

”بڑی پیگم صاحبہ چائے کیلئے باہر بلا رہی ہیں۔ چھوٹی بی بی..... اور خان جی آپ کو بھی“ ملازمہ

نے دروازے میں کھڑے کھڑے کہا تو شہنو اور زرگل اس خول سے نکل آئے۔ جو خاموش تنہائی نے حصار کی

صورت ان کے گرد ہمار کھا تھا۔

”باہر لان میں ہیں سب.....“ زرگل نے چند لمحوں کے توقف کے بعد پوچھا۔

”جی زری بی بی بھی لہجہ ہی ہیں اور شہباز خان بھی..... آپ کو بلا رہے ہیں.....“

”چلو ہم آتے ہیں.....“

”اچھا چھوٹے خان صاحب.....“

”آتے ہیں.....“

”جلدی آجائے..... شہباز خان شاید کوئی کھیل.....“
 ”کیرم لے کر گیا تھا باہر.....“ زرگل نے شہنو کی طرف دیکھ کر کہا..... ”کھیلو گی؟“
 شہنو نے یونہی اثبات میں سر ہلا دیا.....
 ملازمہ دروازے ہی سے لوٹ گئی.....
 ”چلو آؤ.....“ زرگل نے شہنو سے کہا.....
 ”آپ چلیں میں آتی ہوں.....“ شہنو نے جواب دیا۔ وہ اب سنبھل چکی تھی.....
 ”میرے ساتھ چلو.....“ زرگل نے غمور نظروں سے اسے دیکھا.....
 ”نہیں آپ جائیں..... میں آ جاؤں گی“
 ”میرے ساتھ نہ جانے کی وجہ.....“
 ”کچھ بھی نہیں..... ایسے ہی.....“
 ”اور جو میں اکیلے چائنا نہ چاہوں تو.....“
 ”تو..... میں ساتھ ہی جلدوں گی“
 دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے

پھر

ساتھ ساتھ چلتے باہر آ گئے.....

سر سبز لان میں کین کی کرسیاں پڑی تھیں..... زرگی اور شہباز کرسیوں پر آسنے سانسے بیٹھے تھے۔ درمیانی میز پر کیرم بورڈ رکھا تھا۔ دونوں شاید کھیل رہے تھے۔

بی بی گل ذرا پرے بیٹ کر سی پڑی تھیں۔ ان کے سامنے کی میز پر چائے رکھی تھی۔ اور ان کی خاص خدمت گار شیٹی آلتی پالتی مارے گھاس پر بیٹھی کوئی مزے دار سا قہقہہ ان کے گوش گزار کر رہی تھی..... اس کی کسی بات پر ویشمینے ہلکا سا قہقہہ لگاتی تو زرگی اور شہباز سر گھما کر ایک لمحاتی نظر ان پر ڈال لیتے۔

زرگل اور شہنو ساتھ ساتھ چلتے ادھر ہی آ رہے تھے..... ویشمینے نے ان کی طرف

دیکھا۔

”ماشاء اللہ..... نظرد دور.....“ وہ ہولے سے بولیں۔

شہنی نے بھی سر گھما کر ادھر دیکھا..... ”خدا مبارک کرے بڑی بی بی..... کتنا پیارا جوڑا ہے۔

جوانی کا اپنا ہی رنگ ہوتا ہے بڑی بی بی..... کتنے خوبصورت لگ رہے ہیں دونوں“

”نظرد دور.....“ ویشمینے نے پھر
 ”لالہ اور شہنو بھی آ گئے.....“ زرگی نے بورڈ پر رکھی گولت ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔
 ”واہ..... واہ..... اب مزہ آئے گا.....“ بھی جلدی آؤنا..... کیا سچ قدم رکھتے چلے آ رہے
 ہو..... ”شہباز نے دونوں کو دیکھ کر کہا۔
 ”آ گئے.....“ زرگل بولا.....
 ”پہلے سب چائے پی لو۔ پھر کھیلنا.....“ ویشمینے نے سب سے کہا۔
 ”ٹھیک ہے.....“ زرگل ویشمینے کی طرف آ گیا..... ”لایئے چائے..... بی بی گل.....“
 ”میں بتاتی ہوں.....“ شہنو میز کے قریب آ گئی.....
 ”بنانا آتی بھی ہے.....“ شہباز نے مذاق کیا.....
 ”کیوں پھینچتے ہو۔ لڑ پڑے گی تو کو گے.....“ زرگل نے ہنس کر کہا۔
 ”نہیں اب نہیں لڑتی..... میں لاہور جا رہا ہوں تا پڑھنے کے لئے..... جب سے داخلہ ہوا ہے
 شہنو نے لڑائی بند کر دی ہے..... بہت اچھی ہو گئی ہے یہ اب.....“
 ”اچھی تو ہے ہی.....“ زرگی نے پیار سے شہنو کو دیکھا۔ اور پھر زرگل سے پوچھا ”کیوں
 زرگل لالہ؟“

شہنو نے اک مسکراتی تقاضا بھری نگاہ زرگل پر ڈالی..... زرگل نے زرگی کی طرف دیکھ کر سر
 اثبات میں ہلایا۔ اس کی نگاہوں کی خیرہ کن چمک کہہ رہی تھی..... ”بہت اچھی تو کیا بہت ہی..... بہت ہی اور بہت
 ہی اچھی ہے.....“

چائے سب نے گپ شپ کے درمیان پی..... زرگل اور شہباز اپنی اپنی پڑھائی کی باتیں بھی
 کرتے رہے شہنو اور زرگی کے کالج میں داخلہ لینے کی باتیں بھی ہوئیں۔

شہباز نے چند دنوں بعد لاہور چلے جانا تھا۔ زرگی نے یہیں پشاور میں شہنو کے ساتھ ہی کالج
 میں داخلہ لینا تھا..... شہنو خوش تھی۔ کہ شہباز کے جانے سے جو تھمائی اور اداسی ہوتا تھی وہ زرگی کے آنے سے
 کسی حد تک کم ہو جائے گی.....

چائے کے بعد بی بی گل اٹھ کر اندر چلی گئیں..... اور وہ چاروں اس وقت تک کیرم کھیلتے اور
 ایک دوسرے کی کھیل میں بے ایمانی پکڑتے لڑتے جھگڑتے ہنستے کھیلتے مصروف رہے۔ جب تک شام گہری ہو کر نہ
 اتر آئی.....

ہیں۔ میں ان کے جانے سے بہت خوش ہوں.....“
 شہنو کی آنکھوں میں آنسو آگئے..... جنہیں پی جانے کی اس نے بہت کوشش کی..... شہباز
 نے اس کی طرف دیکھا۔ شہنو پر ٹوٹ کر پیار آیا.....
 یہ حقیقت تھی۔ کہ دونوں جتنا زیادہ لڑتے رہتے تھے۔ اتنا ہی ایک دوسرے کو پیار بھی کرتے
 تھے.....

”بس اب رو نہیں دینا..... میرا دل پہلے ہی.....“ شہباز نے بات ادھوری چھوڑ دی شہنو
 نے ہاتھ کی الٹی ہتھیلی سے آنکھوں کے گوشے صاف کئے..... تو نواز خان کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولے.....
 ”کہاں تو اس کاناک میں دم کئے رکھتی تھی..... اور کہاں یہ آنسو.....“
 ریشمینے مسکرا کر بولی ”اب اکیلے رہنا پڑے گا نا..... تو بھائی کی اہمیت کا پتہ چلے گا
 اے.....“

”اکیلے نہیں بی بی گل.....“ شہباز نے کہا ”زری آجائے گی اس کے پاس.....“
 ”وہ تو آئے گی..... لیکن آپ کی کمی تو پوری کوئی نہیں کرے گا شہباز لالہ.....“ شہنو سچ
 سچ ہی رونے لگی..... اس کی سیاہ خوبصورت آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو اس کے بے داغ چمکتے رخساروں پر
 بھسلنے لگے۔

شہباز روٹی کا نوالہ پلیٹ میں رکھ کر اٹھا اور میز کے گرد گھوم کر شہنو کے پاس والی کرسی پر
 بیٹھتے ہوئے بازو اس کی گردن میں حائل کرتے ہوئے بولا..... ”بس بس رونادھو نا بند..... آج مجھے پہلی بار پتہ چلا
 ہے۔ کہ تم مجھ سے اتنا پیار کرتی ہو“

شہنو نے سر اس کے کندھے سے لگا دیا.....
 شہباز اس کی آنکھیں پونچھتے ہوئے بولا ”لاہور کون سادو رہے۔ دو چھٹیاں بھی ہوں تو بندہ آجا
 سکتا ہے..... یہ نہ سمجھ کہ میں پیشہ کیلئے چلا جاؤں گا..... آیا کروں گا تجھ سے لڑنے جھگڑنے..... ٹھیک.....“
 وہ بہن کو تسلی دلا سے دے رہا تھا..... اور ماں باپ دونوں کو دیکھتے ہوئے ہولے ہولے مسکرائے
 جارہا تھے۔

”چلو اب ناشتہ کرو۔ بہت ہو گئے جاؤ چونچلے.....“ ریشمینے نے دونوں سے کہا۔
 ”جائے بھی ٹھنڈی ہو رہی ہے.....“
 شہباز اٹھ کر اپنی جگہ پہ آگیا.....
 ”شہنو..... یہ بالائی لونا..... پراٹھے کے ساتھ بہت مزہ آئے گا“ شہباز نے بالائی کا پیالہ

ناشتے کی میز پر سب بیٹھے تھے۔
 میز پر ناشتے کی مختلف چیزیں رکھی تھیں۔ نواز خان مکھن جیم ٹوسٹ اور انڈا پسند کرتے تھے۔ ریشمینے نے بھی
 اپنی پلیٹ میں ٹوسٹ رکھے ہوئے تھے..... شہنو نے آج پراٹھا بنوایا تھا۔ اور شہباز کے سامنے بالائی اور لمبوتری
 تھوری روٹی رکھی تھی..... چند دنوں تک شہباز نے لاہور جانا تھا..... اس لئے ریشمینے ہر روز بطور خاص اس کی
 پسند کا ناشتہ بنواتی تھیں..... خشک لمبوتری تھوری گرم گرم روٹی کے ساتھ بالائی اسے بہت پسند تھی۔ تھوری پراٹھا
 بھی اچھا لگتا تھا..... کل اس کے لئے پراٹھا بنوایا تھا۔ آج بالائی اور روٹی.....

”شہباز لالہ“ شہنو اس کے سامنے ہی میز کے دوسری طرف بیٹھی تھی۔

”کیا ہے“

”بڑی خاطر میں ہو رہی ہیں آج کل.....“

”جار ہوں نا..... اس لئے..... پورے چار سال گھر سے باہر ہوں گا.....“

شہنو اس کی سنجیدگی پر شوخی سے مسکرا کر بولی ”چار سال تو تبا..... جو ہر سال پاس ہوتے
 رہے..... ورنہ پانچ سات سال بھی لگ سکتے ہیں.....“

”اے ہے شہنو“ بی بی گل نے ٹوکا ”منہ سے کوئی اچھی بات نکالا کر..... خدا نہ کرے جو
 اسے انجینئرنگ کرنے میں اتنے سال لگیں.....“

شہنو نے ہنستے ہوئے کہا ”کیا پتہ..... اتنے لائق تو شہباز لالہ ہیں نہیں.....“

”اوں ہوں.....“ نواز خان نے شہنو کی چھترے محفوظ ہوتے ہوئے اسے تنبیہ ٹوکا

”بابا.....“ شہنو پیار سے شہباز کو دیکھتے ہوئے باپ سے بولی میں تو چھترے ہی پونی

ورنہ جی تو چاہتا ہے شہباز لالہ چار سال کی بجائے دو سال ہی میں کورس پورا کر کے واپس آجائیں..... آپ کیا سمجھتے

شہنو کی طرف سرکا دیا۔ اس نے جج سے پیالے سے بالائی نکال کر اپنی پلیٹ میں ڈالی۔۔۔۔۔
 ”آپ لیس گی بی بی گل۔۔۔۔۔ شہباز نے پوچھا ”خان بابا آپ لے لیں؟“
 ”نہیں۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔ میں نے کر لیا ناشتہ کھاؤ تم۔“ نواز بولے۔ ریشمینے نے ایک نوالے کے ساتھ تھوڑی سی بالائی لے لی۔۔۔۔۔
 ریشمینے نے چائے کی دو پیالیاں بنائیں۔ ایک نواز خان کے سامنے رکھ دی دوسری خود لے لی۔۔۔۔۔

”مجھے بھی بنا دیں بی بی گل“ شہباز نے کہا۔
 ”میرے لئے بھی۔۔۔۔۔“ شہنو بولی۔
 ریشمینے دونوں کے لئے چائے بنا لے گئی۔
 نواز چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے بولے۔ ”شہباز تمہاری تیاری مکمل ہو گئی ہے نا“
 ”بس ہو رہی ہے۔۔۔۔۔“
 ”کپڑے بستر۔۔۔۔۔“

ریشمینے بولی ”میں برابر کر رہی ہوں۔۔۔۔۔ جو چیز یاد آتی ہے لسٹ میں لکھ لیتی ہوں۔ اس طرح ہدی سولت رہتی ہے۔۔۔۔۔“
 نواز چائے پیتے ہوئے بولے ”وہ بنگلہ مل جائے تو بہت اچھا ہو گا۔۔۔۔۔ وہاں رہنے کا مسئلہ نہیں رہے گا۔۔۔۔۔“
 شہباز جلدی سے بولا ”مسئلہ تو اب بھی نہیں ہو گا بابا۔۔۔۔۔ آخر سب لڑکے ہو شلوں ہی میں تو رہتے ہیں۔۔۔۔۔“

”تم میں اور باقی لڑکوں میں فرق ہے شہباز خان۔۔۔۔۔ تم خان خوشدل خان کے پوتے اور خان نواز خان کے بیٹے ہو۔۔۔۔۔“ نواز خان نے مسکراتے ہوئے تاخر سے بیٹے کو دیکھا۔۔۔۔۔
 شہباز احترازاںچسپ رہا۔ لیکن نواز کی بات سے اسے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔
 نواز خان ان دنوں لاہور میں ایک چھوٹا سا بنگلہ خریدنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک کنال کی ایک کوٹھی انہوں نے دیکھی تھی پسند بھی آئی تھی۔ لیکن معاملہ طے نہ ہو سکا تھا۔۔۔۔۔ ویسے بھی یہ کوٹھی انجینئرنگ یونیورسٹی سے کافی دور تھی۔ اب ایک بنگلہ مل رہا تھا۔۔۔۔۔ نواز خان لاہور جا کر دیکھ آئے تھے۔ بڑی مناسب جگہ پہ تھا۔۔۔۔۔ نیا تعمیر شدہ تھا۔ اور سولت کی ہر چیز موجود تھی۔ بات چل رہی تھی۔ مالک کچھ پس و پیش کر رہا تھا۔ لیکن یقین تھا۔ کہ یہ سودا ضرور ہو جائے گا۔۔۔۔۔

نواز خان یہ بنگلہ شہباز کے لئے خریدنا چاہتے تھے۔ تاکہ وہ وہاں سولت سے رہ کر تعلیم حاصل کر سکے۔۔۔۔۔ ہو شلوں کی خوراک اور رہائش انہیں پسند نہ تھی۔ ویسے بھی ہو شلوں میں قسم قسم کے لڑکے ہوتے ہیں۔ نواز اپنے بیٹے کو ان لڑکوں سے میل جول کے زیادہ موافق نہیں دینا چاہتے تھے۔
 نواز کچھ دیر اس بنگلے کی باتیں کرتے رہے۔ وہ جب میز سے اٹھ کر چلے گئے۔ تو شہباز نے بی بی گل سے کہا ”مجھے تو سمجھ نہیں آتا۔۔۔۔۔ بابا اتنا تردد کیوں کر رہے ہیں۔ اور لڑکے بھی تو ہوں گے۔ جو ہو شلوں میں رہیں گے۔۔۔۔۔“

ریشمینے نے مسکرا کر بیٹے کی طرف دیکھا اور بولی ”تیرے بابا چاہتے ہیں پردیس میں بھی تجھے گھر کا سکون ملے۔۔۔۔۔ تجھے رہنے سنے کھانے پینے کی کوئی تکلیف نہ ہو۔۔۔۔۔ امداد خان بہت اچھا اور سچی ہے۔ اور زرین خان ڈرائیور بھی ہے اور محافظ بھی۔۔۔۔۔ دونوں کو تمہارے ساتھ بھیج رہے ہیں۔۔۔۔۔“
 ”اف۔۔۔۔۔ بی بی گل۔۔۔۔۔“ شہباز نے کئی میز پر نکا کر سر ہاتھ پر گراتے ہوئے کہا۔
 ”کیوں“ شہنو جلدی سے بولی۔۔۔۔۔

”آپ لوگ مجھے کیوں پابند کرنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ مجھے نہیں اچھی لگتیں یہ سب باتیں۔۔۔۔۔“ وہ میز پر مکہ مارتے ہوئے بولا۔۔۔۔۔ ”اٹھو تو ملازم ساتھ بیٹھو تو ملازم ساتھ۔ زندگی مفلوج کر کے رکھ دیتے ہیں۔ میں۔۔۔۔۔ یہ سب پسند نہیں کرتا۔۔۔۔۔“
 ”لیکن شہباز لالہ۔۔۔۔۔ بابا کو یہ سب پسند ہے۔۔۔۔۔ اور تم جانتے ہو۔۔۔۔۔ ہوتا ویسے جو بابا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ بی بی گل کی بات بھی نہیں مانی جاتی۔ اس لئے میرے بھائی۔۔۔۔۔ شور مت مچاؤ۔۔۔۔۔ لاہور جاؤ اور ٹھانڈ سے رہو۔۔۔۔۔ ویسے بنگلہ مل جائے تو اچھا ہی ہے کبھی کبھی ہم لوگ بھی لاہور کا چکر لگا سکتے ہیں۔ اپنا گھر وہاں ہو۔ تو کیوں بی بی گل۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ بہت اچھی بات ہے۔۔۔۔۔ ہم بھی لاہور دیکھ لیں گے اسی زمانے۔۔۔۔۔“
 ”لاہور بڑا شہر ہے آغا بی بی۔ وہاں اچھے سے اچھے ہوٹل ہیں۔۔۔۔۔ آپ لوگ اس پوزیشن میں ہیں۔ کہ کبھی لاہور آنا ہو تو ہو شلوں میں ٹھہر سکیں۔۔۔۔۔“
 بڑی دیر تک بحث ہوتی رہی۔۔۔۔۔ ریشمینے اور شہنو شہباز کو قائل کرنے کی کوشش کرتی رہیں کہ ہو شلوں سے بہر حال اپنا گھر بہتر رہے گا۔۔۔۔۔
 بحث چھڑ جائے تو ختم ہونے میں آتی نہیں۔ ریشمینے نے بی لائن بدلی۔ شہباز سے بولی ”تم تو آج گاؤں جا رہے تھے کس وقت جاؤ گے۔۔۔۔۔ جانا تو تیار ہو جاؤ۔۔۔۔۔“ وہ میز سے اٹھ کر چل گئی۔
 ”شہنو تم چلو گی“ شہباز نے پیالی سامنے سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔۔۔۔۔

”میں..... اول.....“ اس نے منہ بنایا۔

”کبھی کبھار جانا اچھا نہیں لگتا۔ تو شادی کے بعد وہاں کیسے رہو گی“ شہباز نے اسے چھیڑا۔ تو وہ شرمیلی ادا سے بولی ”تب کی فکر نہ کرو.....“

”اچھا.....؟“ شہباز نے اٹھتے ہوئے آنکھیں گھما کر کہا۔

”ہاں..... ویسے گاؤں مجھے بہت اچھا لگتا ہے آپ کی اطلاع کیلئے عرض کر دوں.....“

”تو چلو نا آج.....“

”آج نہیں..... میں نے اپنے کپڑے ٹھیک کرنے ہیں.....“

شہباز شرارت سے مسکراتے ہوئے بولا..... ”زر گل کے امتحان اگلے ماہ ختم ہو رہے ہیں واپس آرہا ہے۔ پھر تو بھاگا کرے گی گاؤں کی طرف۔ سب سمجھتا ہوں.....“

”اور.....“ وہ بھی شوخی سے بولی ”میں بھی سب سمجھتی ہوں۔ کہ آپ آج کیوں جا رہے ہیں گاؤں“ دونوں ہنس دیئے۔

موسم ان دنوں بہت خوشگوار تھا۔ گرمیوں کی آمد آمد تھی۔ لیکن روز ہی کہیں سے بادل آجاتے گھن گرج کے ساتھ آسمان میں پھیل کر چادر کی طرح تن جاتے۔ کبھی بوند باندی ہونے لگتی اور کبھی بن بر سے ہی تپتی چادر ہواؤں کے زور سے چیتھڑے چیتھڑے ہو جاتی اور سیاہی مائل سیلیٹی بادل ٹکڑیوں میں بٹ جاتے۔ تب سورج کی تپش ہلکی ہلکی گرمائش پہنچاتی بادلوں کی ہواؤں کے ساتھ آنکھ پھولی اس موسم کا خاصہ تھی۔ ہوائیں بھی چلتی تھیں کبھی تو زوروں کی چلنے لگتیں آندھی کا روپ دھار لیتیں۔ دھول مٹی اڑتی۔ سوکھے پتے ہوا کے ریلیں سے شیش کی آوازوں کے ساتھ زمین پر گھسٹتے کبھی اڑھ چلے جاتے کبھی ادھر کی درخت ٹنڈ منڈ ہو چکے تھے۔ اور سوکھی شبنیاں سیاہی مائل رنگت اختیار کر چکی تھیں۔ موسم کا مزاج تغیر پذیر تھا۔ اس میں ابھی انتہا کا ٹھہراؤ نہیں آیا تھا۔ کبھی تو ایک دم ہی ٹھنڈا ہو جاتا اور کبھی تپ سا جاتا.....

شہباز کو یہ موسم بہت پسند تھا۔ خاص کر گاؤں میں یہ موسم گزارنا اسے بہت اچھا لگتا تھا..... وہ جیب میں گاؤں آیا..... گاؤں سے باہری جیب سے اتر گیا..... وہ پیدل گھر تک جانا چاہتا تھا۔

”خان.....“ زرین خان نے کہا ”آندھی کا سماں بندھ رہا ہے۔ آپ جیب ہی میں حویلی چلے چلتے.....“

”تم جاؤ..... میں کھیتوں سے ہوتا آؤں گا۔ مجھے اس موسم میں پیدل چلنا بہت اچھا لگتا ہے۔

”جیسے مرضی خان“ زرین جیب لے کر چلا گیا۔

شہباز کھیتوں کے کنارے بن پگڈنڈیوں پر چلنا کھیتوں میں اہل مہاتی فصلوں کو دیکھ کر ملاحظہ ہوتا

گھر کی جانب چلے دیا۔

راستے میں کئی آشنا چہرے ملے..... مزارعے جھک جھک کر چھوٹے خان کو سلام کرنے لگے ہر ایک نے خیر مقدمی کلمہ کہا ”نچیر خان جی۔ خیر سے آئے.....“

شہباز نے ہر ایک کو مسکرا کر جواب دیا۔ احوال پر سی کی اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ دو ایک بزرگوں نے اس کے بابا کی خیریت بھی دریافت کی۔ کچھ نوجوان بھی تپاک سے ملے اور خیر و عافیت دریافت کی۔

شہباز کھیتوں پر عورتوں مردوں کو کام کرتے دیکھتا آگے بڑھتا گیا۔ کھیتوں اور حویلی کے درمیان ایک کھلا میدان تھا۔ جس کے آخری سرے ندی سے جا ملتے تھے۔ گھاس کے کئی قطعے ٹکڑیوں کی صورت پھیلے تھے۔ ندی کے کنارے قطاروں میں چستنا درخت کھڑے تھے۔ میدان میں بھیڑ بکریاں چر رہی تھیں اور چھوٹے چھوٹے بچے اور جوان جوان لڑکیاں پھنے پرانے دیہاتی لباسوں میں ملبوس ہاتھوں میں پتلی پتلی چھڑیاں اور درختوں کی ٹنٹیاں لئے ادھر ادھر پھر رہے تھے..... دو ایک لڑکے اپنی بیمنوں کو پانی پلانے کے لئے انہیں ندی کی طرف ہانک رہے تھے۔

شہباز کا جی چاہا کہ وہ بھی ندی کی طرف جائے۔ ندی کے شفاف پانی میں پاؤں لٹکا کر گول بڑے سے پتھر پر بیٹھا رہے..... ندی کے کنارے اور پانی کے اندر صاف صاف گول گول چھوٹے چھوٹے پتھر اسے بت بھلے لگتے تھے۔ بچپن میں وہ اکثر یہ پتھر جھولی میں بھر لیا کرتا تھا.....

لیکن وہ ندی کی طرف نہیں گیا۔ دوپہر ہونے کو آئی تھی..... کھانے کا وقت ہو رہا تھا..... خیال تھا۔ کہ زرین نے اس کے آنے کی اطلاع کر دی ہوگی۔ اور سب لوگ کھانے پر اس کا انتظار کر رہے ہوں گے..... انتظار کے حوالے سے اسے زری کا خیال آگیا۔

”زری“ اس نے لبوں کی مسکراہٹ میں یہ نام دہرایا.....

کتنی حسین تھی زری..... سادہ معصوم اور حسین..... بڑی بڑی حیران حیران سبزی مائل بادامی آنکھیں سنہری رنگت ٹکٹکٹے شگفتہ گلابی رخسار..... یا قوتی ہونٹ..... بھرا بھرا جسم اور بادامی رنگت کے لالہ لالہ سنہری سنہری بال..... وہ سراپا حسن تھی..... لیکن اس کے حسن میں چنچلتا نہیں تھی..... وہ شہنو کی طرح شوخ و شنگ نہیں تھی..... شہنو تو پہاڑی ندی تھی۔ چنچنی چلائی اچھلتی کوئی پتھروں سے سرکراتی رکاوٹوں سے الجھتی نشیبوں کی طرف تیزی سے جانے والی پہاڑی ندی۔ لیکن زری اس کے بالکل برعکس تھی..... صاف شفاف کھلے ہموار میدانوں سے گزرنے والی ندی کی طرح..... جو دیر بے دیر سے بنے جاتی ہے۔ چنچنی ہے نہ پگھلاؤتی ہے۔ ہموار زمین کے سینے سے لگی بے ضرر بے صدا سیسے چلی جاتی ہے۔ اچھلا کودنا کمرانا لہجنا اسے آسانی نہیں۔ بس اک متعین راستہ ہے جس پر ہولے ہولے بنے جاتی ہے۔ سارے ہیجان سارے طوفان اس کے اندر ہی ڈھکے

چھپے رہتے ہیں۔ انہیں باہر آنے کا کبھی موقع ہی نہیں دیتی..... بہت زوروں کے ریلے آئے تو کناروں سے باہر آگئی..... وقتی اور لحاقی طور پر..... پھر ریلوں کو ہماؤ ہمالے گئے تو اپنے آپ میں سمٹ آئی اور بس.....

زری شہباز کو بہت اچھی لگتی تھی..... اور جب سے وہ اس سے شرماتے کھڑے لگی تھی..... اچھا لگتا چاہت اور محبت کے زمرے میں آگیا تھا..... یہی محبت اسے کشاں کشاں یہاں کھینچ لاتی تھی۔ وہ لاہور جانے والا تھا۔ گھربار سے دوری کا احساس ڈستا تھا۔ لیکن زری سے دور ہو جانے کے تصور سے وہ گھبرا جاتا تھا..... وہ ہولے ہولے اس کے دل دماغ اور حواس پر چماتی جاری تھی۔

وہ زری ہی کے تصور میں ڈوبا حویلی میں داخل ہوا۔ صدر دروازے پر بان کے پلنگوں پر بیٹھے بندوق بردار محافظ اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ تعظیماً سر قدرے جھکاتے ہوئے سلام کہا۔ چھوٹے خان کو خوش آمدید کہی۔

”کیا حال ہے ٹھیک ٹھاک ہو“ شہباز نے رک کر ان کی احوال پرسی کی۔

”اللہ کا شکر ہے۔ شہر میں سب خیریت ہے نا..... بڑے خان صاحب بھی آئے ہیں۔“

”نہیں.....“

شہباز چند باتیں کرنے کے بعد اندر چلا آیا۔

حویلی کے صحن میں بچے کھیل رہے تھے۔ بڑے سے چھتہ دار درخت تلے لال پاپوں والے پلنگ پر سرخ سرخ گاؤں کے رکھے تھے۔ برآمدے میں دو تین خدمت گاریں کام میں مصروف تھیں۔ شہباز آگے بڑھا..... آغا بی بی دیکھنے یا زری کوئی بھی نظر نہ آیا..... خدمت گاروں کے سلاموں کا جواب دیتے ہوئے اس نے پوچھا ”بھئی گھر والے کہاں ہیں.....“

”آغا بی بی اونٹن کینے بی بی تو میت والے گھر گئے ہیں.....“ اسی جان نے کہا۔

”کون فوت ہوا.....“

”خان کی پھوپھی کا دیور فوت ہوا ہے..... سب ادھر ہی گئے ہیں.....“ خان صاحب اور

ریشمینے بی بی نہیں آئے..... آدمی تو بھیجنا ہے آغا بی بی نے اطلاع دینے کے لئے.....“

”ہو سکتا ہے میرے آنے کے بعد اطلاع گئی ہو..... سب ہی گئے ہیں وہاں.....“

”زری بی بی ہیں گھر پہ.....“

”کہاں ہیں.....“

”ادھر پچھلے باغیچے میں تھیں.....“

شہباز سامنے والے دروازے کے اندر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد وہ پچھلے باغیچے میں تھا۔ جہاں

زری ایک سرسبز اور رنگ پھولوں سے آراستہ چوترے پر بال سکھا رہی تھی۔ اس کی پشت ادھر تھی۔ شہباز کے آنے کا سے پتہ نہ چلا.....

شہباز کو شرارت سوچھی۔ دبے قدموں چلتا آگے بڑھا اور پیچھے سے دونوں ہاتھ بڑھا کر زری کی آنکھیں بند کر دیں۔

”کون.....“ زری کے دونوں ہاتھ اٹھے اور اس نے آنکھوں پر رکھے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

شہباز کچھ نہیں بولا..... لیکن زری نے ہاتھوں کی مضبوطی کو محسوس کرتے ہی جان لیا۔ کہ وہ کون ہے۔ ہاتھوں کے لمس سے اس کی رگوں میں سنسناتی لہریں دوڑ گئیں۔ دل بے اختیار ہو کر دھڑکنے لگا شرم و حیا کی سرخی چہرے پر لہرائی.....

شہباز کے ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے دھیمے شرمیلے لہجے میں بولی ”چھوڑو نا شہباز.....“

”اوہ“ شہباز ہاتھ ہٹاتے ہوئے اس کے سامنے آکر بولا..... ”کیسے پہچان لیا تم نے..... کہ آنکھیں میں نے بند کی ہیں.....“

زری نے پلنگوں کی جھلریں آنکھوں پر گرا دیں۔ اس نے کہنا چاہا۔ کہ تمہیں تو میں لاکھوں میں پہچان سکتی ہوں۔ تمہیں نہ پہچان پاؤں گی تو اور کسے پہچانوں گی.....

لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ دو ایک دفعہ شہباز کی طرف دیکھا اسے اپنی طرف شوق و تجسس سے دیکھتے پایا..... تو کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ ہوئی.....

”ایکلی بیٹھی ہو.....“ شہباز ذرا ہٹ کر چوترے پر بیٹھ گیا۔

”آپ کب آئے“

”ابھی.....“

”آغا بی بی اور بی بی جان گھر پہ نہیں ہیں.....“

”تم تو ہوتا.....“ اس نے شوخی سے زری کی آنکھوں میں جھانکا..... زری شرمیلی اداس مسکرا

دی چند لمحوں خاموشی رہی۔ لیکن یہ خاموشی بڑی جانفزا بڑی ریلی اور حیات بخش تھی۔

”زری.....“ شہباز گھاس کے تنکے اکھڑتے ہوئے بولا۔

”جی.....“

”موسم آج بہت اچھا ہے“

”جی.....“

”پتہ ہے میں آج کیوں آیا ہوں.....“

”نہیں.....“

”تم سے ملنے.....“

”جی.....“

”میں جا رہا ہوں نا.....“

”کہاں“

”لاہور.....“

”لیکن جانے میں تو ابھی دو ہفتے باقی ہیں.....“

”ہاں..... ہیں تو..... لیکن دن جلدی جلدی گزرتے جا رہے ہیں.....“

”ہاں.....“

”زری.....“

”جی.....“

”میں وہاں اداس ہو جاؤں گا.....“

”آپ کی کمی یہاں بھی سب محسوس کریں گے“

”تم بھی کرو گی.....“

زری نے اپنی پھیلی پھیلی حیران حیران آنکھوں سے اسے دیکھا۔ یہ آنکھیں احتجاج کر رہی

تھیں۔ کہہ رہی تھیں۔ کہ یہ بات بھی پوچھنے کی ہے بھلا؟

”زری.....“

”ہوں“

”تم..... تم مجھے بہت یاد آؤ گی.....“

زری اپنے ہاتھ یونہی مروڑنے لگی..... وہ بہت بے کل اور بے چین نظر آ رہی تھی.....

”شہنو اور تم دونوں ہی کو میں مس کروں گا۔ شہنو کو اس لئے کہ وہ مجھ سے لڑتی بہت

ہے اور تمہیں اس لئے کہ تم مجھ سے بولتی کم ہو.....“ وہ مسکرا رہا تھا.....

زری نے روشنی روشنی نگاہ اس پر ڈالی..... شہباز نے نگاہ کا مفہوم سمجھتے ہوئے کہا ”تم مجھ سے

باتیں کیوں نہیں کرتیں..... شوخ شوخ باتیں مسکراتی مسکراتی باتیں.....“

”مجھے..... شرم آتی ہے..... شہباز.....“ ”بہ شکل زری نے کہا اور دونوں ہاتھوں

سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا.....

شہباز بہت محظوظ ہوا..... وہ کتنی ہی دیر اس کی خوبصورت انگلیوں کو دیکھتا رہا۔

خدمت گار کھانے کے لئے بلانے نہ آجاتی تو شاید شہباز کے انہماک کا سلسلہ کبھی نہ ٹوٹتا۔

.....

”آغا بی بی جانے.....“

”جی بچیا..... قربان کیا بات ہے.....“

”آپ بھی شہر چلیں گی نا.....“

”کس وقت جاؤ گے تم لوگ“

”دوپہر کھانے کے بعد..... شہباز آج رات کی گاڑی سے لاہور جا رہا ہے.....“

”ہاں وہ تو پتہ ہے مجھے.....“

”ہم لوگ کھانے کے بعد چلیں گے۔ خان جی شام کو آجائیں گے.....“

”ٹھیک ہے.....“

”رات وہیں رہیں گے..... کل میں بازار جاؤں گی۔ کچھ چیزیں خریدنی ہیں..... زری کے

داخلے کا بھی کچھ کرنا ہے.....“

”اے بھی شہر رہنا ہو گا.....“

”ہاں آغا بی بی ریشمینے کے پاس رہے گی۔ ویسے بھی شہباز تو اب لاہور جا رہا ہے ہرج تو

کوئی نہیں.....“

”شہباز چار سال وہاں رہے گا.....“

”جی.....“

”ہوں“

”تب تک زری چودہ جماعتیں پڑھ لے گی.....“

”شہنو بھی داخل ہو گئی ہے.....“

”جی.....“

”زرگل اسی مہینے واپس آ رہا ہے“

”جی اس کا آخری پرچہ چودہ کو ہے۔ انشاء اللہ پندرہ سولہ تک واپس آ جائے گا“

”ہاں.....“

”نتیجہ تو کچھ ماہ بعد نکلے گا.....“

”جب بھی نکلے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس نے کون سا نوکری کرنا ہے.....“

”اس نے علم حاصل کرنا تھا کر لیا..... کتنا ہے گاؤں کی حالت بدل دوں گا.....“

”خوشی کی بات ہے تمکینے بی بی کہ زرگل کو اپنے گاؤں سے پیار ہے..... چار سال بڑے شہر

میں رہ کر بھی اس کے خیالات نہیں بدلے..... اپنی مٹی کو نہیں بھولا.....“

”وہ میرا بیٹا ہے آغا بی بی“

”تمکینے نے ہنس کر آغا بی بی سے کہا تو آغا بی بی غار ہوتے ہوئے بولیں ”اس میں کیا شک ہے

بیٹی..... تمہاری تربیت ہی کا نتیجہ ہے..... میں تم سے بہت خوش ہوں.....“

”مہربانی آغا بی بی جانے“ تمکینے نے آگے بڑھ کر آغا بی بی کے ہاتھ ہاتھوں میں لے کر ان پر

بوسہ دیا۔ آغا بی بی نے تمکینے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

”تو آغا بی بی..... تیار رہنے گا“ تمکینے اٹھتے ہوئے بولی.....

”میں نے کیا تیاری کرنی ہے۔ دو ایک جوڑے کپڑے رکھ لینا میرے بھی..... شاید میں وہاں دو

چار دن رک جاؤں“

”اچھا جی.....“

”زری بھی تیار ہے“

”ابھی دیکھتی ہوں اسے.....“

”تمکینے آغا بی بی کو تیار ہونے کا کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

برآمدے میں کچھ خدمت گاریں زرگل کی تردد تاج برو کے ارد گرد بیٹھی تھیں۔ تاج برو کی پوتی

زری کی ہم عمر تھی۔ اس کا رشتہ تاج برو نے اپنی جان کے نواسے سے کیا ہوا تھا۔ یہ لڑکا حویلی چھوڑ کر شہر چلا گیا

تھا۔ جہاں وہ ان دنوں ٹرک ڈرائیوری کر رہا تھا۔ ٹرک پشاور سے کراچی جاتے آتے تھے۔ خاصے پیسے کماتا

تھا۔ لیکن جانے کیسے وہ کچھ سمگلروں کے ہتھے چڑھ گیا۔ انہوں نے سبز باغ دکھائے۔ تنخواہ ڈبل دینے کی

پیش کش کی علاوہ اور بھی بہت کچھ دینے کا وعدہ کیا۔ لالچ میں آکر نور خان نے ان کی آفر قبول کر لی۔

انجام و عواقب سے بے خبر ہو کر وہ زیادہ سے زیادہ پیسے کمانے کے لالچ میں ان کا کام کرنے لگا.....

لیکن کچھ زیادہ عرصہ یہ کام نہ کر پایا۔ پچھلے ہفتے وہ جوڑک کراچی لے کر جا رہا تھا۔ وہ پولیس نے حیدر آباد کے قریب روک لیا۔ مجبری ہو گئی تھی۔ تلاشی پر سگنگ کمال برآمد ہوا..... جس کے نتیجے میں نور خان اس کے ساتھ کنڈکٹر اور ایک مزدور تینوں کو پولیس نے حراست میں لے لیا.....

آج صبح ہی اس کے پکڑے جانے کی خبر ایسی جان کو ملی تھی۔ وہ پریشان ہو گئی تھی۔ سینے پر دو ہنٹر مارے تھے۔ تاج برو کو بھی پتہ چلا تھا اور وہ استفسار کے لئے اپنی جان کے پاس آئی تھی.....

رشتوں کے بندھن نازک تھے۔ تاج برو نے بیٹے اور سوتے زبردستی اس رشتے کے لئے ہاں کروائی تھی۔ اور ایسی جان نے بھی بڑی خوشی اور خواہش سے نور خان کے لئے شیش کار شتہ مانگا تھا۔ آغا بی بی نے اپنی ذمہ داری پر یہ رشتہ نہ کر دیا تھا۔ اپنی اور تاج برو حویلی ہی میں بی بی بڑھاپے کی حدوں کو چھو رہی تھیں۔ رشتہ معقول تھا۔ دونوں طرف سے رضامندی کا اظہار ہوا تھا۔ آغا بی بی نے اسی بنا پر بندھن باندھ دیا تھا۔ حویلی کے نوکر گھروں میں رہنے والے نوکروں اور خدمت گاروں کے اکثر رشتے انہی کے توسط سے طے ہوتے تھے..... شادی بیاہ کا خرچہ بھی وہی کرتی تھیں..... اب تک جتنے رشتے بھی کئے تھے۔ سب اچھی طرح نبھ رہے تھے۔

تمکینے نے خدمت گاروں کو یوں ہنگامہ باندھ دیکھا تو زری کے کمرے میں جانے کی بجائے اوہری آگئی.....

”کیا بات ہے“ اس نے ماہ گل سے پوچھا۔

”جی..... وہ.....“ وہ ہکلائی۔

”کوئی خاص بات ہے کیا؟“ تمکینے نے آگے بڑھ کر اپنی ہان سے پوچھا..... ”پریشان لگ

رہی ہو.....“

”نور خان پکڑا گیا بی بی جانے.....“ اپنی کی بجائے تاج برو نے سر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”نور خان؟ اپنی جان کا نواسہ؟“

”جی.....“

”کیوں پکڑا گیا.....“

”پتہ نہیں.....“

”تمہیں کس نے بتایا.....“

”حجرے میں یہ خبر نجیب خان نے سنائی۔ زرین خان بھی یہ خبر لے کر آیا ہے۔“

”پکڑے جانے کی وجہ معلوم ہوئی.....؟ کہیں کوئی پکڑ لٹ تو نہیں کر دیا اس نے.....“

”وہ..... وہ جی.....“

”کیا بات ہے..... تاؤ تو سی.....“

”تاج برو نے اٹھ کر تمکینے کو سرگوشی کے انداز میں بتایا ”سگنگ کے جرم میں گرفتار ہوا

ہے..... اب کیا ہو گا بی بی جانے.....“

تمکینے ششدر رہ گئی..... جھٹ سے بولی ”تمہیں کس نے کہا..... تاج برو.....“

”حجرے کے سب مردوں کو خبر ہے بی بی جانے.....“

”لیکن وہ تو ایسا نہیں تھا..... بہت سادہ سا شریف سا جوان تھا.....“

”پتہ نہیں۔ کس ظالم نے اسے چنگل میں پھنسا لیا“ اپنی جان بین کے انداز میں روتے ہوئے

بولی۔

”اپنی جان صبر اور حوصلے سے کام لو۔“ تمکینے نے پریشان ہو کر کہا پھر پوچھا ”خان جی کو پتہ

چلا“

”وہ تو تنگی گئے ہوئے ہیں.....“ خدمت گار بولی۔ ”خان زمان خان کے والد کا چالیسواں

ہے آج.....“

”ہاں..... وہ تو شاید پچھلے پہر لوٹیں گے.....“

”جی.....“

”آغا بی بی کو بتایا.....“

”جی نہیں.....“

”ان سے بات کرو۔ آج ہم شہر جا رہے ہیں۔ وہاں نواز خان سے کہیں گے کہ اسے چھڑانے

کا کوئی بندوبست کریں.....“

”نور خان کو چھڑا کر یہاں پہنچا دو بی بی جان“ اپنی نے روتے ہوئے کہا..... ”میں اسے

ڈرائیوری کرنے نہیں دوں گی..... اسے حجرے ہی میں خدمت کیلئے رکھوں گی.....“

”خان جی آئیں۔ وہی سارے معاملے کی تہہ کو پنچیں گے..... ویسے میں نواز خان سے بھی

کہوں گی.....“

”کم بخت نے لٹیا ہی ڈبو دی“ اپنی بڑبڑائی.....

”میری پوتی کا کیا بنے گا“ تاج برو نے سینے پر ہاتھ مارا.....

”سب ٹھیک ہو جائے گا تاج برو.....“

”اس پر جرم کا داغ لگ گیا ہے بی بی جان“ وہ روہاٹی آواز میں بولی ”میرا بیٹا اور سو تو پہلے ہی
رضامند نہ تھے اب..... اس مجرم کو بیٹی کیسے دیں گے.....“

ایسی جان رونا دھونا بھول کر تراز سے بولی ”اے واہ..... کیسے نہیں دیں گے۔ شیشینی نور
خان کی منگ ہے۔ اس کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت تو کرے..... آنکھیں نہ پھوڑ دوں.....“

تمکینے نے تاج برو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دبایا..... جو اس سے بھی بڑھ کر تیزی سے اور
تندی سے جواب دینے والی تھی.....

”بی بی جان.....“ وہ صرف یہی کہہ پائی۔

تمکینے نے کہا ”ابھی بات نہ بڑھاؤ..... کیا عجب نور خان بے قصور ہو۔ رشتے کا معاملہ ہے تم
لوگ یوں گرمی دکھاؤ گے تو زیادہ الجھنیں پیدا ہوں گی۔ ایسی جان تم بھی اب کچھ نہیں کوگی۔ اپنے رسم و رواج تم
سب جانتے ہو۔ بہر حال..... معاملے کو یہیں تک محدود رکھو۔ خان جی آجائیں تو بات ہوگی۔ خان نواز خان نور
خان کو ضمانت پر رہا کروالیں گے۔ ان کا شور و سون بہت ہے فکر نہ کرو.....“

خدمت گاریں چپ ہو گئیں.....

تمکینے نے ان کے ارد گرد کھڑی خدمت گاروں سے کہا ”چلو سب یہاں سر جوڑ کر کیوں
کھڑی ہو..... سب ٹھیک ہو جائے گا..... جاؤ اپنا اپنا کام کرو.....“

خدمت گاریں ادھر ادھر کھٹکے لگیں۔

تمکینے نے تاج برو سے کہا۔ ”ہم لوگ رات شہری رہیں گے..... حجرے میں کھانا بھجوانا ہے
رات کا..... بندوبست کر لینا صدمہ انے سے کہہ کر.....“

”شہر جا کر خان جی سے ضرور کہنا بی بی جان..... نور خان کی اس حرکت نے تو ہمیں کہیں کا نہیں

رکھا“

تمکینے نے اسے تسلی دی۔ ایسی جان کے کندھے پر بھی ہاتھ رکھ کر تسلی و تسنی کے کلمات
کہے۔ دونوں خدمت گاریں تمکینے کو ڈھیروں دعائیں دیتی باورچی خانے کی طرف چل دیں۔

تمکینے زری کے کمرے میں آگئی.....

زری اپنے کپڑے بیک میں ڈال رہی تھی۔

”تیار ہو.....“ تمکینے نے پوچھا

”ہو رہی ہوں بی بی جان.....“

”کل کالج جا کر پتہ بھی کرنا ہے“

”جی.....“

تمکینے اس کے قریب آگئی۔ کپڑوں پر اک نگاہ ڈالی اور پھر بولی ”سٹنے کے لئے جو کپڑے
دینے ہیں وہ بھی رکھ لو.....“

”ابھی کافی کپڑے ہیں بی بی جان..... پھر سلوا لوں گی..... اور اب تو شہری رہنا ہے۔ جس وقت
ضرورت ہو کرے گی سلوا لیا کروں گی.....“

”ہائے زری..... تو بھی چلی جائے گی“ تمکینے نے بیٹی کی پیشانی چوم لی۔

”ہر جمعرات کو آجایا کروں گی۔ بی بی جان..... پڑھنا تو ہے نا.....“ وہ مسکرائی.....

”گھر میں بالکل ہی رونق نہیں رہے گی“

”زر گل لالہ آجائیں گے اسی مہینے.....“

”وہ کون سا گھر میں بیٹھا رہا کرے گا.....“

”پھر بھی..... آتو جائیں گے نا.....“

”اچھا تو تیاری کر لے..... کھانے کے بعد نکل جائیں گے.....“

”بابا تو تنگی گئے ہوئے ہیں؟“

”وہ بعد میں آجائیں گے..... شہباز خیر میل پر جا رہا ہے۔ رات دس بجے چلتی ہے شاید۔ تب

تک آجائیں گے تمہارے بابا بھی.....“

تمکینے ادھر ادھر کی چند باتیں کرنے کے بعد چلی گئی.....

ساڑھے چار بجے کے قریب یہ سب لوگ شہر پہنچ گئے..... شہنو اور ریشمینے نے ان کا
خوشدلی سے استقبال لگایا۔ بعد ایک دوسرے کی احوال پرسی کرتے سب اندر چلے آئے۔ خدمت گاریں
سامان اتار کر لے آئیں۔

شہنو زری کو اپنے کمرے میں لے گئی..... دونوں باتیں کرنے لگیں۔ شہنو کا داخلہ ہو گیا
تھا..... اسی کالج میں زری کا بھی داخلہ ہونا تھا۔

”بہت مزہ آئے گا۔ ہم دونوں اکٹھی رہیں گی۔ کالج اکٹھی جایا کریں گی“ شہنو نے
خوش ہو کر کہا۔

”ہاں.....“ زری بولی۔

”بی بی گل نے یہ برابر والا کمرہ تمہارے لئے ٹھیک کرنے کا کہہ دیا ہے۔ بابا اس میں نیا فرنیچر
ڈالوا رہے ہیں قالین بھی نیا آیا ہے اور پردے بھی.....“ شہنو نے آنکھیں نہاتے ہوئے کہا ”بہت خاطر ہو

رہی ہیں؟..... پتہ ہے کیوں؟“

”چل ہٹ.....“ زری شرمگنی.....

”یہ شہباز لالہ کی فرمائش تھی زری..... دیکھو میرے بھائی کو ابھی سے تمہارا کتنا خیال ہے.....“
 زری لال ہو گئی..... پلکیں گراتے..... اٹھاتے شرکیں انداز میں شہنو کو دیکھا..... ”ان کی فرمائش کیوں وہ تو چلے جائیں گے..... میں جس کمرے میں بھی رہوں انہیں کیا.....“
 ”جی جناب وہ چاہتے ہیں۔ کہ ان کی زری کو کوئی تکلیف نہ ہو.....“ شہنو شوخ ہوتی جارہی تھی.....

”وہ ہیں کہاں“ زری نے جھپکتے جھپکتے پوچھا۔

”اپنے درجن بھر دوستوں کو الوداع کہنے گئے ہیں.....“

”پتہ نہیں تھا انہیں کہ ہم لوگ بھی آرہے ہیں.....“

”اوہو.....“ وہ آنکھیں گھماتے ہوئے شوخی سے بولی ”بری بات شہباز لالہ بہت لاپرواہ ہیں انہیں تو تمہارے استقبال کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کر کے بیٹھنا چاہتے تھانا.....“

”یہ کب کہا میں نے.....“

”آئیں تو خبر لیتی ہوں ان کی.....“

”میرے بارے میں کوئی بات کی تا تو یاد رکھنا.....“

شہنو کھلکھلا کر ہنس دی.....

شوخی شوخی چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی..... تھوڑی دیر بعد شہباز بھی آگیا..... زری کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ستاروں کی چمک بھر گئی.....

”یہ آپ سے ناراض ہیں شہباز لالہ.....“ شہنو نے چھیڑا.....

”کیوں“ شہباز نے پوچھا۔

”نہیں تو..... ایسے ہی بک رہی ہے.....“ زری جلدی سے بولی۔

”آپ خود ہی پوچھ لیں.....“ شہنو اٹھتے ہوئے بولی زری نے اس کا دوشہ پکڑ لیا۔ لیکن وہ دوپٹہ چھڑا کر کمرے سے نکل گئی..... جاتے جاتے آنکھیں نچاتے زری کو چھیڑتی گئی۔

”کیوں ناراض ہو مجھ سے“ شہباز نے اس کے جانے کے بعد پوچھا..... وہ میز پر چڑھ کر بیٹھا تھا اور چند قدم کے فاصلے پر زری درمیانی صوفے کے بازو سے لگی بیٹھی تھی۔

”بتاؤ نا.....“

”ایسے ہی بک رہی تھی وہ..... میں آپ سے کیوں ناراض ہوؤں گی.....“

”ہونا بھی نہیں چاہئے..... میں چار سال کے لئے جا رہا ہوں زری.....“

”چھٹیوں میں آیا بھی تو کریں گے.....“

”ہاں۔ کبھی دو دن کے لئے کبھی چار دن کیلئے۔“

”گر میوں کی چھٹیاں تو کافی لمبی ہوتی ہیں.....“

”ہوں.....“

”دونوں چند لمحوں کے لئے چپ ہو گئے۔“

”زری“ وہ توقف کے بعد بولا.....

”جی“ زری نے اس کی طرف دیکھے بنا جواب دیا۔

”مجھے خط لکھا کرو گی.....“

”خط!“

”ہاں..... میں تمہیں خط لکھوں گا جواب دو گی نا.....“

اس نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا..... وہ خاصی پریشان نظر آرہی تھی۔ اس کی یہ ادا شہباز کے

من بھاتی تھی..... وہ اسے ایک ننگے کیا۔

”بتاؤ نا زری..... جواب دو گی میرے خط کا.....“ اس نے بڑے اصرار سے پوچھا۔ تو زری

ہولے سے بولی ”پتہ نہیں.....“

”کیوں“

”گھر کے لوگ شاید اجازت نہ دیں.....“

وہ جلدی سے بولا ”کیوں نہ دیں گے..... آخر ہم دونوں.....“

وہ کچھ کتے کتے رک گیا..... زری بھی جھجک گئی.....

چند لمحوں بعد وہ پھر آہستگی سے بولا..... ”زری تم جانتی ہو نا..... کہ..... میرا اور تمہارا کیا رشتہ

ہے.....“

زری نے سر جھکا دیا اسے شہباز سے بہت حجاب آ رہا تھا.....

”پتہ ہے نا..... تم میری منگیت ہو.....“

وہ کچھ نہیں بولی۔ اس کا سر کچھ اور جھک گیا۔

شہباز میز سے اتر کر اس کے قریب آ بیٹھا..... سرگوشی ہی کرتے ہوئے بولا ”ہم لوگوں میں

منگنی کا رشتہ بھی اتنا ہی مضبوط ہوتا ہے جتنا شادی کا..... جانتی ہوتا.....

اس نے ہولے سے سر ہلا دیا.....

”یہ انٹ بندھن ہے“ وہ بولا.....

اس نے سٹے ہوئے پھر سر ہلا دیا.....

”پھر“ شہباز نے اس کے کندھے پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بڑے جذباتی انداز میں کہا ”پھر ہمیں خطو کتابت کی اجازت کیوں نہ ملے گی..... میں خط لکھوں گا اور تمہارے جواب کا بے چینی سے انتظار کیا کروں گا..... سمجھیں.....“

زری شہباز کی دہکتی قربت میں پگھلتی جا رہی تھی۔ شہباز نے پھر پوچھا ”خط کا جواب دو گی نا“ تو اس نے پھر ہولے سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

شہباز نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر یہ ہاتھ آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولا۔ ”زری۔ مجھے یقین ہے کہ چار سال کی دوری ہمیں بہت قریب لے آئے گی.....“

زری نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے الگ کرتے ہوئے آہستگی سے کہا ”ہم ہمیشہ قریب رہے ہیں شہباز۔ وقت یا فاصلے ہمیں دور نہیں کر سکتے.....“

”زری“ وہ دوفر جذبات سے گھٹی آواز میں بولا۔

زری نے اس کی طرف دیکھا..... اس کی آنکھوں میں بھی نمی تیر گئی.....

رات شیش پر سب ہی شہباز کو چھوڑنے گئے۔ خان بابا نے یہاں آنے سے پہلے گھنٹہ بھر شہباز کے ساتھ گزار کر اسے نصیحتیں کیں تھیں۔ اونچ نیچ سمجھائی تھی۔ دیار غیر میں رہنے کے طور طریق سمجھائے تھے..... شہباز نے پہلی بار محسوس کیا تھا کہ بابا اس سے بے حد پیار کرتے ہیں اور اس کے جانے سے وہ خلا محسوس کر رہے ہیں۔

بی بی گل سے تو اسے کبھی کوئی شکایت ہوئی ہی نہ تھی۔ وہ اس کی جدائی کو ابھی سے محسوس کر رہی تھیں..... اور تو اور شہنوں کتنی افسردہ تھی..... اسے اس پر بے طرح پیار آرہا تھا۔

اب سب شیش پر موجود تھے۔ کوئی نصیحتیں کر رہا تھا۔ کوئی پیار کر رہا تھا۔ عبور خان اور تمکینے کئی بار گلے سے لپٹا کر پیار کر چکے تھے۔ آغا بی بی نے تو اتنی بار پیشانی چومی تھی کہ لگتا تھا ان کے ہونٹوں کا لمس امر ہو گیا ہے۔ خان بابا اور بی بی گل نے بھی جی بھر کر پیار کیا۔ شہنوں تو اس سے لپٹ کر رو دی.....

شہباز سب سے متاثر دیدہ نظروں سے زری کو دیکھتا کپار ٹمنٹ میں چلا گیا۔ زرین خان نے اوپر والی برتھ پر اس کا بستر لگا دیا تھا اور دیگر سامان بھی رکھ دیا تھا۔

”اچھا خان“ اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ”خدا حافظ.....“

”خدا حافظ“

شہباز اس کے ساتھ ہی کپار ٹمنٹ کے دروازے تک آگیا۔

ایک بار پھر الوداعی کلمات کہے گئے.....

ٹرین نے حرکت کی.....

شہباز نے سب کو ہاتھ بلایا..... اور خدا حافظ کہا.....

سب نے جواباً خدا حافظ کہتے ہوئے ہاتھ ہلائے۔

صرف زری اپنی چادر کے کونے سے بھیگی آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ شہباز اپنے آپ کو ان آنکھوں کی گہری گہری جھللاہٹوں میں ڈوبتا محسوس کر رہا تھا۔

”شہنو..... تم کہاں گم ہو گئی تھیں.....“ زری نے بیک کندھے پر ڈالتے ہوئے چادر نکال کر ادھمی.....

”یہیں تھی۔ کیوں؟“ شہنو نے پوچھا۔

”بھئی گھر نہیں جانا.....“

”چلتے ہیں..... ذرا میں.....“

”اب کہیں نہیں جاؤ گی.....“

”نیچہ سے ملنا ہے۔ صرف دو منٹ میں آتی ہوں۔ یہ گئی اور آئی.....“ وہ دوڑ گئی۔

”اللہ.....“ زری نے اسے جاتے دیکھ کر پیارگی سے کہا ”سینکڑوں تو بیلیاں بنا رکھی ہیں اس

نے.....“

زری کے پاس کھڑی حمدا نے مسکرا کر اسے دیکھا..... اور بولی ”اتنی بھی کیا جلدی ہے گھر

جانے کی“

”آج جمعات ہے بھئی.....“

”تو کیا ہوا.....“

”مجھے جمعات کو گاؤں جانا ہوتا ہے.....“

”اوہ..... اچھا.....“

”کالج سے جتنی جلدی جاؤں اتنی ہی جلدی گاؤں جاسکتی ہوں..... اس شہنو کی بچی کو کچھ

احساس ہی نہیں ہوتا.....“

”بت کلنڈری اور شریر سی ہے.....“

دو تین اور لڑکیاں بھی ان کے پاس آکھڑی ہوئیں۔

کالج میں چھٹی ہو چکی تھی..... لڑکیاں جوق در جوق گیٹ کی طرف آ رہی تھیں۔ گیٹ سے باہر سڑک پر ٹانگوں رکشوں اور گاڑیوں کی قطاریں لگی تھیں۔ چوکیدار گیٹ پر کھڑا تھا..... لڑکیاں گیٹ کے چھوٹے دروازے سے نکل نکل کر ٹانگوں رکشوں اور گاڑیوں میں بیٹھ رہی تھیں..... ان سواریوں کی کوئی لڑکی دیر لگا دیتی تو چوکیدار دروازے کے اندر جھانک کر بلند آواز سے لڑکی کو پکارتا..... لڑکی دوڑی چلی آتی..... یہ روزی کا معمول تھا۔ چھٹی کے وقت یہ رولا گولا ہوتا ہی تھا.....

زری حمدا اور شازیہ کے ساتھ باتیں کرتی گیٹ کے قریب آگئی۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ شہنو ابھی تک لاپتہ تھی۔

”جی تو چاہتا ہے اسے یہیں چھوڑ جاؤں“ زری نے اپنا آپ لمبی چوڑی چادر میں اپنا وجود لپیٹتے ہوئے کہا..... ”ابھی تک نہیں آئی.....“

”جا کے خود بلا لاؤ نا.....“ حمدا نے کہا۔

”میں ادھر جاؤں وہ ادھر آجائے“ زری بولی۔

”یہ بھی ٹھیک ہے یہیں کھڑے ہو کر انتظار کرو.....“ حمدا نے جواب دیا۔

”تمہارا ننگہ تو آگیا ہو گا.....“ زری نے پوچھا۔

”ہاں.....“

”تو جاؤ تم.....“

”بس جا ہی رہی ہوں..... ذرا بھی دیر کی تو چوکیدار لمبی ہانک لگائے گا.....“

”شازیہ تمہارے ساتھ جاتی ہے؟“

”نہیں.....“ شازیہ نے کہا..... ”مجھے بھائی لینے آتے ہیں۔ سکوتر پر جاتی ہوں ان کے

ساتھ.....“

”تو بڑا دیکھو..... شاید آگے پہن وہ.....“

شازیہ نے گھڑی دیکھی پھر نفی میں سر ہلایا ”ابھی نہیں۔ پانچ منٹ بعد آئیں گے۔“

”تمہارے بھائی بھی کالج سے آتے ہیں.....“

”ہاں.....“

وہ تینوں باتیں کر رہی تھیں..... کہ شہنو دوڑتی چلی آئی۔ وہ ہانپتے ہوئے بولی ”وہیں انتظار

نہیں کر سکتی تھیں زری.....“

”یہ تو تمہیں چھوڑ کر جا رہی تھی“ حمدانے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے ہنس کر کہا۔ پھر خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئی۔

”اچھا یہ بات ہے..... اتنی جلدی کا ہے کی.....“ شہنو نے حمد کو خدا حافظ کہتے ہوئے زری سے کہا۔

”آج جمعرات ہے محترمہ.....“ زری نے قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

”اوہ..... میں تو..... بھول ہی گئی تھی.....“ شہنو بولی۔

زری نے ہنس کر شوفی سے کہا..... ”میرا کیا ہے۔ نقصان تمہارا ہی ہوا..... زرگل لالہ پیارے انتظار.....“

”زری کی پکی.....“ شہنو نے ہنستے ہوئے اس کی کمر میں نسو کا لگایا..... ”مجھے تو یاد ہی نہیں تھا۔ کہ زرگل.....“

”زرگل کون؟“ شازیہ نے دونوں کی چھیڑ چھاڑ سے محظوظ ہوتے ہوئے پوچھا.....

”شہنو شوفی سے بولی ”اس کا بھائی اور میرا چچا زاد.....“

زری کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ شہنو نے اسے گیٹ کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا ”اچھا شازیہ بائے“

”بائے“ شازیہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ دونوں آگے پیچھے گیٹ سے باہر نکل آئیں۔

زرین خان گاڑی کے پاس کھڑا تھا۔ دونوں کو آتے دیکھا تو مودبانہ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔

شہنو کو تو پڑھائی سے زیادہ کالج کی دوسری ایکنوٹیز میں حصہ لینے کا شوق تھا۔ ڈرامیک کلب کی ممبر بن گئی تھی۔ ڈینٹس میں حصہ لیتی تھی۔ اور کالج کی جتنی ہنس کھ لڑکیاں تھیں ان سے دوستی کر لیتی تھی۔ وہ تو جوان سال لیکچررز کے ساتھ بھی خاصی بے تکلف تھی..... مس نادیا حسن اور مس ذہرہ بید سے تو خاصی بے تکلفی سے باتیں کیا کرتی تھی..... کئی بار سیلیوں کو چائے پر گھر بلا چکی تھی.....

اس کے برعکس زری لڑکیوں سے جلدی گھلتی ملتی نہیں تھی۔ اس نے صرف حمد اور شازیہ سے پکی دوستی کی تھی۔ نیمہ اور صائمہ جو شہنو کی دوست تھیں۔ ان سے بھی ہنس بول لیتی تھی..... جھگڑنے کے بجائے سیلیوں کے نہیں تھے۔ جیسے شہنو کے تھے۔ ڈراموں یا ڈینٹس میں بھی اس نے کبھی حصہ نہیں لیا تھا۔ اسے سٹیج پر کھڑے ہونے کے خیال ہی سے ڈر لگتا تھا۔ وہ شہنو کی جرأت پر اکثر حیران ہوا کرتی تھی کہ

کس طرح سینکڑوں لوگوں کے سامنے سٹیج پر کھڑی ہو کر تقریر کر لیتی ہے۔ یا ڈرامے کا کوئی کردار نبھا لیتی ہے۔ دونوں کی طبیعتوں اور مزاجوں میں شروع ہی سے تضاد تھا۔ شہنو قہقہوں کی پھوار برسانے والی شوخ و شنگ لڑکی تھی..... زری بڑی ٹھہری ہوئی سلجھی ہوئی سنجیدہ مزاج رکھنے والی دوشیزہ تھی۔ مزاجوں اور طبیعتوں کے تضاد سے چاہئے تو یہ تھا۔ کہ دونوں کی آپس میں بن نہ آتی۔

لیکن

دونوں کی آپس میں بہت غبتی تھی..... بہت پیار تھا دونوں میں..... اور جب سے زری پڑھائی کے لئے شہنو کے ساتھ رہنے کے لئے آئی تھی۔ یہ پیار اور بڑھ گیا تھا..... دونوں کے کمرے الگ تھے۔ لیکن سوتی دونوں اکٹھا تھیں۔ کبھی زری شہنو کے کمرے میں اور کبھی شہنو زری کے کمرے میں..... کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا کھینچے ہی تھا..... جمعرات کو زری گاؤں جاتی۔ اور جمعہ کی شام کو واپس آ جاتی..... یہ وقت گزارنا شہنو کے لئے مشکل ہو جاتا۔ پہلے تو وہ بھی جمعرات جمعہ زری کے ساتھ گاؤں ہی میں گزارتی تھی۔ لیکن جب سے زرگل آ گیا تھا۔ اس نے زری کے ساتھ جانا چھوڑ دیا تھا..... گھر والوں کی طرف سے کوئی روک ٹوک اور پابندی تو نہیں تھی۔ شہنو خود ہی نہیں جاتی تھی۔ کچھ اخلاقی ضابطے بھی تو ہوتے ہیں..... الزاد شوخ و شنگ بے شک تھی۔ لیکن ان ضابطوں سے روگردانی نہیں کرتی تھی۔ ہاں بی بی گل جاتیں تو وہ بھی ساتھ چلی جاتی تھی.....

”شہنو تم نے آج بہت دیر کر دی“ زری نے گھڑی دیکھی۔

”سوری“ اس نے منہ بنایا..... تو زری مسکرا دی۔

دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں..... زرین خان گاڑی چلا رہا تھا.....

”زرین خان“ زری نے کہا۔

”جی چھوٹا بی بی.....“

”زرگل لالہ آگئے تھے.....“

”جی..... وہ تو دس بجے کے قریب آئے تھے۔ کسی کام کے لئے گئے ہیں۔ اب واپس آچکے ہوں گے.....“

”دیکھا.....“ زری نے مسکراتی سرزنشی نظروں سے شہنو کو دیکھا.....

”کیا“ وہ پھر منہ بناتے ہوئے بولی۔

”پیارے زرگل لالہ..... انتظار میں بیٹھے ہوں گے..... سارے کام چھوڑ چھاڑ چلے آتے ہیں.....“

”کیا بڑی بات ہے ہن کو لینے آتے ہیں.....“ شہنو مسکرا ہٹ دباتے ہوئے بولی۔

”جی نہیں جناب..... میرے لئے نہیں آتے.....“

”تو کس کے لئے آتے ہیں.....“

”یہ تم بھی جانتی ہو“ وہ ہنس دی۔

”آہستہ بولو.....“ شہنو نے اس کی چنگلی کاٹ کر زریں خان کی طرف نظروں سے اشارہ

کیا۔

دونوں مسکرائے لگیں.....

”شہنو“ زری نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

”ہوں“

”آج تم بھی چلو نا.....“

”کہاں“

”گاؤں“

”کیوں“

”ایسے ہی مزہ آئے گا۔ کل شام تو واپس آنا ہی ہے“

”نہ بھی.....“

”کیوں.....“

”وہ..... تمہارے چمچل بھائی جو آگئے ہیں.....“ وہ ہنس کر بولی۔

”اے“ زری نے غصے کی اداکاری کی..... ”خبردار جو میرے بھائی کو چمچل کہا.....“

”زری..... سچ کہوں۔ جب سے زرگل نے یہ بڑی بڑی مونچھیں رکھ لی ہیں نا..... تو.....“

”تو کیا ہوا..... کتنے خوبصورت لگتے ہیں مونچھوں سے وہ.....“

”شہنو قہقہہ لگاتے ہوئے بولی ”اسی لئے تو کتنی ہوں.....“

”میں زرگل لالہ کو بتاؤں گی.....“

”اے لڑکی..... رعب نہ جھاڑو..... ڈرنا کون ہے ان سے.....“ شہنو کھلکھلا کر

ہنس پڑی۔

زری بھی ہنس پڑی۔

ہنسنے مسکراتے قہقہے لگاتے کالج سے گھر تک کا راستہ طے ہوا۔

حسب توقع زرگل زری کو لینے آیا ہوا تھا..... وہ گیٹ کے قریب ہی انتظار میں ٹھہر رہا تھا۔ انتظار

اسے زری کا بھی تھا..... جو پڑھائی کی خاطر اب یہاں رہنے لگی تھی۔ اور ہنسنے میں دوایک دن ہی وہ گاؤں میں رہتی تھی۔ اس کے بغیر زرگل بڑی بوریٹ محسوس کرتا۔ وہ تفصیل آباد سے آتے ہی زمین اور اس کی آباد کاری میں لگ گیا تھا۔ ورنہ حویلی میں اکیلے رہنا بہت بار گزرتا۔

اور

انتظار اسے شہنو کا بھی تھا۔

شہنو جو اس کے جواں دل کی دھڑکن بن چکی تھی۔ جس کی شوخی اور پھٹکت کا وہ دیوانہ تھا..... جو اس کی زندگی میں دھنک رنگ بن کر اتری ہوئی تھی..... جو محکم تھی خوشبو تھی اور یہ محکم اور خوشبو اس کے دل و دماغ میں بسی تھی۔ پیار کی جڑیں تو بچپن کی معصوم اور ناکہجی کی حدوں سے شروع ہوتی تھیں۔ لیکن جوانی کا اپنا ہی حسن و نکھار تھا۔ طلب تھی۔ تقاضے تھے۔ تڑپ تھی..... پیار کی جڑوں نے ہستی کی دھرتی کے اندر جال سا بن دیا تھا..... یہ اب بھی پھیل رہی تھیں..... اندر ہی اندر مضبوطی سے من کی ہستی کو گرفت میں لینے جارہی تھیں.....

شہنو سے ملنا اسے دیکھنا اس سے باتیں کرنا لطف و انبساط کی راہیں کھول دیتا تھا۔ زرگل ہر جمعرات کو زری کو لینے آتا..... تو تشنہ نگاہوں کی سیرابی کا وسیلہ بھی بن جاتا۔ وہ اور شہنو ملتے۔ باتیں کرتے..... شہنو کی شوخی کی وارداتیں زرگل کی محبتوں میں بے پناہ اضافہ کر دیتیں.....

زری اور شہنو نے زرگل کو ڈراموں پر ٹپٹے دیکھا.....

شہنو کے چہرے پر گلابوں کے رنگ بکھر گئے..... آنکھوں میں ستاروں کی چمک بھر گئی..... گاڑی سے نکلے ہی دونوں زرگل کی طرف بڑھیں۔ جو خود بھی کمان سے نکلے تیر کی طرح تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہا تھا.....

زری دوڑ کر زرگل سے لپٹ گئی..... زرگل نے اسے ہنساتے ہوئے اس کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے شہنو کی طرف دیکھا..... ”ہیلو..... شہنو.....“

”اتنی دیر لگادی“ وہ شاک کی لہجے میں بولا..... ”انتظار کرتے کرتے تھک گیا.....“

زری نے شہنو کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا دی۔ مسکراہٹیں تو اس کے آنکھوں سے پھوٹ

رہی تھیں.....

”کیسی ہو.....“ زرگل نے شہنو سے پوچھا۔

”فائن.....“ وہ نیم باز نظروں سے زرگل کو دیکھ کر بولی..... ”آپ.....“

”انتظار نے ادھ موا کر دیا.....“ وہ زری کو الگ کرتے ہوئے بولا.....

شہنو کھلکھلا کر ہنس پڑی..... پھر ہاتھ سے زرگل کے لمبے چوڑے سراپا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ”یہ ادھ موئے ہیں..... تو پورے کیا شے ہوں گے.....“

اس کی شوخ ادائی پر زرگل مسکرا دیا.....

”اندر چلے..... بھوک سے آنتیں قل ہو وٹنڈ پڑھ رہی ہیں.....“ زری نے کہا۔
”چلو.....“ شہنو بولی۔

”آئیے زرگل لالہ.....“ زری نے کہا ”کھانا کھاؤ نہیں چکے.....“

”کھالیا ہوا شہنو جلدی سے نگاہ غلط انداز زرگل پر ڈالتے ہوئے مسکرائی.....“ ادھ موئے ہو گئے تھے۔ تو بھوک یقیناً لگی ہو گی.....“

”شہنو.....“ زرگل نے کہا۔

”ہوں“

”میرا تسخراڑا رہی ہو.....“

”جی..... کیا؟“ شہنو زرگل کے لمبے سے کچھ ڈر گئی..... زری تیز قدم اٹھاتے اندر چلی گئی

تھی۔

”انتظار کی اذیت سے تم واقف جو نہیں ہو.....“ وہ روٹھے روٹھے انداز میں بولا.....
”احساس ہوتا۔ کہ میں کس طرح انتظار کر رہا تھا۔ تو کبھی تسخراڑا تیں.....“

”سوری.....“ شہنو نے معصومیت سے کہا۔

”ہاتھ جوڑ کر معافی مانگو.....“ زرگل نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔

شہنو نے برآمدے کی بیڑھیاں چڑھتے کتابوں کا ایک کندھے پر سے اتار کر زرگل کی طرف پھینکا۔ جسے حیرانی سے اس نے کیچ کر لیا..... اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی شہنو نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا ”معاف کیجئے عالی جاہ..... ہم سے غلطی ہو گئی تھی..... ہمیں افسوس ہے۔ کہ آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی.....“

”شہنو“ اداے دلنواز پر زرگل بے اختیار ساہو کر اس کی طرف لپکا۔

شہنو تیزی سے جھکی انہی اور بھاگ کر سامنے والے دروازے میں گم ہو گئی.....

اس کا ایک اٹھائے زرگل سنبھل سنبھل کر چلتا شہنو کے کمرے کی طرف چلا آیا..... وہ اپنے

کمرے ہی میں تھی۔

زرگل نے اس کی کتابوں کا ایک بیڑ پر اچھال دیا.....

اور خود کھڑکی کے قریب رکھی مٹکی کر سی پر بیٹھ گیا..... شہنو ڈریسنگ ٹیبل کے سٹول پر بیٹھی

تھی.....

”شہنو.....“ زرگل قدرے توقف کے بعد بولا۔

”ہوں“ وہ آہستگی سے بولی۔

”پڑھائی کیسے جارہی ہے“

”بس واجبی واجبی.....“

”دلچسپی نہیں خاص ہیں نا.....“

”یہی سمجھ لیں.....“

”تو پھر کیوں بیکار وقت ضائع کر رہی ہو..... اپنا بھی..... اور.....“

”اور.....“

”میرا بھی“

”آپ کا.....“

”ہاں.....“

”وہ کیسے جناب“

”ایسے کہ نواز چاچا تمہاری پڑھائی کی وجہ سے ہماری..... شادی..... میں

تاخیر.....“

”اے بیٹے.....“ شہنو نے شرما کر چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا.....

”وہ کہتے ہیں شہنو بی اے کرے گی تب..... اور تم جس رفتار سے پڑھ رہی ہو لگتا ہے

چھ سات سال اور لگا دو گی“ وہ مسکرا کر کہہ رہا تھا.....

شہنو نے ہاتھ نیچے کر لئے..... زرگل اس کی پشت پر آکر کھڑا ہو گیا..... اس کے کندھوں پر

ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے پوچھا ”ٹھیک کہہ رہا ہوں نا.....“

وہ لپکا گئی..... اس کے ہاتھ کندھوں سے ہٹاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی.....

”کیا پروگرام کیا ارادے ہیں..... کتنے برس اور انتظار کرواؤ گی“ زرگل نے مسکراتے ہوئے

اس کی طرف دیکھا..... اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے کو ہاتھ بڑھایا۔ تو وہ پھسلتی پھسلتی کی طرح پرے کھسک

گئی..... زرگل کے ہاتھ اٹھے رہ گئے۔ شہنو ہنس پڑی۔

زرگل اس کی طرف لپکا..... ”شہنو کی بچی بہت شریر ہو تم.....“

”وہ لپک جھپک دروازے تک پہنچے ہوئے شوخی سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی
”آپ بھی کچھ کم نہیں ہیں زرگل لالہ.....“

”پھر لالہ“ زرگل اس کے پیچھے دوڑا..... ”کتنی ڈھیٹ ہو بازاری نہیں آتیں لالہ کہنے سے۔“

ہاتھ آؤ نا تو“

لیکن وہ قتل کرتی ہنسی کی مترنم گھنٹیوں کا مدہم شور کرتی بھاگ گئی۔

۳۵

شہنو فون پر کسی سے باتیں کر رہی تھی۔

زری برآمدے کی سیڑھیوں پر پام کے بڑے بڑے گملوں کے قریب سائیکالوجی کی کتاب لئے

بیٹھی تھی..... وہ باب دوبارہ پڑھ رہی تھی۔ جو مس نے کلاس میں پڑھایا تھا۔

”زری..... اے زری.....“ شہنو نے کوریڈور سے ہی ہانک لگائی۔

”کیا ہے“ زری نے گردن گھما کے کھلے دروازے میں سے سر نکالے پکارنے والی شہنو کو

دیکھا

”بھاگ کے آؤ..... بھاگ کے“

”کیوں“

”بھئی فون ہے تمہارا.....“

”میرا“

”او خدا یا جلدی کرو۔ آؤ بھی.....“

زری کتاب ہاتھ میں لئے تیزی سے کوریڈور کی طرف آئی..... اور پوچھا ”کس کا ہے“

”شہنو معصوم سے لہجے میں بولی ”تمہاری کسی دوست کا ہے.....“

”نام نہیں بتایا“ اس نے رسیور شہنو کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

”خود ہی پوچھ لو.....“ شہنو نے کہا۔

”جیلو.....“ زری نے رسیور کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

”جیلو.....“ آواز مردانہ تھی.....

”کون؟“ زری نے پوچھا

”آپ کا نیا زمند.....“ آواز آئی۔

”میں.....“ زری آواز پہچانتے ہوئے قدرے گھبرائی۔

”اوہ..... زری..... کو کیسی ہو..... میں شہباز بول رہا ہوں.....“

”آپ.....“

”جی ہاں.....“

”یہ شہنو کی بچی..... بہت شریر ہے.....“ زری کے گالوں پر سرخیاں لہرا گئیں۔ فون کرنے سے پہلے اس نے شہنو کو اس کی شرارت پر کوسنا چلا..... وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ”ادھر..... ادھر بھی دھیان ادھر دو.....“

میرا بچہ بھائی تم سے باتیں کرنے کے لئے بے چین ہے۔ لو میں چلی جاتی ہوں۔ تم کھل کے باتیں کر لو..... بس.....“

وہ واقعی چلی گئی.....

”ہیلو.....“ شہباز کی آواز آئی۔

”جی.....“

”کوئی بات کرو بھی“

”کیا..... بات کروں“

”کیسی ہو“

”ٹھیک ہوں“

”میری کمی محسوس کی کبھی.....“

”آں.....“

”بتاؤ نا.....“

”نہیں.....“

”زری..... تم..... میں تو سمجھا تھا..... میری طرح تم بھی مجھے مس کرتی ہوگی..... دور ہونے سے

خلا محسوس کرتی ہوگی.....“

”جی..... نہیں..... میں نے آپ کو..... اپنے سے دور محسوس ہی نہیں کیا..... آپ ہر دم.....“

میرے ساتھ ہیں شہباز.....“

”زری..... کیا واقعی؟“

”جی.....“

”اوہ..... زری..... تم نے مجھے کتنا سکون دیا۔ میں بہت مضطرب تھا..... تم بہت اچھی ہو.....“

کاش یہ الفاظ میں تمہارے سامنے ہوتا تو سنتا.....“

زری ہولے سے ہنسی اور بولی ”اؤں ہوں.....“

”کیوں“

”میں آپ کے سامنے یہ الفاظ کبھی نہ کہہ پاتی.....“

”زری میں نے تمہیں خط لکھا ہے۔ جواب دو گی نا.....“

”فون جو کر لیا ہے..... پھر..... خط.....“

”فون میں ہفتے میں ایک آدھ بار کر لیا کروں گا۔ فکر نہ کرو۔ لیکن خط..... خط بھی لکھا کروں

گا..... تمہارے جواب کا مجھے بے چینی سے انتظار ہو گا.....“

”شہباز.....“

”ہوں.....“

”خط کا جواب..... میں کیسے دوں گی.....“

”میں نے شہنو سے کہہ دیا ہے۔ ضرورت پڑی تو وہ تمہیں بڑوں سے اجازت لے دے

گی“

”ہائے..... میں.....“

”کوئی عذر نہیں سنوں گا..... اچھا اور سنا..... کیا حال چال ہے..... گاؤں میں سب ٹھیک ہیں

نا.....“

”بی بی گل گھر پہ نہیں ہیں کیا؟“

”ہیں..... بلاؤں..... بی بی گل کو.....“

”میں انہیں ہی بلائے گئی تھی جناب..... آری ہیں بی بی گل“ شہنو نے زری کی پشت پر

کھڑے ہو کر کہا.....

”اچھا..... بی بی گل آری ہیں۔ وہ آگئیں..... خدا حافظ“

”خدا حافظ.....“ شہباز نے کہا ”خط ضرور لکھنا..... میں بی بی گل سے بھی کہہ دیتا ہوں۔“

”اے نہیں..... اچھا خدا حافظ“

زری نے بی بی گل کی طرف رسیور بڑھا دیا.....

بی بی گل شہباز سے باتیں کرنے لگیں.....

زری اور شہنو قریب ہی کھڑی رہیں.....

فون بند ہوا۔ تو رسیور رکھتے ہوئے بی بی گل نے مسکرا کر زری کو دیکھا پھر پیار سے اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لئے ہوئے بولیں ”تم سے خط و کتابت کی اجازت مانگ رہا تھا..... اس نے ہمیں خط لکھا ہے.....“

”ہائے بی بی گل“ زری سرخ ہوتے ہوئے بولی۔

”کوئی ہرج نہیں.....“ بی بی گل نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن.....“ وہ شرمائے لہجے میں بولی۔ ”بابا بی جان.....“

ریشمینے نے اسے پھر پیار کر لیا اور بولی ”آغا بی بی ہمیں ہیں۔ میں ان سے اجازت لے دوں گی ان کے حکم کے آگے تو کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں ہے نا.....“

”ہوں“ شہنو نے شریر نظروں سے اسے دیکھا.....

بی بی گل اندر چلی گئیں۔ تو شہنو نے سینہ تان کر زری سے کہا..... ”تم شہباز کو خط لکھو گی تو میں بھی زرگل کو خط لکھا کروں گی.....“

زری کھلکھلا کر ہنس پڑی..... شہنو ہنسی روکے منہ بنائے کھڑی رہی۔

زری نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا اور بولی ”حسد کہیں کی.....“

”اس میں حسد کی کیا بات.....“

”ہے نا.....“

”جی نہیں.....“ ویسے ہمیں کس حساب سے کھلی چھٹی دی جائے۔ کہ تم اپنے ہونے والے شوہر نامدار کو محبت نا لے لکھو۔“

”تم اپنے ہونے والے شوہر نامدار سے بہ نفس نفیس مل جوتی ہو..... زری نے اس کی کمر میں

ٹھوکا دیا..... تو وہ منہ بنا کر بولی ”ہو منہ“ یہ کوئی ملنا ہوتا ہے.....“

”تو پھر..... کیا ہوتا ہے ملنا.....“

”ایسا.....“ اس نے زری کی کمر میں ہاتھ ڈال کر دو تین چکر دے ڈالے.....

دونوں ہنسنے لگیں۔

اس رات دونوں سونے سے پہلے زرگل اور شہباز ہی کی باتیں کرتی رہیں..... دونوں ہی کو اپنے

بھائیوں سے بہت پیار تھا۔ اس پیار کے حوالے سے وہ دونوں ایک دوسری کے جذبات کی شدت اور انتہا کو جانچنے پر کھنے کی کوشش کر رہی تھیں.....

”زرگل لالہ تمہیں شدتوں کی انتہا سے چاہتے ہیں شہنو.....“ یہ زری تھی.....

”اور شہباز لالہ کی چاہتوں کا تم اندازہ نہیں کر سکتیں.....“ شہنو کہہ رہی تھی۔

وہ دونوں کھل مل کر باتیں کر رہی تھیں۔

اور

آغا بی بی کے کمرے میں نواز اور ریشمینے بھی انہی کے متعلق سوچ بچار کر رہے تھے۔

زرگل اپنی تعلیم ختم کر کے واپس آچکا تھا..... اب زمینداری سنبھالنے میں باپ کی مدد کر رہا

تھا.....

صہب خان اور ریشمینے کی دلی خواہش تھی۔ کہ اسی برس زرگل اور شہنو کو رشتہ ازدواج میں

باندھ دیا جائے..... انہوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار ایک بار نہیں کئی بار کیا تھا..... اور اس دفعہ جب آغا بی بی شر

آئی تھیں۔ تو دونوں نے بطور خاص کہا تھا

”آغا بی بی جانے۔ نواز کو سمجھانے کی کوشش کیجئے گا..... ہماری تو وہ آن سنی کر دیتا ہے۔

شہنو کا بی اے کرنا ضروری تھوڑا ہی ہے.....“

آغا بی بی نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا.....

اور

اب وہ اسی سلسلے میں نواز اور ریشمینے سے باتیں کر رہی تھیں۔

”ہرج تو کوئی نہیں.....“ آغا بی بی نے سلسلہ گفت و گو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن ضرورت بھی نہیں ابھی شہنو پڑھ رہی ہے.....“ نواز خان بولے۔

”پڑھائی اتنی ہی کافی ہے.....“

”آغا بی بی جانے..... شہنو کی عمر بھی ابھی چھوٹی ہے۔ دوسرے میں چاہتا ہوں۔ دونوں

شادیاں اکٹھی ہوں.....“

”کیوں“

”شہنو گھر سے جاے تو اس کے بدلے میں زری اس گھر میں آجائے.....“

”وہ تو اب بھی نہیں ہے“

”آغا بی بی..... اب وہ بی بی بن کر یہاں رہ رہی ہے۔ ہسپتال آئے گی تو بات اور ہوگی“

”در اصل تم شہنو کو اپنے سے جدا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے..... ہے تا یہ بات.....“
 نواز ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے مسکرائے ”آغا بی بی..... کسی حد تک یہ بات ہے بھی
 صحیح..... لیکن کسی نہ کسی دن تو اسے جدا کرنا ہی ہے.....“
 ”یہ دن اسی سال کیوں نہ آجائے.....“
 ”نہیں آغا بی بی جان.....“ ریشمینے بھی بولی ”سولہ سترہ سال کی عمر شادی کے لئے
 موزوں نہیں.....“

”اور سنو..... بیٹی..... ٹھیک ٹھاک عمر ہے“
 ”ابھی وہ اپنے آپ کو بچہ ہی سمجھتی ہے آغا بی بی.....“ ریشمینے بولی۔
 ”مجھے تو بہت چھوٹی لگتی ہے۔ منھی منھی..... معصوم سی.....“ نواز خان نے پیار سے کہا۔
 ”تو تہمارا ارادہ نہیں بن رہا.....“
 ”ابھی نہیں.....“ نواز نے فیصلہ کن انداز میں کہا ”دونوں بچیاں بی بی اے کر لیں۔ تب تک
 شہباز بھی فارغ ہو جائے گا..... پھر انشاء اللہ دھوم دھام سے یہ فریضے ادا ہوں گے.....“
 آغا بی بی نے سر ہلایا..... پھر مسکرا کر بولیں ”تم نہیں چاہتے کہ یہ خوشیاں میں بھی دیکھوں“
 ”کیوں آغا بی بی“ وہ دونوں جلدی سے بولے۔
 ”عمر کے اس حصے میں ہوں کیا خبر کس وقت آنکھیں بند ہو جائیں..... اور.....“
 ”اللہ نہ کرے۔ آغا بی بی جانے“ نواز نے ماں کی گردن میں بازو ڈال دیا..... ریشمینے
 بھی جلدی سے بولی ”خدا آپ کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ رکھے آغا بی بی.....“
 ”آغا بی بی جانے“ نواز نے ماں کے گال سے گال لگا کر کہا ”آپ نے تو ابھی ان بچوں کے
 بچوں کی بھی خوشیاں دیکھنی ہیں.....“

”جیتے رہو..... خدا خوشیوں اور رحمتوں سے نوازے تم سب کو“ آغا بی بی نے دعائیں دیں۔
 بچوں کی شادیاں اکٹھے ہی ہونا طے پائیں نواز خان نے دلائل سے آغا بی بی کو قائل کر ہی لیا۔
 ہفتہ بھر بعد آغا بی بی گاؤں گئیں۔ تو انہوں نے نواز خان اور ریشمینے سے طے کیا ہوا
 پروگرام ان کے گوش گزار کر دیا..... سارے دلائل پیش کئے۔ صبور خان کے بھی بات دل لگی۔ لیکن تمکینے کو
 اچھا نہیں لگایہ پروگرام۔

”ابھی سالوں انتظار کرنا پڑے گا“ تمکینے نے ناخوش ہو کر کہا۔

”ایک طرح سے ٹھیک ہی کہتے ہیں نواز اور ریشمینے.....“ صبور خان بولے۔ ”لڑکیاں

تعلیم مکمل کر ہی لیں تو اچھا ہے۔ ابھی دونوں ہی نا سمجھ بچیاں ہیں۔ ذرا سوجھ بوجھ آ لے تو اچھا ہی ہے..... میرا دل
 بھی تو زری کو ابھی سے جدا کرنے کو نہیں چاہے گا..... آزادی کے دن جتنے زیادہ جی لیں اچھا ہے.....“
 ”شادی کے بعد کون سا پابندیاں لگ جائیں گی“ تمکینے بولی۔
 ”ذمہ داریاں تو سر آن پڑتی ہیں نا.....“ صبور بولے۔
 ”تمکینے بی بی“ آغا بی بی نے مسکرا کر تمکینے سے کہا ”تم جو چاہو کرو۔ نواز ابھی شادی
 کرنے والا نہیں ہے“

”ضدی ہے ان کی.....“

”اور اس کی ضد کو تم بھی جانتی ہو.....“

”بدلے کی شادیوں کو بالکل ہی بدلے کی شادیاں بنانا چاہتے ہیں..... ایک کا ہاتھ دیں اور
 دوسری کا پکڑ لیں.....“
 ”نہیں تمکینے..... ایسی کوئی سوچ نہیں ہے نواز کے ذہن میں..... وہ بچیوں..... کی عمروں کے
 حساب سے ایسا کرتا ہے۔“

تمکینے چپ ہو گئی.....

آغا بی بی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دبا دیا..... ”فیصلہ ہو گیا ہے اسے اب قبول کر ہی
 لو..... وقت گزرتے پتہ بھی نہیں چلے گا.....“
 تمکینے نے کوئی جواب نہیں دیا..... وہ اٹھ کر چل دی..... تو صبور خان نے مسکرا کر ماں سے کہا
 ”اسے سو گھر لانے کا جنون کی حد تک شوق ہے آغا بی بی.....“
 ”اللہ وہ وقت بھی لے آئے گا میرے بچے..... دیر سویر اسی کے ہاتھ میں ہے.....“
 ماں بیٹا کچھ دیر بیکو باتیں کرتے رہے.....

شہباز کچھ اداس ساہور ہاتھا..... نیا شرعی جگہ نئے لوگ تھے..... ان میں ساتے، جذب ہوتے وقت لگتا ہی تھا..... ہوشل کے دو تین لڑکے دوست بن گئے تھے..... دو چار کلاس فیلو بھی بے تکلف ہو چکے تھے۔ ان کے ساتھ شہباز نے لاہور کی سیر بھی کی تھی۔ دو تین دفعہ ان کے گھر میں گیا تھا..... پھر بھی کچھ اکڑا اکڑا سا رہتا تھا..... گھر یاد آتا..... گھر والے یاد آتے..... زری یاد آتی..... اور تو اور اسے تو اب خان بابا کی بھی یاد بہت ستاتی تھی..... وہ اپنے دوستوں سے اکثر انہی کی باتیں کیا کرتا۔

”جب میں گھر پہ تھا..... تو بابا سے کڑا نا پھر تا تھا۔ ان کے وعظ و نصیحت سے تنگ آچا یا کرتا تھا۔ ان کی پابندیوں سے بغاوت کرنے کی سوچا کرتا تھا۔ لیکن اب..... اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ کچھ کرتے تھے جو کچھ کہتے تھے۔ میرے بھلے ہی کیلئے تھا.....“

”یار اب تم بچہ تو ہو نہیں..... گھر والوں کو یوں یاد کر کر کے پریشان ہوتے رہے تو پڑھو گے کیسے.....“ کوئی دوست کہتا.....

”پڑھوں گا تو ضرور..... لیکن دل لگتے لگتے ہی لگے گا“

”یہ لاہور ہے میرے یار..... یہاں دل نہ لگنے والی کوئی بات نہیں..... یہاں زندگی ہے شاد و فحشاں زندگی..... ہر آنے والے کا بائیس پھیلا کر خیر مقدم کرتی ہے.....“

شہباز مسکرا دیتا.....

دوست اس کی دلجوئی کرتے ایک دن عثمان نے کہا ”اپنے آپ کو زندگی کے پھیلے بازوؤں کے حوالے کر دو..... پھر دیکھو یہ تمہیں نشاط کے کتنے خوبصورت لمحے فراہم کرتی ہے۔ فارغ اوقات میں کوئی کھیل کھیلو..... تفریح کے لئے جیتی جاگتی ہنسی مسکراتی سرکوں پر نکل جایا کرو..... ساری اداسی ختم ہو جائے گی.....“

”یہ سب آزمایا ہے..... ٹیبل ٹینس کھیلتا ہوں۔ اور شام کو میر کے لئے بھی چلا جاتا ہوں.....“

ریسٹورانوں اور ہوٹلوں میں بھی جا چکا ہوں.....“

”پھر بھی اداسی دور نہیں ہوئی.....“

”یہی محسوس کرتا ہوں.....“

”تو پھر گھر کا پتہ لگا آؤ.....“

”چھٹیاں ہیں گی تو جاسکوں گا نا“

”ایک چھٹی میں بھی تو جاسکتے ہو..... ایک دن جاؤ دوسرے دن لوٹ آؤ.....“

”کیسے“ بارہ گھنٹے آنے میں لگتے ہیں بارہ جانے میں..... باقی کیا بچے گا.....“

”حد ہو گئی یار..... میں تمہیں اتنا کوڑھ مغز تو نہیں سمجھتا تھا۔ اتنے لمبے چوڑے ہو پر مغز کا خانہ

خالی لگتا ہے.....“

”کیوں“

”پشاور صرف ٹرین ہی جاتی آتی ہے؟ جس میں بارہ گھنٹے آنے اور بارہ گھنٹے جانے میں لگتے

ہیں.....“

”ہوں“

”امیر بابا کے امیر بیٹے ہو۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ جو ٹرین کی بجائے پلین میں جایا آیا کرو.....“

”گڈ.....“

”آئی بات سمجھ میں“

”بالکل.....“

”جعرات کو چار بجے کی فلائٹ سے پشاور جاؤ..... اور جمعہ کو شام کی کسی فلائٹ سے واپس

آ جاؤ..... کیا سمجھے.....؟“

”سمجھ گیا.....“

”راہ دکھائی تا میں نے“

”اچھے دوست اسی لئے تو ہوتے ہیں.....“

”دوستی کبھی.....“

”بالکل.....“

”جانا چاہو گے اس جعرات کو.....“

”ہاں۔ دل چاہ رہا ہے“

”میں نکٹ لا دوں گا۔۔۔۔۔“

”میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔۔۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔ کل چلیں گے۔۔۔۔۔ بہتر ہو گا واپسی کی بھی بنوالیں نکٹ۔۔۔۔۔“

”ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔۔۔۔۔“

اگلے دن عثمان ابو کی گاڑی لے آیا۔ چھٹی کے بعد وہ شہباز کو ساتھ لے گیا۔ دونوں نے اس دن چائیز میں کھانا کھایا۔ شہباز نے پہلی بار کسی چینی ریستورانٹ میں کھانا کھایا تھا۔ کچا کپکا گوشت کھانے والے شہباز کو یہ کھانے بالکل ہی پسند نہ آئے۔ صرف ہاٹ اینڈ سار سوپ اچھا لگا۔

دونوں ریستورانٹ سے باہر نکلے تو شہباز نے منہ بنا کر کہا ”یار پیسے ہی ضائع کئے“

”کیوں۔۔۔۔۔ اچھے نہیں لگے چائیز کھانے۔۔۔۔۔ سب سے اچھا چائیز ریستورانٹ ہے یہ“

”ہو گا۔۔۔۔۔“

”نیکٹ ڈو بیلپ ہو جائے گا آتے جاتے رہو گے تو۔۔۔۔۔“

”میں مت آیا پھر یہاں۔۔۔۔۔“

”بار بار آؤ گے“

”نہیں یار۔۔۔۔۔ مجھے بالکل نہیں بھائیں یہ چائیز ڈشز۔۔۔۔۔ اس سے تو اچھا تھا۔۔۔۔۔ کسی کباب سے نان کباب لے کر کھالیتے۔۔۔۔۔“

عثمان اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولا۔۔۔۔۔ ”خڈگ آدمی ہوتا۔۔۔۔۔ پٹھانوں کے متعلق ٹھیک ہی سنا تھا۔۔۔۔۔ نفاست نزاکت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔۔۔۔۔ چپل کباب اور پورا پورا دنبہ کچے کچے روشت کی صورت کھانے والے کو بھلا یہ نفیس ڈشیں کیا بھائیں!“

شہباز نے ہنس کر عثمان کا کان پکڑ کر کھینچا اور بولا۔۔۔۔۔ ”کبھی کھاؤ نا ہمارے ہاں کے چپل کباب اور روشتیڈ دنبہ۔۔۔۔۔ بھول جائیں یہ ساری چائیز ڈشیں ڈشیں۔۔۔۔۔“

عثمان کان چھڑاتے ہوئے مسکرا کر بولا۔۔۔۔۔ ”دوستی قائم رہی تو چکر لگائیں گے کبھی پٹاور کا ہم بھی۔۔۔۔۔“

”پٹھان نے دوستی کی ہے پنجابی یار۔۔۔۔۔ یہ دوستی ٹوٹنے کے لئے نہیں ہوتی۔ پٹھان اپنی بات کا پکا ہوتا ہے۔ جان چلی جائے بات نہ جائے۔۔۔۔۔ یہ اس کا اصول ہے“

عثمان نے شہباز کے ہاتھ پر ہنستے ہوئے ہاتھ مارا۔۔۔۔۔ دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔۔۔۔۔

عثمان بولا ”خلوص میں پنجابی بھی کسی سے کم نہیں ہوتا دوست۔۔۔۔۔ یہ دوستی عمر بھر نبھے گی“

”انشاء اللہ“ شہباز نے عثمان کا ہاتھ زور سے دبایا۔۔۔۔۔

عثمان نے جلدی سے ہاتھ چھڑا کر جھٹکتے ہوئے کہا ”یہ زور آزمائی نہیں چلے گی۔ ہڈیاں توڑ

ڈالیں۔۔۔۔۔“

شہباز ہنستے ہوئے اس سے لپٹ گیا۔

شہباز نے جتنے لڑکوں سے دوستی کی تھی ان میں سے عثمان ہی اس کے زیادہ قریب آیا تھا۔

عثمان لاہور ہی کا رہنے والا تھا۔۔۔۔۔ ایک پڑھی لکھی متوسط فیملی سے تعلق تھا۔ والد ڈائریکٹر آف ہیلتھ تھے ماں

کالج میں پروفیسر تھیں۔ بڑا بھائی ایم بی اے تھا۔ درمیان والا یو کے میں ایف آر سی ایس کر رہا تھا۔ بسن

ایک ہی تھی۔ جس کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنے پروفیسر میاں کے ساتھ یو ایس اے میں تھی۔ وہ سب سے چھوٹا

تھا۔ اور انجینئرنگ میں اس سال داخلہ لیا تھا۔ تعلیمی ریکارڈ کے ساتھ ساتھ اخلاقی ریکارڈ بھی بہت اچھا تھا۔ وہ

دبلا پتلا درمیانے قد کا لڑکا تھا۔۔۔۔۔ شکل و صورت واجبی سی تھی۔ لیکن ذہانت اور شرافت کا استخراج اسے دوسرے

لڑکوں سے منفرد کرتا تھا۔

شہباز دراز قد خوبصورت اور بھرے بھرے جسم والا پٹھان نوجوان تھا۔ دونوں کی دوستی

دوسرے لڑکوں کو بے ربطی سی لگتی تھی۔۔۔۔۔ قد کاٹھ کی ناموزونیت پر وہ اکثر دونوں پر آوازے کسارتے تھے۔۔۔۔۔

لیکن دونوں ہی اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔۔۔۔۔

ریستورانٹ سے نکل کر دونوں گاڑی میں آ بیٹھے تھے۔ شہباز کو ابھی تک منہ بد مزہ لگ رہا

تھا۔۔۔۔۔ جبکہ عثمان چائیز کھانوں کا ذائقہ اب بھی لے رہا تھا۔

”چلو اب۔۔۔۔۔ شہباز بولا۔

”کہاں“

”نکٹ لینے“

”لے لیں گے یار۔ ذرا گھوم پھر تولیں۔ آج تو گاڑی ہاتھ آئی ہے۔ ابا گاڑی دیتے کہاں

ہیں۔۔۔۔۔“ اس نے گاڑی سٹارٹ کی۔

شہباز نے حیرانگی سے عثمان کی طرف دیکھ کر پوچھا ”کیوں؟“

”بھئی۔ سٹوڈنٹ لائف میں اتنی سولتیں کوئی ماں باپ بھی نہیں دیتا۔۔۔۔۔ ان کا خیال ہے

گاڑی دے دی تو صاحب زادے پڑھائی کو خیر یاد کہہ کر سڑکوں پر آوارہ گردی کرتے پھریں گے“

”لیکن۔۔۔۔۔“

”کیا؟“

”میرے بابا تو اس کے الٹ ہوئے“

”کیسے؟“

”ارے بھئی وہ تو میرے لئے یہاں بنگلہ خریدنے کے پکر میں ہیں۔ گاڑی بھی ضروری سمجھتے

ہیں.....“

”اوں ہوں ہوں..... ہوں.....“

”کیوں“

”میں انکل سے کہوں گا ایسی غلطی کبھی نہ کریں“

”غلطی؟“

”تو اور کیا.....“

”پورا بنگلہ نواب صاحب کے ڈسپوزل پر ہو گا۔ تو کیا کیا گل نہیں کھلائیں گے..... دوستوں کے جھگڑے ہوں گے محفلیں جمیں گی..... پھر بے لیاہن نکلیں گی.....“

”چل ہٹ“ شہباز نے ہنس کر کہا ”سیلیوں کے لئے اس طرف کوئی گنجائش نہیں.....“

”کننے کی باتیں ہیں.....“

”کبھی ممکن ہی نہیں.....“

”اس لئے کہ تمہاری متغنی ہو چکی ہے“

”صرف متغنی ہی نہیں..... وہ میری زندگی ہے کائنات ہے“

”واہ..... واہ.....“

”مذاق نہیں عثمان..... اور یہ میں اسی محسوس کر رہا ہوں نا..... اور پشاور جانے کے لئے بے تاب ہو رہا ہوں نا..... تو سمجھو کہ زیادہ اسی کے لئے ہوں.....“

”ہماری ہونے والی بھالی کاتعارف تم نے پہلے بھی کروایا تو تھا۔ لیکن مجھے پتہ نہیں تھا۔ کہ معاملہ یہاں تک پہنچا ہوا ہے.....“

”بس تم نہیں جان سکتے عثمان کہ وہ میرے لئے کیا ہے.....“ شہباز نے آنکھیں بند کر کے سیٹ کی پشت پر سر رکھ دیا.....

عثمان خاموشی سے گاڑی چلائے لگا۔

کلٹ خرید کر عثمان شہباز کو گھر لے گیا..... اس کی می ابھی کالج سے نہیں آئی تھیں۔ اس

کے ابو سے ملاقات ہوئی۔ وہ خاصے کیم و سٹیم اور ہنس مکھ آدمی تھے۔ لیکن بیٹے کے ساتھ ان کا رویہ بھی خان بابائی کا سا تھا..... کچھ زیادہ بے تکلف نہیں تھے عثمان سے۔

چائے پی کر عثمان شہباز کو ہوشل چھوڑ گیا.....

”پرسوں آ جاؤں انرپورٹ پر“ عثمان نے واپس ہونے سے پہلے پوچھا۔ ”کل تو چلے جاؤ گے نا

خود ہی“

”ہاں..... تم تکلف نہ کرو..... واپس بھی خود ہی آ جاؤں گا..... دوبارہ انکل سے گاڑی

مانگی..... تو خیر نہیں ہوگی.....“

عثمان ہنس پڑا..... پھر بولا..... ”خیر اب ابواتنے بھی سخت گیر نہیں ہیں۔ کام کے لئے گاڑی

وے ہی دیتے ہیں.....“

عثمان واپس چلا گیا..... اور شہباز اپنے کمرے میں آ گیا..... جہاں اس کا ملتان روم میٹ اپنے

دوست شفیع سے گپ شپ لگانے میں مصروف تھا۔

دونوں نے شہباز کا خیر مقدم کیا..... شہباز نے دونوں سے ہاتھ ملائے۔

”کہاں غائب تھے.....“ صفدر نے پوچھا۔

”کلٹ لینے گیا تھا۔ کل چار بجے کی فلائیٹ سے گھر جا رہا ہوں“

”خیریت“

”بس ایسے ہی۔ دل چاہ رہا تھا..... پرسوں واپس آؤں گا.....“

”کیا کہنے دانشمندیوں کے۔ ہم تو تین تین چار چار چھٹیوں میں بھی گھر نہیں جاتے۔ کہ خواہ

خواہ کا خرچہ ہو گا.....“

شہباز نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔ اور جیکٹ اتار کر بیڈ پر ڈال دی۔

دوسری شام

وہ بنا اطلاع کے پشاور پہنچ چکا تھا۔ انرپورٹ سے بھی گھر فون نہیں کیا۔ رکشہ لیا اور گھر کی راہ

لی۔ وہ سب کو سر پر اتر دینا چاہتا تھا۔

یہ واقعی سر پر اترتا تھا۔ شہنو اور زری برآمدے ہی میں کھڑی تھیں۔ زری نے آج گاؤں جانا

تھا۔ لیکن زرگل اپنے کسی کام کے سلسلے میں بازار گیا ہوا تھا اور ابھی تک نہ لوٹا تھا۔ اپنے ٹریکٹر کے کسی پرزے

کے لئے سرگزداں تھا..... زری اور شہنو برآمدے میں کھڑی تھیں۔ زری کا بیک قریب ہی فرش پر رکھا تھا.....

رکشے کی آواز گودوں نے گیٹ کی طرف دیکھا..... رکشے میں بیٹھنے والا نظر نہ آیا.....

رکشاکچھ دور ہی رکھا۔

اور

جب

اس میں سے شہباز کو دیکھ کر حیرانی سے چلائی.....
تو شہنو نے تو اک زوردار خوشی سے بھرپور چیخ ماری.....

زری بھی شہباز کو دیکھ کر حیرانی سے چلائی.....
رکٹے والے کو پیسے دے کر شہباز نے بیگ نکالا ہی تھا۔ کہ شہنو اس سے لپٹ گئی۔
”ہائے شہباز لالہ..... آپ..... کیسے آئے کب آئے..... کس طرح آئے۔“
اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ شہباز نے اسے ساتھ لگالیا..... چند لمحے دوڑوں کھڑے رہے۔
پھر شہباز نے اس کے بالوں پر بوسہ دیا..... ”پڑیل تجھ سے اداس ہو گیا تھا۔ لڑائی جو نہیں
ہوئی تھی..... بھاگا چلا آیا.....“

”لڑنے؟“ شہنو نے اس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈالے ڈالے پوچھا۔
”نہیں..... تم سے ملنے.....“ اس نے کہا..... اور بیگ وہیں چھوڑ کر آمدے کی طرف لپکا
جہاں زری ابھی تک ششدر سی کھڑی تھی.....
”سلام نہ دعا..... یہ کیا بد تمیزی ہے۔“ اس نے برآمدے کی میز پر قدم رکھتے ہوئے
کہا..... شہنو نوکر کو آواز دے رہی تھی..... کہ شہباز کا بیگ اٹھا کر لے جائے۔
زری لجاتے ہوئے بولی ”میں تو ابھی تک یقین ہی نہیں کر پائی..... کہ آپ..... آپ ہی
ہیں.....“

”چھو کر دیکھ لو“ شہباز نے شوخی سے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تو وہ لجا کر گھبرا کر پیچھے ہٹ
گئی..... اس کا چہرہ گلابی ہو گیا تھا اور آنکھوں میں ستارے لٹکارے مارے تھے۔
”مارڈر الا ظالم“ شہباز شوخ ہوا جا رہا تھا..... ”شکر ہے تم نہیں ہو..... آج جمعرات تھی نا.....
سوچ رہا تھا..... تم گاؤں جا چکی ہو گی.....“

”جانی رہی ہوں..... زر گل لالہ بازار گئے ہیں آتے ہی ہوں گے.....“
”اب کون جانے دے گا جناب“ وہ اس کے سامنے آکر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے

بولاً۔

”میں اتنے پیسے خرچ کر کے صرف ایک دن کے لئے آیا کس کے لئے ہوں.....“
زری اور لالہ ہو گئی۔ اس کے کانوں کی لوئیں دہکنے لگیں.....

”کیا کہہ رہے ہیں شہباز لالہ“ شہنو پشت پر آتے ہوئے بولی۔
”اس سے کہہ رہا ہوں اتنی موٹی ہوتی جا رہی ہے۔ بالکل گول گہ بن گئی ہے.....“ شہباز نیم
بار نظروں سے شرمانی لپائی زری کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”نظر نہ لگا دیجئے گا..... چلیں اندر..... بی بی گل تو یقین ہی نہ کریں گی..... ویسے لالہ ہم سب
آپ سے بہت اداس ہو گئے تھے.....“

”اچھا کیا نا آگیا ہوں.....“

”بہت اچھا کیا.....“

”خان بابا ناراض تو نہیں ہوں گے“ اس نے ہنس کر کہا۔ تو شہنو اس کے بازو میں بازو
ڈالتے ہوئے بولی ”وہ تو آپ سے سب سے زیادہ اداس تھے.....“
”واقعی“

”ہاں.....“

”اور تم“

”میں بھی تھی.....“

”اور یہ.....“ اس نے زری کی طرف اشارہ کیا۔

”انہی سے پوچھ لیجئے گا.....“ شہنو شوخی سے آنکھیں نہچاتے ہوئے بولی ”میں تو اتنا ہی بتا
سکتی ہوں..... کہ.....“

اس نے رک کر شریر نگاہوں سے زری کو دیکھا۔ زری پر خوبصورت سی گھبراہٹ مسلط ہو گئی
اس نے جلدی سے کہا ”شہنو..... کوئی بکواس نہیں کرنا.....“

”بتاؤ نا.....“ شہباز دونوں کے درمیان کھڑا تھا.....

شہنو ہنس کر بولی ”چلئے معاف کیا زری کو..... ویسے شہباز لالہ آج زری گاؤں جانا نہیں
چاہ رہی تھی..... شاید اس لئے..... کہ آپ نے آنا تھا.....“

”تمہیں کیا پتہ تھا..... کہ میں آ رہا ہوں“ شہباز نے زری کے حسین سراپا پر پیار سے نگاہ
ڈالی.....

زری نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا..... یہ خاموش نگاہیں بول رہی تھیں۔ بتا رہی تھیں۔ کہ دل
کے معاملے کیا ہوتے ہیں..... چھٹی حس خبر داری کیسے کرتی ہے..... اور آنے والے مسرور لمحوں کا سرور کیسے
وقت سے پہلے ہی حواس پر چھا جاتا ہے۔

شہباز کے آنے سے گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ بی بی گل خان بابا بھی خوش تھے۔ نوکر چاکر خدمتگار سب ہی تین مینوں میں اس سے بے طرح اداس ہو گئے تھے۔

شہباز نے زر گل اور زری کو گاؤں جانے نہیں دیا۔ چار سہ ڈاکٹر کے ہاں فون کر دیا گیا کہ وہ گاؤں پیغام بھجوادے۔ زر گل اور زری آج گاؤں نہیں جا رہے تھے۔

چاروں رات گئے تک باتوں میں مصروف رہے۔ شہباز لاہور کی باتیں بڑی تفصیل سے ان سب کو سنارہا تھا..... چٹائی زبان کے کئی الفاظ سیکھ کر آیا تھا..... وہ استعمال کر کے ان کو ان کے معنی بھی سمجھا رہا تھا..... پشاور اور لاہور پاکستان ہی کے علاقے ہیں۔ لیکن تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے دونوں میں خاصہ بعد ہے۔ شہباز کو وہاں کی کچھ باتیں بہت اچھی لگی تھیں۔ کچھ بالکل پسند نہ آئی تھیں..... وہ بڑے جذباتی انداز میں پسند و ناپسند کا ذکر کر رہا تھا۔

زر گل اس کی باتیں سنتے ہوئے زیر لب مسکرائے جا رہا تھا۔ وہ خود بھی چار سال پنجاب میں رہ کر آیا تھا..... لیکن اتنا مرعوب و متاثر نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی ناپسندیدگی کے جذبات بڑھائے تھے..... شہباز دو حدوں میں خاصہ بے چین تھا..... کچھ زیادہ ہی متاثر لگتا تھا۔

زر گل نے اس کی باتیں سنتے ہوئے کہا ”شہباز تم تعلیم حاصل کرنے وہاں گئے ہو۔ میری طرح۔ تم بھی اپنے کام سے کام رکھو..... اتنے تجربے کئے تو پڑھائی بھول جاؤ گے.....“

”نہیں زر گل..... یہ بات نہیں۔ لاہور جگہ ہی ایسی ہے۔ ایک بات ضرور ہے۔ کہ وہاں گھٹن نہیں ہے۔ بڑی حد تک لوگوں کو آزاد ماحول میسر آتا ہے۔“

”تم بھی تو وہاں مادر پدر آزاد ہو.....“ زر گل نے ہنس کر کہا۔

شہباز نے منہ بنایا آنکھیں گھمائیں اور مسخرانہ انداز میں بولا..... ”خاک آزاد ہوں۔ خان بابا کا خوف تو رگ رگ میں اس طرح دھنس چکا ہے۔ کہ وہاں بھی اس سے فرار نہیں ملتا۔ سچی بات ہے“

”اچھی بات ہے“ شہنو بولی..... ”یہ خوف دھنسا رہتا ہی چاہئے..... ورنہ آپ شہباز لالہ۔ آپ ماحول کی آزادی کا ناجائز فائدہ اٹھانے لگتے.....“

”ویسے وہ ماحول اور فضا اچھے لگتے ہیں مجھے.....“ شہباز نے دزدیدہ نظروں سے زری کو دیکھا۔

زری ہلکی جھپکا کر رہ گئی.....

دیر تک چاروں باتیں کرتے رہے۔

(۳۷)

دونوں کالج سے آتے ہی اپنے اپنے کمروں میں گھس گئیں۔ یونیفارم بدل کر گھر والے کپڑے پہن کر شہنو نے زری کو آواز دی۔

”آؤ بھئی..... بھوک لگی ہے۔ کھانا کھالیں.....“

زری نے مرل سی آواز میں کہا ”تم چلو میں آتی ہوں“

زری بھی کپڑے بدل کر کھانے کے کمرے میں آگئی۔ خاناماں نے کھانا میز پر لگا دیا تھا..... شہزاد گئی پانی کا جگ لئے آگئی.....

ایک دم ہی دونوں کو گھر میں کچھ سنگین سی خاموشی کا احساس ہوا..... بی بی گل توکل کی تہ کاں بالا گئی ہوئی تھیں..... لیکن نوکر چاکر تھے۔ پھر یہ من کے اندر اترتی خاموشی کیسی؟

زری نے شہزاد گئی سے پوچھا ”کیا بات ہے بڑی خاموشی ہے گھر میں“

”بی بی گل جو نہیں ہیں“ شہنو بولی۔

شہزاد گئی نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا پھر دھیسے لہجے میں بولی ”بی بی گل صبح آگئی تھیں“

”آگئی تھیں؟“

”جی“

”کہاں ہیں.....“

”آپ کھانا کھالیں جی.....“

”کیا بات ہے شہزاد گئی“ زری نے توڑا ہوا نوالہ پلیٹ میں رکھ دیا.....

”کیا ہوا.....“ شہنو نے بھی سالن کے ڈونگے سے سالن نکالتے ہاتھ روک کر پوچھا۔

”بی بی آپ دونوں کھانا کھائیں.....“

”ترورے.....“ شہنو نے کہا..... ”بی بی گل کہاں ہیں۔ انہوں نے تو کل آنا تھا خان ماما تو ٹھیک ہیں نا.....“

”جی.....“

”کیا بات ہے“

”وہ جی آپ کھانا کھالیں تو بتاتی ہوں۔“

دونوں میز سے پرے ہٹ کر کسی کی پشت سے ٹیک لگا کر شہزاد گئی کو تکتے لگیں۔ زری کی تو پہلے ہی بھوک اڑی ہوئی تھی۔ صبح ہی سے کچھ گھبراہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے کہا ”کیا ہوا.....“

”جی وہ زرگل خان.....“

”کیا ہوا.....“ دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا..... زری ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی اور شہنو بیدم سی کرسی میں بڑی رہی.....

”بتاؤ نازر گل لالہ..... کو کیا ہوا.....“ زری بے اختیارانہ شہزاد گئی کی طرف بڑھی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اور چہرے کی سرخ و سپید رنگت پہلی پڑ گئی تھی۔

شہنو کے ہونٹ بھی سپید پڑ گئے تھے۔

”وہ..... جی..... وہ ٹریکٹر سے گر پڑے ہیں..... ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ ہسپتال میں داخل کیا ہے۔ سب ہسپتال میں ہیں.....“

زری کی آنکھوں میں اندھیرا اتر آیا..... وہ تیورائی اور کرسی کی پشت کو پکڑنے کی کوشش کرتے گر گئی..... شہزاد گئی نے لپک کر اسے تھانے کی کوشش کی..... لیکن شہنو کسے سننے کی آواز سن کر اس کی طرف دوڑی۔

دونوں لڑکیوں کو سنبھالنا مشکل ہو گیا اس نے مدد کے لئے دوسری خدمت گاروں کو آوازیں

دیں۔

”سلطان مورے“

”زرمینہ.....“

”ابنی جان.....“

اس کی آواز سن کر سلطان کی ماں سب سے پہلے آئی.....

”یہ کیا؟“

زرگل خان کا سن کر دونوں ہی..... ”شہزاد گئی نے ہاتھ ہلائے۔ زرمینہ، ابنی جان اور

سرداری بھی آگئیں۔

سلطان کی ماں نے زری کو ہلایا۔ اس کا سراونچا کر کے گھٹنے پر رکھا اور سینے پر ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔ بچیا..... خیر ہے..... چھوٹا خان ٹھیک ہے۔ ہوش میں ہے۔ اتنی.....“

زری اٹھ بیٹھی روتے ہوئے بولی ”مجھے کالج میں کیوں اطلاع نہیں دی..... زرگل لالہ کے پاس لے چلو مجھے..... والی زرگل لالہ.....“

وہ بے اختیار ہو کر رونے لگی۔ شہنو بھی رو رہی تھی۔

”تھوڑا سا کھانا کھالو.....“ شہزاد گئی نے دونوں کو چپ کراتے ہوئے کہا..... ”بی بی گل جان نے اسی لئے کہا تھا۔ کہ کھانا کھانے کے بعد بتاؤں آپ کو.....“

”نہیں کھانا مجھے.....“ زری نے دوپٹے سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا..... ”شہنو چلو ہسپتال چلیں..... میرا دل بیٹھا جا رہا ہے..... میرے زرگل لالہ.....“

دونوں لپٹ کر رونے لگیں.....

خدمت گاروں نے بمشکل انہیں چپ کرایا.....

سلطان مورے بولی ”جا کر ہاتھ منہ دھو لو..... اسی طرح ہسپتال گئیں۔ تو سب پریشان ہوں گے خدا نے خیر کی ہے..... جان بچ گئی ہے..... پانچہ الجھ گیا تھا..... گر پڑے..... خدا خیر کرے گا..... ٹھیک ہو جائیں گے.....“

”ہاں بی بی.....“ زرمینہ نے بھی کہا ”چل کر ہاتھ منہ دھولیں..... اس طرح روتے دھوتے وہاں گئیں تو..... خان پریشان ہوں گے.....“

ابنی جان بولی ”ابھی ابھی زرین خان آیا ہے۔ خان کو ہوش ہے اب..... آپریشن ہو گیا ہے۔“

زری کا دل بیٹھا جا رہا تھا..... زرمینہ اسے سارا دے کر کمرے میں لے گئی..... شہزاد گئی نے شہنو کو اس کے کمرے میں پہنچایا۔ منت سماجت کرنے کے باوجود بھی دونوں لڑکیوں نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد زری اور شہنو اپنی پھولدار چادریں اوڑھے برآمدے میں تھیں۔ جہاں ڈرائیور گاڑی لے آیا تھا۔ شہزاد گئی گاڑی میں بیٹھی تھی۔

دونوں گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ زری تو بالکل کم صم تھی۔ شہنو نے ڈرائیور سے پوچھا۔

”خان علی کا کا..... زرگل اب کیسے ہیں.....“

”زرین خان ابھی ہسپتال سے آیا ہے جی..... کتابے اب ہوش میں ہیں۔ آپریشن ہو گیا ہے۔
بڑی دو جگہ سے ٹوٹی ہے۔“

زری نے ایک بے آوازی سسکی لی۔ شہنو بھی اندر دنی کرب سے بلبل اٹھی۔
”وہ..... وہ گرے کیسے؟“

”خبر نہیں لی بی..... کہتے ہیں چپل میں پانچہ الجھ گیا..... چلتے ٹریکٹر سے گر پڑے۔“
زری نے آنکھیں بند کر کے سہا تھوں پر گرا دیا۔ لگتا تھا۔ وہ کچھ سننے کی ہمت اور برداشت
نہیں پار ہی.....

وقوفوں سے سوال کرتے راستہ کٹا..... دونوں لڑکیاں بے حد پریشان تھیں۔ خان علی کی
راہنمائی پر ہی وہ اس بلاک تک پہنچیں..... جس میں زرگل کے لئے کمرہ لیا گیا تھا۔ لیڈی ریڈنگ ہو سہیل کی
بولتی بلاک میں کمرہ نمبر دس کے سامنے بیرونی برآمدے میں بہت سے لوگ کھڑے تھے..... صبور خان نواز خان
تمکینے ریشمینے اور آغا بی بی کے علاوہ کئی عزیز رشتہ دار دوست احباب اور خدمت گار اکٹھے اور بکھرے
بکھرے کھڑے تھے۔

لڑکیوں کو آتے دیکھا تو صبور اور نواز جلدی سے ان کی طرف بڑھے..... ریشمینے اور
تمکینے بھی ادھر آگئیں۔

”بابا.....“ زری باپ سے لپٹ کر بے اختیار سی ہو کر رونے لگی..... صبور خان کی آواز گھٹ
گئی۔

”بہن بچے..... بس..... بری بات روتے نہیں.....“ شہنو کو نواز خان نے سینے سے لگا کر
پتھپایا۔

”زری..... میری بچی.....“ تمکینے اپنے آنسو نہ روک سکی۔ ماں بیٹی گھر کر رونے لگیں.....
ریشمینے نے دونوں کو الگ کرتے ہوئے زری کو اپنے ساتھ لپٹا لیا اور تمکینے کے آنسو پونچھتے ہوئے دلا سے
کے انداز میں بولیں ”بھابی..... آپ تو حوصلہ رکھیں..... خدا نے بڑی خیر کی ہے..... آپ جانتی ہیں زری کو.....
اس سے دوسروں کی تکلیف برداشت نہیں ہوتی۔ زرگل تو اس کا جان سے پیارا بھائی ہے..... اسے حوصلہ
دیں..... چپ کرائیں.....“

صبور خان بھی بڑے دلگیر اور افسردہ تھے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولے ”ریشمینے ٹھیک کہہ
رہی ہیں تمکینے.....“

دو ایک بزرگ مرد اور عورتیں بھی اس طرف آگئے..... سب تمکینے، صبور خان اور زری کو تسلی

دے رہے تھے..... شہنو باپ ہی کی چھاتی سے لپٹی کھڑی تھی..... بہت خوف زدہ اور پریشان تھی وہ بھی۔
تمکینے اور زری کو ریشمینے نے ایک بیچ پر بٹھا دیا..... آغا بی بی سین بٹھی تھیں وہ زری کو پیار
کرنے لگیں۔

”میں زرگل لالہ کو دیکھوں گی.....“ زری نے کچھ دیر بعد منہ ہلے ہوئے کہا۔
”وہ اس وقت سو رہے ہیں..... انکشن کا اثر ہے.....“ نواز شہنو کو بازو میں لپٹائے لپٹائے
ادھر آگئے..... شہنو نے روتی آنکھوں سے آغا بی بی کو دیکھا اور سران کے آگے جھکا دیا۔ آغا بی بی نے اس کے
بالوں پر بوسہ دیا۔

”ہوش میں آئے تھے زرگل لالہ“ کچھ دیر بعد زری نے پوچھا۔
”ہاں بیٹا.....“ نواز خان بولے۔
”گرے کس وقت تھے“ شہنو نے پوچھا۔
”صبح مجھے تو دس بجے کے قریب اطلاع ملی..... میں آفس میں نہیں تھا.....“ نواز نے کہا۔
”نوبجے کے قریب تو تھکال میں فون آیا..... میں تو اسی وقت چلی آئی تمہارے ماما کے
ساتھ.....“ ریشمینے نے کہا۔

”گاؤں سے ہسپتال لاتے کافی وقت لگا..... خون بہہ گیا.....“ ایک گاؤں میں رہنے والا
عزیز بولا.....

”غلطی یہ ہوئی۔ کہ پہلے چار سہ ہسپتال نہ لے گئے..... وہاں کچھ ابتدائی مرہم پٹی ہو جاتی تو
شاید اتنا خون نہ بہتا.....“ دوسرا بولا.....

”بس افزاتفری میں کچھ سمجھ نہ پائے..... ہسپتال پہنچانے کے لئے دوڑ پڑے.....“ آغا بی بی
نے سینے پر ہاتھ مارا کچھ دیر مارتے ہی کی باتیں ہوتی رہیں۔

پھر
زری نے کہا ”بابا..... مجھے لالہ کے کمرے تک لے چلیں..... میں دروازے ہی سے ان کو دیکھ
لوں گی“

”اچھا“ صبور کی جگہ نواز بولے ”آؤ میرے ساتھ۔ لیکن ایک شرط ہے۔ رونا دھونا
نہیں.....“

”میں بھی چلوں گی بابا“ شہنو چادر کے کونے سے آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی۔
”آؤ.....“

”نواز خان دونوں کو لے کر کارڈور کی طرف بڑھے۔ ان کے پیچھے پیچھے ریشمینے اور تمکینے بھی چلی آئیں۔

نواز خان نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔

دیوار کے قریب لگے بیڈ پر زرگل چت پڑا تھا۔ فولڈنگ بیڈ کی پائنٹی اوچی تھی۔ اور اس کی ایک ٹانگ پر سفید پٹی بندھی تھی۔ پٹی پر دو ایک جگہ سے خون رس آیا تھا۔ اور سرخ سرخ ستارہ سے دھبے دکھائی دے رہے تھے۔

زرگل کی آنکھیں بند تھیں۔ سرخ و سفید چمکتا دکھتا چہرہ پیلا ہٹ لے ہوئے تھا۔ بیڈ کے قریب سنول پر نرس بیٹھی تھی۔ جو انہیں دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور مودبانہ بولی۔

”سر۔۔۔۔۔ یہ ملاقات کا وقت نہیں ہے“

”میں جانتا ہوں۔۔۔۔۔“

”سینٹ کے لئے ریٹ بہت ضروری ہے۔۔۔۔۔“

”ٹھیک ہے دروازے ہی سے یہ لوگ انہیں ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔“

زری نے گہرا کر زرگل کو دیکھا۔ پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر پیچھے ہٹ گئی۔ مبادیج کی آواز نہ نکل جائے شہنو نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا۔

”بیچیاں خاصی خوف زدہ ہیں۔۔۔۔۔“ نواز خان نے کوریڈور میں آتے ہوئے کہا

”ریشمینے بہتر ہے تم انہیں گھر لے جاؤ۔۔۔۔۔“

”جی اچھا۔۔۔۔۔“ وہ بولی۔

برآمدے میں آکر اس نے زری اور شہنو سے گھر چلنے کے لئے کہا۔ لیکن زری ماں کے کندھے سے لگ گئی۔

”بی بی جان۔۔۔۔۔ میں گھر نہیں جاؤں گی۔۔۔۔۔“

”بیچے۔۔۔۔۔“ نواز خان نے اسے پیار کیا ”شام کو پھر آ جانا۔۔۔۔۔ چار بجے ملاقات کا وقت ہے۔

میں خود تمہیں لے آؤں گا۔۔۔۔۔ اب تو باقی سب لوگ بھی جا رہے ہیں۔ دو چار آدمی یہاں کافی ہیں۔۔۔۔۔ تم کیا کرو گی یہاں۔۔۔۔۔“

”ہاں جاؤ تم۔۔۔۔۔ میں ہوں تا یہاں۔۔۔۔۔ شام کو نواز چاچا تمہیں لے آئیں گے۔۔۔۔۔ شہنو میری

جان تم بھی جاؤ۔۔۔۔۔ شام کو دیکھنے چلی آنا۔۔۔۔۔ ہوں۔۔۔۔۔ ٹھیک۔۔۔۔۔ شاباش جاؤ۔۔۔۔۔“ تمکینے نے دونوں کو پیار کیا۔

ریشمینے نے آغلی بی بی سے بھی گھر چلنے کو کہا۔۔۔۔۔ ”صبح سے آپ اسی طرح بیٹھی ہیں۔ چلے گھر۔ کچھ دیر آرام کر لیں۔۔۔۔۔“

آغلی بی بی سب کے اصرار پر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ریشمینے انہیں سارا دے کر چلنے لگی۔ گھر آکر بھی کسی کو چین تھوڑا ہی ملا۔۔۔۔۔ کسی نے کچھ کھایا یا پیا بھی نہیں تھا۔ ریشمینے نے خانساں سے کھانا گرم کرنے کو کہا۔۔۔۔۔

”ادھر کمرے ہی میں لے آنا۔۔۔۔۔“ اس نے ملازم سے کہا۔

”جی بہتر۔۔۔۔۔“

کھانا گرم کر کے اس نے ٹرائی پر رکھا اور بڑی بی بی کے کمرے ہی میں لے آیا۔

ریشمینے نے زبردستی سب کو تھوڑا تھوڑا کھانا کھلایا۔

”چار بجے ہسپتال جانا ہے“ ریشمینے نے سب سے کہا۔۔۔۔۔ ”اچھا ہو گا آپ سب تھوڑی

دیر کے لئے آرام کر لیں۔۔۔۔۔“

اس نے آغلی بی بی کو بستر میں لٹا دیا۔۔۔۔۔ وہ اب خاصی معمر تھیں۔۔۔۔۔ صحت پہلے ہی گر چکی تھی۔ اس صدمے نے انہیں بالکل نڈھال کر دیا تھا۔۔۔۔۔

شہنو اور زری کو بھی اس نے ان کے کمرے میں بھیج دیا۔۔۔۔۔ دونوں گم سم سی بیٹھی رہیں۔

شام ہسپتال کے کمرے میں زری کا زرگل سے ملنے کا نظارہ دیدنی تھا۔۔۔۔۔ وہ اس کی چھاتی پر سر

رکھے بلک بلک کر رو رہی تھی۔۔۔۔۔ زرگل اس کے سر اور پشت پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے چپ کرانے کی

کوشش کر رہا تھا۔۔۔۔۔ تمکینے آنسو پونچھتے ہوئے اسے کندھے سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

چند قدم پرے شہنو بھی کچھ اسی قسم کے جذباتی دورے گزر رہی تھی۔ آنسو بہانے سے آنسو

چھپانا کس مشکل تھا۔۔۔۔۔ ہونٹوں کے سرے دانتوں سے کاٹتے وہ اپنی آنکھوں میں گھٹاؤ کی طرح امنڈ امنڈ آنے

والے آنسوؤں کو پینے کی کوشش میں ناکام ہوئی جا رہی تھی۔

زری ماں کے کندھے سے لگ کر سکیاں بھرنے لگی۔۔۔۔۔ تو زرگل نے شہنو کی طرف

دیکھا۔۔۔۔۔

شہنو اپنے امنڈتے جذبات پر قابو نہ پاسکی۔ آنکھیں پونچھتے ہوئے وہ کمرے سے تیزی سے

باہر نکل گئی۔

لاہور ہولے ہولے بڑے غیر محسوس طریق سے شہباز کی زندگی اور رویوں پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ وہ پلا بڑھا پٹا اور ہی میں تھا۔ شہری زندگی کے آداب کی باتیں روایتی تھیں۔ ان لوگوں نے شہر میں رہ کر اصول و آداب اپنا کر بھی اپنا ناظم اپنی جڑوں سے نہیں توڑا تھا۔ وہ سوچ و فکر کے لحاظ سے اب بھی وہی تھے جو ان کے آباؤ اجداد تھے۔ جوش جذبہ جرأت بہادری دوستی دشمنی جانثاری وفاداری غیرت، زبان کی آن بھانا جانتے تھے۔ وعدہ ایفا کرنے کے لئے جان بھی جائے تو پرواہ نہ تھی۔ اپنے اخلاقی ضابطے تھے۔ مزاجی رویے تھے۔ اور ان پر سختی سے کاربند رہتے تھے۔

لاہور آکر شہباز نے اک نئی دنیا دیکھی۔ اس دنیا کے رنگ ڈھنگ قطعی مختلف تھے۔ تہذیبی قدس اور روایتیں مختلف نظر آئیں۔ یہ تبدیلی اسے خوشگوار لگی۔ گو کچھ عرصہ وہ اکڑا اکڑا سلا رہا۔ اپنی حدود سے کٹنا آسان نہیں تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ ماحول فضا اور لوگوں کے رویوں سے مانوس ہوتا گیا۔

اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں وہ مادر پدر آزاد تھا۔ وہ باپ کے کڑے اصولوں تلے ڈر اسما زندگی گزارتا رہا تھا۔ رعب و دبدبہ حاوی رہتا۔ اپنی ذات اور شخصیت کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ پھر خان بابا کا شروع ہی سے اس کے ساتھ رویہ غیر مساویانہ سا تھا۔ شہنوں کے مقابلہ میں وہ اسی رویے کی وجہ سے اپنے آپ کو کمتر محسوس کرتا رہتا تھا۔ ماں البتہ بہت پیار کرتی تھی۔ لیکن وہ بھی خان بابا کے کھنے دائروں سے باہر آنے کی جرأت نہ کر سکتی تھیں۔

یہاں وہ آزاد تھا۔ بابا کی گونج گرج تھی۔ نہ بی بی گل کی پوچھ پچھ۔ محافظوں کے شکجے کی گرفت تھی نہ خدمت گاروں کی ہمہ وقت کی جی حضوری۔

گھر میں تھا تو وہ بہن پر لوجھ ہی بوجھ تھے۔

”کہاں سے آرہے ہو“

”وقت پر گھر آیا کرو“

”دوستی صرف کالج تک ہی محدود رکھو۔“

”تمہارا شتر بے ہمار کی طرح پھرنا مجھے پسند نہیں۔“

”تمہیں شہر ضرورت سے زیادہ ہی راس آگیا ہے۔ گاؤں باقاعدگی سے جایا کرو۔ آغا بی بی تم

سے شکی ہیں۔ یہ اچھی بات نہیں۔“

”زر گل جیسا بنو۔ اسے اپنی مٹی سے پیار ہے۔ اپنی تہذیب سے انس ہے۔“

”نشاندہ بازی کی مشق کرتے رہا کرو۔“

ایسی ایسی کئی باتیں تھیں۔ جو گھروالے اس کی بھلائی کے لئے کہتے تھے۔ لیکن اس کے مزاج

پر گراں گزرتی تھیں۔

اب یہاں

وہ ان ساری باتوں سے آزاد تھا۔ وہ اپنی آزاد دنیا میں اپنی مرضی سے جینے لگا تھا۔

کبھی کبھی تو اسے یوں لگتا جیسے اب تک وہ کنوئیں کے مینڈک کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ کنوئیں

سے باہر تو وہ اب آیا تھا۔

وہ بہت خوش رہنے لگا تھا۔ اور اس خوشی نے اس کی صحت پر بہت اچھا اثر ڈالا تھا۔ تو مند تو نا

اور صحت مند تو وہ پہلے بھی تھا۔ لیکن اب بھر پور جوانی نکھار پہ آگئی تھی۔ وہ بہت وجہ اور بڑا ہی کلیل نظر آنے لگا

تھا۔

”بڑے صحت مند ہو“

”کھایا پیا لگتا ہے“

”اتنے پیٹنڈم ہو تم۔“

”قد کاٹھ بھی تو بلا کا ہے“

اس کے ساتھی لڑکے اس سے کہتے۔ وہ تقاریر مسکراتا۔ یونیورسٹی میں لڑکوں کی اکثریت

دھان پان قسم کی تھی۔ دبے پتلے درمیانے قد کے۔ بہت کم پیٹنڈم اور سارٹ تھے۔ لیکن شہباز ان میں

الگ تھلگ تھا۔ اور اپنی جسمانی ساخت، رنگ و روپ اور اٹھنے بیٹھنے سے اپنے خطے کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا۔

شہباز کو خوش قسمتی سے اچھے دوستوں کی صحبت میسر آئی تھی۔ راشد تبسم اور عثمان سے توفیق

اٹری سے دوستی تھی۔ عثمان ان تینوں میں سے قریب تر تھا۔

راشد اور تبسم بھی امیر کبیر گھرانے کے لڑکے تھے۔ لیکن بیکے ہوئے نہیں تھے۔ اکثر شامیں

یہ سب لوگ اکٹھے گزارتے..... شہباز ہوٹل کے کھانوں سے تنگ آجاتا تو ان سب کے ساتھ باہر کسی ایسے ہوٹل میں کھانا کھانے چل دیتا۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی..... اس کا اپنا بینک اکاؤنٹ تھا..... بابائے دونوں بہن بھائیوں کا بینک اکاؤنٹ کھلوار کھاتا تھا..... جس میں ہر سال باقاعدگی سے ان کا حصہ جمع کروا دیا جاتا تھا..... روپے پیسے کے معاملے میں راشد اور تنسیم کو بھی کوئی تنگی نہ تھی۔ ہاں عثمان کے پاس زیادہ پیسے نہیں ہوتے تھے..... وہ ان سب کے ساتھ ہوٹلوں ریستورانوں میں کھانے پینے تو جاتا..... لیکن اپنا حساب یوں بیک کرتا..... کہ اپنی می سے کبھی کبھی ان دوستوں کو گھر پہ دعوت دلاتا.....

اس کے گھر کے ماحول میں اس کی می پیا کے ساتھ کھانا کھانا شہباز کو بہت ہی اچھا لگتا تھا..... اس کی می تو بہت ہی اچھی تھیں۔ پڑھی لکھی حلیم الطبع شائستہ سی خاتون تھیں۔ شہباز کو ان کی صحبت میں بیٹھنا ان کی باتیں سننا بہت ہی پسند تھا۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا..... وہ تجربوں کی بھٹی سے بھی گزری تھیں۔ انہیں اپنے گرد و پیش سے بھی آگئی تھی..... وہ ملکی مسائل بھی جانتی تھیں۔ انہیں دنیا بھر کی سیاست سے واقفیت تھی..... عثمان کی شش جہت خبرداری رکھنے والی می شہباز کو بہت مرعوب و متاثر کرتی تھیں.....

کبھی کبھی

لاشعوری طور پر وہ اس عورت کا موازنہ اپنے ماحول کی پروردہ عورتوں سے کرتا تو بے چین سا ہو جاتا..... اضطرابی کیفیت طاری ہو جاتی۔

”اس کی بی بی گل ایسی کیوں نہیں ہیں“

”تم کینے چاچی اس طرح کیوں نہیں.....“

”کیا زندگی صرف کھانے پینے اورڑھنے پینے کا نام ہے“

”شوہروں کے آگے دم نہ مارنے ان کے حکم پر سر جھکا دینے ان کی غلطی پر بھی سر تسلیم خم

کرنے والی عورتیں..... جانوروں کی طرح جیتی اور مر جاتی ہیں.....“

”زری بھی ایسی ہی عورت بنے گی؟.....“

”نہیں..... اسے ایسی عورت نہیں بننا.....“

”لیکن.....“

وہ اپنی سوجوں میں خود ہی الجھ جاتا..... زری کا ضمیر جس مٹی سے اٹھا تھا۔ اس میں وہی صفات تھیں۔ جوتکینے چاچی اور بی بی گل میں تھیں..... زری تو شہنشاہ سے بھی گئی گزری تھی..... بات کرتے لال ہو جاتی تھی..... شوخ و شنگ نہیں تھی..... چپ چاپ سی لڑکی تھی..... جمیل کے ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح۔ جس میں کبھی کبھار پلچل ہوتی ہے۔

کبھی کبھار

جب آندھیوں کے طوفان اٹھتے ہیں

یا

جب کوئی کشتی اس کا سینہ چیرتے ہوئے نکل جاتی ہے.....

بس.....

جمود

ٹھہراؤ

یہ اس کا مقدر ہوتا ہے.....

شہباز عثمان کی می سے جتنا متاثر ہو رہا تھا..... اتنا ہی اس کا رد عمل زری کی سنجیدگی کی طرف ہو رہا تھا..... وہ لاشعوری طور پر چاہنے لگا تھا..... کہ ٹھہرے پانی میں پلچل بھی رہے۔ جمود ٹوٹ جائے اور شور شرابے کی سی کیفیت جاری و ساری رہے۔

وہ اس تبدیلی کا شدت سے خواہاں تھا..... یہ خواہش دن بدن بڑھ رہی تھی۔ تو مند ہو رہی

تھی.....

وہ ان دو سالوں میں کئی دفعہ پشاور گیا تھا..... زری کے سنگ خوبصورت لمحات گزارے تھے..... وہ قائل بھی ہو جاتا تھا..... کہ زری کی بولتی خاموشی کا اپنا ہی حسن ہے۔ اس کے ٹھہراؤ میں بھی کیف زا اضطراب ہے۔ اس کے جمود میں بھی حسین پلچل ہے.....

لیکن

یہ سب محسوس کرنے کے باوجود وہ لاشعوری طور پر زری میں زبردست انقلابی تبدیلی کا خواہاں

تھا..... جو ناممکن تھی

اور

اس

ناممکنیت کا احساس بھی اسے پوری طرح تھا.....

وہ راشد اور تنسیم کے ہاں بھی کبھی کبھار چلا جاتا تھا۔ ان کی ماؤں سے بھی ملا تھا..... گودوں

گھر کیلو قسم کی عورتیں تھیں..... اور ان میں عثمان کی می جیسی کوئی انفرادیت نہیں تھی.....

پھر بھی

وہ اس کی بی بی گل اور تکینے چاچی سے مختلف تھیں۔ ان کے جینے کے انداز اپنے تھے۔ تنسیم

کی می کو تو اس نے اس کے ڈیڈی کے سامنے تنگ کر سرائھا کر باتیں کرتے دیکھا تھا..... جو بات ٹھیک سمجھتی تھی اسے ہی ٹھیک کہنے والی عورت تھی..... شوہر کی عزت اپنی جگہ لیکن اس نے شوہر کی غلط بات کو کبھی ٹھیک نہیں کہا تھا۔ اس کی یہ جرات اور بے باکی شہباز کو اچھی لگتی تھی..... اپنی بی بی گل تو خان بابا کے سامنے سیدھی بات کہتے ہوئے بھی ڈر کرتی تھیں.....

راشد کے ای ڈیڈی تو اک آئیڈیل جوڑا تھے۔ اس کے ڈیڈی بڑے خوش باش انسان تھے۔ امی بہت ہنس مکھ تھیں..... گھر کا ماحول سدا بہار تھا..... بچوں کے ساتھ ان کا رویہ دوستانہ تھا..... بچے اپنا حق مانگنے کا حق رکھتے تھے۔ ان کے حق کے لئے انہیں ماں باپ نے کبھی ڈانڈا نہیں تھا..... ماں باپ سے بچوں کی بے تکلفی اور دوستی شہباز کو اچھی لگتی تھی.....

شہباز کبھی کبھی اپنے آپ سے الجھنے لگتا..... وہ جو کچھ دیکھتا تھا اسے اپنی ذات کے حوالے سے پرکھتا تھا..... اسے بھی گھر کے ایسے ہی ماحول کی تمنا تھی.....

وہ سوچتا آخر اس کے گھر کا ماحول ایسا کیوں نہیں ہے.....

خوشگوار سی بے تکلفی

دوستانہ ماحول

برابری کا احساس

ذات کا تقدس

ہونے کا احساس

یہ سب اس کے ہاں کیوں نہیں تھا.....

یہ اتفاق ہی کی بات تھی۔ کہ شہباز کی دوستی ہی ایسے لڑکوں کے ساتھ ہوئی تھی..... جن کے گھروں کا ماحول واقعی قابل رشک تھا..... حامد اس کا دوست بننا تو اسے احساس ہوا کہ ٹوٹے بکھرے رشتے جس شخصیت کے نصیب میں ہوں۔ وہ کتنی شکستہ اور کتنی محروم ہوتی ہے..... ندیم دوست بننا تو وہ جان پاتا..... کہ گھر بیوا ماحول کی ناہمواری کس طرح احساس کمتری کو جنم دیتی ہے۔ سیل۔ غالب اسلم۔ فرحان بے شمار لوگ تھے جو ان گنت مسائل سے دوچار تھے۔ کہیں مالی مسائل تھے۔ کہیں ماں باپ کی ان بن تھی۔ کہیں بے انتہا دولت مسئلہ بنی ہوئی تھی۔ کہیں رشتوں ناطوں نے الجھنیں پیدا کر رکھی تھیں۔ یہ لاتعداد لوگ مسائل میں گھرے ہوئے تھے۔ کچھ ڈھب سے زندہ تھے..... مسائل کو زندگی کی زندہ حقیقتیں سمجھ کر گلے لگایا تھا..... کچھ نے یہ تسلیم کر لیا تھا..... کہ مصائب نہ ہوں تو آسائشوں کی پہچان بھی نہ ہو سکے..... بالکل اسی طرح جس طرح اندھیرا نہ ہو تو روشنی کا وجود بھی نہ رہے..... کہ اندھیرے کے دم ہی سے تو روشنی کی پہچان ہوتی ہے۔

دونوں لازم و ملزوم ہیں.....

شہباز کو ایسے لوگوں سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس کی تو اپنی دنیا تھی۔ اس دنیا میں دکھ نہیں تھے تلخیاں نہیں تھیں۔ مالی مسائل نہیں تھے۔ رشتوں کی الجھنیں نہیں تھیں۔ ناطوں کی صحیح پہچان تھی۔ خون کے رشتے عظیم اور مقدس تھے۔ صرف اسے پابندیوں سے کھٹن محسوس ہوتی۔ لگے بندھے اصولی دائروں سے باہر آنے کی خواہش تھی۔ ماں باپ سے دوستانہ بندھن باندھنے کی امنگ تھی۔ پرانی روشوں سے ہٹ کر نئے دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تمنا تھی۔

اپنے گھر کا ماحول وہ راشد تنیم اور عثمان کے گھروں جیسا دیکھنے کا متنی تھا۔ ان گھروں میں ہر فرد کو اپنی مرضی سے جینے کا حق تھا.....

تنیم کی منگنی بھی اپنی خالہ زاد سے ہو چکی تھی۔ وہ اپنی منگیتر کو جہاں چاہتا ساتھ لے جاتا تھا۔ ہو مٹوں میں کھانا کھائے بازاروں میں شاپنگ کرنے اور لمبی سنان سرکوں پر لمبی ڈرائیو کے لئے لے جانے پر کوئی پابندی نہ تھی..... اس کی منگیتر بھی بڑی جاندار قسم کی شے تھی۔ دونوں کتنے بے تکلف تھے۔

شہباز اپنا ناقابل و موازنہ انہیں سے کیا کرتا تھا..... زری کی جھجک، تکلف اور خاموشی اسے کھلنے لگتی..... جوں جوں وہ بڑی ہوتی جا رہی تھی..... اپنے میں سستی جا رہی تھی..... اسے دیکھتی تو کانوں کی لوئیں تک دھکنے لگتیں۔ آنکھ ملا کر بات کرنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ رومانی باتیں تو کرنا کیا سننا بھی گھبراہٹوں کا پیش خیمہ ہوتا تھا.....

وجہ جو بھی تھی۔

لیکن

یہ حقیقت تھی کہ شہباز کے حراج میں رویوں میں سوچوں میں انقلابی تبدیلیوں کی اساس بن رہی تھی..... اور زری کے ہاں توجہ و تحرک نام کی کوئی شے تھی ہی نہیں..... وہ جہاں تھی وہیں تھی..... اپنے سارے جنریوں کی انتہاؤں اور شدتوں کو اپنے اندر سمیٹے۔ اس پیڑ کی طرح جو جہاں اگتا ہے وہیں بڑھتا ہے..... مضبوطی سے استقامت سے کھڑا رہتا ہے۔ اور اس کی جڑیں دھرتی کے سینے میں پھیل کر اس کی توانائی اور نومندی میں اس طرح معاون ثابت ہوتی ہیں کہ آندھی آئے بھکڑ چلیں طوفان برق و باراں ہو..... پیڑ کو کچھ نہیں ہوتا..... وہ مضبوطی اور استقامت سے کھڑا رہتا ہے۔

مضبوطی

اور

استقامت سے.....

”زری“

”جی لالہ“

”بھئی یہ بری بات ہے“

”کیا.....“

”تم چار دن سے کالج نہیں جا رہی..... تمہارے امتحان قریب ہیں..... پڑھائی کا اتنا ہرج ہو رہا ہے.....“

”آپ کو چھوڑ کر میں کالج جاؤں.....“

”بھئی..... دیکھو نا..... اب میرے زخم ٹھیک ہو رہے ہیں..... چند دن کی بات ہے پھر پلستر لگ جائے گا..... زرگل لالہ..... پڑھائی آپ سے مقدم نہیں.....“

”پگلی..... اچھا یوں کیا کرو..... کالج سے سیدھی یہاں ہو سہیل آجایا کرو..... لیکن کالج جایا کرو ضرور..... میں نے بی بی جان سے بھی کہا ہے..... صبح کے وقت وہ میرے پاس ہوتی ہی ہیں..... پچھلے وقت تم آجایا کرو..... ویسے زری اب میری تکلیف کم ہے..... اور یہ جو بڑی جڑنے کی بات ہے نا تو اس میں مہینوں لگ جائیں گے.....“

زری نے ایک درد بھری سانس لی..... زرگل کو ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا.....

”بس..... بس.....“ زرگل ہنس کر بولا..... ”رو نے نہیں لگ جانا..... بری بات

پٹھان پچی اور حوصلہ اتنا کم..... غلط بات ہے میری بیماری پیاری بہن.....“

”آپ کب چلے پھرے لگیں گے زرگل لالہ..... آپ کیوں گر گئے..... میری ٹانگ ٹوٹ جاتی آپ ٹھیک رہتے“

”اوہ پگلی بہنا.....“ زرگل نے بیڈ کے قریب کھڑی زری کو پیار بھری نظروں سے دیکھا.....

”ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالو.....“

”کیسی باتیں؟“ تمکینے ہاتھ روم سے نکلتے ہوئے بولی..... اس نے انہوں نے بچوں پر نگاہ ڈالی.....

”اے دیکھیں بی بی جان“ زرگل شاکی انداز میں بولا.....

”کیوں کیا ہوا.....“ تمکینے بیڈ کے دوسری طرف آکر بولی.....

”کیا کیا کہہ رہی ہے بے وقوف..... کہہ رہی ہے میری جگہ اس کی ٹانگ ٹوٹ جاتی..... بی بی جان

یہ پاگل تو نہیں یہ میری تکلیف برداشت نہیں کر سکتی تو میں اس کا دکھ دیکھ سکتا بھلا..... زری بی بی یقین مانو میں تمہاری آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی بھی برداشت نہیں کر سکتا سمجھیں..... یہ جو روتی دھوتی ہوتا..... تو مجھے سخت ذہنی کوفت ہوتی ہے.....“

”اب نہیں روو پگلی لالہ.....“ زری نے آنکھیں دوپٹے سے پونچھ ڈالیں.....

”ٹھیک..... وعدہ.....“ زرگل نے ہاتھ بڑھایا.....

زری نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا ”وعدہ.....“

”اور یہ وعدہ بھی کہ کل سے کالج جاؤ گی“ زرگل نے کہا..... تو زری نے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا.....

لیکن زرگل نے مضبوطی سے ہاتھ پکڑے رکھا.....

”ہاں بھئی اب تم کالج جایا کرو..... اتنے دن گئی نہیں..... پڑھائی کا بہت ہرج ہوا ہو گا.....“

تمکینے نے کہا.....

”جاؤ گی نا کل سے کالج.....“ زرگل نے زری کے ہاتھ کو زور سے دبایا..... ”وہی وہی.....“

وہی“ کہتے ہوئے ہنس دی.....

”منہ سے ہاں کو“ زرگل نے کہا.....

”اچھا زرگل لالہ کل سے جاؤ گی کالج.....“

”بس ٹھیک اور ہاں اس دوسری بے وقوف لڑکی سے بھی کہنا..... کہ ڈیوٹ میں حصہ ضرور

لے.....“

”تمکینے مسکرا کر بولی“ تمہارے اس حادثے نے دونوں بچیوں کو سب سے زیادہ متاثر اور

پریشان کیا ہے..... دیکھو تو اس کارنگ کتنا پیلا پڑ گیا ہے..... بیمار تو یہ لگتی ہے..... اور وہ شہنو - وہ تو جیسے ہنسنا بولنا

ہی بھول گئی ہے.....“

زرگل شوخی سے ہنس کر بولا ”اس بیچاری کو ڈر ہو گا کہ زرگل لنگڑا ہو گیا تو کیا کرو گی.....“

”اے ہے“ تمکینے اور زری کے منہ سے بیک وقت نکلا۔ تمکینے نے اس کے سر پر ہولے سے چپت بھی لگائی۔ ”بستر پر پڑے پڑے الٹی سیدھی باتیں سوچنے لگا ہے تو.....“

”ایسی بری بری باتیں منہ سے نہ نکالا کریں زرگل لالہ“ زری نے کہا..... زرگل مسکراتے لگا..... وہ کچھ کہنے ہی کو تھا کہ دروازہ کھلا اور نرس چھوٹی سی سرے میں دوایاں اور تھرمائیز لے اندر آگئی۔ اس نے آتے ہی سلام کیا اور بیڈ کے قریب آکر بولی ”کیسے ہیں خان صاحب.....“

”ٹھیک ہوں“

”ٹانگ میں کچھ آؤ محسوس نہیں ہوتا.....“

”ہلانے سے درد ہوتا ہے“

”وہ تو ہو گا..... میرے خیال میں کل پر سوں پلستر چڑھا دیا جائے گا..... زخم معمولی تھے اب ٹھیک بھی ہو رہے ہیں.....“

”دو جگہ سے ٹوٹی ہے ہڈی.....“

”ایک جگہ سے ٹوٹی ہے۔ دوسری جگہ یہ کریک آیا ہے الگ نہیں ہوئی۔ اسکیرے رپورٹ یہی ہے.....“

زرگل نے ایک گہری سانس لے کر کہا ”کتنا وقت لگے گا جڑنے میں.....“

”وقت تو لگے گا.....“ نرس نے تھرمائیز اس کی طرف بڑھایا.....

”اس کا مطلب ہے کہ مہینوں آپ کا مہمان بننا پڑے گا“ زرگل نے کہا..... سسر مسکرا کر بولی ”ہاں خان صاحب ویسے ہم ایسے میزبان ہیں..... کہ مہمانوں کو جتنی جلدی ہو سکے چلا کرنے کی کوشش کرتے ہیں.....“

”کہاں..... اوپر.....“ زرگل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تو سسر نے ڈانٹا..... ”خان ہماری

کوشش تو ہوتی ہے مہمان اپنے گھر ہی کو واپس لوٹیں.....“

”زرگل..... تمہیں کیا ہو گیا ہے.....“ تمکینے بولی..... زری نے بھی گھور کر اسے دیکھا۔

”بی بی جان مذاق کر رہا تھا.....“ زرگل نے تھرمائیز منہ میں رکھ لیا۔

”لمبے پیر ٹوٹ کر کے نرس نے دو تین قسم کی گولیاں زرگل کو کھلائیں۔ ٹانگ کو سیدھا رکھنے کے لئے اس سے بندھے وزن کو دیکھا اور ٹانگ بالکل سیدھی رکھنے کی ہدایت کرتے ہوئے باہر چلی گئی۔

زری نے بیڈ کے قریب رکھی لوہے کی سفید ٹیبل نما لماری میں چیزیں درست کر کے رکھیں۔

”تم گھر چلی جاؤ.....“ تمکینے نے زری سے کہا..... ”ڈرائیور یہیں ہے۔ ابھی چائے اور

دوایاں لے کر آیا ہے۔“ ”آپ تھوڑی دیر گھر جا کر آرام کر لیں.....“

”میں صبح ہی تو آئی ہوں تم چلی جاؤ.....“ ریشمینے اور شہنو نے آنا ہو گا.....“

زری نے گل کی طرف مسکرا کر دیکھا..... اس نے بھی جانے کا اشارہ کیا.....

”ٹھیک ہے میں چار بجے آ جاؤں گی.....“

”وہ وقت تو ملاقاتیوں کا ہوتا ہے۔ گاڑی سے بے شمار لوگ آتے ہیں۔ بہتر ہو گا۔ تم شام ڈھلے

آؤ..... چار بجے تو میں بھی گھر آ جاؤں گی..... تمہارے بابا تو یہیں ہوں گے..... مرد آ جاتے ہیں۔ تو یہاں ٹھہرنے سے بڑی مشکل پڑتی ہے.....“

”وہ تو ہے.....“

”اچھا اب جاؤ اور انہیں کھانے کے ساتھ بھیج دینا.....“

”یہ شہنو بھی کالج نہیں جا رہی“ زرگل نے پوچھا.....

”دو تین دن وہ بھی نہیں گئی.....“ زری بولی۔

”حد ہو گئی.....“ زرگل نے سزا دھر دھرا.....

”کیوں ایک سیکنڈ کیا تھا.....؟ ایک تو بستر پر پڑ گئے جناب اس پر حکم یہ ہے کہ ہم سب نارمل

رہیں.....“ زری پیار سے بولی.....

”ابنا نارمل لوگوں کو نارمل رکھنے کے لئے کچھ تو کرنا ہی تھا.....“

”اچھا..... ہم ابنا نارمل ہیں؟“

”اور نہیں تو کیا.....“

”آپ کی شہنو ہو گی..... میں نہیں.....“ زری نے مسکراتے ہوئے شوخی سے کہا..... پھر گھر

لے جانے والی چیزیں سمیٹ کر نوکری میں رکھنے لگی۔

تمکینے کو دو ایک چیزیں یاد آ گئیں..... وہ بھی منگواتا تھیں..... اپنے استعمال کے لئے اور دو جوڑے کپڑے بھی بھجوانے کے لئے زری کو کہا۔

وہ سر اثبات میں ہلاتے ہوئے زرگل کے بیڈ پر جھکی کندھے پر بوسہ دیا اور خدا حافظ کہتے ہوئے بولی

”آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بھجوا دوں.....“

زرگل نے اس کے گال پر پیار سے تھپتھپایا اور مسکرا کر سرگوشی کی..... ”شہنو کو بھیج

دینا.....“ زری ہنس پڑی ”اب جا بھی چکو“ تمکینے نے کہا..... ”چیزیں یاد سے بھجوا دینا ریشمینے کے

ہاتھ.....“

”جی اچھا“

زری سلام کر کے باہر چلی آئی.....

شہنو انتظار ہی میں تھی..... زری سے آتے ہی پوچھا ”کیسے ہیں زر گل.....“

”بہترین..... تمہیں یاد کر رہے ہیں..... میں گھر آگئی ہوں..... اب تم جاؤ..... انتظار کر رہے ہیں تمہارا.....“

”ہو.....“

”جی.....“

”میں نہیں جاؤں گی.....“

”کیوں؟“

”بس.....“

”بہنیں.....“

”زری..... جی..... میں نہیں جانا چاہتی.....“

”کیوں“

”مجھ سے دیکھا نہیں جاتا..... کتنی تکلیف میں ہوتے ہیں وہ.....“

”آج بہترین۔ اسی لئے تو دیکھو۔ میں چلی آئی..... آج تو گپ شپ بھی لگا رہے ہیں۔ باقی

رہی تکلیف..... وہ تو ہے ہی اور ابھی جانے کتنے دن اور لگیں گے ٹھیک ہوتے..... نظر لگ گئی ہے میرے زر گل لالہ کو..... کتنا کام کر رہے تھے..... سب کتنے تھے زر گل کی زمینیں زراعت لگی ہیں.....“

زری نے شہنو کو تیار ہونے کا کہا اور خود ماں کی کچی ہوئی چیزیں بیک میں ڈالنے لگی..... دشمنینے ہسپتال جانے کے لئے تیار تھی..... نفن کیہر میں کھانا اور تھرماس میں چائے بھر رہی تھی۔

ان کے جانے کے بعد زری نے نہادھو کر کپڑے بدلے کھانا کھایا اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے اردے سے اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ کہ ٹیلیفون کی ٹھنٹی بجی.....

اس نے رسیور اٹھایا ”ہیلو.....“

”کون.....“ شہباز کی آواز تھی..... ”زری؟ میں شہباز بول رہا ہوں.....“

زری نے ہولے سے سلام کیا۔

”ٹھیک ہوں“ کیسی ہو.....“

”گھر میں سب خیریت ہے نا.....“

”جی..... جی.....“

”کیا بات ہے بڑی بھی بھی آواز میں بول رہی ہو..... اچھا نہیں لگا میرا فون کرنا.....“

وہ گھبرا کر بولی ”نہیں نہیں..... آپ“

شہباز اودھرا دھر کی باتیں کرنے لگا..... زری ہوں ہاں کرتی رہی.....

پھر شہباز نے پوچھا ”ذرا شہنو کو بلانا..... تمہارے متعلق اس سے پوچھنا پڑتا ہے..... بلانا

اے.....“

”وہ ہو سسٹل..... گئی ہے.....“

”ہو سسٹل..... وہ کیوں؟“

”زر گل لالہ..... کا ایکسیڈنٹ.....“

”کیا“

”ٹریکٹر سے گر گئے تھے.....“

”کب.....“

”چار پانچ دن ہوئے.....“

”مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔ زیادہ چوٹ تو نہیں آئی.....“

”ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے.....“ زری کی آواز بھرا گئی.....

شہباز گھبرا گیا..... اس نے جلدی جلدی تفصیلات پوچھیں۔ زری بتاتے بتاتے رونے لگی۔

شہباز سسٹلٹا گیا۔

”حد ہوگئی۔ مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔ آج بھی فون نہ کرتا۔ تو مجھے پتہ نہ چلتا.....“

”وہ..... وہ..... نواز چاچا کہتے تھے آپ کو..... نہ ہی بتایا جائے..... پریشان ہوں گے آپ.....“

اسی لئے فون نہیں کیا..... اب زر گل لالہ بہترین ہیں..... دو ایک دن میں پلستر لگ جائے گا.....“

”آپ..... پریشان..... نہ ہوں..... اب وہ پہلے سے بہترین ہیں..... میں ان کے پاس ہی تھی.....“

ریکور کر رہے ہیں.....“

”تم اب تک پریشان ہو..... رو رہی ہو..... اور مجھے کتنی ہو پریشان نہ ہوؤں.....“

”خدا کرے زر گل لالہ کی ہڈی ٹھیک سے جڑ جائے.....“

”لیڈی ریڈنگ میں ہیں یا خیر ہسپتال میں“

”لیڈی ریڈنگ میں.....“

”اودھو۔“

”وہاں آر تھو پیڈک سرجن سردار حسین ہیں شاید.....“

”جی وی ہیں.....“

شہباز چند لمبے باتیں کرتا رہا۔ پھر خدا حافظ کہنے سے پہلے بولا..... ”اس جمعرات کو میں سیٹ مل گئی تو آؤں گا..... زرگل کو دیکھنے.....“

”چشیاں ہوں گی تو آجائیے گا..... وہ اب.....“

”مشورے کا شکریہ..... زرگل میرا بھی کچھ لگتا ہے اور اس کی تکلیف سے مجھے بھی تکلیف پہنچ سکتی ہے۔ سمجھیں.....“

”جی.....“

”خدا حافظ“

”خدا حافظ“

زری فون رکھ کر اپنے کمرے میں آگئی..... شہباز سے باتیں کی تھیں۔ کچھ رنگین دحسین جھللا نہیں چہرے پر آپوں آپ بکھر گئیں تھیں۔

(۴۰)

شہباز بیک کندھے پر ڈالے ایئر پورٹ سے باہر آیا تو زرین خان گاڑی لئے اس کا منظر تھا۔ وہ لپک کر اس کی طرف آیا۔ سلام کیا اور بیک اس سے لے گیا۔

اس نے سلام کا جواب دیتے ہوئے مصافحہ کیا ”کیسے ہو زرین خان.....“

”شکر خان صاحب“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر قدرے جھکتے ہوئے منود بانہ بولا..... ”آپ ٹھیک

ٹھاک ہیں نا.....“

شہباز نے مسکرا کر کہا ”کیسا لگتا ہوں“

”ایک دم فٹ کلاس خان جی.....“

”اوٹے ہوئے“ شہباز گاڑی کی طرف بڑھا..... ”زرگل کی سنا.....“

”کل پلسترنگ کیا ہے جی.....“ زریں نے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

شہباز فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا..... ”اب تو میں گاڑی چلا سکتا ہوں نا.....“

”جی خان صاحب..... بالکل..... اب آپ بڑے ہو گئے ہیں.....“

زرین نے چابی اسے دے دی..... بیک بچھلی سیٹ پر رکھا اور دروازہ کھول کر بیٹھنے لگا۔ تو شہباز

نے اسے اپنے برابر والی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا.....

زرین چادر کندھے پر درست کرتے ہوئے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا.....

ایئر پورٹ پر کوئی زیادہ رش نہیں تھا..... فوکر طیارے میں تھوڑے لوگ ہی پشاور آئے تھے.....

تھوڑی دیر پانچل ہوئی تھی۔ گاڑیاں رکشے سوار یوں کو لینے بڑھے تھے..... پھر معمول کی خاموشی چھا گئی تھی۔

شہباز اور زرین خان گپ شپ لگاتے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ شہباز زرین خان کو یاد دلارہا تھا۔ وہ گاڑی چلانے کے لئے ضد کیا کرتا تھا۔ اور زرین خان عاجز آجایا کرتا تھا۔ ایک طرف بڑے خان کا حکم کہ شہباز گاڑی نہیں چلائے اور دوسری طرف اس کی ضد کہ گاڑی چلاؤں گا۔

زرین مسکرا مسکرا کر سر ہلارہا تھا۔

گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو تین چار ملازموں نے ہاتھ اٹھا اٹھا کر سلام کیا۔ شہنو اس کے انتظار میں برآمدے کے ستون کے پاس کھڑی تھی۔ گاڑی پورچ میں آکر رکی۔ تو وہ برآمدے کی میڑھیاں پھلاکتے ہوئے دوڑی۔

”شہباز لالہ“ وہ شہباز کے گاڑی سے نکلے ہی اس سے پٹ گئی۔

شہباز نے اس کا سر سینے سے لگا کر اس کے بالوں پر شفقت سے بوسہ دیا۔ جو اب شہنو نے بھائی کے ہاتھ پر پیار کر لیا۔

”کیسی ہو“ شہباز نے اس کی پشت پر تھکی دی۔

”آپ کہیں..... ٹھیک ٹھاک رہے نا.....“ شہنو نے اس سے الگ ہوتے ہوئے پیار سے

اس کے سر پر ہاتھ لگا دیا۔ ”اتنے بڑے ہو گئے ہیں آپ تو..... ایک دم بڑے.....“ دونوں ہنس دیئے۔ پھر دونوں ہاتھ پکڑے برآمدے میں آئے۔ دو تین خدمت گاریں بھی لپک کر ادھر آگئیں۔ چھوٹے خان کا تپاک سے خیر مقدم کیا۔ شہباز نے سب کو سلام کیا اور احوال پرسی کی۔ یہ سب خاندانی ملازم تھے اور بچوں کو ان کی عزت کرنا شروع ہی سے سکھایا جاتا تھا۔ شہباز کی ترور نے تو اسے گلے سے لگایا۔ بلائیں لیں دعائیں دیں..... شہباز بھی اس سے تپاک سے ملا۔

دونوں اندر آگئے ”بی بی گل کہاں ہیں.....“

”ہسپتال گئی ہیں.....“

”اور بابا تو حسب معمول دفتر میں ہوں گے.....“

”نہیں..... وہ کراچی گئے ہوئے ہیں۔“

”کیوں“

”مشینری کے سلسلہ میں..... آپ کو پتہ ہے نا خان بابا شوگر مل لگانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں.....“

وہ شاید جاپان بھی جائیں.....“

شہباز نے یونہی سر ہلادیا۔ ”بی بی گل نے فون پر کچھ بتایا تو تھا.....“

شہباز صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”سر ماگرم چائے پلا دو..... پھر ہوش چلتے ہیں.....“

”ابھی بخواتی ہوں..... میں بھی چلوں گی آپ کے ساتھ.....“

”وہ کہاں ہے“ چند لمحوں بعد شہباز نے پوچھا۔

”کون.....؟“ شہنو شوخی سے آنکھیں نہچاتے ہوئے بولی۔

”دبی..... مٹی کا مادھو.....“ شہباز نے ہنس کر کہا۔

”ایسے مت کہا کریں.....“

”کیوں برامان جائے گی“

”اتنی اچھی اتنی پیاری ہے وہ..... اور آپ اس کے نام دھرتے رہتے ہیں.....“

”اچھا..... اتنی اچھی ہے اتنی پیاری ہے“

”اور نہیں تو کیا؟“

”پھر.....“

”پھر کیا..... ہسپتال نہ جاتی..... اس کا بھائی ہو ہسپتال میں ایڈمٹ ہے جناب.....“

”بات توئی کہیں کی..... چائے تو بنواؤ.....“ شہباز نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ابھی لائی.....“ شہنو باہر چلی گئی۔

شہباز اس کمرے سے دوسرے کمرے میں چلا آیا۔ اس دفعہ وہ پورے چھ سات ماہ بعد آیا تھا۔

چائے آنے تک اس نے گھوم پھر کر ساری کوٹھی دیکھ لی۔ بیک یارڈ میں ملازموں کے بچے

کھیل رہے تھے۔ وہ چند لمحے انہیں بھی دیکھتا ہاں سے باتیں بھی کیں۔

شہباز لالہ..... شہباز لالہ..... شہنو نے اسے دو تین آوازیں دیں۔

تو

وہ اگلے قدموں راہداری سے ہوتا کمرے میں چلا آیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں ہسپتال میں تھے۔

ہسپتال کی اک اپنی ہی دنیا ہوتی ہے۔ قطار در قطار کمرے مریضوں سے بھرے ہوتے ہیں دکھ اور تکلیف سے کراہتے انسان حتیٰ کہ بعض برآمدوں میں بھی مریضوں کے بیڈ لگے ہوتے ہیں۔ دکھ اور تکلیف سے کراہتے انسان ڈاکٹروں کی مسیحا کی منتظر رہتے ہیں..... نرسیں بھاگ بھاگ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جا آرہی ہوتی ہیں۔ ملاقات کے وقت میں تو خاصی پاپل اور رونق ہوتی ہے۔ لوگ خلوص سے احوال پرسی کا فرض نبھاتے ہوئے بعض اوقات مریضوں کے لئے درد سری کا باعث بھی بن جاتے ہیں۔ کوئی آ رہا ہے

کوئی جارہا ہے۔ بیماری کی تفصیل پوچھی جارہی ہے۔ علاج کے متعلق آگہی حاصل کی جارہی ہے۔ مریض اور اس کے لواحقین ایک ہی کمانی ہر آنے والے کے سامنے دہراتے دہراتے عاجز آرہے ہیں۔ لیکن کوئی اس تکلیف دہ عمل کو محسوس نہیں کرتا۔

ملاقات کے وقت کے علاوہ بھی اکاد کاٹنے والے چلے آتے ہیں۔ کوئی کھانا لے کر آرہا ہے۔ کوئی احوال پرسی کرنے۔ ڈاکٹروں اور نرسوں کی واضح ہدایات کے باوجود اصول توڑے جاتے ہیں۔ اور مریض سے محبتوں کے اظہار کے لئے وقت بے وقت یلغار کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ مریض کے پاس رہنے کی صرف ایک تیار دار کو اجازت ملتی ہے۔ لیکن دو دو تین لوگ اس کے پاس رہ جاتے ہیں۔ کرسیوں پر بیٹھ کر فرشتوں پر سو کر بے آراہی کی راتیں گزارتے ہیں۔ شاید مریض کی قربت ان کی پریشانیوں اور گھبراہٹوں میں کمی کا باعث بنتی ہے۔

شہنو اور شہباز جب ہو اسپتال پہنچے تو ملاقات کا وقت تھا۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ چمنوں میں برآمدوں میں وارڈوں میں کمروں میں خاصہ رش تھا۔ شہباز شہنو کے ساتھ ساتھ بیٹھڑ میں سے ہوتا زرگل کے کمرے کی طرف جارہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پھولوں کا گلہ دستہ تھا۔ جو اس نے راستے سے خرید لیا تھا۔ دونوں کوریڈور میں آئے۔ یہاں بھی کافی لوگ مختلف کمروں میں سے نکل رہے تھے اندر جا رہے تھے۔ زرگل سے بھی حسب معمول بہت سے لوگ ملنے اور احوال پرسی کرنے آئے ہوئے تھے۔ رشتہ دار عزیز دوست جیسے بھی پتہ چلتا خبر گیری کو دوڑا چلا آتا۔ کئی لوگ شہباز سے برآمدے اور کوریڈور میں مل چکے تھے۔ حال احوال پوچھا تھا۔ بھگت ہوئے تھے۔ مصافحے کئے تھے۔

ملا ملا تا وہ شہنو کے پیچھے پیچھے زرگل کے کمرے میں آگیا۔ یہاں بھی زرگل کے دوست اور گاؤں سے آئے کچھ رشتہ دار تھے۔

زری اور ریشمینے بھی وہیں تھیں۔ دونوں نے پھولدار کالی چادروں میں اپنا آپ لپیٹ رکھا تھا۔ اور ایک طرف بیرونی کھڑکی کی طرف منہ کئے بیٹھی تھیں۔ کچھ غیر لوگ بھی عیادت کو آئے ہوئے تھے۔ ”اوشہباز۔۔۔۔۔ شہباز غانا۔۔۔۔۔ شہباز کو دیکھتے ہی دو تین مرد تپاک اور محبت سے اس کی طرف بڑھے۔ گلے لگا بیار کیا۔ ریشمینے بھی جھٹ سے اٹھ کر ان کی طرف آئی۔ زری نے بھی ادھر دیکھا۔ شہباز نے جو شبیلی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ زری نے گلابی ہوتے ہوئے نظریں جھکا لیں۔

ماں سے بھگت ہوئے شہباز نے زرگل کی طرف دیکھا۔ ”تم نے یہ کیا تماشا بنا رکھا ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے زرگل سے کہا۔

پھر ماں سے الگ ہوتے ہوئے بیڈ کے قریب آکر جھک گیا۔ لینے ہوئے زرگل کے سینے پر سر رکھ دیا۔ اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے لیا۔

دونوں بڑے پیار اور تپاک سے ملے۔ شہباز بیڈ کی پٹی پر ہی بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر ملتے ہوئے بولا۔ ”یار مجھے کسی نے اطلاع ہی نہ دی۔ اتنے دنوں بعد پتہ چلا۔“ ریشمینے بھی سرہانے آن کھڑی ہوئی ”زرگل ہی نے منع کیا تھا۔ کتنا تھا خواہ مخواہ پریشان ہو گا۔“

”بڑی عقلمندی کی۔۔۔۔۔ شہباز نے زرگل سے طنزیہ انداز میں کہا۔ شہباز کچھ دیر گلے شکوے کرتا رہا۔ اسے واقعی دلی افسوس ہو رہا تھا۔ زرگل کزن ہی نہیں دوست بھی تھا۔ اس نے زری کا شکریہ ادا کیا جس نے دنوں بعد سہی اسے اطلاع تو دی تھی۔ ملاقات کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ احوال پرس کو آنے والے لوگ واپس جانے کی اجازت چاہ رہے تھے۔

شہباز انہیں رخصت کرنے دروازے تک آیا۔ کچھ ہی دیر بعد کمرہ خالی ہو گیا۔ صرف زری شہنو ریشمینے اور شہباز ہی رہ گئے۔ شہباز حادثے کی تفصیلات سننے لگا۔ بستر والی ٹانگ پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ پاؤں کی انگلیوں کو چھوا۔

”کوئی تکلیف تو نہیں اب“ اس نے پوچھا۔

”سب سے بڑی تکلیف تو بیڈ پر پڑے رہنے کی ہے۔ جانے کتنے دن یوں لیٹنا پڑے گا۔“

”یہ تو ہے۔۔۔۔۔“

”سیدھے پڑے پڑے تھک گیا ہوں۔ ٹانگ تو بالکل شل ہو گئی ہے۔“

شہباز کو دکھ ہوا۔ بیڈ کے قریب دوسری طرف کھڑی زری کی آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے۔

”تمہیں کیا ہوا۔۔۔۔۔ شہباز نے زری کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ تو زرگل نے بھی گردن گھما کر اس دیکھا۔ زری نے رخ موڑ لیا اور چادر کے کونے سے آنسو پونچھنے لگی۔ اس کی دیکھا دیکھی شہنو کی آنکھیں بھی جھلکانے لگیں۔

ریشمینے نے پیار سے دونوں کو دیکھا۔ اور شہباز سے بولی ”ان دونوں کو تو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ رورور کر پاگل ہوئی رہی تھیں۔ زری نے تو کالج جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔“

کچھ دیر کی باتیں ہوتی رہیں۔ زری اور شہنو باہر چلی گئیں۔

”چاچی کہاں ہیں۔۔۔۔۔ شہباز نے پوچھا۔“ اور صبور چاچا۔۔۔۔۔

”بی بی جان آج گاؤں گئی ہیں۔ اتنے دنوں سے یہیں تھیں۔ بابا جان بھی گاؤں گئے ہیں۔ فصل کی بوائی ہو رہی ہے نا۔ مجھے تو اپنی فصلوں کی فکر ہے۔ میرے یہاں پڑے رہنے سے بوائی کا کام بہت متاثر ہو گا۔“

”سنا ہے اپنی تعلیم کو زمینوں پر آزما رہے ہو۔“ شہباز نے مذاق کیا۔

”بالکل۔۔۔۔۔ کلاس پیداوار لے رہا ہوں۔“ زرگل نے فخر سے کہا۔

”ماشاء اللہ پچھلے سال۔“ ریشمینے بولی ”بہت اچھی فصلیں ہوئیں۔“

”میں انشاء اللہ گاؤں کو پیداواری ہدف سے بہت آگے لے جاؤں گا۔“

”یار پہلے ٹانگ تو ٹھیک ہو لینے دو۔ پھر یہ باتیں سوچنا۔ بڑی ٹھیک بڑی گئی ہے نا۔“

”ایکسرے میں تو ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ اب پلستر اترے گا تو پتہ چلے گا۔“

”چائے پیو گے“ ریشمینے نے پوچھا۔

”گھر سے پی آیا ہوں“

”ٹھیک ٹھاک رہے ہوتا۔“

”بالکل۔۔۔۔۔“

”تمہیں تو لاہور لگتا ہے کچھ زیادہ ہی اس آگیا ہے۔“ زرگل نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”کیوں“

”صحت خوب بتائی ہے۔ رنگت نکھر آئی ہے۔ جسم بھر گیا ہے اور۔۔۔۔۔ بھاری بھاری

مونچیں رکھ کر تو چہرے کو رعب وار بنالیا ہے۔“

”مادر پدر آزادی کا نتیجہ ہے یار۔۔۔۔۔“ زرگل کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے شہباز نے ماں کی

طرف ہنس کر دیکھا۔ ”دن اپنا راتیں اپنی۔۔۔۔۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔ جہاں جی چاہے جاؤ۔ جو جی چاہے

کرو۔“ ریشمینے نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے پوچھا ”پڑھائی بھی کرتے ہو یا آزادی ہی آزادی ہے“

”بی بی گل۔۔۔۔۔“ شہباز نے ماں کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا ”آپ کا بیٹا اتنا نالائق بھی

نہیں۔۔۔۔۔ ذہنی آزادی ہو تو پڑھنے میں بھی دل لگتا ہے۔“

”کیا آزادی آزادی کی رٹ لگا رکھی ہے“ ریشمینے نے ہلکی سی ڈانٹ پلائی۔۔۔۔۔ یہاں تو

قید تھا نا جو وہاں آزادی مل گئی۔۔۔۔۔“

”قید نہیں تھا کیا۔ بابا کے حکموں کا قیدی۔۔۔۔۔ یہ کرو وہ نہ کرو۔۔۔۔۔ محافظوں کی نگرانی میں رہا

کرو۔۔۔۔۔ اب پڑھو۔۔۔۔۔ اب اٹھو۔۔۔۔۔ اب بیٹھو۔۔۔۔۔ اب لیٹو۔۔۔۔۔ وہاں یہ باتیں تو نہیں نا۔۔۔۔۔“ شہباز نے اتنے

تمسخر انداز میں کہا کہ زرگل ہنس پڑا اور ریشمینے بھی مسکرائے لگی۔

”دو سال اور آزادی کی بہاریں لوٹ لے۔ پھر آنا تو یہیں ہے۔۔۔۔۔“ ریشمینے بولی۔

”اوں ہوں“

”کیا“

”میں نے تو نیت کر لی ہے“

”کیسی۔۔۔۔۔“

”لاہور ہی سیٹل ہونے کی“

”چل جا۔۔۔۔۔ بڑا آیا لاہور سیٹل ہونے والا۔۔۔۔۔“

”بی بی گل۔ لاہور لاہور ہے۔ زندہ دلوں کا شہر ہے۔۔۔۔۔ روشن خیال لوگ۔۔۔۔۔ جینے کی

آزادی۔۔۔۔۔“

ریشمینے شہباز کا منہ تک رہی تھی اور وہ اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا۔

”چاچی“ زرگل نے اس کی باتیں سننے کے بعد کہا ”یہ تو پہتے سے اکھڑ گیا۔“

”ہتھ اتنا کمزور نہیں۔ جو اسے اکھڑنے دے گا۔۔۔۔۔“

شہباز نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔۔۔۔۔ پھر بولا۔۔۔۔۔ ”یہی تو ظلم ہے۔۔۔۔۔ بی بی گل“ اس نے پیار سے ماں

کے گلے میں بائیں ڈال کر ان کے گال پر پیار کر لیا۔۔۔۔۔ ”لاہور کی کشش پر بھی آپ لوگوں کی کشش غالب

آجاتی ہے۔۔۔۔۔“

”رشتوں کے بندھن بڑے اٹوٹ ہوتے ہیں شہباز خان۔“ زرگل نے کہا۔

”ان بندھنوں ہی نے تو پابہ زنجیر کر رکھا ہے۔“ وہ ہنس کر بولا۔۔۔۔۔ ”ورنہ۔۔۔۔۔“

”ورنہ کیا۔۔۔۔۔“

”کچھ نہیں۔۔۔۔۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

”زندگی اپنے محور کے گرد گھومتی رہے تو ٹھیک ہوتا ہے دوست۔“ زرگل نے کہا۔

”وہ تو پوری تیز رفتاری سے گھوم رہی ہے۔“ وہ ہنس کر بولا۔

باتیں ہو رہی تھیں۔

زری اور شہنو اندر آگئیں.....

”اب چلیں.....“ ریشمینے نے کہا۔

”کہاں“

”گھر“

”یہاں کون رہے گا.....“

”رات حائلہ اللہ رہتا ہے..... آج تو بھابی بھی نہیں آئیں گی.....“

”میں رات یہاں رہ جاؤں گا.....“

”نہیں شہباز کیا ضرورت ہے اب کوئی ضرورت نہیں..... بی بی جان سے تو میں کئی دنوں سے

کہہ رہا ہوں۔ کہ رات نہ رہا کریں۔ مانتی ہی نہیں..... آج بھی جانے کیسے چلی گئی ہیں.....“

”یار میں آیا ہی تمہارے لئے ہوں..... صبح چلے جاتا ہے..... رات گپ شپ لگائیں گے.....“

شہباز نے کہا پھر گھڑی دیکھ کر بولا..... ”اب جاتا ہوں..... رات کھانا کھا کے آ جاؤں گا..... دو ایک دوستوں سے بھی ملتا ہے.....“

”ٹھیک ہے“

”تویوں کرو.....“ ریشمینے بولی ”شہنو اور زری کو لے جاؤ ابھی..... میں یہیں رہتی

ہوں.....“

”نہیں چاچی آپ بھی چلی جائیں.....“

”نہیں نہیں..... بھابی بھی نہیں ہیں۔ میں رہتی ہوں.....“

ریشمینے وہیں رہ گئی۔

شہباز شہنو اور زری کو ساتھ لے کر آگیا.....

کچھ دیر تینوں ڈرائیونگ روم میں بیٹھے باتیں کرتے رہے پھر شہنو بھانے سے اٹھ گئی۔ وہ شہباز اور زری کو کچھ دیر مل بیٹھنے کا موقع دینا چاہتی تھی۔

شہنو کے ساتھ زری نے بھی اٹھنا چاہا۔

”تم کہاں جا رہی ہو۔ بیٹو.....“ شہباز نے اس کے سراپا پر بھرپور نگاہ ڈالتے ہوئے کہا وہ

جھجھکتے ہوئے صوفے پر ٹنگ گئی۔

شہباز اٹھ کر اس کے قریب آیا..... اور جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے بولا ”تم مجھ سے

کڑائی کیوں ہو“ زری نے گہرا کر جھجھک کر اسے دیکھا.....

شہباز نے سگریٹ سلگا یا اور کش لیتے ہوئے پھر کہا ”زری..... میرے آنے سے تمہیں خوشی نہیں ہوتی.....“

جواب دینے کی بجائے زری نے گہرائے سے انداز میں پوچھا ”آپ سگریٹ پینے لگے ہیں.....“

وہ ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا ”ہاں..... بری بات ہے کیا.....“

”آپ..... لاہور جا کر.....“

”کیا کیا لاہور جا کر.....“

”نئی..... نئی عادتیں اپناتا ہے ہیں.....“

شہباز نے کش لیا اور دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے مرغولے اس کی طرف چھوڑتے ہوئے بولا ”ٹھیک سمجھی ہو.....“

زری نے گہرا کر پھر اسے دیکھا.....

وہ بے تکلفی سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔ زری کھسک کر ایک طرف ہو گئی.....

شہباز جھنجھلا کر بولا..... ”مجھ سے ڈرتی ہو.....“

اس نے پریشان ہو کر شہباز کی طرف دیکھا.....

”دیکھو زری.....“ شہباز نے پھر بکس لیا..... ”میں دل میں جانے کتنی چاہتی ہوں لے کر تمہارے پاس آتا ہوں..... لیکن تم..... اس طرح لے دیئے رہتی ہو..... کڑائی کڑائی..... گہرائی گہرائی..... یار ہم کوئی غیر ہیں..... بچپن سے اک بندھن میں بندھے ہوئے ہیں..... ہمیں ایک دوسرے سے ملنے سے بھی کبھی کوئی منع نہیں کرتا..... تمہاری یہ بے جا جھجھک..... یار تم بہت اچھی..... بہت اچھی لیکن تمہاری یہ باتیں مجھے بالکل اچھی نہیں لگتیں.....“

وہ رکا

تو

زری نے اس کی طرف دیکھا..... اس کی اس بات سے اسے ذہنی کوفت ہوئی تھی..... اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں..... ”جب کوئی اچھا لگتا ہے شہباز خان تو پھر اس کی کوئی بات بری نہیں لگتی..... ہم اپنے محبوب کو اچھی بری باتوں میں تقسیم نہیں کر سکتے..... بانٹ نہیں دیتے..... اس لئے کہ اس کی ذات کی اکائی ہر چیز پر محیط ہو جاتی ہے..... تم نے کیسے کہہ دی یہ بات.....“

زری کی نگاہوں کی زبان تو وہ سمجھ نہ سکا..... لیکن ان نظروں کے خاموش بھجان سے متاثر ضرور

اس دفعہ شہباز واپس چلا گیا۔ تو اس کے متعلق زرگل کی رائے یہی تھی کہ وہ لاہور اور لاہوری دوستوں سے بے حد مرعوب ہے..... یہ مرغوبیت اسے ان کے رنگ میں رنگے جا رہی ہے.....

اور

وہ

اپنی تہذیب اپنی روایتوں اور اپنے ماحول کے سے اکھڑتا جا رہا ہے۔

.....○.....

ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی عید سب نے گاؤں میں اکٹھے ہی منانا تھی۔ عیدیں اہتمام سے منائی جاتی تھیں..... مہینہ بھر پہلے ہی تیاریاں شروع ہو جاتی۔ گھر والوں سے لے کر ملازموں تک کے لئے آغا بی بی نئے لباس تیار کرواتی تھیں..... تین دن دعوتیں ہوتیں۔ غریب مزارعوں کو بطور خاص معقول رقمیں دی جاتیں۔ غریب گھروں میں انانج بھجوا یا جاتا..... اور عیدی کے لئے الگ رقم مختص کر دی جاتی.....

اس دفعہ تو عید کی خوشیاں اس لئے بھی دو بالا ہو گئی تھیں کہ رمضان المبارک کے آخری دنوں زرگل ہسپتال سے گھر آ گیا تھا۔ پلستر اتر گیا تھا اور بڑی ٹھیک جڑ گئی تھی۔ پاؤں پر ابھی زیادہ زور دے کر تو نہیں چل سکتا تھا۔ لاشی سارے کے لئے استعمال کر رہا تھا۔ پھر بھی صحتیابی خوشی کا باعث تھی۔ اور خوشیاں منانے اور دوسرے لوگوں میں بانٹنے کا سلیقہ اس خاندان کو خوب آتا تھا۔ لوگ بھی جواباً ان نوازشات کا حق ادا کرتے تھے۔ زرگل کو ہسپتال میں دیکھنے گاؤں کا کوئی ہی فرد ہو گا جو نہ گیا ہو..... اور اب وہ گھر آ گیا تھا۔ تو لوگ مبارک دینے چلے آ رہے تھے۔ پھولوں کے ہار اور شیرینی لے کر..... زرگل کے نخیال والوں نے تو شہر سے مٹھائی کے ٹوکے منگوا کر لوگوں میں تقسیم کئے تھے۔ تحائف لائے تھے..... کالے بکرے صدقے میں دیئے تھے..... اور غریب غریب کپڑے تقسیم کئے تھے۔

شہنو اور زری نے اس عید کے لئے بڑے اصرار سے اپنے روایتی پٹھانی ڈریس بنوائے

تھے.....

”ان کپڑوں میں اس دفعہ تصویریں بھی اتروائیں گے“ شہنو نے کہا تھا۔ ”کالج میں اپنی

سہیلیوں کو دکھائیں گے“

”ہاں ضرور.....“ زری نے کہا۔

”آغا بی بی کہہ رہی تھی۔ اس دفعہ عید پر زیور بھی پہننے کو دیں گی.....“ شہنو بہت خوش تھی

”ہمارے کرتوں پر انہوں نے سونے کے گلے لگوائے ہیں..... یہاں سارے مگر بیان کے ارد گرد“ زری بولی۔

”بچپن میں بھی ایک دفعہ ہم دونوں کے ایسے ڈریس بنے تھے نا.....“ شہنو نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں.....“ زری نے جواب دیا۔

”مجھے بہت اچھا لگتا ہے یہ ڈریس.....“ شہنو خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

”گاؤں میں ہی رہنا ہو گا..... شوق پورا کر لیتا.....“ زری نے شہنو کو خوشی سے چھیڑا۔

”ہم تمہارے لئے ڈیر سارے ڈریس بنوادیں گے ایسے.....“

”مجھے بے حد خوشی ہوگی محترمہ.....“ شہنو نے خوشی سے منہ بناتے اور آنکھیں منکاتے ہوئے کہا۔

”اچھی بات ہے..... بلکہ ہمارے لئے خوشی اور تسکین کی بات ہے..... میری پیاری پیاری مگڑیا سی بھابی صاحبہ“ زری نے پیار سے اسے لپٹا کر کہا۔

شہنو ہنس پڑی۔

”شہنو.....“ زری نے کہا۔

”ہوں“

”تجھے گاؤں اور گاؤں میں زندگی کے طور طریق اچھے لگتے ہیں نا.....“

”کیوں نہ اچھے لگیں گے زری۔ گاؤں میں ہماری جڑیں ہیں۔ گاؤں ہماری پہچان ہے۔ شہر

میں رہنے سے ہم اس سے کٹ تو نہیں گئے۔ مجھے تو گاؤں بہت اچھا لگتا ہے۔ اس لئے بھی کہ.....“

”کہ؟“

وہ جواب دینے کی بجائے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”بتاؤ نا..... اس لئے کہ.....“

”زری“

”ہوں“

”تو بتا“

”کیا“

”اگر شہباز گاؤں میں رہتا ہوتا۔ تو تجھے گاؤں اچھا نہ لگتا؟“

”ضرور لگتا.....“

”بس پھر مجھے بھی اس لئے زیادہ ہی اچھا لگتا ہے۔ کہ میرا زر گل یہاں رہتا ہے“

زری خوشی سے پھول گئی..... اسے چھیننے کو جلدی ہو چکا ہے ابھی میرا مت کہ..... وہ ابھی میرا ہے..... میرا بھائی.....“

”اے جا.....“ وہ اتر کر بولی ”وہ تو جب نہیں تھا تب بھی میرا تھا اور اب جب ہے تب بھی میرا ہے..... اپنا حق مت جما..... بھائی کے حوالے سے چاہے کہ..... لیکن اس طرح میرے ساتھ گڈمڈ نہ کر..... ہاں..... سمجھیں“

”سمجھ گئی“

دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

آغا بلی نے اس دفعہ شہباز اور زر گل کے لئے ایک جیسے لباس بنوانے کے لئے کہا تھا چوڑے چوڑے بانڈیوں والی بھاری بھاری شلواریں..... کھلے کھلے گھیر والے کرتے واسکٹیں..... تلے والے پشاور کی چپل اور چادریں زر گل تو اکثر ایسے لباس پہنا کرتا تھا۔ لیکن شہباز کو عرصہ ہی ہو گیا تھا ایسے کپڑے پہنے۔ اس کے استعمال میں تو اب شہری پہناوے تھے۔ سوٹ پتلونیں جیکٹس..... جدید تراش خراش کے لباس اسے بہت پسند تھے..... گرمیوں میں ملل کے ملٹانی کڑھائی والے کرتے اور لٹھے کی شلواریں بھی اسے پسند تھیں..... اور یہ اس پر چچی بھی خوب تھیں۔

وہ جب بھی چپٹیوں میں گھر آتا۔ تو ان کے لئے جدید ملبوسات تحفہ لے کر آتا..... ملل کے کڑھائی والے کرتے یہاں کا پہناوہ نہیں تھا..... لیکن اس نے کئی کرتے زر گل کو لا کر دیئے تھے۔ صبور خان اور بابا خان کے لئے بھی لے کر آیا تھا.....

شہنو بھی اس کی طرح نئے نئے ڈریسز کی دیوانی تھی۔ علاقائی لباس بھی بہت پسند تھے اور جدید طرز کے ڈریسز بھی من بھاتے تھے۔ وہ اکثر بھائی سے فرمائش کر کے بھی جدید طرز اور نئے نئے فیشن کے کپڑے لاہور سے منگواتی تھی۔ درائی کو وہ مزاج پسند کرتی تھی۔

زری کبھی کبھی اس سے پوچھتی..... ایک طرف تو تم دیہاتی لباس کو پسند کرتی ہو..... دوسری طرف اتنا ہی جدید قسم کے ملبوسات منگواتی ہو.....

وہ ہنس کر جواب دیتی ”مجھے اچھے اچھے مختلف قسم کے لباس پسند ہیں..... ایسے لباس جو الگ ہوں اور وہ سے..... تنوع لئے ہوئے..... اب دیکھو نا..... ہمارے بھائی لباس..... یہ تو اب گاؤں میں بھی لڑکیاں نہیں پہنتیں..... لیکن مجھے پسند ہیں..... اسی طرح جدید طرز کے ملبوسات جو یہاں شہری لڑکیوں تک بھی نہیں

مجھے اچھے لگتے ہیں.....“

زری شہنو کے مزاج کی ہر کڑی سے واقف تھی۔ اس کا جدیدیت کی طرف رجحان تھا۔ اسی لئے وہ کبھی کبھی فکر مند سی ہو جاتی..... ”شہری لڑکی گاؤں میں رہ سکے گی؟“ وہ دل ہی دل میں سوچا کرتی..... ”کہیں شادی کے بعد وہ زرگل کے لئے مسئلہ تو نہیں بن جائے گی“

اس نے بار بار اسے مٹولا تھا..... اور مطمئن بھی ہو گئی تھی..... اس میں کوئی شک نہیں تھا..... کہ زرگل سے بے پناہ محبت کرتی تھی.....

پھر بھی

اسے یہ سوچ ضرور تنگ کرتی تھی..... اور وہ اس کا حل بھی خودی تلاش کرنے کی کوشش کرتی

تھی.....

پھر

ایک دن اس نے زرگل سے کہہ ہی دیا۔

”زرگل لالہ.....“

”ہوں“

”ایک بات کہوں..... مانیں گے“

”سو بات کو گڑیا..... ضرور مانیں گے“

”آپ یوں کریں..... کہ ایک خوب صورت سی کوٹھی بنوالیں.....“

”کوٹھی؟“

”ہاں زرگل لالہ..... حویلی کے ارد گرد کتنی زمین پڑی ہے۔ یہاں نئی کوٹھی بن سکتی ہے“

”حویلی کیا کم بڑی ہے“

”مانیں ناگل لالہ.....“

زرگل نے مسکرا کر اسے دیکھا اور پھر خوشی سے بولا ”تمہیں نواز چاچا کی کوٹھی میں رہنے کی

عاوت ہو گئی ہے اس لئے.....“

”میں اپنے لئے نہیں کہہ رہی.....“

”تو اور کس کے لئے کہہ رہی ہو“

”شہنو کے لئے..... زرگل لالہ.....“

”کیا مطلب؟“

”دیکھیں گل لالہ..... شہنو تو کوٹھی ہی میں ہی بڑھی ہے نا.....“

”ہاں.....“

”یہاں آئے گی..... تو.....“

”تو یہاں رہے گی۔ جیسے پہلے آتی ہے تو رہتی ہے“

”زرگل لالہ..... سمجھنے کی کوشش کریں نا..... شادی کے بعد.....“

”اوہ..... دور کی سوچ رہی ہو..... کیا شہنو نے کہا ہے تم سے“

”ہائے نہیں..... آپ بھی کمال کرتے ہیں..... میں خود سوچتی ہوں.....“

”کیا سوچتی ہو“

”آپ کوٹھی بنوالیں تو کوئی ہرج ہے؟“

”نہیں ہے تو نہیں.....“

”پھر.....“

”بات سوچنے کی ہے.....“

”بالکل.....“

”بابا سے بات کریں گے آغا بی بی سے پوچھیں گے وہ مان گئے تو ٹھیک ہے۔ تمہاری شہنو

کے شانِ شایاں گھر بن جائے گا..... تمہاری خوشی ہماری خوشی.....“

”میری خوشی یہی ہے کہ آپ خوش ہوں..... شہنو خوش رہے..... میرا بس چلے نا زرگل

لالہ تو ساری دنیا کی خوشیاں سمیٹ کر آپ دونوں کے قدموں میں ڈھیر کر دوں.....“

”میری مٹی سی بن.....“ زرگل نے پیار سے اس کے سر پر تھپکا ”اس مغز میں سوچیں کتنی

بڑی بڑی ہیں.....“

وہ زرگل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سر سے اتار کر ہونٹوں تک لے آئی۔ اور بڑے احترام

سے ہاتھ پر پیار کر لیا.....

زری کی بات سب کے دل لگی تھی..... آغا بی بی اور مصور خان بھی متفق ہوئے تھے۔ تمکینے بھی

یکی چاہتی تھی۔ پیسہ کوئی مسئلہ نہیں تھا..... شہر میں آرکٹیکٹ سے رجوع کیا گیا..... اس نے جگہ دیکھی..... ڈیمانڈ

سنی..... اور مطلوبہ نقشہ تیار کر دیا.....

اب حویلی سے ملحقہ وہ کوٹھی بن رہی تھی..... جو جدید ترین تقاضوں سے ہم آہنگ تھی..... جس

کے وسیع و عریض چمنوں میں فواروں کی منجائش بھی رکھی گئی تھی اور ایک طرف سو ٹمنگ پول اور سن ہاتھ کے

لئے شیشے کا کرہ بنانے کی بھی گنجائش تھی.....

زری اب بہت خوش تھی..... اتنی خوب صورت کوٹھی کو اتنی ہی خوب صورتی سے آراستہ کرنا تھا..... یہ آرائشی شہنوں کی خواہش اور خوشی سے ہوتا تھی.....

عید سے ایک دن پہلے سب گاؤں میں اکٹھے ہوئے..... شہباز بھی لاہور سے آگیا تھا..... سب نے کوٹھی دیکھی..... بہت پسند کی گئی..... چاروں طرف گھوم پھر کر کوٹھی دیکھ رہے تھے.....

شہباز نے کہا ”زرگل تم نے بہت اچھا کیا..... جو یہ کوٹھی بنوا رہے ہو.....“
”شکریہ.....“

”میں اکثر سوچا کرتا تھا.....“
”کیا“

”یہی ہے..... کہ شہنوں شادی کے بعد گاؤں میں کیسے رہے گی..... اب تسلی ہو گئی ہے.....“
زرگل ہولے سے مسکرایا..... پھر بولا..... ”میرے خیال میں شہنوں حویلی میں بھی رہ کر خوش

رہتی.....“ شہنوں نے مسکرا کر سر ہلایا.....

”کتنی تو یہی ہے..... لیکن جب رہنا پڑنا تو شاید مشکل پاتی.....“ شہباز بولا.....

”اسی لئے تو میں نے زرگل لالہ کو صلاح دی تھی..... زری ہولے سے بولی.....

”ہوں.....“ شہباز نے مسکرا کر کہا ”یہ آپ کی رائے تھی.....“

”ہاں شہباز..... زری ہی نے کہا تھا.....“

”شہنوں نے اس کے ذریعے فرمائش کی ہوگی“ شہباز ہنسا.....

تو شہنوں بولی ”جی نہیں..... شہباز لالہ..... یونہی قیاس آرائیاں نہ کریں..... مجھے کیا

ضرورت تھی.....“

”لڑنا نہیں“ شہباز نے ہنس کر ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا.....

شہنوں نے منہ بنایا..... سب اس کے منہ پھلانے پر ہنس پڑے.....

چاروں ہتے مسکراتے ایک دوسرے پر شوخ شوخ فقرے اچھالتے حویلی میں آگئے..... رات

کھانے کے بعد سب بڑے دالان میں بیٹھے تھے..... آغا بی بی دیوار کے ساتھ تکیہ لگائے گدے پر بیٹھی تھیں.....

کافی کمزور پڑ گئی تھیں..... ان کے ارد گرد مصور نواز ریشمینے اون کینے بیٹھے تھے..... چاروں بچوں نے آغا بی بی

کو گھیر رکھا تھا..... زری اور شہنوں ان کے گھٹنوں سے لگی بیٹھی تھیں..... زرگل اور شہباز ان کی پشت پر رکھے تکیوں

پر چڑھے بیٹھے تھے.....

ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں.....

”کیوں بچے..... اچھی بن رہی ہے نا کوٹھی“ مصور خان نے شہنوں سے پوچھا.....

”بہت اچھی ہے خان بابا.....“ وہ بولی.....

”اب اسے سجانا تمہارا کام ہے“ وہ بولے.....

”یہ کیا سجانے گی خان بابا.....“ شہباز نے کہا.....

”کیوں.....“ شہنوں نے گھور کر اسے دیکھا.....

”اس کا ٹیسٹ بالکل اچھا نہیں.....“

”اے ہے..... میرا ٹیسٹ.....“

”ہاں.....“

”تم سے بہت اچھا ذوق رکھتی ہے میری بچی.....“ نواز خان نے ہنس کر کہا.....

”آپ تو یہی کہیں گے..... بابا“ شہباز نے کہا ”ویسے کوٹھی کی آرائش کے لئے کسی انٹیریر

ڈیکور یٹر کی خدمات حاصل کیجئے گا..... کہیں تو میں لاہور میں کسی سے بات کروں.....“

”تم تو پھر پھر کر تان لاہور پر ہی توڑو گے“ زرگل نے کہا.....

”لاہور لاہور ہی ہے ختم بھائی صاحب.....“ شہباز نے کہا.....

”ہے تو ہو..... ہمیں تو اپنے ماحول اور ضروریات کے مطابق آرائش کرنی ہے.....“

”اس ماحول سے نکلو گے کبھی نہیں.....“ شہباز بولا.....

”اپنے ماحول میں انسان اس طرح میتا ہے..... جیسے پانی میں مچھلی..... پانی سے باہر نکالو تو مر

جاتی ہے.....“

شہباز ہنس کر بولا ”اپنے ماحول سے نکلنے کے بعد آدمی کم از کم مرتا نہیں ہے.....“

”مر جاتا ہے..... ذات کے اندر.....“

”اوہ رہنے دو فلسفہ.....“

”یہ حقیقت ہے.....“

”میں اس حقیقت کو جھٹلا کر دکھاؤں گا.....“

”یعنی..... تم.....“

”اپنا الگ ماحول بناؤں گا اور اس میں تم لوگوں کو جی کر دکھاؤں گا.....“

”وہ تم نہیں ہو گے..... تم ماحول میں کوئی نیا آدمی جنم لے گا..... تمہاری صفات بدلیں گی

تب ہی جومات بدلے گی.....

دونوں ہولے ہولے بحث کرنے لگے..... شہنو اور زری نے کوئی بات نہیں کی..... آغا بی بی انہیں بحث میں الجھتے دیکھ کر بولیں..... ”کوئی اور بات کرو۔“

”آغا بی بی جلنے“ رشتہ میں نے کہا ”یہ اپنی پڑھائی لکھائی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔“

”ایسی باتیں کریں جو سب سمجھ سکیں“ آغا بی بی نے کہا۔

”آغا بی بی جانے..... آپ کا جو یہ برخوردار ہے نا.....“ زرگل نے ہولے سے کہا ”اس کا

دماغ لاہور جا کر الٹ گیا ہے۔“

”کنوئیں کے باہر بھی دنیا ہے“ شہباز نے ہنس کر کہا۔

”ہم کنوئیں کے مینڈک ہی بھلے.....“ زرگل نے جواب دیا۔

رات گئے تک سب گپ شپ لگاتے رہے۔

عید کے دن حویلی میں صبح معمول سے کہیں پہلے بیدار ہو گئی تھی۔ نوکر چاکر بہت سویرے اٹھ گئے تھے..... حجرے میں بھی علی الصبح ہلچل مچ گئی تھی..... سب نے غسل کر کے نئے کپڑے پہنے جلدی جلدی ناشتہ کیا گیا۔ مرد نماز کے لئے چلے گئے..... عورتیں گھر داری میں لگ گئیں..... سب نے نئے کپڑے زیب تن کئے..... شہنو اور زری نے آغا بی بی کے تیار کروائے ہوئے لباس پہنے..... اتنے اور گلے کے زیور بھی آغا بی بی نے پہنے کودیے..... شہنو خوشی سے باؤلی ہو رہی تھی..... لال پھول دار پٹی والی کالی چادر سر کے پیچھے کندھوں سے ہوتی لٹک رہی تھی..... گھیر دار کرتے کے گریبان پر ساری چھاتی کے حصے پر سونے کے ٹکے ٹکے تھے۔ گریبان پر رنگارنگ ریشمی دھاگوں سے پھول بھی کڑھے تھے..... سبز کرتے کے گھیرے پر لال رنگ کی پٹی لگی ہوئی تھی..... بازوؤں کے کناروں پر بھی یہی پٹی تھی۔ اس پٹی پر بھی ریشمی دھاگوں کا کام تھا۔ سرخ شلوار کے پانچے تنک تھے..... اور گھیر کرتے سے بھی زیادہ تھا..... پاؤں میں نوکدار تلے والی جوتی تھی..... زری کے کپڑے بھی ایسے ہی تھے..... رنگ فرق تھے..... زری کی چادر لال فیض بے زار شلوار کالی تھی.....

دونوں لڑکیاں حسین تھیں..... شہنو دہلی پتلی اور بے حد سمارت تھی۔ زری بھرے بھرے جسم کی کندنی رنگت اور گہری گہری خوب صورت آنکھوں والی لڑکی تھی..... لمبے خوب صورت بال تھے جن کی مینڈھیاں کل رات اس کی ترور نے گوندھی تھیں..... شہنو کو اس دن اپنے کئے بالوں کا فوس ہوا تھا..... وہ مینڈھیاں نہ بندھوا سکی تھی..... دونوں نے گالوں اور ٹھونڈیوں پر خال بھی لگائے تھے.....

زرگل تو شہنو کو اس لباس میں دیکھ کر دیدہ دل نثار کئے جا رہا تھا.....

”شہنو ہمیشہ ایسے ہی کپڑے پہنا کرو..... کتنی اچھی لگ رہی ہو“

”واقعی؟“

”میری نظروں سے دیکھو تو پتہ چلے.....“

زرگل نے بھرپور نظروں سے اسے دیکھا تو وہ شرمائی.....

شہباز کو بھی زری اس لباس میں اچھی لگی..... وہ کمرہ لایا ہوا تھا..... سب کی تصویریں کھینچی زری کے کئی پوز اس نے کمرے کی آنکھ میں محفوظ کر لئے..... موقعہ پا کر اس کے کان میں سرگوشی کی ”اچھی تو اس ڈریس میں لگ رہی ہو..... لیکن میرے لائے ہوئے کپڑے پہنو گی تو ایک دم قاتل لگو گی“

عید کو پورے احترام اور خوشیوں سے منایا گیا..... آغا بی بی نے سب کو عیدیاں دیں..... رشتے دار حویلی میں عید مبارکی کے لئے آئے..... نوکروں خدمت گاروں کی تو آج چاندی تھی.....

نواز اور صبور سارا دن حجرے میں لوگوں سے عید ملتے رہے..... آنے والوں کی خاطر مدارات میں نوکر اور خدمت گار جتے رہے۔

چاہتا تھا..... جنہیں وہ لاہور میں اپنے ارد گرد دیکھتا تھا..... رنگ رنگ لباسوں میں ملبوس..... بے جھجک بے دھڑک باتیں کرنے والی..... ہوٹلوں رستورانوں میں انداز دلربائی لئے آنے جانے والی..... سمارٹ فیشن ایبل زمانے کے سنگ چلنے والی..... بلکہ زمانے سے آگے جانے والی زری کی جگہ شہنہ ہوتی تو کب کی اس کے رنگ میں رنگ چکی ہوتی۔

لیکن

زری کا مزاج مختلف تھا..... اس نے الگ سے ماحول میں تربیت پائی تھی۔ اسے جینے کے جو آداب سکھائے گئے تھے ان میں بے باکی کی کس گنجائش نہ تھی۔

ویسے بھی وہ مزا جابڑی ٹھہری ہوئی سلجھی ہوئی لڑکی تھی..... وہ زمانے سے آگے تو کیا زمانے کے سنگ چلنے میں بھی محتاط تھی..... سنبھل سنبھل کر قدم اٹھایا جائے تو گرنے کا امکان نہیں رہتا..... انسان بھٹکتا بھی نہیں..... راستے نظروں سے اوجھل بھی نہیں ہوتے..... دوڑنا پھلانگنا اور جدھر منہ اٹھے نکل جانا اس کے کردار کا حصہ نہیں تھا.....

شہباز اس دفعہ بڑے دیدہ زیب ملبوسات اس کے لئے لایا تھا.....

حسب عادت زری نے شکریے کے ساتھ لباس لے لئے تھے.....

شہباز نے ایک انتہائی شوخ اور بھڑکیلے چنچرے چلاتے رنگوں والا لباس نکالا.....

”یہ آج پہنو.....“

”آج.....“

”آج نہیں ابھی“

”جی.....“

”شاید میں لاطینی زبان نہیں بول رہا.....“

زری نے سر جھکا لیا تھا.....

”ابھی پہنو نا.....“

”تھوڑی دیر ہوئی یہ کپڑے پہنے تھے.....“

”میں اس لباس کی بات کر رہا ہوں.....“

”پہن لوں گی.....“

”ابھی کیوں نہیں.....“

”شہباز..... آپ ضد نہ کیا کریں.....“

(۳۲)

زری پھولوں کے کج کے قریب ایک بڑے سے پتھر بیٹھی تھی۔ موسم بے حد حسین تھا..... آسمان پر گہرے بادل چھائے تھے..... ہوائیں سبک خرام تھیں..... پھولوں کی مہک چراچر کر پورے چمن میں بکھیر رہی تھیں..... رت بدلی ہوئی تھی سردی کا دم خم ٹوٹ چکا تھا..... لیکن گرمیوں کی آمد ابھی دور تھی..... بہار کا نشیلا جو بن نکھر رہا تھا..... ہر طرف پھول سر اٹھا رہے تھے..... بہار تو جس طرف بھی آئے اپنے رنگ لٹاتی ہے..... لیکن پشاور کی آب و ہوا اسے کچھ زیادہ ہی راس آتی ہے..... نکھرے رنگ بکھرے ہوتے ہیں..... فضاؤں میں خوشبو رچ بس جاتی ہے..... سبز زمین کا سینہ چیر کر سر نکالتا ہے..... مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو جو شبیلی بہار کی آمد کا پتہ دیتی ہے۔

چمن کے جنوبی کونے میں گھنے درختوں اور نازک بیلوں کے درمیان وہ پھولوں لدی کج تھی..... جس میں ایک بڑا سا پتھر بڑا تھا..... اس پتھر کے گردا گرد گھاس اور خود رو پودے حصار کی صورت اختیار کئے تھے..... بعض پودے تو اس طرح لپٹے تھے کہ لگتا تھا پتھر کا سینہ توڑ کر باہر نکل آئے ہیں.....

زری اس پتھر پر بیٹھی تھی..... لمبے بادامی مائل سنہرے بال پشت پر لہرا رہے تھے..... آنکھیں اذیت زدہ سی تھیں..... چہرے پر کرب کی تشفی سی کیفیت کا اثر تھا..... کندنی رنگت کی دک بھی ذہنی خلفشار سے ماند سی نظر آرہی تھی۔

اس کے سامنے شہباز کمرہ لئے کھڑا تھا..... اس کے چہرے پر بھی قدر سختی کے آثار تھے.....

شہباز جب بھی لاہور سے آتا تھا..... زری اور شہنہ کے لئے منگے منگے بوتلیکوں سے فیشن ایبل لباس خرید کر لاتا تھا..... شہنہ سے زیادہ اس کے ذہن میں زری کا تصور ہوتا تھا..... زری کو وہ نئے انداز سے جینے کی تربیت دینے کی کوشش کرتا تھا..... اس کے خیالات بہت بدل چکے تھے روایتوں سے بغاوت کرنے کے جذبے پیدا ہو گئے تھے..... دنیاوی خیالات سے وحشت ہوتی تھی..... وہ زری کو ان لڑکیوں کے رنگ میں رنگنا

”میرے جذبات کا تمہیں کچھ بھی خیال ہے..... کس شوق سے لاتا ہوں کپڑے اور تم انہیں اٹھا کر الماری میں بند کر دیتی ہو.....“

”نہیں..... پہنتی بھی ہوں.....“

”میرے سامنے کبھی نہیں پہنے.....“

”وہ چپ ہو گئی..... اتنے ماڈرن کپڑے وہ اس کے سامنے پہنتے ہوئے جھجکا کرتی تھی.....“

”آج اور ابھی..... یہ لباس تم پہنو گی.....“

”وہ..... میں.....“

”میں نے تصویریں لیتی ہیں..... جلدی سے پہن کر آ جاؤ..... میں لان میں جا رہا ہوں..... ادھر

ہی آ جانا.....“

شہباز حکم کے سے انداز میں کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

زری تھوڑی دیر کھڑی رہی..... وہ شش و پنج میں تھی..... شہباز کی باتوں سے اسے کوفت ہوئی

تھی۔

ہمیشہ ایسی باتوں سے کوفت ہوتی تھی۔ وہ جس قسم کی فرمائش کرنے لگا تھا۔ وہ پوری کرنا اس کے بس میں نہیں تھا.....

بچھلی دفعہ آیا تھا..... تو اس سے بال کٹوانے کے لئے کہا تھا.....

وہ بولا تھا ”زری تمہارے بال بہت لمبے اور بڑے خوب صورت ہیں۔ لیکن انہیں کٹا دو.....“

ترشے ہوئے بالوں میں تم زیادہ سمارٹ لگو گی..... وہ زمانے گئے جب لمبے بال لڑکیوں کی خوب صورتی سمجھے جاتے تھے۔ کم از کم میری نظر میں یہ خوب صورتی کی علامت نہیں۔ ایک بار کٹوا کر دیکھو۔ ایمان سے تمہارا حلیہ ہی بدل جائے گا.....“

زری اس کی باتیں سن کر جھلا سی گئی تھی۔ تلخی سے بولی تھی..... ”پھر زری سے کچھ اور بن

جاؤں گی“ جو اب اس نے ڈھٹائی سے کہا تھا ”بالکل..... ایک دم سمارٹ اور دلکش و لفریب.....“

”میں..... میں بال نہیں کٹواؤں گی.....“

”میری خوشی کی خاطر بھی نہیں.....“

زری بیچاری کچھ نہ کہہ سکی.....

وہ بولا..... ”ٹھیک ہے ابھی نہیں کٹواتی تو نہ کٹاؤ..... جب مجھے پورا اختیار مل جائے گا تب تو

کٹ کٹ کٹ.....“

اس نے ہنس کر انگلیوں کو قبضی کی صورت چلا یا تھا.....

زری بیچاری سے اسے ہنسنے لگی تھی.....

یہ باتیں زری کے ذہن میں کندہ ہوتی جا رہی تھیں..... وہ گھبرا گھبرا کر سوچتی اور سوچ سوچ کر

گھبراتی شہباز کی ذہنی تبدیلیاں اس کی سوچوں میں تشویش کے رنگ بھردیا کرتی تھیں..... شہباز تیز ہواؤں کے دوش

پرانے والا بادل تھا..... جس کا ایک جگہ قیام نہیں ہوتا۔ ہوائیں جدھر اڑائے پھرتی ہیں اڑتا چلا جاتا ہے۔ لیکن

زری ایسی نہیں تھی۔ کوشش کے باوجود ایسی نہیں بن سکتی تھی۔

زری اب بھی بیڈ پر کھڑے مختلف ملبوسات کو دیکھ رہی تھی۔ جس لباس کی شہباز نے فرمائش کی

تھی۔ وہ تھا تو بہت خوب صورت..... لیکن اس کا گریبان بہت کھلا تھا..... پشت پر سے بھی دی کی شکل میں تھا.....

پہننے سے سینہ اور پشت بڑی حد تک کھل رہے تھے..... اسے تو یہ کپڑے دیکھ کر ہی جھرجھری سی آرہی تھی..... پہن

بھی لیتی تو شہباز کے سامنے کیسے جاتی.....

وہ شش و پنج ہی میں تھی کہ شہنو کمرے میں آ گئی۔

”آہا..... کتنے اچھے کپڑے ہیں.....“ اس نے وہی کپڑے اٹھائے۔

”ہاں اچھے ہیں..... زری بولی۔

”یہ منہ لٹکائے کھڑی کیا دیکھ رہی ہو.....“

”شہنو..... اس کا گریبان بہت کھلا ہے۔ دیکھو نا پشت پر سے بھی.....“ زری نے کرناٹھا

کر آگے پیچھے سے اسے دکھایا۔

”ہاں ہے تو..... لیکن یہ ڈیزائن ہی ایسا ہے.....“

”میں کیسے پہنوں.....“

”پہننے لگی ہو.....“

وہ جھجکی..... پھر بولی ”شہباز ضد کر رہے ہیں..... وہ تصویریں لینا چاہتے ہیں ان کپڑوں

میں.....“

”تو پہن لو.....“

”کتنی آسانی سے کہہ رہی ہو.....“

”تو اور کیسے کہوں.....“

”میں ایسے نہیں پہن سکتی.....“

”تو نہ پہنوں۔“ وہ ہنس پڑی۔

”شہباز ناراض ہو جائیں گے۔“

”تو پہن لو۔“ وہ شوخی سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”شہنو۔۔۔۔۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”ہوں۔“

”تم شہباز کو نہیں سمجھا سکتیں۔“

”شہباز لالہ کو۔۔۔۔۔ وہ سنتے ہیں کسی کی۔۔۔۔۔ اور پھر میری سنیں گے۔۔۔۔۔ ویسے ہی لڑائی کاموڈ بنا

رہتا ہے۔۔۔۔۔“

”تو میں کیا کروں۔۔۔۔۔“

”وہی کرو جو مناسب سمجھتی ہو۔“

”شہنو۔۔۔۔۔“

”جی۔۔۔۔۔ فرمائیے۔۔۔۔۔“

”مجھے صلاح دو۔ کیا کروں۔۔۔۔۔“

”پہن لو۔۔۔۔۔ اور تصویریں اتروالو۔۔۔۔۔ شہباز لالہ پر آج کل ماڈرن بننے کا جنون سوار ہے۔۔۔۔۔“

وہ چیپ رہی۔۔۔۔۔

”یوں کرو۔۔۔۔۔“

”کیا۔۔۔۔۔“

”یہ گریبان تھوڑا تنگ کر لو۔۔۔۔۔ لاؤ سوئی دھاگہ میں تنگ کر دیتی ہوں۔۔۔۔۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“

”جناب دماغ ہوتا چاہئے دماغ۔۔۔۔۔“

”دونوں نے مل کر گریبان سی دیا پشت پر بھی چٹنیں ڈال کر پھیلا گلاتنگ کر دیا۔

”لو اب ٹھیک پہن لو۔۔۔۔۔“

زری نے کپڑے اٹھائے اور ڈرنسنگ روم میں چلی گئی۔۔۔۔۔

شہنو نے ہنس کر کہا ”تھوڑی سی بولڈ ہو جاؤ۔۔۔۔۔ ویسے بھی گھر پہ لی بی گل نہیں ہیں اور نہ ہی

خان بابا اس وقت آفس سے آئیں گے۔۔۔۔۔ اتروالو تصویریں۔۔۔۔۔ پوری کرو شہباز لالہ کی فرمائش۔۔۔۔۔ کیا جاتا ہے

تمہارا۔۔۔۔۔ بچا رہے میرا بھائی۔۔۔۔۔“

وہ ہنستے ہوئے رسالہ اٹھا کر دیکھنے لگی۔

زری نیالباس پہن کر باہر نکلی۔۔۔۔۔ تو واقعی یہ لباس اس پر بہت اٹھاتا تھا۔

”اے ہے قربان جاؤں۔۔۔۔۔ قیامت کا روپ دھار رہے۔۔۔۔۔ شہباز لالہ بچا رہے ایسے ہی تو یقیناً

نہیں تھے۔۔۔۔۔“

”بس کرو۔۔۔۔۔“

”سچ کہہ رہی ہوں۔۔۔۔۔ بہت پیاری لگ رہی ہو۔۔۔۔۔ لاؤ تمہارے بال میں خاص اشائل سے بنا

دوں۔۔۔۔۔“

”شہباز کو تو ان بالوں سے بھی پڑ ہے۔“

”کیا؟“

”ہاں شہنو۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں میں نمی حیر گئی۔۔۔۔۔ اپنے بالوں کو ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی

”کتنے پیارے ہیں میرے بال۔۔۔۔۔ لیکن ان کی ضد ہے کہ کٹوا دوں۔۔۔۔۔“

”ہائے اللہ۔۔۔۔۔ یہ شہباز لالہ کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔۔۔۔۔ میرے تو بال بڑھتے ہی نہیں ورنہ میں بھی

کبھی نہ کٹواتی۔۔۔۔۔ خبردار ان کی باتوں میں نہ آتا۔۔۔۔۔ ایسے ہی جو منہ میں آئے کہہ جاتے ہیں۔“

شہنو نے شہباز کو برا بھلا کہا۔۔۔۔۔

پھر

زری کے بالوں کو خوب صورتی سے سنوارا۔۔۔۔۔ اور پیار اسٹاڈھیلا ڈھالا جوڑا بنا دیا۔

زری بے حد اچھی لگ رہی تھی۔۔۔۔۔

”جاؤ اب۔۔۔۔۔ بنوالو تصویریں۔“

زری جاتے ہوئے جھجک رہی تھی۔۔۔۔۔

”اس کے ساتھ دوپٹہ ہوتا ہی نہیں۔۔۔۔۔“ شہنو نے کہا ”ڈھیلا ڈھالا تو ہے۔۔۔۔۔“

”لیکن میں تو دوپٹے بغیر نہیں جاؤنگی۔۔۔۔۔“

”تو کسی رنگ سے ملتا ہوا اوڈھ لو۔۔۔۔۔ تین رنگ ہیں لباس میں۔۔۔۔۔“

زری نے ہلکے زرد رنگ کا دوپٹہ الماری سے نکالا اور کندھوں پر ڈال لیا۔۔۔۔۔

شہنو اسے ساتھ لے کر کمرے سے باہر نکلی۔۔۔۔۔

”جاؤ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ اس طرف کھڑے ہیں شہباز لالہ۔۔۔۔۔ نوکروں کے بچوں کی تصویریں لے

رہے تھے وہاں۔۔۔۔۔“

”تم بھی آؤ نا۔۔۔۔۔“ زری نے کہا۔

”میں.....“ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ”خواہ مخواہ کباب میں ہڈی بننے..... نہ بھی.....“
 ”بڑی خراب ہو.....“

”خراب نہیں جناب..... ہم تو انتظار میں ہیں..... تمہارے ساتھ کیوں جائیں..... اپنے کمرے میں بیٹھ کر انتظار کیوں نہ کریں.....“
 ”کس کا.....“

”اوہ..... اچھا..... زرگل لالہ آئیں گے آج.....“

”جی جناب.....“

شہنو نے زری کو لان میں دھکیلا اور خود ہنسنے ہوئے واپس مڑ گئی.....
 زری قدم قدم چلتی لان میں آگئی..... شہباز پھولوں کی کج کے قریب کھڑا تھا..... کچھ بچے اس کے ارد گرد کھڑے تھے..... جنہیں زری کے آنے پر اس نے چلنا کر دیا.....
 زری جھجھک جھجھک کر قدم اٹھا رہی تھی..... شہباز نے اس کی طرف دیکھا..... وہ اس ڈریس میں تھی جو شہباز نے پہننے کے لئے کہا تھا..... اسے اپنی جیت کا احساس ہوا..... کچھ سرشاری کی سی کیفیت محسوس ہوئی..... چند خیر مقدمی قدم اٹھاتے وہ اس کے سامنے آگیا.....
 زری سر جھکا کر کھڑی ہو گئی.....

شہباز نے اس کے سراپا پر بھرپور نگاہ ڈالی.....

”تم بہت اچھی ہو زری.....“ اس نے جذباتی لہجے میں کہا.....

زری نے اک شاکی سی نگاہ اس پر ڈالی جیسے کہہ رہی ہو..... تمہارا زبردستی کا انداز تشویش کا باعث ہے شہباز ہر بات اپنی ضد سے منوالیتے ہو.....

”آؤ ادھر.....“ شہباز نے پھولوں بھرے کج کی طرف اشارہ کیا..... ”بہت اچھی تصویریں آئیں گی.....“

زری کج میں پڑے پتھر کی طرف بڑھی.....

اس پتھر پہ بیٹھ جاؤ.....“ شہباز نے کہا.....

”زری پتھر بیٹھ گئی“

شہباز نے نگاہ شوق اس پر ڈالی..... لیکن یہ نگاہ اس کے دوپٹے سے الجھ گئی جسے اس نے نیچے

تک سینے پر ڈال رکھا تھا.....

یہ دوپٹہ.....“ شہباز کیمرا ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے بولا.....

”جی.....“ زری نے سسم کر اسے دیکھا.....

”اس ڈریس کے ساتھ دوپٹہ.....؟“ شہباز نے ہلکا سا مسخرانہ قہقہہ لگایا.....

زری کے چہرے پر پتھر کی سی سنجیدگی اتر آئی.....

”میں نے دھیان ہی نہیں دیا تھا..... بھی یہ ڈریس دوپٹے کے بغیر ہوتا ہے..... اتار دو دوپٹہ.....“

”نہیں“ زری جلدی سے بولی.....

”کیوں نہیں..... ڈریس کی ساری خوب صورتی جاتی رہے گی“ شہباز نے کہا.....

”لیکن میں.....“ وہ ہلکائی.....

”پلیز زری.....“ شہباز نے لجاجت سے کہا.....

”شہباز ایسی ضد نہ کیا کریں..... جو پوری کرنا میرے لئے ممکن نہ ہو.....“ وہ ہولے سے

بولی.....

”میری ہر بات کو تم ضد کیوں سمجھتی ہو.....“ شہباز چمک کر بولا.....

”تم مجھے سمجھتی ہی نہیں ہو.....“ وہ روٹھا روٹھا بولا.....

”یہ کیسے کہہ سکتے ہیں آپ..... میں آپ کو..... اچھی طرح سمجھتی ہوں.....“ وہ جلدی سے

کہہ گئی.....

”سمجھتی ہو تو شاید مجھے پسند نہیں کرتیں.....“ شہباز نے تیر چھوڑا.....

”جی.....“ وہ بے طرح گھبرا گئی.....

”ہاں یہی بات ہوگی..... اسی لئے تو میری ہر بات تمہیں ضد لگتی ہے.....“ شہباز تلخی سے بولا.....

”شہباز.....“ وہ روہانسی ہو گئی.....

چند لمبے دونوں الجھے الجھے رہے.....

پھر شہباز نے کھردرے لہجے میں کہا..... ”تصویریں نہیں اتروانی تو واپس جاسکتی ہو.....“

زری چپ چاپ بیٹھی رہی..... اس کے چہرے پر کرب و اذیت کے سائے لہرا رہے تھے.....

شہباز ناراض ہو گیا تھا.....

اس کی ناراضگی وہ برداشت بھی تو نہیں کر سکتی تھی.....

چند لمبے وہ ذہنی کشمکش میں مبتلا رہی.....

پھر
اس نے کچھ سوچ کر دہیہ اتار کر قریبی جھاڑی پر ڈال دیا۔
شہباز کے چہرے پر فالتحانہ چمک لہرا گئی..... مسکراہٹ ہونٹوں میں دباتے ہوئے بولا ”تم بہت
اچھی ہو زری..... بہت اچھی.....“
زری کے چہرے پر وہی پتھر جلی بخید گئی تھی.....

شہباز نے کسرہ ہاتھوں میں پکڑ کر زری کو پتھر بیٹھے بیٹھے دائیں رخ دیکھنے کو کہا۔ یہ پوز بیحد
خوب صورت تھا۔

پھر
اس نے ایک دو تین نہیں پوری بارہ تصویریں کھینچیں.....
وہ بہت خوش تھا.....

وہ بار بار زری کی تعریف کر رہا تھا..... اسے پر شوق نظروں سے دیکھ رہا تھا.....
جب دونوں واپس ہوئے تو شہباز زری سے کہہ رہا تھا..... ”تم میری پسند کا احساس کیا کرو
زری..... میں تمہیں ایک دم ماڈرن دیکھنا چاہتا ہوں..... گاڑی چلانا سیکھ رہی ہو نا..... گھڑ سواری کی بھی پریکٹس کرتی
رہا کرو..... یہ بڑی بڑی چادریں اوڑھنا چھوڑ دو..... جھجک دور کرو..... سو نمٹنگ سیکھو بس ایک دم سے ماڈ
ہو جاؤ..... مجھے ایسی لڑکیاں ہی اچھی لگتی ہیں..... سلم سارٹ..... ماڈرن..... زمانے کی جدیدیت کا ساتھ دینے
والی..... شوخ و شنگ..... بے دھڑک بولنے والی بولڈ لڑکیاں..... اور ہاں..... ذرا..... دیکھو برا نہیں ماننا..... اپنا
دزن کچھ کم کرو..... ڈانٹنگ کیا کرو..... اس طرح تو سال دو سال میں تم بالکل ہتکینے چاچی بن جاؤ گی.....“ شہباز
نے چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔

زری کچھ نہیں بولی.....

اس کے ذہن میں تو تلاطمی کیفیت تھی.....

شہباز اکثر ایسے خیالات کا اظہار کیا کرتا تھا..... اور یہ اعتمار زری کے ذہن میں قیامت کی
بے چینیاں بھردیا کرتا تھا.....

(۳۳)

”شہباز خان“

”ہوں“

”کہاں ہوتے ہو آج کل.....“

”کیوں..... بیس ہوتا ہوں.....“

”کم ہی نظر آتے ہو..... کل شام بھی میں ہوٹل آیا..... پتہ چلا جناب اپنے کسی دوست کے
ساتھ باہر گئے ہوئے ہیں.....“

”اوہ ہاں..... عمر کے ساتھ..... گیا تھا.....“

”یہ عمر شریف کون ہیں..... حدود اربعہ کیا ہے ان کا.....“

”میرا دوست ہے عثمان..... بہت اچھا لڑکا ہے.....“

”اس کی دریافت!“

”پلٹن میں ہوئی.....“

”وہاں ملازم ہے“

”اے نہیں.....“

”تو.....“

”اس رات غوث نے مجھے ڈنر پر بلایا تھا نا.....“

”ہاں“

”عمر بھی مدعو تھا..... تمہیں اس سے ملاؤں گا۔ بہت نفیس لڑکا ہے“

”کرنا کیا ہے“

”جواب کر رہا ہے۔ ایم بی اے کیا ہوا ہے۔ مزید تعلیم کے لئے امریکہ جانا چاہتا ہے۔ اس کے ڈیڑی قمر احسان صاحب کی سرپرستی کی مل ہے۔ لیکن وہاں کام نہیں کرتا۔ بالکل میری طرح ہے۔ میرے خان بابا نے بھی شوگر مل میرے لئے لگائی ہے۔ لیکن میں مل میں کام کرنے کی بجائے جواب کرنا پسند کروں گا۔“

”تمہاری کیا بات ہے یار۔ کام کرو نہ کرو فرق نہیں پڑے گا۔ جک بھرے ہیں تمہارے“

”لیکن بیکار بھی تو وقت نہیں گزر سکتا عثمان صاحب۔“

”یہ تو ہے۔“

”او۔ ہاں۔“

”کیا؟“

”ایک پروگرام بنایا ہے۔“

”کس نے۔“

”میں نے۔“

”کیسا پروگرام۔“

”تین چھٹیاں آرہی ہیں۔“

”ہاں۔“

”ندیم انجم نے پشاور نہیں دیکھا۔“

”تو۔“

”وہ میرے ساتھ ان چھٹیوں میں پشاور جا رہے ہیں۔ تم بھی چلو گے اور عمر بھی“

”میں۔“

”کیوں تمہیں کیا ہے۔ آنٹی انکل سے میں اجازت دلوا دوں گا۔ یار تمہارے شہر کی تو

لڑکیاں اجازت و اجازت کے پکروں میں نہیں پڑتیں تم۔“

”خیر یہ بات بھی تمہارے مغز میں ایسے ہی تھس گئی ہے۔“

”میں نے برے سینس میں نہیں کہا۔ مجھے تو یہی بات پسند ہے۔ جیو اور آزادی سے

جیو۔ ہمارے ہاں یہ نہیں ہے نا عثمان۔ ہمیں خان بابا کی پسند نا پسند پر جینا پڑتا ہے۔“

”میرے خیال میں یہ تمہارے خان بابا کی بے پناہ محبت کا نتیجہ ہے“

”ہو نہ۔“

”اب دیکھو نا۔ تمہارا انہیں کتنا خیال ہے۔ گاڑی بھجوا دی۔ کہ صاحبزادے کو رہنے سہنے میں تکلیف نہ ہو۔“

”اب گھر خرید بھی لیں تو مضائقہ نہیں۔ تم فائل ایئر میں ہو۔ اور چار سال یہاں رہ کر میچور ہو گئے ہو۔ ہیں نا۔“ عثمان نے جواب دیا۔

”ویسے اب باخترید ہی لیں تو اچھا ہے۔ امتحانوں کے بعد میں لاہور ہی میں رہوں گا۔“

”واپسی سے فرار۔“

”نہیں فرار کہاں۔ کھونٹے سے باندھ دیا ہے بچپن ہی میں کسے تروانے کی کوشش کروں

گا۔ تو بابا شوٹ کر دیں گے۔“

شہباز نے ہنس کر کہا۔ تو عثمان حیرانگی سے بولا۔ ”کیا واقعی؟“

”اور نہیں تو کیا“ شہباز بولا۔ ”ہمت سخت قسم کی شے ہیں میرے بابا۔ جان جاتی ہے

میری توان سے۔“

”لیکن پھر بھی من مانی کر لیتے ہو۔“

”یہ ان کی سختی کا رد عمل ہے۔“

”اچھا تو پھر گھر خرید رہے ہیں۔“

”ہاں گلبرگ ہی میں کوئی کوٹھی دیکھ گئے تھے پچھلی دفعہ۔ دراصل وہ لاہور میں ریست ہاؤس

ٹائپ گھر رکھنا چاہتے ہیں۔“

”ہوں۔“

”اچھا تو پھر تیار رہنا۔ تین دن کا پروگرام ہے۔ تمہیں اپنا علاقہ دکھاؤں گا عثمان! اپنے

لوگوں سے ملو اس گا۔ شکار پر چلیں گے۔ دنبہ پارٹی ہوگی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ تم جیسے میزبان سے اس سے بھی زیادہ کی توقع ہو سکتی ہے۔ لیکن۔“

”لیکن کیا۔“

”یار فائل اگزا مزر سر پر آرہے ہیں۔ یہ عیاشی امتحانوں کے بعد میں تو ہو سکتی ہے پہلے

نہیں۔“

شہباز نے قہقہہ لگاتے ہوئے عثمان کی پشت پر دھپ سے ہاتھ مارا۔ ”ابھی سے امتحانوں کی

فکر۔ یار غور دلی دور است۔ آٹھ نومبر پڑے ہیں ابھی تو۔“

”تیار کے لئے کچھ زیادہ وقت نہیں مجھے اسی سال پاس ہوتا ہے اور ماسٹرز کی ڈگری لینے کے لئے امریکہ جانا ہے۔“

”اتنے پڑھا کو نہیں بنو تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ ورنہ۔۔۔“

”ورنہ۔۔۔“

”ورنہ شوٹ کروں گا۔۔۔“

دونوں نے اس بات پر مشترکہ قہقہہ لگاتے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

تھوڑی دیر دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کھڑے رہے۔

”آئی انکل سے اجازت لینے کا مسئلہ ہو۔ تو بندہ حاضر ہے۔“

”اوہ نہیں یار۔ ایسی بات نہیں جائز کاموں میں وہ ناجائز رکاوٹیں نہیں ڈالتے۔“

عثمان نے ہنس کر کہا۔

”بہت مکی ہو تم لوگ۔۔۔ وہ عمر ہے اس کے ممی ڈیڈی بھی ایسے ہی ہیں۔“

”کسی دن ملاؤنا اپنی دریافت سے۔۔۔“

”ضرور۔ اچھا لڑکا ہے۔ تم اس سے مل کر یقیناً خوش ہو گے۔“

”مزاج ملنے کی بات ہے۔ مل گئے تو خوش نہ ملے تو بس سلام۔“

عثمان نے ہنس کر ہاتھ ماتھے سے لگا کر سلام کی ادا کاری کی تو شہباز مسکرا کر بولا۔

”مزاج تو تمہارا مجھ سے بھی نہیں ملتا۔ لیکن چار سال سے نہ رہی ہے ہماری بھی۔“

”چار سال سے تمہیں برداشت کئے جا رہا ہوں“ وہ ہنس کر بولا۔ ”صرف اس لئے۔“

”کہ۔۔۔“

”کہ۔۔۔ کیا۔۔۔“

”کہ تم اک مخلص انسان اور اچھے دوست ہو۔“ وہ ہنس دیا۔

”شکریہ نوازش۔ کرم نوازی۔“ شہباز نے جواباً کہا۔

تھوڑی دیر دونوں باتیں کرتے رہے۔

”بڑے دن ہو گئے۔ تم ہماری طرف بھی نہیں آئے“ عثمان نے کہا ”مئی تمہارا پوچھ رہی

تھیں۔۔۔“

”انہیں میرا سلام کہنا۔ پتہ نہیں کیوں نہیں آ سکتا تمہاری طرف۔ دراصل پچھلے مہینے دو

دفعہ پشاور جو جانا پڑا۔۔۔“

”دو دفعہ۔۔۔“

”ہاں۔۔۔ تمہیں نہیں پتہ۔۔۔“

”نہیں۔۔۔“

”میرے نانا فوت ہو گئے تھے نا۔۔۔“

”وہ تو پتہ ہے۔۔۔ تمہیں میں نے ہی تو ایئر پورٹ چھوڑا تھا۔۔۔“

”دو ماہ پہلے کی بات کر رہے ہو۔ پچھلے مہینے دو دفعہ جانا پڑا مجھے۔ ایک دفعہ تو نانا کے چہلم پر

دوسری دفعہ خان بابا کے بلانے پر۔ کچھ حساب کتاب کا معاملہ تھا۔“

”کتنا مال ملا؟“ عثمان نے ہنس کر پوچھا۔

”بس اللہ کا فضل ہے؟“ خان بابا ہر سال ہمارے حصے کی رقیں ہمارے اکاؤنٹس میں جمع کرا

دیتے ہیں۔۔۔“

”تم تو طالب علمی کے زمانے ہی میں بھاری بھر کم آسای بن گئے ہو۔ یہ تم پر تمہارے خان

بابا کا کتنا بڑا احسان ہے۔“

”ہے تو۔۔۔“

”پھر بھی روٹا روتے رہتے ہو۔۔۔“

”میں نے پیسے کاروبار دیا کبھی۔ صرف ان کی سخت گیری سے ٹالا ہوں۔ میرا دل بھی

چاہتا ہے خان بابا تمہارے ڈیڈی کی طرح میرے دوست ہوں۔ ماحول میں گھسن نہ ہو۔ پابندیاں نہ ہوں۔

آزادی چاہتا ہوں میں آزادی۔۔۔ سمجھے۔۔۔“

دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ پشاور جانے کی حای عثمان نے بھر لی۔ اس نے بھی

سرحدی علاقہ نہیں دیکھا تھا۔ موقعہ بن رہا تھا۔ دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کا لطف بھی آتا ہے۔ ویسے

بھی وہ شہباز کے گھر اس کے گاؤں اور اس کے ماحول کو دیکھنا چاہتا تھا۔ شہباز سے باتیں سن کر اسے خاصہ

اشتیاق بھی تھا۔

وہ واپس جانے لگا تو شہباز نے پھر وعدہ لیا۔

”اب عین وقت پر جانے سے انکار نہیں ہو گا سمجھے۔۔۔“

”نہیں ہو گا یار۔ چلیں گے ضرور۔“ عثمان نے کہا۔ پھر مسکرا کر بولا ”اپنی ہونے والی

بہابی کو بھی دیکھ لیں گے اسی بھانے۔۔۔“

”اے۔۔۔“ شہباز نے گوجندار لہجے میں کہا۔ تو عثمان نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔

”کیوں؟“

”ایسی کوئی خواہش لے کر نہیں جانا میرے ساتھ.....“ شہباز نے رعب کی اداکاری کی.....

”کیوں؟“

”شوٹ کر دیئے جاؤ گے..... لاش کا بھی کہیں پتہ نہ چلے گا.....“ وہ ہنس کر بولا.....

”کیا بہت پردہ ہوتا ہے تمہارے ہاں.....“

”پردہ بھی ہے اور..... دستور بھی..... ہماری عورتیں غیر مردوں کے سامنے بالکل نہیں

آتیں..... بچو سنبھل کے رہنا..... بھابی کو دیکھنے کے جوش میں تانک جھانک کی کوشش کی نا تو دھڑلے جاؤ گے

ہاں.....“

عثمان نے آنکھیں پھیل کر گھمائیں.....

شہباز ہنس پڑا.....

دونوں کچھ دیر یہی باتیں کرتے رہے.....

دوسرے دن شہباز نے عمر اور عثمان کا تعارف کروا دیا..... دونوں تپاک سے ملے.....

پشاور جانے کا پروگرام بن گیا..... شہباز نے خان بابا کو فون کر دیا..... زرگل سے بھی بات

ہوئی..... پٹھان مزاج اسمان نواز..... ہیں..... اس بات سے خان بابا اور زرگل دونوں ہی بہت خوش ہوئے.....

زرگل نے تین دن کا پروگرام بنالیا..... اس میں شکار پہ جانا بھی شامل تھا..... حجرے میں گانے

بجانے کی محفل کا اہتمام بھی تھا..... اور خیبر پاس لنڈی کوتل، طورخم اور دوسرے علاقے گھومنے پھرنے کی بھی

گنجائش تھی.....

پشاور جانے کی تیاری ہو گئی..... عثمان کی مئی شہباز کو عرصے سے جانتی تھیں..... اس کے گھر

والوں سے غائبانہ تعارف تھا..... اس لئے انہوں نے اس کی بی بی گل، شہینو اور زری کے لئے تحفے خریدے اور

بڑی محبت سے عثمان کو دیئے.....

انجم اور ندیم بھی تیار تھے..... لیکن عمر کا پروگرام عین وقت پر کینسل ہو گیا..... اس نے بڑی

معذرت کی..... شہباز کو غصہ آ گیا.....

”کمال کرتے ہو عمر.....“ وہ بولا..... ”عین وقت پر انکار کر رہے ہو.....“

”تمہیں اپنی مجبوری بتادی ہے..... پھر کبھی سی.....“

”پھر کبھی بھی نہیں..... سمجھے.....“

”یار بگڑتے کیوں ہو..... جانتے ہو مجھے پشاور دیکھنے کا سب سے زیادہ شوق تھا..... اب

ڈیڈی..... کا کام ہے..... چلا گیا نا تمہارے ساتھ تو ہزاروں کا نقصان ہو جائے گا انہوں نے..... میرے

ذمے.....“

”چلو بس کرو..... فیکٹری کے قریب بھی نہیں پھٹکتے اور لگے ہیں ڈیڈی کے کام کرنے.....“

”کمانا پھر سہی تمہارے امتحانوں کے بعد چلیں گے.....“

شہباز کاموڈ آف ہو گیا..... لیکن عثمان ندیم اور انجم نے دلچسپ باتوں اور خوشگوار انداز سے اس

کا دماغ ٹھنڈا کر ہی دیا.....

چاروں علی الصبح لاہور سے روانہ ہوئے..... راستے میں پنڈی دو تین گھنٹے قیام و آرام کرنا

تھا..... ندیم تو پنڈی بھی کبھی نہیں آیا تھا..... اور انجم نے اسلام آباد بھی نہیں دیکھا تھا..... اسلام آباد ان دنوں

آج کی طرح نہیں تھا..... نیا نیا آباد ہوا تھا..... سرکاری اور غیر سرکاری بلڈنگیں دھڑا دھڑن رہی تھیں..... کئی فیز

ابھی تک سنسان ویران تھے..... سڑکیں اور شاہراہیں بن چکی تھیں..... صاف ستھرے علاقوں میں فلیٹ کوٹھیاں

اور بنگلے بنے ہوئے تھے..... آب پارہ کی مارکیٹ مکمل تھی..... بیس رونق اور گہما گہمی ہوتی تھی..... شکر پڑیاں

لوگ تفریح کے لئے آتے تھے.....

شہباز تو کئی دفعہ اسلام آباد چلا چکا تھا عثمان نے بھی دو ایک مرتبہ دیکھا ہوا تھا..... لیکن انجم اور ندیم

مصر تھے..... کہ اسلام آباد کا چکر ضرور لگائیں گے.....

”تم میرے مہمان ہو..... اس لئے اسلام آباد کا چکر لگالو گا..... یہ بات نہ ہوتی تو کان پکڑ کر

تمہیں گاڑی میں بٹھاتا اور سیدھا پشاور لے جاتا“ شہباز نے ہنس کر دونوں سے کہا.....

”یار..... اب آئے ہیں تو پکڑ لگالینے میں کوئی ہرج بھی نہیں.....“ ندیم بولا.....

”پشاور پہنچنے میں دیر ہو جائے گی“ عثمان نے کہا..... ”سورج غروب ہونے سے پہلے پشاور پہنچ

جائیں تو اچھا ہے..... سنا ہے نوشہرے سے پشاور تک کے علاقے میں رات کو سفر ٹھیک نہیں ہوتا.....“

شہباز نے عثمان کی بات پر قہقہہ لگا یا اور اس کی پشت پر تھپکا دیئے ہوئے بولا ”حد کرتے ہو یا.....“

شہباز خان کے ساتھ جارہے ہو..... اور ایسی باتیں کرتے ہو.....“ عثمان کچھ عجوب سا ہو گیا.....

پنڈی کھانا کھانے کے بعد شہباز انہیں اسلام آباد لے گیا..... گھوم پھر کر چار بجے کے قریب

سب واپس لوٹے..... دور میانی راستے ہی سے شہباز جی ٹی روڈ پر آ گیا.....

تھوڑی دیر کے لئے ڈرائیونگ کے فرائض عثمان نے بھی ادا کئے..... چاروں دوست ہستے

مسکراتے باتیں کرتے پشاور پہنچ گئے۔

زرگل انہیں خوش آمدید کہنے کے لئے گیٹ پر موجود تھا۔

اس سے مل کر سب بہت خوش ہوئے۔

رات یہیں قیام تھا۔ دیر تک گپ شپ لگی۔ خان بابا بھی کچھ دیر کے لئے شہباز کے دوستوں کے پاس بیٹھے۔ عثمان ان کی شخصیت سے بہت مرعوب ہوا۔ اس کا بی تو بہت چاہا کہ شہباز کی امی سے بھی ملے لیکن شہباز نے پہلے ہی واضح کر دیا تھا۔ اس لئے وہ اپنی خواہش کے اظہار کی جرأت نہ کر سکا۔

دوسرے دن زرگل انہیں گاؤں لے گیا۔ دوپہر دریا کے کنارے محفل جمی کھانا بھی دیں کھایا گیا۔ پورا دن روست ہوا تھا۔ نوکر چاکر سب ساتھ تھے۔ کار تو سوں کی پٹیاں کندھوں پر ڈالے ہوئے لٹر میں بھرے پستول کندھوں پر چادر میں رکھے تھے والی ٹوپیاں اور واسکتیں پہنے۔ دانتوں میں سوار کی چٹکیاں بھرتے کھلے کھلے لباسوں اور چمڑے کے چپلوں والے محافظ اور ملازم لاہوری دوستوں کے لئے نئی چیز تھے۔

رات حجرے میں گائے کی محفل جمی۔ گاؤں کے خوش گلوں نے نچے اور لوبھ گا کر رنگ جمادیا۔ ندیم انجم اور عثمان پشتو سے تابلد تھے۔ لیکن موسیقی کی کوئی زبان نہیں ہوتی یہ تو تاریکی کیفیت ہوتی ہے۔ سوز و گداز کی لہریں روح کے اندر اترتی ہیں۔ اور انسان مسحور ہو جاتا ہے۔ الفاظ سمجھ نہیں آرہے تھے۔ لیکن تینوں سردھن رہے تھے۔ محفوظ ہو رہے تھے۔ کسی کسی شعر کا ترجمہ زرگل انہیں بتا رہا تھا۔

اگلادن شکار کے لئے مخصوص تھا اس سے اگلے دن طور خم جانا ہوا اور اتفاق ہی سے اک جرگے کی کاروائی دیکھنے کا بھی اتفاق ہو گیا۔

زرگل اور صبور خان کی مہمان نوازی اور شفقت بھرے رویے نے ان کے دل جیت لئے۔ خان بابا کے پیار و خلوص نے بھی متاثر کیا۔ عثمان کے ذہن میں شہباز کی باتوں سے جو تصور جمنا تھا۔ وہ اس کے بالکل الٹ نظر آئے۔ وہ حیران تھا کہ اتنی شفیق ہستی سے شہباز نالاں کیوں ہے۔

تین چٹیاں گزرتے پتہ بھی نہ چلا۔ سب نے اس تقریبی دورے کو بہت انجوائے کیا شہباز اور گاؤں دونوں جگہ اتنی خاطر مدارت ہوئی تھی کہ سب مہمان دگدگ رہ گئے تھے۔ عثمان نے زرگل کو لاہو آنے کی پر زور دعوت دی۔

چوتھے دن سب واپس لاہور روانہ ہو گئے۔

۴۴

کھانے کی میز پر شہنواز اور زری بیٹھی تھیں۔ بی بی گل اور خان بابا آج گاؤں گئے تھے۔ ان کی چھو بھی زاد جینے کے بڑے نواسے پر کسی نے قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ وہ بال بال بچا تھا۔ اس کا خاندانی ملازم اس حملے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ قاتلوں کا سراغ نہیں ملا تھا نواز خان اور دشمنینے احوال پر سی کو گئے تھے۔

شہنواز اور زری انہی کی باتیں کر رہی تھیں۔

”پتہ نہیں ہمارے لوگوں کو کب عقل آئے گی۔ ذرا فوری بات پر مرنے مارنے پر قتل جاتے ہیں۔ شہزاد گل پر جس نے قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ وہ اب بچ تھوڑا ہی سکے گا۔ شہزاد گل کے بھائی بھتیجے پستولیں اس وقت تک رکھیں گے تھوڑا ہی جس وقت تک ان کی گولیاں دشمن کے سینوں میں نہ اتار لیں گے۔“

شہنواز نے بیزار سی کہا۔

”بدلہ لے کر ہی انتقام کی آگ ٹھنڈی ہوتی ہے۔“ زری کچھ بھی بھی سی تھی۔

”لیکن اس طرح تو دشمنی کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلتا ہے نا۔“

”بالکل۔“

”یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہوتی۔“

”ہوں۔“

”شہباز لالہ ایک طرح سے تو سچے ہی ہیں۔ ان کی اس لئے تو بنی نہیں اپنے لوگوں

سے۔“

زری نے کھانے سے ہاتھ روک کر شہنواز کی طرف دیکھا۔

”شہباز۔ اپنے مرکز سے چھوٹے جا رہے ہیں۔“ زری نے چند لمحوں بعد ہولے سے

کہا۔

شہنو ہنس کر بولی ”خیر یہ بات تو نہیں..... ویسے انہیں یہ روایتی دشمنیاں..... یہ انتقامی وارداتیں پرانے ریت رواج اچھے نہیں لگتے۔“

”لاہور جا کر ماڈرن ہو گئے ہیں۔“

”ہم سے زیادہ دنیا دیکھ لی ہے..... زیادہ لوگوں سے مل چکے ہیں..... ان میں تو ذرہ بھر تبدیلی نہیں آئی..... جیسے تھے ویسے ہی ہیں..... بلکہ چار سال دور رہنے سے اپنوں کے اور قریب ہو گئے ہیں۔“

شہنو اس کی بات کی سنجیدگی کو شوخی میں اڑاتے ہوئے بولی ”تمہارا بھائی ٹھہرا ہوا پانی ہے..... جو ایک ہی جگہ صدیوں ٹھہرا رہتا ہے..... شہباز لالہ اس کے بالکل برعکس ہیں..... وہ تو..... پہاڑی چشمے کی طرح ہیں..... جو پتھروں کے درمیان سے پھوٹتا ہے اور نیشیوں کی طرف اچھلتا کودتا چلتا۔“

”مجھے تو پہاڑی چشمے کی بجائے وہ برساتی نالہ زیادہ لگتے ہیں۔“

”کیا کہا..... برساتی نالہ۔“

”ہاں شہنو..... برساتی نالہ جو بارشوں میں بڑی گھن گرج کے ساتھ بہتا ہے..... اور بارشیں ختم ہو جائیں تو.....“

”دیکھ زری.....“ شہنو شوخی سے بولی ”میرا بھائی لاکھوں میں ایک ہے..... میں اس کے خلاف کچھ سننا پسند نہیں کروں گی۔“

زری نے شوخی کو سنجیدگی سے لیا..... کھانے سے ہاتھ رک گیا..... اس کی خوب صورت آنکھوں میں کریناک سی نمی تیر گئی.....

شہنو شوخی بھول کر جلدی سے بولی ”کیوں کیا ناراض ہو گئیں.....“

اس نے نفی میں سر ہلایا.....

”تو کھانے سے ہاتھ کیوں کھینچ لیا.....“ شہنو بولی.....

”بس کھالیا.....“

”اتنا تھوڑا.....“

”جتنی بھوک تھی کھالیا.....“

”میں دیکھ رہی ہوں..... تم نے کھانا بہت کم کر دیا ہے.....“

”شاید.....“

”ڈانٹنگ کر رہی ہو.....“

”موٹی ہوں نا.....“

شہنو نے اسے دیکھ کر تسخیر سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ”کیا کہا..... موٹی ہو..... ہائے اللہ..... اتنا خوب صورت جسم ہے بھر بھرا اسے مونٹا کمرہ رہی ہو۔“

”ہاں.....“ اس نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا.....

”زری.....“ کئی بات پر اس کی سنجیدگی سے جھنجھلا کر شہنو نے پھر پوچھا.....

”کچھ نہیں.....“

”اداس اداس لگ رہی ہو.....“

”نہیں تو.....“

”کھانا بھی نہیں کھا رہیں..... حالانکہ تمہاری پسندیدہ ڈشیں بنی ہوئی ہیں..... کئی دنوں سے تم.....“

ادھورا سا کھانا کھاتی ہو..... ڈانٹنگ کی ضرورت تو نہیں..... پھر یہ.....“

”ضرورت ہے.....“

”کیوں.....“

”کھانا موٹی ہو رہی ہوں.....“

”دماغ ٹھکانے پہ ہے یا نہیں..... کون کتا ہے تم موٹی.....“

”تمہارا بھائی.....“ ایک دم سے زری نے کہہ دیا..... تو شہنو ہونفوں کی طرح اس کا منہ تکتے ہوئے بولی..... کیا شہباز لالہ نے کہا ہے.....“

”ہاں.....“ زری کی آواز بھرا گئی.....

”زری شہباز لالہ نے مذاق کیا ہو گا..... تمہارے قد کاٹھ کے لحاظ سے تمہارا جسم موزوں تو ہیں.....“

ہے..... تم نے ڈانٹنگ کی نا تو فگر کا ستیا ناس کر لو گی..... کالج کی لڑکیاں تو تم پر رشک کرتی ہیں..... اتنا خوب صورت جسم ہے تمہارا..... دہلی پتلی سوکھی سوکھی لڑکیاں تو مجھے زہر لگتی ہیں.....“

”تمہارے بھائی کی پسند تم سے مختلف ہے.....“

”نہیں.....“

”ہاں شہنو.....“ زری کی آنکھوں میں مچلتے آنسو بہہ نکلے..... وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی.....

شہنو کھانا بھول گئی..... نپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے جلدی سے اٹھ کر زری کی طرف آئی..... اس کے گلے میں بازو ڈال کر بڑے پیار سے پکارنے لگی.....

”زری..... کیا ہوا ہے..... شہباز لالہ نے کچھ کہا..... لڑائی ہو گئی؟ بتاؤ نا.....“

چند لمبے زری سکتی رہی.....

پھر انچل سے آنسو پونچتے ہوئے کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی..... شہنو بھی اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی باورچی خانے میں سے نوکروں کی آوازیں اور برتنوں کی کھٹ پٹ سنائی دے رہی تھی..... شاید کوئی خدمت گار کھانے کے کمرے کی طرف بھی آ رہی تھی..... زری نے قدم اٹھایا..... ”تم کھانا کھاؤ شہنو..... میں کمرے میں جا رہی ہوں.....“

”اس طرح میں کھانا کھا سکوں گی“ شہنو بولی..... اور اس کے ساتھ ساتھ چلتے کمرے سے

باہر نکل آئی.....

زری اپنے کمرے کی طرف بڑھی..... شہنو بھی اس کے ساتھ ساتھ تھی.....

”کیا بات ہے زری بتاؤ گی نہیں“ شہنو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف

گھم لایا۔ زری مسکراتے لگی..... اس کی روتی مسکراہٹ نے شہنو کو اور بے چین کر دیا.....

”شہباز لالہ نے کچھ کہا تھا اس دفعہ.....“

زری چند لمحے چپ کھڑی اپنے دوپٹے کے کونے کو مسلط رہی

”بتاؤ نا.....“

”اس دفعہ کیا.....“ زری ہولے سے بولی ”ہر دفعہ کہتے ہیں.....“

”کیا؟“

”کوئی ایک بات تو نہیں شہنو.....“ زری نے افسردہ سے لہجہ میں کہا.....

”پھر بھی.....“

”اس نے اک گہری سانس لی اور بولی ”شہباز جب سے لاہور گئے ہیں..... ان میں تبدیلی آگئی

ہے“

”یہ تمہارا وہم ہے“ وہ جلدی سے بولی ”خیر..... کہا کیا انہوں نے.....“

”کہہ تو رہی ہوں..... کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں..... مجھے لگتا ہے..... میں..... میں ان کے معیار

پر پوری..... نہیں.....“ زری کی آواز بھرا گئی..... اور وہ دونوں ہاتھوں پر چہرہ گرا کر پھر سے رونے لگی.....

شہنو پریشان ہو گئی..... زری کو کندھوں سے پکڑ کر بیٹھا یا اور خود اس سے جڑ کر بیٹھتے

ہوئے اس کے دونوں ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹاتے ہوئے اس کے آنسو پونچنے لگی.....

”میں کئی دنوں سے تمہیں بھی محسوس کر رہی تھی.....“ شہنو بولی ”اس دفعہ جو

شہباز لالہ آئے تو ضرور تم لوگوں کی جھڑپ ہوئی ہوگی..... ہیں نا.....“

زری نے سکتے ہوئے نفی میں سر ہلایا.....

”کمال ہے شہباز لالہ سے لڑائی بھی نہیں ہوئی..... اور.....“

”مجھے سے تم لڑائی کی توقع کر سکتی ہو.....“ زری نے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا.....

”تم سے نہ سہی..... شہباز لالہ سے تو کر سکتی ہوں.....“

”کوئی لڑائی نہیں ہوئی.....“

”تو تحریر سب کیا ہے.....“

”کچھ نہیں.....“

”عجب سر پھری لڑکی ہو.....“

زری اس کی بات پر ہنس پڑی..... اس نے اپنے آپ کو سنبھالا..... اپنے آپ پر حیرانگی بھی

ہوئی..... اس کمزوری کی توقع تو اسے اپنے آپ سے نہیں تھی..... وہ اک غیور اور بہادر لڑکی تھی..... جانے کیسے

جذبات کی رو میں بہہ گئی.....

شہنو نے گھور کر زری کی طرف دیکھا ”پریشان کر دیا تم نے.....“

وہ پھر ہنس پڑی.....

”مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا..... ابھی رو رہی تھیں اب دانت نکال رہی ہو..... لیکن میں

تمہارے بننے سے بہل تھوڑا ہی جاؤں گی..... تمہیں کیا ہوا ہے..... تمہیں بتانا پڑے گا.....“

شہنو اس سے بار بار پوچھنے لگی..... زری کمزور لحوں کی گرفت سے ٹکنا چاہتی تھی..... شہباز

نے اس سے لڑائی کی تھی نہ جھگڑا..... لیکن اس کے خیالات میں جو تبدیلیاں آ رہی تھیں..... انہیں زری شدت

سے محسوس کر رہی تھی..... وہ جب گھر آتا کوئی نہ کوئی بات ایسی کر جاتا..... جس سے زری کے اندر غیر محسوس سی

بے چینی پھیل جاتی..... کچھ ٹوٹنے ٹکھرنے کا احساس جاگ اٹھتا..... خوشیاں مجروح ہو جاتیں..... اور وہ نہ چاہتے

ہوئے بھی اپنے اوپر افسردگی کی کمر قمر محسوس کرتی.....

پچھلی بار آیا تھا..... تو زری سے بال کنوائے کو کہا تھا..... اتنے خوب صورت لالے اور گھنیرے

بال کنوائے کو زری کا جی نہیں چاہتا تھا..... لیکن اس نے اصرار کیا تھا..... زری پریشان ہو گئی تھی.....

اس دفعہ آیا تو بطور خاص تاکید کی ”زر..... تم مائل بہ فریبی ہو..... ذرا اپنی ٹائمنگ کنٹرول

کرو..... خیر روٹی مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی..... تمہیں اپنا وزن کم کرنا چاہئے..... سلم سمارٹ لڑکیاں تم نے شاید

دیکھی ہی نہیں ہیں..... اب میں آؤں تو تمہارا وزن کم از کم پچیس پونڈ کم ہو..... سمجھیں.....“

زری کے دل میں گرہ سی پڑ گئی تھی..... گلے میں پھندہ محسوس ہوا تھا..... وہ نم نم آنکھوں سے

اسے دیکھنے لگی تھی.....

”دیکھو زری مجھے بات بات پہ آنسو بہانے والی لڑکیاں بالکل نہیں بھاتیں..... چنچل شوخ ہنس کھلے اور بولڈ لڑکیاں اچھی لگتی ہیں..... اب میں نے اتنی سی بات کہی ہے اور تم رونے پہ آمادہ ہو رہی ہو..... نہ بھی نہ رونا دھونا بالکل بند.....“

زری امنڈتے آنسوؤں کو آنکھوں میں پی گئی تھی..... لیکن آنسو پینا آسان تو نہیں ہوتا..... یہ برسے جائیں تو بے ضرر ہوتے ہیں..... اندر اتار لئے جائیں تو ان کی تلخی پیرحمی کی حد تک تکلیف دہ ہو جاتی ہے..... آہستہ آہستہ ٹھکے والے زہر کی طرح..... اندر ہی اندر کھائے جاتی ہے..... زندگی اور اس کی ساری رنگینیوں کو.....

زری نے بڑے دن اپنے اوپر قابو رکھا..... شہنو یا بی بی گل کے سامنے اپنی پریشانی ظاہر نہ ہونے دی تھی..... گاؤں پہ بھی کسی پر حال دل عیاں نہیں کیا تھا..... دو ایک دفعہ زرگل نے پوچھا بھی تھا

زری..... کیا بات ہے چپ چپ کیوں ہو..... اداس لگتی ہو.....“

”وہ اپنے آپ سے ڈھٹائی برت کر بولی تھی“ ایسے ہی چپ ہوں..... زرگل لالہ آپ مجھے شہنو کب سے سمجھنے لگے..... میں اس کی طرح شوخ و شنگ تھی ہی کب..... ایسے ہی ہوں سدا سے ایسی ہی ہوں..... ہمیشہ ایسی ہی رہی ہوں گی.....“

زرگل نے اس کے سر پر پیار سے چپٹ لگاتے ہوئے کہا تھا ”ہمیشہ ایسی ہی رہے گی“

”بالکل..... عادت ہے فطرت ہے..... بدل تھوڑا ہی جائے گی“

”وہ تو ٹھیک ہے..... لیکن پتہ نہیں کیوں..... میں..... تمہیں دیکھتا ہوں..... تو لگتا ہے..... تم

کچھ اداس ہو..... کچھ چپ سی ہو.....“

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی..... کھوکھلی ہنسی زرگل کو مطمئن نہ کر سکی.....

”زری.....“

”جی زرگل لالہ.....“

”سچ کہتی ہوں کوئی بات نہیں.....“

”چلے جھوٹ کہتی ہوں.....“

”ناراض نہیں ہونا..... میرے پیار کا ناجائز فائدہ نہ اٹھا یا کرو..... جانتی ہوں تاہم تمہیں ناراض

دیکھ ہی نہیں سکتا.....“

وہ پھر ہنس پڑی تھی اور ہنسنے ہوئے بولی تھی ”تو پھر آپ ایسی باتیں ہی کیوں کرتے ہیں.....“

”بس..... کچھ واہمہ سا ہونے لگا تھا.....“ زرگل نے اس کی پیشانی چوم کر اسے پیار کر لیا.....

”خدا تمہیں ہمیشہ شاد و آباد رکھے..... میری پیاری سی بہن سدا خوش رہے.....“ زرگل نے کہا..... تو زری کا دل بھر آیا..... بھائی کا ہاتھ آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولی ”اپنے جان سے پیارے لالہ کے لئے میری بھی دعا ہے.....“

”ہنسی مسکراتی رہا کرو.....“ زرگل نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا.....

”ہمت اچھا جناب.....“ وہ ہنس کر بولی..... ”آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے..... آئندہ اس پر زبردستی عمل کرنے کی کوشش کروں گی..... عادت بدل لوں گی..... فطرت سے باغی ہو جاؤں گی“

”شریر کہیں کی“ زرگل نے ہنس کر اس کے تھپڑ لگا دیا تھا.....

اور

وہ جب کمرے سے مسکراتے ہوئے نکل گیا تھا.....

تو

زری کی آنکھیں دھندلا گئیں تھیں..... پیار کی یلغار بھی تو بعض اوقات مار ڈالتی ہے..... زری اپنے لالہ کو کتنی عزیز تھی کتنی پیاری تھی..... اس کو وہ بخوبی جانتی تھی.....

بی بی جان اور آغا بی بی نے بھی شاید اس کی افسردہ دلی کو محسوس کیا تھا..... زری اب اتنی سیانی اور سمجھدار ہو گئی تھی کہ شفقت بھرے دلوں کو اطمینان اور سکون دینے کے لئے اپنی ذات کے گرد حصار بنالے..... شہباز کی باتوں اور رویوں سے اسے دکھ و اذیت محسوس ہوتی تھی.....

لیکن

اس کا اظہار وہ کسی پر نہیں کرنا چاہتی تھی..... وہ اپنی ذات کے اندر ضرور بٹ رہی تھی لیکن کسی پر یہ بات ظاہر کرنا اسے اچھا نہیں لگتا تھا..... ماں اور دادی کو بھی اس نے اسی طرح مطمئن کر دیا تھا..... جس طرح زرگل لالہ کو کیا تھا.....

لیکن

آج شہنو کے سامنے وہ جانے کیسے کمزور لمحوں کی گرفت میں آگئی تھی..... کیسے آنسو بہے نکلے تھے کیوں رو دی تھی.....

شاید

اس لئے

کہ

بار سنبھالنا نہ جاسکے..... تو اسے اتار پھینکا جاتا ہے.....

دم لینے کے لئے
سکون پانے کے لئے
تھکاوٹ اتارنے کے لئے

یا

ہمت اور قوت نئے سرے سے جمع کر کے بار اٹھانے کے لئے.....

زری آج شہنو کے سامنے رو دی تھی..... شہنو مضر تھی..... وہ جانا چاہتی تھی..... کہ اسے کیا ہوا ہے..... زری ہنس کر ٹالنا چاہتی تھی..... لیکن رونے اور ہنسنے سے معاملے نے جو سنجیدہ اور چھپیدہ صورت اختیار کر لی تھی..... شہنو کھانچو پھوٹنے والی تھوڑا ہی تھی.....

اس نے بار بار پوچھا..... بار بار کریدا..... تو زری پریشان ہو گئی.....

شہنو نے کہا ”دیکھ زری میں تمہاری بہن ہوں دوست ہوں..... مجھ سے کچھ نہیں چھپاؤ..... شہباز لالہ کی طرف سے کوئی واہمہ و سوسہ ہے تو بتا دو..... کوئی تکلیف پہنچی ہے تو کہہ ڈالو..... شاید میں کوئی مددوا کر سکوں“

زری نے ساری باتیں جو اس کے دل میں تیر کی طرح ترازو ہو جاتی تھیں کہہ ڈالیں..... بظاہر یہ باتیں کچھ بھی نہ تھیں..... معمولی غیر اہم اور غیر سنجیدہ تھیں..... شہنو سن کر ہنس پڑی ”بے وقوف ہو تم زری..... ان باتوں کا تاثر کر لیا ہے تم نے..... شہباز لالہ کو جانتی نہیں ہو..... بچپن ہی سے وہ ایسے ہیں..... اپنا اپنا مزاج ہے نا..... لاہور جا کر ڈراما ڈرن بن گئے ہیں..... تم میں تبدیلی چاہتے ہیں..... آئیڈیل لڑکی کے روپ میں تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں پگلی ڈراما سوچو تو..... کیوں تمہیں ایسا دیکھنا چاہتے ہیں..... صرف اس لئے زری..... صرف اس لئے کہ وہ تم سے بے حد پیار کرتے ہیں.....“

زری نے دیکھی نظروں سے دیکھا.....

”ہاں زری“ شہنو اس کے چہرے سے بال پیچھے ہٹاتے ہوئے بولی ”میں اپنے بھائی کو جانتی ہوں..... وہ تمہیں بہت چاہتے ہیں..... تم ان کی زندگی کا محور ہو..... تمہارے گرد ہی تو گھومتے ہیں وہ..... اسی لئے تو تمہیں کبھی کبھی کہہ دیتے ہیں کبھی کبھی..... کسی اور کو تو نہیں کہتے..... جس پر اپنا حق سمجھتے ہیں اسے ہی کہتے ہیں نا.....“

”تو..... تو کیا میں ان کے کہنے پر ہال کٹاؤں.....“ زری نے معصومیت سے کہا.....

شہنو ایک دم کچھ نہ کہہ سکی..... پھر بولی ”ضروری نہیں.....“

”تو ان کی ناراضگی؟“

”سب ٹھیک ہو جائے گا زری..... اس سال ان کی تعلیم مکمل ہو جائے گی..... لاہور سے واپس آجائیں گے..... پھر یہ نئی نئی باتیں جو ان کے دماغ میں ساتی ہیں نا خود بخود ختم ہو جائیں گی.....“

”ان کا ارادہ امتحانوں کے بعد لاہور ہی میں رہنے کا ہے.....“

”اول ہو نمہ..... خان بابا انہیں رہنے دیں گے؟“

”خان بابا ہی نے تو کوٹھی خرید کر دی ہے انہیں.....“

”کوٹھی بابا نے خریدی ہے..... ایک طرح کارلسٹ ہاؤس بنانے کے لئے..... جب کبھی لاہور گئے ہو ٹل کی بجائے اپنے گھر ٹھہر لیا.....“

”مستقل ٹھکانہ بن گیا شہباز کے لئے.....“

”ایسا ممکن تو نہیں..... بالغرض انہوں نے لاہور رہنے کی ضد بھی کو تو دو چار ماہ اور وہاں رہ لیں گے..... زری انہیں لوٹ کر تو ہمیں آتا ہے..... وہ مثل معلوم نہیں تمہیں کہ دن میں چرند پرند چگتے چرتے جہاں چاہیں پھر شام کو لوٹ کر تھانوں ٹھکانوں پر ہی آتے ہیں..... شہباز لالہ بھی واپس بیس آئیں گے..... فکر و تردد کی کوئی بات نہیں..... تم خواہ مخواہ پریشان نہ ہوتی رہا کرو..... زری..... ہم لوگ جن بندھنوں میں بندھے چکے ہیں..... وہ ٹوٹ سکتے ہیں کبھی؟ کسی میں جرأت ہے انہیں توڑنے کی..... نہیں نہیں..... زری..... کبھی ایسا سوچا بھی نہیں جاسکتا..... تم تو انتہائی بے وقوف لڑکی ہو..... ذرا ذرا سی بات پر اس طرح پریشان ہو جاتی ہو.....“

شہنو دیر تک اسے سمجھاتی رہی.....

زری خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی.....

”مستان کو تو رکھو گے نا..... چوکیداری کے لئے..... تم سارا وقت کالج میں ہو گے تو گھر کی نگہداشت کون کرے گا.....“

”ہاں مستان کو رہنے دیں.....“

مستان شہباز کی آیا یعنی ترور کا شوہر تھا..... بچپن میں اس نے شہباز کو گود کھلایا تھا..... شہباز اس کی عزت کرتا تھا..... ویسے بھی یہاں اسے ایک ذاتی ملازم کی ضرورت تو تھی ہی..... اس نے بابا کی بات مان لی.....

خان بابا چند دن قیام کے بعد لوٹ گئے۔ وہ کوٹھی خرید کر بہت خوش تھے۔ انہیں کاروباری سلسلے میں لاہور آنا پڑتا تھا۔ گھر اسی لئے خریدا تھا کہ پردیس میں آکر ہوٹلوں کی زحمت سے بچ سکیں۔ علاوہ خاندان کے دوسرے لوگ بھی کبھی کبھار لاہور آتے تھے۔ اب یہاں اپنا گھر تھا۔ کسی کو یہاں آکر رہائش کا مسئلہ درپیش نہیں تھا.....

شہباز یہاں آ گیا تھا..... کبھی دوست اس کے ہاں آ جاتے..... پہلے پہلے تو اکیلے میں جی نہ لگا..... ہوٹل میں لڑکوں کے ساتھ رہنے کی عادت ہو گئی تھی..... کھانا بھی اکیلے ہی کھانا عجیب سا لگتا تھا..... اکثر مستان خان کو وہ اپنے ساتھ ہی میز پر بٹھالیتا تھا.....

لیکن رفتہ رفتہ عادی ہو گیا..... کبھی دوست اس کے ہاں آ جاتے..... تو گہما گہمی ہو جاتی..... کبھی پشاور سے کوئی آ جاتا تو رونق ہو جاتی.....

چند دن پہلے زر گل آیا تھا..... اس کا تین دن قیام بڑا خوشگوار تھا..... شہباز نے اپنے سارے دوستوں کو زر گل سے ملانے کے لئے مدعو کیا تھا..... رات گئے تک چل پھل رہی تھی.....

صبح چاچا بھی دو دن یہاں ٹھہرے تھے..... ان کے کسی دوست کا میوہ ہسپتال میں اپریشن ہوا تھا..... اس کی احوال پرسی کو آئے تھے.....

شہنواز اور بی بی گل لاہور آئیں..... تو شہباز کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا..... دو تین دفعہ وہ پہلے بھی آئی تھیں..... لیکن ہوٹلوں میں ٹھہری تھیں..... اب تو اپنے گھر والی بات تھی.....

بی بی گل اور شہنواز بھی یہ گھر بہت اچھا لگا..... سب سے اچھی بات تو یہ تھی کہ سروٹ کواڑ بھی تھا اور فون کی سہولت بھی تھی..... ان کے ساتھ شہزاد گئی جو شہنواز کی ترور تھی آئی تھی..... اور حکمت خان بھی تھا..... زرین بھی ساتھ آیا تھا.....

سونی سونی اکیلی کوٹھی میں گھریلو ماحول پیدا ہو گیا تھا..... شہنواز نے کمروں کی ترتیب بدلی تھی..... آرائش کی کئی چیزیں نوٹ کر لی تھیں..... کمروں کو سجانے کے لئے ان کی ضرورت تھی.....

خان بابا کوٹھی کی ریمزری کروانے آئے تو اس میں کارپٹ فرنیچر اور پردے بھی ڈلو گئے۔ ضرورت اور سہولت کی ہر چیز مہیا کر دی..... زرین خان مستان خان اور نصر اللہ بھی ان کے ساتھ آئے تھے..... خان بابا ان تینوں کو یہاں چھوڑنا چاہتے تھے..... لیکن شہباز نے بابا پر منت در خواست کی تھی۔

”خان بابا..... ان کی مجھے ضرورت نہیں ہے.....“

”کیا؟..... تم اکیلے رہو گے اس کوٹھی میں“ بابا نے حیرانگی سے کہا۔

”کیا فرق پڑتا ہے میں اکیلا رہنے کا عادی ہو گیا ہوں بابا..... ہوٹل میں بھی تو اتنے سال اکیلے

ہی گزارے ہیں..... اپنا کام میں خود کر لیتا ہوں.....

”کھانا بھی خود پکا لیا کرو گے.....“ خان بابا نے تسخر سے کہا.....

”کھانا.....؟ خانساں رکھوں گا.....“ وہ بولا

”نصر اللہ کھانا بنانا جانتا ہے.....“ وہ گویا ہوئے.....

”نہیں خان بابا..... میں یہاں خانساں رکھوں گا..... جو اچھے اچھے کھانے بنانا جانتا ہو..... وہ

مستقل یہاں رہے گا..... میرے ایک دوست نے بندوبست بھی کر دیا ہے..... آخر آپ لوگ بھی آیا کریں گے..... یہاں آکر بھی وہی کھانے کھایا کریں گے؟ نصر اللہ کو کیا پکنا آتا ہے.....“

”ہمارے ہاں جس قسم کے کھانے بنتے ہیں وہ ان کو پکانے میں ماہر ہے“

خان بابا خوشگوار موڈ میں تھے..... شہباز کی بات انہوں نے مان لی.....

”زرین تو رہے گا نا.....“ انہوں نے پوچھا

”خان بابا..... مجھے ڈرائیو کی بھی ضرورت نہیں.....“

”نہیں.....“

شہباز ان کو گھمانے پھرانے لے جاتا..... لاہور تاریخی عمارتوں کا شہر ہے..... شہنو کو یہ جگہیں دیکھنے کا شوق تھا..... پہلے آئی تو دیکھنے کا موقع نہ ملا..... اب کے اس نے بطور خاص شہباز سے فرمائش کی.....

”شہباز لالہ..... ٹھیک ہے پروگرام بنالیں..... میں نے اس دفعہ ساری تاریخی عمارتیں دیکھنی ہیں.....“

”ٹھیک ہے..... دکھا دیں گے..... کیا یاد کر دی کہ کس رئیس سے پالا پڑا..... بھی تم ہمارے ہاں مسمان آئی ہو..... مسمان کی خدمت اور عزت افزائی..... ہماری کوشش ہوگی“ وہ ہنس کر بولا.....
دونوں شاہی قلعہ شاہی مسجد، جمائیکر کے مقبرہ، نور جہاں کا مقبرہ اور شاہی مارباغ جانے کے لئے دن اور اوقات کا تعین کرنے لگے.....

”بھی ہم نے انارکلی اور لبرٹی بھی جاتا ہے“ بی بی گل نے دونوں سے کہا.....

”وہ تو جائیں گے ہی.....“ شہنو بولی.....

”پروگرام اس طرح بناؤ کہ یہ گنجائش بھی نکل سکے.....“

”اسی طرح بنائیں گے بی بی گل.....“ شہباز بولا.....

”اتنی جگہیں گنوا رہی ہے شہنو..... ہفتہ بھر تو انہیں ہی دیکھنے میں لگ جائے گا۔“
”تو کیا ہوا.....“

”لو..... واپس نہیں جاتا ہم نے چار دن کے لئے آئے ہیں“

”او..... نہیں بی بی گل جانے..... میں تو آپ کو چار ہفتے میاں رکھوں گا.....“

”نہ..... نہ..... ہم پیر کی صبح میاں سے نکل جائیں گے.....“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے.....“

”بیٹے گھر اکیلا ہے..... اور تمہارے بابا جان سے اجازت بھی اتنے دنوں کی ملی ہے“

”اوہ خدا یا..... بی بی گل آپ.....“

”کیا؟“

”آپ اب بھی خان بابا سے ڈرتی ہیں.....“

”ڈرنا کیسا؟..... بس انہوں نے چار پانچ دن کی اجازت دی ہے.....“

”اور آپ اتنے دنوں سے زیادہ رکھیں گی نہیں.....“

”ریشمینے مسکرا دی پھر بولی“ کافی ہیں اتنے دن.....“

”نہیں..... میں آج ہی خان بابا کو فون کر دوں گا..... کہ آپ لوگ اگلے ماہ.....“

”نہیں بیٹے.....“ بی بی گل نے جلدی سے کہا.....

”کیوں شامت لانی ہے بی بی گل کی.....“ شہنو نے بھی شہباز سے کہا ”بابا کی طبیعت کا پتہ

نہیں تمہیں شہباز لالہ.....“

”پتہ ہے..... لیکن اب ہم بھی بڑے ہو گئے ہیں شہنو.....“

”بڑے ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ عدول حکمی کرنے لگوںچے“

”بی بی..... آپ نے ہی خان بابا کی عادتیں خراب کی ہیں ہر بات پر سر جھکا دیتی ہیں.....

ابھی تک ایسا کرتی ہیں.....“

”یہ کرنا میرا فرض ہے بچے.....“

”ہونہر.....“

شہنو ہنس پڑی..... ”شہباز لالہ آپ اتنے سالوں سے دور رہ رہے ہیں شاید خان بابا کی خو

خصلت سے.....“

”جی نہیں..... مجھے بھولا کچھ نہیں..... لیکن مجھے اپنے حق کے لئے آواز اٹھانا آ گیا ہے..... میں

آپ لوگوں کو اتنی جلدی نہیں جانے دوں گا..... میں بھی بابا ہی کا بیٹا ہوں..... آج ہی فون کرتا ہوں انہیں.....“

”شہباز بچے..... کیوں بد مزگی پیدا کرنے کے درپے ہو.....“ ریشمینے نے اتنی عاجزی

سے کہا کہ شہباز کو ماں پر بے اختیار پیار آ گیا..... ان کے گلے میں بازو ڈال کر جھولتے ہوئے ان کے گال سے

گال لگا کر بولا..... ”میری پیاری پیاری ماں..... کتنی اچھی ہیں آپ..... چلے نہیں کرتا فون.....“

”پھر آجائیں گے.....“ ریشمینے نے اس کا گال تھپکا.....

”اچھا اب تیار ہو جائیں.....“ شہنو نے کہا.....

”ہاں.....“ شہباز نے گھڑی دیکھی..... ”آج لبرٹی چلتے ہیں آپ لوگوں نے جو شاپنگ

کرنی ہے کر لیں کل شاہی قلعہ اور شاہی مسجد دیکھنے جائیں گے.....“

”ٹھیک.....“ شہنو نے چٹکی بجا کر کہا ”ابھی تیار ہوتے ہیں.....“

”ذرا جلدی کرنا.....“ شہباز نے کہا.....

”بی بی گل آپ کپڑے بدلیں گی“ شہنو نے پوچھا.....

”بدل لیں.....“ شہباز بولا..... ”رات کھانا بھی باہر ہی کھائیں گے“

شہنو خوشی سے بولی ”چائینیز جائیں گے.....“

”جہاں کھوگی..... لے چلوں گا.....“ شہباز نے اٹھتے ہوئے کہا..... پھر گھڑی دیکھی اور بولا
”بس دس منٹ کے اندر تیار ہو جاؤ.....“

شہباز اپنے کمرے میں چلا گیا..... بالوں میں برش کیا..... سگریٹ سلگایا..... بٹوہ جیب میں
ڈالا..... اور باہر نکل آیا.....

شہنو اور بی بی گل تیار تھیں انہوں نے اپنی لمبی چوڑی چادریں اپنے مخصوص انداز سے اوڑھ
رکھی تھیں..... پورا جسم چادروں میں لپیٹا تھا..... پلو ماتھے پر بھی جھکا ہوا تھا..... چہرے کا تھوڑا سا نچلا حصہ ہی نظر آ رہا
تھا..... وہ بھی باہر نکل کر ڈھانپ لیا جاتا تھا..... صرف آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔
شہباز نے انہیں دیکھا اور حیرانگی سے بولا ”یوں چلیں گی باہر.....“
”تو اور کیسے؟“ بی بی گل بولیں.....

”یہ برقعے تو اتار دیں.....“ اس نے تسخر سے ان کی پھولدار کالی چادروں کی طرف اشارہ
کیا.....

”کیوں بی بی گل بولیں.....“

”بھئی یہ پشاور نہیں ہے..... لاہور ہے لاہور.....“

”ہم پہلے بھی لاہور آچکے ہیں شہباز لالہ..... اسی طرح باہر جاتے تھے.....“

”وہ خان بابا کے ساتھ جاتے تھے آپ لوگ..... آج میرے ساتھ جانا ہے..... پلیز یہ چادریں
اتار دیں..... مضحکہ خیز لگ رہی ہیں ان میں.....“

”نہیں شہباز.....“ بی بی گل نے کہا ”ہمیں ننگے سر پھرنے کی عادت نہیں.....“

”ننگے سر کیوں..... دوپٹے تو ہیں..... بے شک انہیں سروں پر ڈال لیں.....“

”خواہ مخواہ کی ضد نہ کرو.....“

”بی بی گل..... پلیز..... آپ بھی ضد نہ کریں..... جیسا دلیں ویسا بھیجیں ہونا چاہئے..... آپ
باہر نکل کر دیکھیں تو..... یہاں عورتیں اور لڑکیاں کیسے گھومتی پھرتی ہیں..... آپ تو عجیب لگیں گی اس
طرح.....“

اچھی خاصی بحث تکرار شروع ہو گئی..... بی بی گل تو چادر اتارنے پر آمادہ ہو رہی تھیں..... ہاں
شہنو شہباز لالہ کی بات ماننے کو تیار ہو گئی..... وہ بھی اس طرح کہ یہ لمبی چوڑی چادریں اتار کر چھوٹی چادر اوڑھ
لے.....

اس نے بی بی گل سے بھی کہا ”وہ چکن کی چادر اوڑھ لیں آپ بھی..... موٹے دوپٹے کی

طرح ہے..... میں بھی اپنی لینن کی چادر اوڑھ لیتی ہوں.....“

”چادر اوڑھنی ضرور ہے شہباز لالہ نے بیزار سی سے کہا۔

”شہباز لالہ ہمیں عادت جو نہیں ہے..... بغیر چادر باہر نکلنے کی.....“

”عادت ڈالی جاسکتی ہے“

”کس لئے؟ رہنا تو ہم نے اپنے علاقے میں ہے اور وہاں چادر اوڑھنا معیوب نہیں.....“

”وہاں جوجی چاہے کرو..... اب یہاں آئی ہو تو یہاں اسی طرح کرو..... جیسا میں چاہتا ہوں“

شہنو ہنس کر بولی ”آپ کے چاہنے کے ہم پابند نہیں ہیں..... جو پابند ہو..... اس پر جو حکم

جی چاہے چلائے گا.....“

”وہ تو ایسا چلاؤں گا کہ یاد کرے گی“ شہباز نے شہنو کا اشارہ سمجھ کر اس کے کان میں

کہا..... ”ایک دم چادر تو کیا دوپٹے سے بھی آزاد کروں گا.....“

شہنو نے مسکراتے ہوئے سرنفی میں ہلایا..... ”مشکل ہے..... آپ کی آزاد خیالی اور

زری..... اول ہوں..... آپ کو ہتھیار ڈالنا پڑیں گے“

”یہ کبھی نہیں ہوگا.....“

”دیکھ لیں گے کہ ہوگا.....“

بی بی گل دونوں کے قریب آ کر بولیں ”کیا بحث لگا رکھی ہے..... باہر چلنا ہے کہ نہیں.....“

”نہیں میں دوسری چادریں نکال لوں.....“ شہنو بولی..... پھر الماری کھول کر اس میں

سے چکن اور لینن کی دو چادریں نکالیں..... یہ چادریں گھر پہ اوڑھنے کی تھیں..... لیکن شہباز کی ضد اور اصرار

دیکھ کر دونوں نے یہ چادریں کندھوں پر ڈال لیں..... بی بی گل نے اپنا جارح کا دوپٹہ بھی سر پر اچھی طرح ڈالا۔

وہ پہلے لہٹی گئے.....

شہنو اور بی بی گل جھجھکتے جھجھکتے گاڑی سے اتریں..... لہٹی میں خاصہ رش

تھا..... عام عورتیں دوپٹوں ہی میں گھوم پھر رہی تھیں..... کچھ نے تو دوپٹے کی زحمت بھی نہ کی تھی..... چند عورتیں

چادریں اوڑھے بھی نظر آئیں..... یہاں کون کسی کو جانتا پہچانتا تھا..... شہنو کی جھجھک جلد ہی دور

ہو گئی..... لیکن بی بی گل کو اس طرح آنا اچھا نہیں لگ رہا تھا.....

شاپنگ کے بعد وہ انہیں گلبرگ کے ایک چائینیز ریستورنٹ میں لے گیا..... بال کچا کھچ بھرا

ہوا تھا..... عورتیں مرد بچے خاصی بڑی تعداد میں کھانا کھانے آئے ہوئے تھے..... ابھی تک آ رہے تھے..... کونے

کی ایک میز خالی ہوئی..... تو شہباز دونوں کو لے کر اس طرف بڑھ گیا..... بی بی گل کرسی پر اس رخ بینیں کہ منہ

کوئے کی طرف ہو گیا..... شہنو ان کے دائیں ہاتھ اور شہباز سامنے بیٹھ گیا..... فیشن ایبل اور ماڈی عورتیں اور لڑکیاں شہباز کی توجہ کا مرکز تھیں..... وہ شہنو کی توجہ بھی ان کی طرف مبذول کرتے ہوئے آہستگی سے کہہ رہا تھا ”دیکھو نا..... یہ بھی تو ہیں..... تم لوگ ان کی طرح کیوں نہیں بن جاتیں.....“

”شہباز لالہ.....“ شہنو نے کہا ”ہر کوئی اپنے ماحول کا پروردہ ہوتا ہے.....“

”ماحول میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے“

”تبدیلی کا عمل آہستہ آہستہ خود بخود ہوتا ہے..... آپ ایک دم ماحول کو بدلنا چاہیں تو یہ غلطی

ہے.....“

”ذرا زری کو میرے قابو میں آ لینے دو پھر دیکھنا یہ عمل کتنی سرعت سے..... ہوتا ہے.....“

”نہیں شہباز لالہ..... ایسی غلطی نہ کیجئے گا.....“

کچھ دیر دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے..... میرا مینولے کر آ گیا..... شہنو اور شہباز اس میں سے اپنی اپنی پسند کے کھانے دیکھنے لگے..... شہنو ایک دو بار پہلے بھی مال کے چائیز پر خان بابا کے ساتھ آچکی تھی..... اسے چند کھانے اچھے لگے تھے..... انہی کا آرڈر دیا.....

”بی بی گل آپ کیا کھالیں گی“ شہباز نے پوچھا تو وہ بولیں ”جو چاہو منگا لو..... کھالوں

گی.....“

شہنو مسکرانے لگی..... برابر والے ٹیبل پر اب تین خوب صورت اور فیشن ایبل لڑکیاں آ بیٹھی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان مرد بھی تھا..... ایک لڑکی نے جینز پن رکھی تھی۔ دوسری نے ڈھیلا ڈھالا مردانہ کرتا زیب تن کیا ہوا تھا۔ تیسری نے البتہ شلوار قبض پر دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ چاروں بے تکلفی سے گپ شپ لگا رہے تھے کبھی کبھی تو ان کا مشترکہ ققمہ دوسری ٹیبلوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو بھی متوجہ کر لیتا تھا.....

”کتنے اچھے کتنے زندہ دل لوگ ہیں.....“ شہباز نے شہنو سے کہا..... پھر خود ہی بولا.....

”اچھا ہوتا جو تم زری کو بھی ساتھ لے آئیں..... ایسے لوگوں کو دیکھ کر اسے کچھ تو بہتہ چلا۔ کہ زندگی کو کیسے جیا جاتا ہے.....“

شہنو نے شہباز کی طرف تشویش سے دیکھا اور بولی ”شہباز لالہ..... آپ زری کے متعلق

کیوں ایسا سوچتے ہیں۔ بہت پریشان کرتے ہیں بے چاری کو.....“

”کیوں کیا کیا میں نے.....“

”کیا نہیں کرتے..... جب جاتے ہیں اسے رلا کر ہی آتے ہیں.....“

”رلا کر.....“

”اور نہیں تو کیا..... آپ الٹی سیدھی باتیں کر کر کے اسے بہت پریشان کرتے ہیں.....“

ہراساں سی رہنے لگی ہے..... چپ لگ گئی ہے اسے تو..... ہنسنا کھیلنا ہی بھولتی جا رہی ہے.....“

”چچ کمر رہی ہو.....“

”جا کر دیکھ لیں..... پوچھ لیں اس سے.....“

دونوں ہولے ہولے باتیں کر رہے تھے..... بی بی گل ان کی طرف متوجہ نہ تھی..... اسی لئے اس

نے ان سے پوچھا ہی نہیں کہ کیا معاملہ زیر بحث ہے.....

رات شہباز نے اکیلے میں شہنو سے زری کے متعلق باتیں کی..... شہنو نے زری کی ذہنی

کیفیت پوری طرح اس پر واضح کر دی.....

شہباز کچھ پریشان سا ہو گیا..... انجانے میں اس نے زری کو اتنی ذہنی کوفت دی تھی..... شہنو

نے احساس دلایا تو وہ خفت سی محسوس کرنے لگا..... اس نے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ اب کے پشاور گیا..... تو

زری کی ساری پریشانیاں دور کر دے گا.....

نکلے ہوئے کہا.....

”ٹھیک ہے.....“ زوہبی اپنے دبائے کٹ بالوں کا چھباما تھے پر ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔
”ابھی آیا“

”گھنڈ بھر دیں نہ بیٹھے رہنا.....“

”نہیں نہیں..... یہ گیا اور یہ آیا“ اس نے چٹکی بجا کر کہا.....

”جاؤ..... میں بیس ہوں.....“ زوہبی نے کہا..... اور کھلی کھڑکی سے لان کو دیکھنے لگی۔

مستان خان نے عمر کے آنے کی اطلاع دی۔ تو شہباز کتاب بند کر کے اٹھ بیٹھا..... بالوں کو انگلیوں سے سلجھا تا وہ بیرونی برآمدے میں آگیا۔

عمر نے گاڑی چند گز کے فاصلے پر پارک کی تھی..... اور اب گاڑی سے نکل کر برآمدے ہی کی طرف آ رہا تھا.....

”ہیلو“ اس نے شہباز کو دیکھ کر نعرہ مارنے کے انداز میں کہا۔

جواباً شہباز نے ہاتھ اٹھا کر ہیلو کہا۔

دونوں برآمدے کی سیڑھیوں پر ملے تپاک سے مصافحہ کیا اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے پر جوش انداز میں ہلاتے ہوئے احوال پرسی کرنے لگے.....

کیا کر رہے تھے ”عمر نے اسی طرح ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہوئے پوچھا۔

”پڑھ رہا تھا..... یار فاضل میں معرکہ مار ہی لیں تو اچھا ہے“ شہباز نے ہنس کر بولا.....

”پھر تو تمہیں ڈسٹرب کیا.....“

”اوہ..... بالکل نہیں..... اب میں کتابیں رکھنے ہی والا تھا..... چھٹی کا بہترین مصرف کیا میں

نے آج..... صبح سے پڑھ رہا تھا.....“

شہباز نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا..... اور بولا ”کیسے آئے.....“

”ایک پیغام دینا تھا عثمان کو..... تمہارے پاس آتا رہتا ہے نا.....“

”رات آئے گا.....“

عمر نے عثمان کے لئے جو پیغام دینا تھا دیا.....

”اندر تو آؤ نا..... بیس کھڑے کھڑے باتیں کئے جاؤ گے.....“ شہباز نے اس کا بازو پکڑ کر

کہا..... عمر نے مڑ کر گاڑی کی طرف دیکھا..... اور اس کی نظروں کے تعاقب میں شہباز کی نظر بھی گاڑی پر پڑی.....

گاڑی میں بیٹھی لڑکی کو دیکھ کر شہباز نے شوفی سے کوئی فقرہ عمر کی طرف اچھالنے کو ابھی

۳۶

گیٹ پر گاڑی رکی تو مالی سے باتیں کرتے مستان خان نے گردن اونچی کر کے گیٹ کی طرف

دیکھا.....

مالی کیاریوں میں آنے والے موسم کے پھولوں کی پیریاں لگا رہا تھا..... مستان خان پھولوں کا

شیدائی تھا وہ مالی سے پھولوں کے رنگ و بو کی باتیں کر رہا تھا.....

”کوئی آیا ہے“ مالی نے کھڑکی چلاتے ہوئے کہا۔

”خان کا دوست ہے“ مستان جلدی سے گیٹ کی طرف آیا.....

”شہباز ہیں گھر پر.....“ عمر نے گیٹ کے پٹ کھلنے سے پہلے ہی مستان خان سے پوچھا.....

مستان نے گیٹ کھولتے ہوئے سلام کیا اور گاڑی کے قریب آ کر منوہ بانہ بولا ”جی صاحب خان ہیں گھر

پر.....“

”اطلاع کرو کہ عمر آیا ہے“

”اچھا صاحب“

”سو تو نہیں رہے“

”جی نہیں پڑھ رہے تھے“

”اچھا بتاؤ انہیں.....“

”بہت اچھا“

مستان خان چمن میں سے ہوتا ہوا صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

”عمر نے گاڑی اندر ڈرائیو پر کھڑی کر دی۔

”تم دو منٹ یہیں بیٹھو وہی..... میں شہباز سے بات کر کے ابھی آیا.....“ عمر نے گاڑی سے

صرف آنکھوں ہی سے اشارہ کیا.....
تو

عمر جھٹ سے بولا ”وہ زوبی ہے میری بہن.....“

”اوہ“ شہباز گڑبڑا گیا..... شکر ہے اس نے کوئی آوازہ کس نہیں دیا تھا.....

”میں اندر نہیں آسکتا سوری.....“ عمر نے پلٹتے ہوئے کہا ”زوبی کو تھوڑی سی شاپنگ کرنا ہے

بلا جیسی ہے پیچھے ہی پڑ گئی شاپنگ کے لئے ہاں تو میرا پیغام عثمان کو دے دینا.....“

شہباز کی نگاہیں گاڑی میں بیٹھی زوبی پر تھیں..... وہ جلدی سے بولا ”حد کرتے ہو یا..... اپنی بہن کو گاڑی ہی میں بٹھائے رکھا..... کتنی بری بات ہے۔ انہیں لائے ہو ساتھ تو تھوڑی دیر میٹھو چائے وائے

پیو.....“

”تکلف کی کوئی بات نہیں.....“ عمر نے کہا..... ”چائے پھر کبھی سسی..... آؤ ملو زوبی

سے.....“

عمر نے شہباز کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے ساتھ گاڑی کی طرف لے آیا۔

انہیں اپنی طرف آتے دیکھ کر زوبی گاڑی سے نکل آئی.....

وہ بے حد سمارٹ لڑکی تھی..... اس نے جینز اور ڈھیلا سالیس لگا بلاؤ پہن رکھا تھا..... چیونگم

چباتے ہوئے اس کے گال میں گڑھا سا پڑ رہا تھا..... آنکھیں بے حد خوب صورت بڑی شریر اور خاموشی میں بھی بولنے کی کیفیت لئے تھیں.....

شہباز عمر کے ساتھ آکر زوبی سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ اس وقت اس نے فان کلر کی

شلوار قبض پہن رکھی تھی..... ڈارک براؤن جیکٹ کے بٹن کھلے تھے..... پاؤں میں پشاور کی چمڑے کی چپل تھی..... گرانڈیل جوان تھا..... اس کے خوب صورت چہرے پر بھاری بھاری مونچھوں نے اس کے حسن و وقار میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا.....

زوبی نے اسے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی.....

”یہ میری بہن زوبی ہے اور زوبی یہ ہیں میرے عزیز دوست شہباز..... جن کا غائبانہ تعارف تو

تم سے ہے ہی.....“

زوبی نے عمر کی بات سنی ان سنی کر دی..... وہ تو مہموت سی حیرت زدہ سی ششدر سی اس

نوجوان کو ننگے جاری تھی..... جو..... جو شاید اس کا آئینڈیل تھا.....

نظروں کے انہماک سے شہباز کچھ سٹپسا گیا..... کسی غیر لڑکی سے یوں رو رو ہونے کا

اسے کم ہی اتفاق ہوا تھا..... اور لڑکی بھی ایسی..... جو سمارٹ تھی خوب صورت تھی فیشن ایبل اور ماڈی تھی.....

شہباز نے عمر کے متعارف کرانے پر ہاتھ سلام کے انداز میں اٹھاتے ہوئے رسمی سا جملہ کہا
”خوشی ہوئی آپ سے مل کر.....“

”یہ میرے دوست ہیں شہباز خان.....“ عمر نے زوبی کی محبت توڑنے کو پھر کہا.....

”بڑے گرانڈیل قسم کے دوست ہیں آپ کے“ زوبی پسندیدگی کی بھرپور نگاہ ڈالتے ہوئے

مسکرا کر بولی.....

”پٹھان ہیں نا.....“

”جی.....“

”ہاں.....“

”تجھی.....“

وہ اب بھی شوق کی ساری فراوانی آنکھوں میں سمیٹے اسے ننگے جاری تھی.....

”اندر آئیے نا.....“ شہباز نے اس کی نگاہوں سے بچنے کے لئے قدرے رخ موڑ کر کہا.....

”نہیں یار..... پھر کسی دن آئیں گے“ عمر بولا ”ابھی ہمیں لبرٹی جانا ہے..... فارغ ہو تو آؤ تم

بھی“ شہباز نے کوئی جواب نہیں دیا.....

”چلو آؤ..... بہت پڑھ چکے ہو صبح سے..... ذرا گھوم پھر آؤ.....“ عمر نے اصرار کیا.....

”آجائیے.....“ زوبی نے بھی کہا.....

شہباز متذبذب تھا.....

زوبی نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور بیٹھتے ہوئے بولی ”کچھ زیادہ کام نہیں

ہے مجھے..... آپ بوریقینا نہیں ہوں گے.....“

وہ شوخ چمکتی نظروں سے شہباز کو دیکھتے ہوئے مسکرائی.....

شہباز سے انکار نہ ہو سکا.....

عمر نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے دوسرا دروازہ کھول دیا.....

شہباز نے بیٹھنے سے پہلے متان خان کو بلا دیا..... ”میں تھوڑی دیر کے لئے جا رہا ہوں“

”اچھا خان.....“ متان نے کندھے پر ڈالی چادر درست کرتے ہوئے سر تعظیم اٹھکایا.....

”پشاور سے شاید فون آئے.....“ وحیان رکھنا.....“ عمر نے بیٹھتے ہوئے آستین ہٹا کر گھڑی

دیکھی پھر متان خان سے کہا ”شاید چھ بجے تک فون آئے خان بابا کا.....“

”اچھا خان.....“

”خیر چھ بجے تک میں خود ہی آجاؤں گا..... ویسے دھیان رکھنا..... یہ نہ ہو کہ کھٹی بجتی رہے اور تم مالی سے پھولوں کی سرگزشت ہی سنتے رہو.....“

”نہیں خان.....“ مستان نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر انکساری سے کہا.....

زوبی بڑے شوق اور تجسس سے شہباز اور مستان خان کو دیکھ رہی تھی.....

”چلے جناب.....“ شہباز نے عمر سے کہا.....

”آپ یہاں اکیلے رہتے ہیں.....“ زوبی نے شہباز کی چوڑی پشت پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا.....

”خان صاحب..... شہزادے ہیں شہزادے“ عمر نے گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے شوخی سے

کہا..... ”ٹھانڈے ہاتھ سے اتنی بڑی کوٹھی میں رہتے ہیں.....“

زوبی کو شہباز شہزادہ ہی لگتا تھا.....

شہباز زوبی سے براہ راست باتیں کرتے ہوئے جھجک سی محسوس کر رہا تھا..... لیکن زوبی بلا

جھجک اس سے باتیں کئے جاری تھی..... خاصی باتنی لڑکی تھی..... بے تکلفی اس کی فطرت تھی..... اس کا انداز بڑا

دلکش تھا اس کا رویہ ہمیشہ خوشگوار رہتا تھا..... وہ ان دنوں ہوم اکناکس کالج میں پڑھ رہی تھی..... ایم اے پریوس

میں تھی ٹیکسٹائل اس کا سبجیکٹ تھا..... پڑھائی میں بس واجبی سی دلچسپی لیتی تھی..... ہاں فیشن کے نئے نئے

انداز اپنانا اسے بہت اچھا لگتا تھا..... نایاب چیزیں بے حد پسند تھیں..... آزاد ماحول کی پروردہ تھی..... خود اعتمادی

بہت تھی..... ماڈرن اور فیشن ایبل ہوتے ہوئے بھی اس اعتماد کو کبھی مجروح ہونے نہیں دیا تھا..... می ڈیڈی نے

بھی اسے ہر طرح کی آزادی دے رکھی تھی..... اس کی پسند ناپسند اپنی تھی کبھی اس پر یہ چیز می ڈیڈی نے مسلط

نہیں کی تھی..... وہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی ذوق شوق سے حصہ لیا کرتی تھی..... سوئمنگ اور لائڈنگ کے

علاوہ فیشن شوز میں بھی حصہ لیا کرتی تھی..... اب تک وہ کئی انعامات جیت چکی تھی.....

دولت مند والدین کی اکلوتی بیٹی ہونے کے ناطے اس کے کئی امیدوار تھے..... خاندان میں

بھی رشتے تھے اور باہر والوں کی نظر میں بھی اس پر تھیں..... اس کی ممی کی دوست مزنا شام کا پناہ خیم تو بڑی دیر سے

اس پر آس لگائے بیٹھا تھا..... ڈیڈی کے دوست کا پناہ جاہت بھی امیدوار تھا.....

لیکن مسرت اور قمر احسان صاحب نے بیٹی پر شریک حیات کے چننے کا مسئلہ چھوڑ رکھا

تھا.....

زوبی اپنے مشاغل میں الجھی ہوئی تھی..... رفیق حیات کے انتخاب کا ابھی مرحلہ نہیں آیا

تھا..... اس کے حلقہ احباب میں لڑکیاں لڑکے بھی شامل تھے..... خیم سے بھی وہ دوستوں کی طرح ملتی تھی..... لیکن

اپنی پسند کا لیبل اس نے ابھی کسی پر چسپاں نہیں کیا تھا..... بات یہ نہیں تھی..... کہ اس کے خواب مٹنے تھے..... یا جنس مخالف کے لئے اس کے جذبات خفستہ تھے..... وہ جوان لڑکی تھی..... اور جوانی جب آتی ہے..... تو خواب خود بخود رنگین و حسین ہو جاتے ہیں..... جذبات لطافت کی نرمی و گرمی سے ج جاتے ہیں..... یہ سب کچھ آپوں آپ ہو جاتا ہے..... زوبی کے من میں بھی رنگیں پھل پھلایں..... چھوٹے لگی تھیں..... پسینے کھرنے لگے تھے..... لیکن اس نے جو سراپا خیا لوں کی چمک اور تصور کی مہک سے گوندھا تھا..... تراشا تھا..... وہ اسے ابھی ملا نہیں تھا..... وہ جانتی تھی کہ آئیڈل ملا نہیں کرتے..... یہ تصور کی ایچ ہے..... خیالوں کا بھنور ہے..... جو سوچنے کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن پانے کی حد میں آنے والا نہیں ہوتا.....

لیکن

لیکن

آج اس نے شہباز کو دیکھا..... اس سے باتیں کیں..... تو لگا..... آئیڈل تصور اتنی اور خیالی خاکے ہی نہیں ہوتے..... وجودی حقیقت بھی رکھتے ہیں.....

زوبی شہباز کے ساتھ تھوڑی دیر ہی رہی..... اس نے دو چار چیزیں خریدنا تھیں..... شہباز اور عمر برآمدے میں ہی کھڑے رہے اور زوبی شور سے اپنی مطلوبہ چیزیں لے آئی.....

”اب“ عمر نے اس سے پوچھا ”واپس چلیں.....“

نہیں..... ”وہ مسکرائی.....“

”کیوں“ عمر نے پوچھا.....

”اپنے دوست کو خاص طور پر ساتھ لائے ہو..... کوئی چائے وائے نہیں چلے گی“ وہ مسکرا کر شہباز کو دیکھنے لگی.....

”چائے کی ضرورت نہیں“ شہباز بولا.....

”ہے بھی“ عمر نے کہا..... ”ابھی تو گھر پہ ہمیں چائے پینے کو کہہ رہے تھے..... کیا جھوٹ موٹ دعوت دے رہے تھے.....“

”لگتا ایسا ہی ہے.....“ زوبی نے ایک خوب صورت نگاہ شہباز پر ڈالی.....

”نہیں نہیں.....“ شہباز نے زور دار لہجے میں کہا..... ”دعوت دینے اور نبھانے میں ہم لوگ بخل سے کام نہیں لیتے.....“

”تو کیا بخیل ہم ہی ہیں“ عمر نے ہنس کر کہا..... ”زوبی نے چائے کی دعوت دی ہے..... چلو ہم دونوں اس کے مہمان ہیں کس ریٹورنٹ میں چلیں زوبی.....“

”ٹھیک ہے۔“ وہ لفافے گاڑی کی پچھلی نشست پر رکھتے ہوئے بولی۔ ”هلٹن۔۔۔ انٹر کون۔۔۔ شیزان۔۔۔ جہاں جی چاہے چلیں۔“

”ہو گئی۔“ عمر نے ہاتھ بڑھایا۔

”بالکل۔“ زوبی نے اپنا خوب صورت ہاتھ عمر کی ہتھیلی پر مارا۔

شہباز نے دیکھا اس کی انگلیاں بہت خوب صورت تھیں۔

”هلٹن چلتے ہیں۔“ عمر نے شہباز سے کہا۔

”اب اتنی دور جاؤ گے۔“ شہباز بولا۔

”کیا فرق پڑتا ہے۔“ گھوٹے پھرے ہی تو نکلے ہیں۔“ عمر نے کہا۔

”تمہاری مرضی۔“ شہباز نے جواب دیا۔

”میری نہیں زوبی کی مرضی۔ کیوں زوبی۔۔۔ هلٹن میں چائے کیسی رہے گی۔“ عمر بولا۔

”فائن۔“ وہ پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔

”بل بھاری بھر کم ہو گا۔“ عمر نے من کو چھیڑا۔

”پرواہ نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ اوکے۔۔۔ بیٹھ شہباز۔“

شہباز سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا ”آج کی یہ چائے میری طرف سے ہوگی“

”کس خوشی میں۔“ عمر نے سیرنگ سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”زوبی لے جا رہی ہے ہیس۔“

”نہیں یار۔“ شہباز نے کہا۔

”کیوں نہیں۔“ زوبی پشت پر سے بولی۔

”عمر۔۔۔ چائے میری طرف سے ہوگی۔“

”جی نہیں۔“ زوبی نے کہا۔

”تکلف کیوں کرتے ہو شہباز۔۔۔ زوبی کی دعوت پر ہم هلٹن جا رہے ہیں۔“

”اچھا نہیں لگتا ہم دونوں کے ہوتے ہوئے وہ بل دیں۔۔۔ ان سے پہلے طے کر لو۔“

”اے مسٹر شہباز خان۔“ زوبی نے مسکراہٹوں کے جلو میں کہا۔ ”میرا نام زوبی ہے۔“

مجھے ان۔۔۔ ان۔۔۔ وہ۔۔۔ یہ کہنا اچھا نہیں لگتا۔۔۔ آپ مجھے میرے نام سے پکاریں۔“

عمر ہنس پڑا۔ شہباز زوبی کی بے تکلفی سے اندر ہی اندر خوف زدہ سا ہو گیا۔

چائے کا آرڈر زوبی ہی نے دیا۔ اور شہباز اور عمر کی پسند کی چیزیں بھی منگوائیں۔

وہ شہباز کے بالمقابل بیٹھی تھی۔۔۔ باتوں تو تھیں ہی بڑی پر لطف باتیں کرتی تھی۔۔۔ شہباز کو وہ جب بھی بھر پورا اور پر جوش نظروں سے دیکھتی وہ کچھ گڑبڑا سا جاتا۔

چائے کا بل زوبی ہی نے دیا۔

”یہ بڑی زیادتی ہے۔“ شہباز کو واقعی اس کا بل دینا اچھا نہیں لگا۔

”او کم آن۔۔۔ عمر بولا۔“ کافی بھاری پاکٹ ہے اس کی۔۔۔ می ڈی کی لاڈلی ہے۔

جب خرچ کے علاوہ بھی ہتھیالیتی ہے۔“

”کچھ بھی ہو۔۔۔ ہمارے ہوتے بل یہ دیں۔ اچھا۔۔۔ نہیں۔۔۔ لگتا۔“

”اے۔“ زوبی نے کھکارا۔ ”پھر یہ!۔“ میں زوبی ہوں۔۔۔ آپ میرا نام کیوں نہیں لیتے۔“

شہباز خفت سے مسکرا دیا۔

”اور یہ جو۔۔۔“ زوبی دونوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ ”یہ جو میں نے آج آپ دونوں پر چائے کا احسان کیا ہے نا۔۔۔ وہ آپ اتار بھی سکتے ہیں۔“

”جی۔۔۔“ شہباز کے منہ سے نکلا۔

”جی ہاں۔۔۔ اتار سکتے ہیں۔“ زوبی نے شوخی سے کہا۔

”کیسے؟“ عمر نے پوچھا۔

”آج کل پرسوں۔۔۔ یا کسی بھی دن مجھے کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھلا دیں۔“

”کیوں شہباز؟“ عمر نے شہباز سے پوچھا۔

”ٹھیک۔۔۔ ٹھیک ہے۔“ وہ صرف یہی کہہ پایا۔

”تو ہو گئی بات طے۔“ زوبی نے مسکرا کر کہا۔

شہباز نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

”کب؟“ زوبی نے پوچھا۔

”جب آپ چاہیں۔“ وہ بولا۔

”کل۔“ زوبی نے شوخ نگاہیں اس پر ڈالیں۔

”کل سہی۔“ شہباز نے جواب دیا۔

”بھول نہ جائیے گا۔“ زوبی اترا کر بولی۔

”یہ بلا پچھا چھوڑنے والی نہیں۔“ عمر نے پیار سے بہن کو دیکھا۔

”زوبی نے آنکھیں گھماتے ہوئے سر ہلایا.....

وہ بے حد خوش تھی.....

شہباز سے دوبارہ ملنے کی راہ خود بخود بن گئی تھی..... عجیب سی بات ہے..... بعض اوقات

ہم راہیں کھوجتے پھرتے ہیں..... ڈھونڈتے رہتے ہیں پھر بھی نہیں پاسکتے

اور

بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ راہیں..... خود بخود قدموں تلے آتی چلی جاتی ہیں.....

کھوج ہوتی ہے نہ تلاش..... لیکن راستے بن جاتے ہیں..... اور ان راستوں پر قدم آپ آپ اٹھتے چلے جاتے ہیں..... چاہنے نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا.....

کچھ.....

بھی

نہیں ہوتا

پھر

یہ راستے یہ راہیں

ہمیں ان منزلوں سے دور لے جاتے ہیں.....

جو

متعین ہوتی ہیں

حد نگاہ تک سبزہ ہی سبزہ پھول ہی پھول تھے..... پہاڑی سلسلے دور تک پھیلے ہوئے تھے..... خود رو گھاس اور بیلوں نے پہاڑیوں کے پتھر لیے وجود اپنی پلیٹ میں لے رکھے تھے کہیں کہیں تروتازہ سبزے میں سے کالے کالے پتھر جھانکتے ہوئے نظر آتے تھے..... اوس سے بھیگے یہ پتھر سیاہی میں بھی تازگی کا احساس لئے ہوئے تھے..... سبک خرام ہواؤں کے دوش پر خوشبوؤں کا بار تھا..... ممک رچی بسی تھی..... کئی جگہ پہاڑیوں کے سینے سے جٹے پھوٹ رہے تھے..... بلور کی طرح چمکتا صاف ستھرا پانی دراڑوں سے نکل کر نشیب کی طرف جارہا تھا..... اس کی تہ میں بیٹھے گول گول پتھر صاف نظر آرہے تھے..... آسمان کی نیلا نیلیں نکھری ہوئی تھیں..... اور چمکتے سورج کی شعاعوں میں نرم نرم حدت تھی.....

سبزہ لدی جھکی چٹانوں کے قریب گھاس کے زمردیں فرش پر زری بیٹی تھی..... اس کے خوب صورت بال کھلے تھے اور اس کے حسین چہرے کے ارد گرد پھیل کر انہوں نے چہرے کو اور..... مڑکش بنا دیا تھا..... وہ سر جھکاتی تو بال بکھر کر کندھوں سے ڈھل آتے..... اور اس کے گھٹنوں کو چھونے لگتے..... وہ اپنا نرم و گداز ہاتھ اٹھاتی اور بالوں کی لٹوں کو اٹھا کر کندھے کے پیچھے ڈال دیتی.....

شہباز اس کے عین سامنے نیم دراز تھا..... سوکھی گھاس کا تنکا ہاتھ میں لئے کبھی دانتوں میں دبا لیتا کبھی ہاتھ میں ملے لگتا..... وہ ایک نیک زری کو تنکے جارہا تھا..... ہوشربا موسم تھا..... شہباز کے دل دو ماغ پر خمار سا چھایا تھا.....

زری جب بھی بکھرے بال سیٹ کر کندھے کے پیچھے کرتی..... وہ نگاہوں سے نفی کا اشارہ

کرتا.....

”بکھرنے دو انہیں..... یہ ریشمی زلفیں لہرانے دو.....“

”لیکن.....“ زری جھکی جھکی نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھتی.....

”کیا“

”تمہیں تو یہ پسند نہیں ہیں نا۔۔۔۔۔“

”کب کہا میں نے۔۔۔۔۔ میں تو ان زلفوں کے ریشمی اندھیروں میں کھوجانا چاہتا ہوں“

”جھوٹ بھی بولتے ہو۔۔۔۔۔“

”کبھی نہیں۔۔۔۔۔“

”تم نے جب بھی میرے بال دیکھے یہی کہا کہ کنوا دو۔۔۔۔۔“

”اول ہوں۔۔۔۔۔“

”جی۔۔۔۔۔“

”نہیں زری۔۔۔۔۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے“

”شہباز“

”ہوں“

”تم مکر رہے ہو“

”نہیں زری ایسا نہیں ہے۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ تم میری محبوب ہو۔۔۔۔۔ میرا پیار ہو۔۔۔۔۔ میری زندگی

ہو۔۔۔۔۔“

”کاش تمہارے الفاظ میں سچائی ہوتی۔۔۔۔۔“

”کیسے یقین دلاؤں تمہیں۔۔۔۔۔ اور پھر تمہارے یقین نہ کرنے کی وجہ بھی کیا ہے۔۔۔۔۔“

”وجہ۔۔۔۔۔ وجہ؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ میرے الفاظ میں سچائی نہیں۔۔۔۔۔“

”او شہباز خان۔۔۔۔۔ بعض پرچھائیاں دھندلے آئینوں میں بھی نظر آجاتی ہیں۔۔۔۔۔ تمہارے

مزاجی رو بے بتا دیتے ہیں شہباز۔۔۔۔۔“

”نہیں زری۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ ایسا مت کہو۔۔۔۔۔ مجھے ڈر لگتا ہے خوف آتا ہے۔۔۔۔۔ تمہاری باتوں

سے۔۔۔۔۔“

”میری باتوں سے نہیں شہباز۔۔۔۔۔“

”تو اور۔۔۔۔۔“

”تمہیں خوف اپنی باتوں سے اپنے رو بے اپنی حرکات سے آتا ہے۔۔۔۔۔“

”شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔۔۔۔۔ لیکن میں کیا کروں۔۔۔۔۔ مجھے سہارا دو۔۔۔۔۔ چھپا لو۔۔۔۔۔ تھام لو

زری۔۔۔۔۔“ وہ بیحد جذباتی انداز میں زری کی طرف جھکا۔۔۔۔۔ اس نے سر زری کے زانو پر رکھ دیا چاہا۔۔۔۔۔

لیکن

لیکن

زری وہاں نہیں تھی۔۔۔۔۔

گھبرا کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔۔۔۔۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔۔۔۔۔ دینتلی مٹی کی آندھی امنڈ رہی

تھی۔۔۔۔۔ سبزہ اور پھول جل گئے تھے۔۔۔۔۔ پہاڑی سلسلے چٹیل میدان بن گئے تھے۔۔۔۔۔ چشموں کا قاتل کر تا پانی خون

رنگ ہو رہا تھا۔۔۔۔۔

وہ ڈر گیا۔۔۔۔۔

خوفزدہ ہو کر چیخا۔۔۔۔۔

”زری۔۔۔۔۔ زری۔۔۔۔۔ زری۔۔۔۔۔“

اور

پھر

اپنی چیخیں آواز ہی سے اس کی آنکھ کھل گئی۔۔۔۔۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔۔۔۔۔ اپنے

آپ کو چھو ابستر پر ہاتھ پھیرا۔۔۔۔۔ وہ اپنے کمرے میں اپنے بیڈ پر ہی تھا۔۔۔۔۔

وہ حواس میں آیا تو بستر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔۔۔۔۔ دونوں ہاتھوں پر سر گر کر کئی لمحے بیٹھا رہا۔۔۔۔۔

اس نے خواب دیکھا تھا۔۔۔۔۔

ہاں

خواب ہی دیکھا تھا۔۔۔۔۔

لیکن

یہ خواب۔۔۔۔۔

حقیقت کا پرتو بھی تو تھا۔۔۔۔۔

وہ واقعی خوفزدہ سا رہتا تھا۔۔۔۔۔ اسے اپنے آپ سے ڈر لگتا تھا۔۔۔۔۔

اپنا آپ

جو ان دنوں بٹ رہا تھا تقسیم ہو رہا تھا۔۔۔۔۔

زہلی۔۔۔۔۔ غیر محسوس طریق سے نہیں ملاعلان اس کی قربتوں کی حصہ دار بن رہی تھی۔۔۔۔۔

وہ آئیڈیل جو اس نے برسوں سے تراشا تھا۔۔۔۔۔ زہلی اس آئیڈیل سے حیران کن حد تک مشابہ

تھی..... زوبی کو پہلے دن ہی دیکھ کر من کے سونے ساحل جاگ اٹھے تھے..... اور ان ساحلوں پر شوریدہ سرسبز
کھرانے اور طوفان اٹھانے لگی تھیں..... اس نے گھن گرج کی آوازیں سنی تھیں..... لیکن ہنسنے ہوئے بھی ان سنی
کردی تھیں..... لیکن کب تک..... زوبی اگلے دن اس کے ساتھ ڈنر کرنے آئی تھی..... اسے دیکھ کر یوں لگا
تھا..... جیسے یہ لڑکی اس کی سوچ کی لکیروں کے ساتھ ساتھ چلتی ہے..... اس نے جوباس پر ہاتھ وہاں شہباز کی پسند
تھا..... اس نے جس طرح بال سنوارے تھے وہ شہباز کے دل پسند تھے..... وہ جس طرح بے تکلفی سے باتیں کرتی
تھی جس انداز سے ہنستی تھی..... جس تکیے پن سے دیکھتی تھی..... وہ سب شہباز کے وضع کردہ معیار پر پورے
اترتے تھے..... زوبی سے مل کر اسے یوں لگتا جیسے وہ اس کی تشنہ خواہشوں اور آرزوؤں کا دوسرا نام ہے..... وہ
اس کے لئے کوئی نئی شے نہیں تھی..... لگتا تھا برسوں کی شناسائی ہو..... جانی پہچانی اور اپنی اپنی سی ہو.....
لیکن اس احساس سے وہ خوش نہیں ہوا تھا..... اک بے نام سی اداسی اس کے اندر اتر گئی
تھی..... خوف کی اک لہری من میں اٹھی تھی..... یہ خوف اس کے دل و دماغ اور ذہن پر چھا گیا تھا.....

اور

اسے

زری بے طرح یاد آتی تھی.....

اس کا جی چاہنے لگا تھا..... کہ اڑ کر زری کے پاس پہنچ جائے..... اس کے دامن میں پناہ پانے
کے لئے..... اس سے استدعا کرنے کے لئے کہ زری مجھے تھام لو..... مجھے سہارا دو..... مجھے خوفزدہ ہونے سے بچا
لو..... مجھے اس آزمائش سے دور لے جاؤ..... اپنے آنکھ میں اس طرح چھپالو..... کہ کوئی مجھے پانے سکے.....
اس کے ذہن کا پرتو اس خواب میں بھی تھا..... وہ زری کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا..... چھوڑ نہیں
سکتا تھا..... وہ دونوں جس بندھن میں بندھے تھے اس کی مضبوطی کا احساس اسے تھا..... یہ بندھن کیا تھا کیسا تھا یہ
بھی جانتا تھا.....

زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے..... ادھر ادھر نہیں ہنپتی..... ذرا سا بھی ادھر سرک جائے تو
جہاں ہی تباہی ہے..... یہ بندھن بھی اس کی زندگی کا ایسا ہی محور تھا..... اس کے ذرا سا سرکے پر بھی جوتباہی آ سکتی
تھی اس کا اسے پوری طرح احساس تھا.....

زری اس کی منگیتر تھی..... چچا زاد تھی..... بدلے کے رشتے ہوئے تھے..... صرف وہ اور زری ہی
اس رشتے میں نہ بندھے تھے زرگل اور شہنو بھی ان مضبوط ڈوروں میں باندھے گئے تھے..... یوں یہ سب ایسے
نقطے تھے..... جن سے زندگی کے خطا نکلتے تھے..... ان نقطوں کی اپنی اہمیت تھی انہیں اپنی جگہ سے ہٹا نہیں جاسکتا
تھا..... اور نہ ہی کوئی نیا نقطہ ان کے درمیان لانے کی گنجائش تھی.....

لاشعوری طور پر یہ سوچیں شہباز کے ذہن میں ہلچل مچا رہی تھیں..... اس لئے وہ خوفزدہ سا
ہو جاتا تھا..... ڈرنے لگتا تھا.....

شہباز بستر میں گر گیا..... پھر باقی رات اس نے اپنے آپ سے الجھتے گزار دی.....
اس نے فیصلہ کر لیا..... کہ وہ زوبی سے آئندہ نہیں ملے گا..... اور زری کو اپنے آپ پر اپنے
حواس پر اپنے دل و دماغ پر پورے تسلط کر لے گا..... زری اس کے بچپن کا پیار بھی تو تھی..... اس کا پہلا احساس
محبت زری ہی کی ذات سے تو چھوٹا تھا.....

وہ اپنے آپ کو سمجھتا رہا..... احساس دلاتا رہا.....

لیکن

بعض اوقات اپنے ہی اندر کا آدمی کسی طرح آنکھیں پھیر لیتا ہے..... کس طرح جھٹلاتا ہے.....
تمسخر سے ہنساتا ہے..... جھوٹ پکڑ لیتا ہے..... چڑاتا ہے..... جلاتا ہے..... اور کسی طور قابو میں نہیں آتا..... نہ
چاہتے ہوئے بھی اس اندر کے آدمی کے سامنے ہار ماننا پڑتی ہے..... جھک جانا پڑتا ہے.....

شہباز کے ذہن پر جھنجھلاہٹ مسلط تھی.....

وہ بٹ رہا تھا تقسیم ہو رہا تھا..... اور جب انسان بٹ جائے تقسیم ہو جائے تو اس کا اپنا آپ رہتا ہی

کہاں ہے.....

یہ حقیقت جانتے ہوئے بھی شہباز اپنا آپ منوانے کے درپے تھا.....

اس دن زوبی نے اسے اپنے ہاں چائے پر مدعو کیا تھا..... چند اور دوستوں کو بھی بلایا تھا..... یہ
بلا وہ دینے وہ خود آئی تھی..... بڑے سحرانہ انداز میں دعوت دی تھی..... وہ اس کی بے تکلفانہ کافرا دانی سے کچھ
اور خوفزدہ ہو گیا تھا.....

اسی لئے

زوبی کے ہاں جانے کی بجائے وہ ایئر پورٹ پہنچا تھا اور تین بجے کی فلائٹ سے پشاور چلا گیا تھا.....

ایکایکی

اور

اچانک

اس نے بوہتے قدموں کی راہیں بدل ڈالی تھیں..... انہیں پرانے راستوں پر لوٹنے کے لئے نئے
راستوں کے نشان مٹانے کی کوشش میں ایسا کیا تھا.....

اور

جہاں زوہبی اس کی راہ نکلتے نکلتے پریشان ہو گئی تھی.....

وہاں

زری اس کی غیر متوقع اور بالکل اچانک آمد پر حیران ہو گئی تھی.....

شہنؤ بی بی گل اور خان بابا نے بھی اس کے یوں چلے آنے پر حیرانگی کا اظہار کیا تھا رات کھانے

کی میز پر اسی حیرانگی کا اظہار ہو رہا تھا.....

”بھئی تمہارے لئے یہ دن بڑے قیمتی ہیں.....“ خان بابا نے کہا تھا ”آخری سال ہے.....

امتحان آرہے ہیں اور ابھی پچھلے ماہ ہی تو تم ہو کے گئے ہو.....“

”بابا.....“ وہ بے اختیار ساہو کر بولا تھا ”بابا میں بہت اداس ہو رہا تھا.....“

اس کی آواز میں رقت سی تھی..... میز کے کنارے پر بیٹھی زری نے بے چین ہو کر اسے

دیکھا.....

شہباز نے اک بھر پور نگاہ اس پر ڈالی..... اس نگاہ میں زمانے بھر کی ہمدردیاں سمٹ آئی

تھیں.....

”اچھا کیا شہباز لالہ.....“ شہنؤ نے اک معنی خیز مسکراہٹ آنکھوں سے اگلے ہوئے

کہا..... پھر چوری مسکراتی نگاہ زری پر ڈالتے ہوئے بولی ”میں بھی آپ سے بہت اداس تھی.....“

خان بابا اور بی بی گل اس کی بات پر مسکرا دیئے..... شہباز اس کی نگاہوں کی علامت سمجھتے ہوئے

افردگی سے اس کی طرف دیکھنے لگا.....

شہنؤ نے اثبات میں سر ہلایا.....

زری کھانے میں مصروفیت کا انداز اختیار کئے رہی..... حالانکہ کھانا کھانے سے زیادہ کھانا دیکھ

رہی تھی.....

”آپ لوگ میرے یوں آنے سے خوش نہیں ہوئے شاید.....“ شہباز نے پلیٹ میں چپل

کباب رکھتے ہوئے کہا.....

”کیوں نہیں ہوئے“ جھٹ سے بی بی گل بولیں..... ”اچھا ہی کیا ہے..... دو تین دن سے

پڑھائی میں کیا فرق پڑے گا“

”دو تین دن کے لئے نہیں آیا بی بی گل.....“

”تو.....“ شہنؤ نے پوچھا.....

”کل تین بجے کی فلائٹ سے واپسی ہے“

”صرف ایک دن کے لئے.....“

”ہاں.....“

”شہباز لالہ..... آج منگل ہے“

”ہوں“

”کل بدھ.....“

”اور پرسوں جمعرات.....“

”بدھ کی چھٹی تو لی ہی ہے..... جمعرات کی بھی لے لیتے تو جمعہ کو واپسی ہو جاتی.....“

”ہو تم بڑی عقل مند.....“

”کوئی شک ہے کیا.....“

”تھوڑا سا.....“

شہنؤ نوک جھونک کرتے ہوئے کپٹی پر انگلی رکھ کر بولی ”یہاں تھوڑا سا بھیجا ہوتا نا.....

تو ایک چھٹی اور بھی کی جاسکتی تھی..... ہاتھ لگانے آئے ہیں پشاور کو.....“

”ہاں.....“

”کیا کہنے.....“

”برائی کیا ہے..... دل اداس ہو رہا تھا..... چلا آیا.....“

کھانے کے بعد وہ بی بی گل کے پاس ان کے کمرے میں تھوڑی دیر بیٹھا رہا..... بابا بھی

آگئے..... وہ شوگر مل کے بارے میں اسے بتانے لگے..... ان کا چند ماہ کے اندر جاپان جانے کا بھی پروگرام

تھا..... وہ ہنس کر بولے ”تمہارے واپس آنے تک مل اے دن حالت میں چل رہی ہوگی.....“

”انشاء اللہ“ بی بی گل نے کہا.....

وہ بھی مسکرایا.....

کچھ دیر یہی باتیں ہوتی رہیں..... جنہیں وہ سنی ان سنی کرتا رہا.....

بی بی گل اور خان بابا سے تفصیلاً شوگر مل اور دیگر کاروباری باتیں سننے کے بعد وہ شہنؤ کے

کمرے میں چلا آیا.....

”آج اکیلی ہو.....“ اس نے پوچھا.....

”زری اپنے کمرے میں ہے“ شہنؤ نے ہنس کر اسے دیکھا.....

”سو گئی اتنی جلدی.....“

”استحان کی سنجیدگی سے تیاری کر رہی ہے گویا“

”تو اور۔۔۔۔۔“

”تم تو سنجیدہ نہیں ہوگی۔۔۔۔۔“

”تھوڑی تھوڑی ہوں۔۔۔۔۔“

وہ ہنس پڑی۔۔۔۔۔ شہباز نے پیار سے اس کے بالوں میں مٹھی بھر کر اس کا سر ہلایا۔۔۔۔۔

شہباز کمرے سے نکلا تو اس کے قدم از خود زری کے کمرے کی طرف اٹھ گئے۔۔۔۔۔ دروازہ ادھ

کھلا تھا۔۔۔۔۔ روشنی باہر جھانک رہی تھی۔۔۔۔۔ زری سوئی نہیں تھی۔۔۔۔۔ کرسی پر بیٹھی میز پر رکھی کتاب پر جھکی ہوئی تھی۔۔۔۔۔

”زری۔۔۔۔۔“ شہباز نے دروازے پر رک کر آواز دی۔۔۔۔۔ ”اندر آ سکتا ہوں۔۔۔۔۔“

زری نے سر گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔ ادھ کھلے دروازے کے باہر شہباز کھڑا

تھا۔۔۔۔۔ وہ کچھ گھبرائی کچھ سسپٹاٹی۔۔۔۔۔

”آ جاؤں۔۔۔۔۔“ شہباز نے پھر کہا۔۔۔۔۔

”آئیے۔۔۔۔۔“ زری سمجھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔۔۔۔۔

شہباز اندر چلا آیا۔۔۔۔۔

دونوں آنے سامنے کھڑے رہے۔۔۔۔۔ زری ہاتھ میں پکڑی کتاب کے صفحے انگلی سے چھوتی رہی

اور شہباز گہری گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔۔۔۔۔

نظروں کی حدت زری اپنے چہرے پر محسوس کرتے ہوئے سرخ سرخ ہو رہی تھی۔۔۔۔۔

”بیٹھے۔۔۔۔۔“ وہ چند لمحوں کی بولتی خاموشی کے بعد بولی۔۔۔۔۔

”تم بھی بیٹھو۔۔۔۔۔“ شہباز بولا۔۔۔۔۔

زری اسی کرسی پر بیٹھ گئی۔۔۔۔۔ کرسی اس نے تھوڑی سی پرے ہر کالی۔۔۔۔۔

شہباز صوفے پر بیٹھنے کی بجائے اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔۔۔۔۔ میز کے کنارے پر ہاتھ رکھتے

ہوئے اس سے ٹیک لگالی۔۔۔۔۔

”کیسی ہو۔۔۔۔۔“

”ٹھیک ہوں۔۔۔۔۔“

”میرے اچانک آنے سے پریشان ہو گئی ہو۔۔۔۔۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔“

”خوش ہوئی ہو۔۔۔۔۔“

زری جواب نہ دے سکی۔۔۔۔۔

”زری“

”جی۔۔۔۔۔“

”یقین مانو۔۔۔۔۔ میں صرف تمہارے لئے آیا ہوں۔۔۔۔۔“

”جی۔۔۔۔۔؟“

”حیران کیوں ہو رہی ہوں۔۔۔۔۔ تمہارے اور صرف تمہارے لئے آیا ہوں۔۔۔۔۔“

زری نے جھپکتے ہوئے اک نگاہ اس پر ڈالی۔۔۔۔۔

شہباز اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا ”میری بات کا یقین کرو زری۔۔۔۔۔ میں بہت ادا اس ہو رہا

تھا۔۔۔۔۔ جب سے شہنشاہ بنایا تھا۔۔۔۔۔“

وہ رکاوٹ زری نے جلدی سے پوچھا ”کیا بتایا شہنشاہ نے۔۔۔۔۔“

وہ میز پر اچک کر بیٹھتے ہوئے بولا۔۔۔۔۔ ”تمہارے متعلق۔۔۔۔۔“

”کیا“ وہ اپنی خوب صورت آنکھوں پر لمبی پلکوں کے پردے گراۓ اٹھاتے بولی۔۔۔۔۔

”میری باتوں سے تم پریشان رہتی ہو۔۔۔۔۔؟“ شہباز نے اس کو گہری گہری نظروں سے دیکھتے

ہوئے پوچھا۔۔۔۔۔

”جی۔۔۔۔۔؟“ وہ جیسے کچھ نہ سمجھ پائی۔۔۔۔۔

”زری“

”جی۔۔۔۔۔“

”میری باتوں سے کیا تم واقعی پریشان ہو جاتی ہو۔۔۔۔۔“

زری نے چند لمحے اپنے نرم و گداز ہاتھوں کو ملنے کے بعد ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی۔۔۔۔۔

”بتاؤ نا۔۔۔۔۔ ہو جاتی ہو پریشان۔۔۔۔۔“

”پتہ نہیں۔۔۔۔۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔۔۔۔۔ کچھ کموتو۔۔۔۔۔“

”کیا کہوں۔۔۔۔۔“

”جو میں پوچھ رہا ہوں۔۔۔۔۔ میں جو کبھی فرمائش کرتا ہوں۔۔۔۔۔ بال کنوا دو۔۔۔۔۔ مسلم ہو جاؤ۔۔۔۔۔ فری

اور بولند ہو کر باتیں کیا کرو۔۔۔۔۔“

زری نے اک گہری سانس لی.....

”زری..... ان باتوں سے پریشان ہونے کی بجائے تم ان پر عمل کیوں نہیں کرتیں..... میں تمہیں جیسی دیکھنا چاہتا ہوں ویسی بن کیوں نہیں جاتیں..... زری تم اپنے آپ کو میری آنکھوں سے دیکھا کرو نا..... کیا مجھے..... تمہیں اپنے معیار پر لانے کا حق نہیں؟..... بولو نا..... بولو نا زری.....“

زری کچھ نہیں بولی سر جھکائے اس کی باتیں سنتی رہی..... جذبات سے بھرپور باتیں..... اس کی باتوں میں گرفتاری کی کیفیت تھی یا فراہری کی کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا..... وہ باتیں کئے گیا وہ سر جھکائے ہاتھ مسلتے..... اس کی باتیں سنتی رہی۔

پھر اس نے بیحد جذباتی ہو کر زری کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا..... زری نے جلدی سے گھبرا کر اپنا ہاتھ اس کی مضبوط گرفت سے چھڑانا چاہا..... لیکن اس نے چھوڑا نہیں..... پیچھا لگنے سے فریادی لہجے میں بولا..... ”زری مجھے تمام لو میں گر رہا ہوں..... ٹوٹ رہا ہوں..... مجھے بکھرنے سے بچالو..... مجھے سارا دو..... مجھے بچا لو.....“

زری بے طرح گھبرا کر اسے دیکھنے لگی..... وہ کہنے چلا گیا ”مجھے سارا دو زری..... مجھے تمام لو..... میں بکھر رہا ہوں..... گر رہا ہوں“

وہ کیا کہہ رہا تھا؟

وہ سننے کے باوجود سمجھ نہ رہی تھی.....

شہباز نے خود ہی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پھر..... بنا کوئی اور بات کہنے کے کمرے سے نکل گیا..... وہ اتنا جذباتی کیوں ہو رہا تھا..... اس نے ایسی باتیں کیوں کی تھیں..... زری کے پلے کچھ نہیں پڑا

تھا.....

دیا بجھنے سے پہلے ایک بار پوری خون مندی سے بھر مکتا ہے.....

شاید..... یہ بھی لو کی آخری پھڑپھڑا ہٹ تھی.....

زری کے اندر ہی اندر اداسی اترنے لگی..... شہباز کی باتوں سے وہ خوش کسی طور نہ ہو سکی.....

(۴۸)

”شہباز آیا تھا“

”جی ہاں.....“

”ہمیں ملا بھی نہیں اور چلا گیا.....“

”وہ یوں آئے اور یوں چلے گئے“

شہنو نے ہاتھ اٹھا کر نیچے کیا اور پھر اسی رفتار سے نیچے کیا ہوا ہاتھ اوپر کر دیا.....

زرگل اس کی بے ساختہ ادھر فریفتہ ہو گیا..... پیار بھری گہری نظروں سے اسے تکتا رہا.....

”اے..... شہنو شوخی سے بولی۔

”ہوں“

”مت دیکھیں ایسے“

”کیوں“

”بس.....“

”دیکھنے پر بھی پابندی ہے“

”عام شام دیکھنے پر نہیں..... اس طرح..... دیکھنے پر..... خان صاحب.....“

”شہنو..... تم کیا شے ہو.....“

”جوشے بھی ہوں..... یہ بتائیے آنا کیسے ہوا.....“

”آنے پر بھی وقت کی کوئی قید ہے“

”میرا مطلب ہے کسی کام سے آئے یا.....“

”جب بھی آؤں کسی کام ہی کے سلسلے میں آتا ہوں نا.....“

شہنوں نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا اور بولی ”کبھی ایسے بھی آجایا کریں..... کام کو تو آپ نے اوڑھنا پھوننا بیا رکھا ہے.....“

زرگل شکوے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا..... ”ایسے ہی کیوں آیا کروں.....؟“
شہنوں نے آنکھیں جھپکا جھپکا کر اسے دیکھا وہ چہرے پر بے نیازی کا تاثر لئے اس کے سامنے کھڑا تھا.....

شوخی و شنگ ہونے کے باوجود شہنوں کو زرگل کی یہ بے نیازی کچھ اداس کر گئی.....
زرگل کن آنکھیں سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتے ہوئے بولا..... ”بے کار آدمی تو ہوں نہیں..... جو ایسے ہی شہر کے چکر لگاتا رہوں..... ہزاروں کام ہوتے ہیں..... یہ بھی غنیمت کہ کام کے بہانے یہاں بھی آجاتا ہوں.....“

”اور..... جو..... کام نہ ہوں..... تو آپ یہاں کبھی نہیں آئیں.....“
زرگل نے متانت اور سنجیدگی اپنے اوپر طاری کرتے ہوئے سرفنی میں ہلا دیا.....
شہنوں کو جیسے ذہنی دھچکا لگا.....

”سچ کہہ رہے ہیں زرگل“

”آج تک جھوٹ کبھی بولا تو نہیں.....“

”اوہ.....“ وہ کچھ اور اداس ہو گئی..... اس کی روشن روشن چمکتی چمکتی آنکھیں جیسے دھند کی پلیٹ میں آگئیں.....

زرگل من ہی من میں مظلوم ہوتا رہا.....

شہنوں کی ساری شوخی خاموشی کے سمندر میں ڈوب گئی.....

کئی لمحے یونہی گزر گئے.....

زرگل تھوڑی دیر ہی پہلے آتا تھا..... لی بی گل اور زری بازار گئی ہوئی تھیں..... گھر پہ شہنوں ہی تھی..... استغاثی تیاری کے لئے دونوں کالج سے چھٹی پر تھیں.....

زرگل اکثر ہی آتا رہتا تھا..... کبھی دوسرے چوتھے دن چکر لگاتا..... شہر میں کام بھی ہوتے.....

اور کشش بھی..... شہنوں سے ملے اسے دیکھے بغیر تو کبھی جاتا ہی نہیں تھا..... وہ اپنے آنے جانے کے اوقات شعوری کوشش سے اسی طرح ترتیب دیتا..... کہ شہنوں سے ملاقات ہو ہی جاتی..... شہنوں کالج ہوتی تو اس کی واپسی کا انتظار ضرور کرتا.....

آج شہنوں گھر پہ ہی تھی.....

دونوں برآمدے ہی میں کھڑے باتیں کر رہے تھے.....

”آؤ اصر چلتے ہیں.....“ زرگل نے لان کی طرف اشارہ کیا.....

شہنوں نے روٹھی روٹھی سی نگاہ اس پر ڈالی..... اور بگڑے بگڑے تیروں سے بولی ”کیوں؟“

”تم آؤ تو.....“ وہ پیار سے بولا.....

”ادھر بھی کوئی کام ہے.....“ شہنوں نے بگڑ کر اتنے پیارے انداز میں کہا..... کہ زرگل کو ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو گیا.....

”ہنسنے کی کیلیات ہے.....“ شہنوں نے جل کر کہا.....

”تمہیں دیکھ کر ہنسی بے قابو ہو رہی تھی“

”کیوں..... میں کوئی کارٹون ہوں“

”لگ تو ایسی ہی رہی ہو“

”زرگل.....“

”اوہ..... تم تو رونے پہ آمادہ ہو رہی ہو.....“

”میں سچ ہی رو دوں گی.....“

”نہ شہنوں..... نہ..... رونا تم پر اچھا نہیں لگتا..... سدا ہنستی رہو..... مسکراتی رہو..... شوحیاں اور شرارتیں ہی تمہیں..... زیب دیتی ہیں.....“

”مت کریں..... یہ باتیں.....“

”کیوں نہ کروں..... ناراض ہو گئی ہو.....“

شہنوں نے لٹے ہاتھوں سے آنکھیں ملے ہوئے معصومیت سے سراباٹ میں ہلا دیا.....

اس کی یہ ادالتی معصوم اور دل فریب تھی..... کہ زرگل کو دل پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا..... جی چاہا بڑھ کر اس متاع عزیز کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لے.....

شہنوں کے مزاج کا یہ رنگ اس نے آج پہلی بار دیکھا تھا..... اسے بچپن کی شہنوں یاد آگئی تھی.....

جب وہ روٹھا کرتی تھی..... تو ایسے ہی آنکھوں میں مٹھیاں گھسیٹ لیا کرتی تھی.....

”شہنوں.....“ زرگل نے کئی لمحے اسے آنکھوں میں جذب کرنے کے بعد ہولے سے

پکارا.....

وہ کچھ نہیں بولی.....

”شہنو.....“ اس نے پھر پکارا.....

”کیا ہے.....“ وہ ہاتھ آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے بولی..... آنکھیں اس نے سرخ کر لی

تھیں.....

”جیسی بھی لگ رہی ہو.....“ وہ ہنسی ہونٹوں میں دباتے ہوئے بولا.....

”جیسی بھی لگ رہی ہوں..... آپ کو کیا.....“

”چھوٹی سی بچی لگ رہی ہو..... برسوں پہلے کی شہنو..... بات بات پر لڑنے جھگڑنے والی.....

بت لڑا کا ہوتی تھیں تم..... اب بھی ویسی ہی لگ رہی ہو.....“

”لڑا کا اور جھگڑا لو ہوں نا.....“

”اوہو..... تم تو آج واقعی لڑنے جھگڑنے کا موڈ بنا رہی ہو.....“

”باتیں کیوں کرتے ہیں ایسی.....“

”کیا کہا میں نے.....“

”جی ہاں آپ نے تو کچھ کہا ہی نہیں.....“

”اچھا ابھی اگر کچھ کہا بھی ہے..... تو معاف کر دو.....“

”کیوں کروں.....“

”عجب ہٹ دھرمی ہے..... معافی مانگ رہا ہوں پھر بھی لڑائی باقی.....“

زرگل ہنس ہنس کر اسے منانے لگا.....

وہ نرم و گداز ہونٹوں میں مسکرائیں دبائے گئی.....

کچھ دیر دونوں وہیں کھڑے رہے..... شہنو کی ناراضگی زرگل نے دور کرتے ہوئے کہا

”ہنگی..... میرے کاموں میں سرفہرست تمہیں دیکھنے کا تو کام ہوتا ہے..... کیا یہ کام نہیں.....“

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی.....

”چلو اب جلدی سے چائے بنوا دو..... میں نے جانا ہے.....“

”واپس گاؤں.....“

”نہیں پاسپورٹ آفس.....“

”کیوں.....“

”فارم لانے ہیں.....“

”کس لئے.....“

”پاسپورٹ بنوانے ہیں.....“

”کس کے.....“

”اپنا اور تمہارا.....“

”میرا.....؟“

”جی ہاں..... تمہارا اور اپنا.....“

”زری کا نہیں.....“

وہ ہنس کر بولا..... ”میں تو اپنا اور تمہارا بنا رہا ہوں..... اس لئے کہ میرا پروگرام بن گیا

ہے.....“

”کیسا پروگرام.....“

”باہر جانے کا.....“

زرگل نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”لیکن ابھی نہیں.....“

”تو پھر کب.....“

وہ ہنس کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا..... ”تب جب تم میرے ساتھ جاسکوگی“

شہنو اس کی بات پر سرخ ہو گئی..... شرمیں ادا سے اسے دیکھا اور سر جھکالیا.....

زرگل بولا..... ”سو چاہیہ چھوٹے چھوٹے کام ابھی کر لئے جائیں تو اچھا ہے..... میں نے نواز چاچا

سے اجازت لے لی تھی..... کہ اپنے ساتھ تمہارا پاسپورٹ بھی بنوا لوں..... وہ زری اور شہباز کا پاسپورٹ بھی

بنوالیں گے..... بہر حال میں اپنی ذمہ داری..... شہنو..... تم میری ذمہ داری ہوتا.....“

زرگل نے پھر اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپاتے ہوئے منہ

دوسری جانب پھیر لیا.....

”ہم شادی کے بعد ورلڈ ٹور پہ جائیں گے شہنو.....“ زرگل نے اس کی پشت پر آتے ہوئے

ہولے سے سرگوشی کی.....

”ہائے ہٹئے.....“ وہ لجا شرماکر بھاگی.....

زرگل اسے پیار بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا.....

پھر

وہ بھی ہوئے ہوئے قدم اٹھا تا کوریڈور کی طرف بڑھ گیا.....
شہنوں نے چائے بنانے کا کہہ دیا تھا..... زرگل لابی میں آگیا..... اس نے خدمت گار سے
چائے لابی ہی میں لانے کو کہا.....

چائے دونوں نے لابی ہی میں بیٹھ کر پی.....
چائے کے دوران زرگل ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا.....
”ہمت دن ہوئے تم لوگ گاؤں نہیں آئے شہنوں.....“ زرگل نے پیالی واپس پلیٹ میں
رکھتے ہوئے کہا.....

”ہاں مجھے تو گئے تقریباً دو مہینے ہو گئے ہیں.....“
”کوشی تیار ہو گئی ہے..... دیکھنے آؤ نا کسی دن.....“
”آؤں گی.....“
”اسے آراستہ تم ہی کر دو گی..... تعمیر کا کام تو تقریباً مکمل ہو چکا ہے..... صرف سوئمنگ پول
اور سن باتھ والے شیشے کے کمرے کی فنشنگ ہو رہی ہے“

”ہمت خوب صورت لگے گا..... سن روم.....“
”کوشش تو یہی ہے..... کہ تمہارے لئے خوب صورت اور آرام دہ گھر بنے.....“
شہنوں نے چشم نیم باز سے اسے دیکھا..... وہ بے حد خوش نظر آ رہی تھی.....
”اب اس کی آرائش جیسی چاہو کر لو.....“
”میں اور زرگی مل کر کریں گے.....“

”یہ تمہاری خوشی اور خواہش ہے..... جو زرگی کو بھی شامل کر لو.....“
”زرگی بڑے نفیس ذوق کی مالک ہے.....“
”تو بس پھر شروع ہو جاؤ..... اب تو رنگ و روغن بھی ہو چکا ہے.....“
”امتحانوں کے بعد کریں گے.....“

”کیا؟“
”امتحانوں کے بعد..... فارغ ہوں گے نا.....“
”تو تمہارا پروگرام..... اتنا لمبا ہے“

”کیا مطلب؟.....“
”مطلب یہ کہ امتحانوں کے فوراً بعد تو.....“

”تو کیا؟.....“

”تو یہ کہ..... امتحانوں کے فوراً بعد تمہیں اس نئے گھر میں تشریف لانا ہے..... اس لئے اسے
سجانے سنوارنے کا کام پہلے ہونا چاہئے.....“

شہنوں کے چہرے پر سرخیاں لہرائے لگیں..... آنکھیں جگ جگ کر رہی تھیں.....
لجائے شرمائے انداز میں بولی ”شہباز لالہ کے امتحانوں میں ابھی پانچ ماہ ہیں.....“
”ایک تو اس شہباز نے مصیبت ڈال رکھی ہے“ زرگل ہنس کر بولا..... ”اپنے ساتھ ہمیں بھی
لے ڈوبے گا.....“

شہنوں اس کی بات پر مسکرا دی.....
چائے ابھی پی جا رہی تھی..... کہ گاڑی رکنے کی آواز آئی.....
”آگئیں بی بی گل اور زرگی.....“ شہنوں نے پیالی ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا.....
”زرگی کو میں آج ساتھ ہی لے جاؤں گا“ زرگل نے بسکٹ اٹھاتے ہوئے کہا.....
”کہاں؟“
”گاؤں“
”کیوں؟“

”چٹھیاں ہیں..... گھر پہ گزارے گی“
”یہ گھر نہیں کیا.....“

”شہنوں میں اس انداز سے بات نہیں کر رہا..... جب سے میں گھر آیا ہوں زرگی یہاں آگئی
ہے..... چھٹی کے دن گھر جاتی ہے..... کچھ لطف نہیں آتا..... جی چاہتا ہے اس کے ساتھ ڈھیر دن
گزار دوں..... یہی آخری چٹھیاں ہیں..... پھر تو وہ بھی اپنے گھر کی ہو جائے گی..... تب تک چند دن ہم اکٹھے رہ لیں تو
کوئی مضائقہ ہے.....“

”نہیں تو.....“

”پھر ٹھیک ہی ہے نا..... جو اسے ساتھ لے جاؤں.....“

”زرگی سے پوچھ لیں..... ویسے ہم دونوں اکٹھے پڑھتی ہیں..... اور.....“
شہنوں کی بات ادھوری رہ گئی بی بی گل اور زرگی لاؤنج میں آگئے تھے..... دونوں نے کالی
پھولدار لمبی چوڑی چادریں اوڑھ رکھی تھیں.....
زرگل اور شہنوں انہیں دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے.....

زرگل نے بی بی گل کو سلام کرتے ہوئے زری کو دیکھا.....
 بی بی گل جواب دیتے ہوئے چادر اتارنے لگیں..... زری چادر اتارے بنا ہی دوڑی آئی اور
 زرگل سے بغل گیر ہو گئی.....
 ”زرگل لالہ..... میں آپ سے اداس ہو رہی تھی..... اس نے کہا..... زرگل نے شفقت
 سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”جھوٹی کہیں کی.....“
 ”نہیں زرگل لالہ.....“ وہ جلدی سے بولی..... ”میں راستے میں بی بی گل سے کمر رہی
 تھی..... کہ آج مجھے گاؤں چھوڑ آئیں.....“
 ”ج“
 ”ج زرگل لالہ.....“
 ”میں بھی شہنو سے کمر رہا تھا زری..... کہ تجھے آج ساتھ ہی گاؤں لے جاؤں گا.....“
 بی بی گل قریب آئیں.....
 زرگل کی پیشانی چوی..... جواباً زرگل نے بھی ان کا ہاتھ ہونٹوں سے لگایا.....
 ”جیتے رہو.....“ بی بی گل نے دعائیں دیں..... ”سب خیریت؟“
 ”جی بالکل.....“
 ”اکیلے آئے ہو“
 ”جی.....“
 ”آغا بی بی کو لے آتے ساتھ اور تمہاری ماں نے تو شاید گاؤں سے نہ نکلنے کی قسم کھالی
 ہے.....“

زرگل ہولے سے مسکرایا..... پھر بولا ”وہ آنا چاہ رہی تھیں..... کہ دردانہ بی بی کے داماد
 آگئے..... بابا بھی ان دنوں مصروف ہیں..... گاؤں کی کئی پارٹیوں میں مصالحتیں کروا رہے ہیں..... جرگہ بھی بیٹھنے
 والا ہے.....“

”اب تو خیر سے تم بھی جرگے میں بیٹھتے ہو“
 ”جی بی بی گل آپ کی دعا سے اس قابل ہو گیا ہوں.....“
 بی بی گل نے پھر پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولیں ”بیٹھو..... چائے پی.....“
 ”جی“ شہنو بولی..... ”آپ لوگ پیس گئے.....“
 ”ہاں.....“ بی بی گل نے جواب دیا..... خدمت گار گاڑی سے شاپنگ کی ہوئی چیزیں نکال

لائی تھی..... اس نے زری کے دو لفافے اسے دے دیئے..... باقی کے لئے بی بی گل سے پوچھا.....
 ”میرے کمرے میں رکھ دو میں آتی ہوں.....“ بی بی گل بولیں.....
 ”بڑی خریداری کی ہے آپ نے.....“ زرگل لفافے دیکھتے ہوئے بولا.....
 بی بی گل مسکرا کر بولیں..... ”ابھی سے شروع کروں گی تو کچھ بنے گا..... شہنو اور زری کے
 لئے کچھ کپڑا خریدا ہے..... میں تو دونوں کے لئے ایک جیسے کپڑے بنواؤں گی.....“
 زری شرمائی.....
 زرگل نے اس کے سر پر پیار سے چپٹ لگائی..... ”اسی لئے ساتھ گئی تھی..... اپنی پسند کے
 ملبوسات خریدنے.....“

”میں چیزیں سنبھال کے آتی ہوں“ بی بی گل نے کہا ”تم لوگ بیٹھو.....“
 ”تم کیا لائی ہو زری.....“ شہنو نے پوچھا.....
 ”کچھ نہیں..... ایک خلاصہ ہے ناول کا..... اور.....“
 ”خلاصوں کی مدد سے ناول پڑھتی ہو.....“ زرگل نے بات کاٹتے ہوئے کہا.....
 ”یہ انگلش کا ناول غاصہ مشکل ہے زرگل لالہ..... خلاصے سے مدد لیتے ہیں ہم تو.....“ زری
 بولی..... تھوڑی دیر زرگل ان سے پڑھائی کی باتیں کرتا رہا.....
 پھر
 وہ باہر نکل گیا..... کوٹھی کے برابر میں جو مردانہ بیٹھک تھی اوھر چلا گیا..... یہ نواز خان کا جہرہ
 تھا..... زری اور شہنو وہیں بیٹھ گئیں.....

زری نے خلاصہ ایک طرف رکھ کے دوسرا لفافہ شہنو کو دکھایا.....
 ”اس میں کیا ہے“
 ”قیض کا کپڑا لائی ہوں“
 ”دکھاؤ تو.....“
 ”دیکھ لو.....“
 ہلکے فیروز رنگ پر خوب صورت پھول تھے..... شہنو کو یہ کپڑا بہت پسند آیا.....
 ”میرے لئے بھی لے آئیں“ اس نے کہا ”کتنا خوب صورت ہے.....“
 ”تم لے لو.....“
 ”نہیں جناب..... اسے اب آپ ہی پہننے گا..... ہاں پہلے خیال نہیں آیا..... کہ ایک کی جگہ دو

قیضیں لے لیتیں

”مجھے تمہارا خیال نہ آئے یہ کیسے ہو سکتا ہے میری پیاری بھابی.....“

”اے ہٹو..... ابھی سے مت کہا کرو بھابی.....“

”کیوں نہ کہا کروں.....“

”بس.....“

”اچھا تو شہنو پیاری میں تمہارے لئے بھی ایسی ہی قیض لائی ہوں..... بی بی گل کے لفافوں

میں پڑا ہو گا لفافہ.....“

”اوہ زری..... تم کتنی اچھی ہو.....“

شہنو نے زری کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر اس کی گال سے گال لگا دیا۔

زری نے اس کے ہاتھوں کو پیار کر لیا.....

دونوں سرشار سی تھیں.....

”شہنو“ زری نے مسکرا کر اس کے کان میں ہولے سے کہا.....

”ہوں“ وہ اسی انداز میں اس کے گلے سے لپٹی ہوئی.....

”زرگل لالہ کب آئے تھے؟ خوب موقع ہاتھ لگا..... کیا کیا باتیں ہوئیں.....“

شہنو اس کے گلے کے گرد بازوؤں کا حلقہ تنگ کرتے ہوئے شوقی سے بولی ”اے ہے.....“

باتیں کیا ہوتیں..... اتارو کھاپھ کا سا بھائی ہے تیرا.....“

”چل ہٹ شریر کہیں کی..... تو ایسے کہے گی تو کیا میں بھی مان لوں گی.....“

”مان لو بھئی مان لو..... یہ زرگل تھا..... شہباز تھوڑا ہی تھا..... جو موقع پا کر رومانوی دنیا بیا

لیتا.....“

زری نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا..... آہستگی سے اس کی ہاتھیں گلے سے نکالتے

ہوئے بولی ”شہنو میں تیاری کر لوں..... زرگل لالہ کے ساتھ آج گاؤں جاؤں گی.....“

”یہ کیا بات ہوئی زری“ شہنو منہ بناتے ہوئے بولی ”مجھے اکیلی چھوڑ جاؤ گی.....“

”چند دن رہ کر آ جاؤں گی..... نہ آئی تو تم چلی آنا..... کالج سے تو چھٹیاں ہیں ہی..... یہاں رہ

لیا تو کیا..... گاؤں چلے گئے تو کیا..... ویسے میں آغا بی بی بابا..... بی بی جان اور زرگل لالہ سبھی سے بے طرح ادا اس ہو

رہی ہوں..... سمجھیں.....“

”سمجھ مئی جناب سمجھ مئی..... تو اٹھئے..... تشریف لے چلے کمرے میں..... تیاری کر لیں.....“

زرگل شاید فارم لینے گئے ہیں آجائیں گے ابھی.....“

”کیسے فارم.....“

”پاسپورٹ بنوا رہے ہیں“

”پتا.....“

”جی نہیں ساتھ میرا بھی.....“

”اوہو.....“

”دونوں ہنس پڑیں.....“

”تھوڑی دیر دونوں باتیں کرتی رہیں..... شہنو تو اب بات بات پر بے طرح قہقہے لگا رہی

تھی..... من خوشیوں سے بھرا تھا..... یہ خوشیاں ہنسی کے ذریعے اظہار بن رہی تھیں..... زری البتہ خود نہیں ہنس

رہی تھی..... صرف شہنو کی ہنسی میں اس کا ساتھ دے رہی تھی.....

☆☆☆.....

”جب بھی میں آپ کو مدعو کرتی ہوں..... آپ غائب کیوں ہو جاتے ہیں.....“

”جی..... وہ.....“

”جی وہ..... یہ..... کچھ نہیں چلے گا.....“ وہ ادائے ناز سے اپنے نازک نازک لمبی لمبی نعل پالش لگی انگلیوں والے ہاتھ نفی کے اشاروں میں ہلاتے ہوئے بولی.....

”تو.....“ شہباز محرزہ سالا سے تنک رہا تھا..... وہ اس وقت بڑے خوب صورت اور جدید لباس میں ملبوس تھی..... یہ لباس اس کے جسم پر بہت سج رہا تھا.....

”تو یہ کہ پہلے بتائیے..... آپ ہمارے ہاں کیوں آنا نہیں چاہتے.....“

”آپ سوال ہی غلط کر رہی ہیں..... میں جواب کیسے دوں.....“

”سوال غلط ہے“

”بالکل.....“

”مائلنے کا اچھا انداز ہے.....“

”نہیں..... نہیں.....“

”چلئے درست مان لی آپ کی بات..... لیکن..... اس دن مدعو کیا تو جناب پشاور بھاگ گئے.....

کل بلایا تو پڑھائی کا بہانہ داغ دیا..... لیکن آج..... آج کیا کریں گے خان صاحب..... آج تو میں خود لینے آپہنچی ہوں.....“ وہ دلفریب انداز سے آنکھیں منکارتے ہوئے مسکرائی.....

شہباز کے فرار کے سارے بہانے دھرے رہ گئے.....

”چلئے.....“ وہ بولی.....

”کہاں..... شہباز ایک تنک اے نکلے گیا.....“

”وہاں جہاں میں لے چلوں“ وہ اس کی نظروں کی تپش چہرے پر محسوس کرتے ہوئے کچھ

جھپٹی.....

”کیا پتہ آپ جہنم میں لے جائیں.....“ شہباز شونی سے بولا.....

”دوستوں کے ساتھ جہنم بھی جنت بن جاتی ہے یہ نہیں سنا کبھی“ وہ اترا کر بولی.....

شہباز اس کا فرداوائی سے متزلزل ہو گیا.....

متزلزل تو وہ اسی دن ہو گیا تھا..... جس دن زوبی کو دیکھا تھا..... وہ اچانک ہی بڑے کروفر سے

اس کے من میں اترا آئی تھی..... شاید..... شاید..... برسوں سے اسے اسی کا انتظار تھا..... وہ اس کی تعمیل لڑکی کا

پرتوتھی..... سینٹیلی لڑکی وہ زری میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہار گیا تھا اب وہ اس کے تخیل سے نکل کر اس کے سامنے

۴۹

”آ..... آ..... آپ“

”جی..... میں.....“

”میرا مطلب ہے آپ اس طرح آئیں.....“

”اس طرح؟ تو اور کس طرح آتی“

”میں..... میں کہنا چاہ رہا تھا آپ اکیلی آئی ہیں.....“

وہ شہباز کی بات پر کھلکھلا کر ہنس دی.....

شہباز قدرے مجبور سا ہوا..... کچھ کہنے کو تھا کہ اس نے کہا..... ”واہ شہباز خان..... ہنسی آئی ہے

آپ کی بات پر..... میں کوئی چھوٹی سی بچی ہوں..... جو کہیں آنے جانے کے لئے مجھے کسی کی انگلی پکڑنا پڑے.....

حد ہو گئی.....“ زوبی نے اپنے ہی ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا.....

شہباز خفت سے اسے دیکھنے لگا.....

وہ اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑی تھی..... گاڑی شہباز کے ڈرائیوے پر تھی..... شہباز

کیاریاں پھلانگ کر ادھر آ گیا تھا..... زوبی کو اکیلے اپنے گھر میں دیکھ کر اسے واقعی حیرانی ہوئی تھی..... لیکن جب وہ

اس کی حیرانی پریشانی پر قتل کرتے قہقہے لگا رہی تھی..... تو اس کا یہ انداز اسے بے حد بھایا تھا وہ اب اسے چشم شوق وا

کئے نکلے جا رہا تھا.....

”ہاں تو شہباز خان صاحب.....“ وہ بے تکلفی سے بولی.....

”جی فرمائیے.....“ شہباز دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کھڑا تھا.....

”پہلے تو یہ بتائیے..... کہ آپ.....“

”جی.....“

کھڑی تھی.....

سامنے

اور

قریب

اتنی قریب کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتا تھا محسوس کر سکتا تھا.....

وہ مذبذب اور کنگش سے نکل آیا..... اپنی تلاش کو بار آور دیکھ کر وہ خوش نظر آ رہا تھا.....

”چلے“..... زوبی نے اس کی جذبات کی شدت وحدت سے تپتی نگاہوں کو محسوس کرتے

ہوئے کچھ جھپٹتے ہوئے کہا.....

”کہاں“ وہ بے خیالی میں کہہ گیا.....

زوبی کی قفل کرتی ہنسی پھر چشمے کی طرح پھوٹ پڑی..... ”ارے بھی..... کہاں ہیں

آپ.....“

زوبی نے اپنا ہاتھ اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا ”جاگ رہے ہیں؟ سن رہے

ہیں؟“

”ہاں..... ہاں.....“ شہباز نے بھرپور نظروں سے اسے دیکھا..... ”جاگ بھی رہا ہوں اور

آپ کی باتیں سن بھی رہا ہوں“

”تو جواب کیوں نہیں دے رہے.....“

”جواب؟“

”ہاں“

”تم نے کوئی سوال نہیں کیا تھا..... صرف ساتھ چلنے کا حکم دیا تھا.....“

”حکم“..... زوبی پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی..... اس کے ہنسنے کا انداز اتنا من موہنا تھا..... کہ

شہباز کے چھاتی پر بندھے بازوؤں میں بجلیوں کی تڑپ جاگنے لگی.....

”خان صاحب..... میں آپ کو لینے آئی ہوں..... حکم نہیں ریکورڈ ہے..... میں آج آپ

کو اپنے ممی ڈیڑی سے ملوانا چاہتی ہوں..... دو تین دفعہ آپ طرح دے گئے..... اس لئے آج خود لینے آئی

ہوں..... دیکھئے انکار سننے کی میں عادی نہیں..... بہت ضدی قسم کی چیز ہوں میں..... کوئی ہمانہ نہیں چلے گا.....

آج آپ کو میرے ساتھ میرے گھر چلنا پڑے گا.....“

”حاضر ہیں جناب“ شہباز نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر جھکا دیا.....

زوبی شہباز کے اس انداز پر اپنا آپ پورے کاپور ہار بیٹھی..... دل تو اس نے بھی شہباز کی طرح

پہلے دن ہار اٹھا..... یہ گرانڈیل قسم کا خوب صورت نوجوان بنا دستک دیئے دل میں برا جمان ہو گیا تھا..... مدافعت

کی ضرورت پڑی تھی نہ مزاحمت کی..... دل کے در تو اس کے لئے آپوں آپ کھل گئے تھے۔

چند لمحے دونوں وہیں کھڑے رہے..... شہباز کی نگاہیں زوبی پر گزری رہیں اور زوبی پلکیں جھپکاتے

اٹھاتے ان خوب صورت نگاہوں کے وار سے بچنے کٹنے کی کیفیت سے دوچار رہی.....

مستان خان نہ آ جاتا تو شاید یہ کیفیت صدیوں اور کڑوں پر محیط رہتی.....

”شہباز خان!.....“ وہ قریب آ کر بولا.....

”ہوں“

”فون ہے جی.....“

”اچھا.....“

شہباز نے زوبی سے کہا ”ایک منٹ میں ابھی آیا.....“

وہ تیز قدم بڑھاتے اندر چلا گیا.....

مستان خان نے اس شوخ اداسینہ پر اک گہری نگاہ ڈالی.....

”آپ کون ہیں جی.....“ مستان خان نے پوچھا.....

”لڑکی ہوں خان بابا.....“ وہ مسکراتے ہوئے بولی.....

مستان خان مسکرایا..... ”وہ تو میں دیکھ رہا ہوں..... لیکن آپ ہیں کون جی.....“

اس کے دوبارہ سوال پر زوبی چونکی..... اسے احساس ہوا..... کہ اس پٹھان ملازم کو ایک اکیلی

لڑکی کے آنے پر اچھا ہوا ہے.....

وہ جلدی سے بولی ”تمہارے خان کے دوست ہیں نا عمر..... میں ان کی بہن ہوں..... آج ہم

نے انہیں اپنے ہاں دعوت پہ بلایا ہے..... دو تین دفعہ پہلے بھی بلایا یہ آئے نہیں..... آج میں ادھر سے گزر رہی

تھی سوچا ساتھ ہی لیتی چلوں.....“

”ہاں جی..... ہاں جی..... خوش ٹھیک ہے..... ہمارے خان صاحب کسی کے گھر زیادہ آتے

جاتے نہیں ہیں.....“

”وہ ان کے دوست عثمان جو ہیں..... ان کے تو گھر جاتے آتے ہیں.....“

”خو..... وہ ان کے جگری دوست ہیں.....“

”خو عمر بھی جگری دوست ہیں.....“

زوبی نے مستان خان کی سی آواز اور لہجہ بنا کر جواب دیا تو مستان خان مسکرانے لگا.....

تھوڑی دیر بعد شہباز واپس آگیا.....

مستان خان پھر لان کی طرف چلا گیا۔ وہ مالی سے گپ شپ لگا رہا تھا..... گپ شپ لگاتے

ہوئے بھی اس کا وہ بیان زوبی کی طرف تھا.....

اکیلی..... جوان اور خوب صورت لڑکی یہاں کیوں آئی تھی.....

وہ پشاور سے تھوڑا عرصہ ہی پہلے آیا تھا..... لڑکیوں اور لڑکوں کے آزادانہ میل جول کو ابھی

ذہنی طور پر قبول نہیں کر رہا تھا.....

”عمر کا فون تھا.....“ شہباز نے زوبی سے کہا.....

”اچھا..... کیا کہتے ہیں.....“ زوبی بولی.....

”بلا یا ہے مجھے“

زوبی فاتحانہ سی ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔ ”اب تو جانا پڑے گا نا..... عمر نے بھی آج شاید اپنے کچھ

دوستوں کو مدعو کیا ہے..... وہ اس مینے کی پیچیس کو جا رہے ہیں آپ کو..... تو پتہ ہے.....“

”ہنگ ہو گئی“

”ہاں نکٹ بھی لے لیا..... ساری فارمیشنز بھی پوری ہو گئیں..... داخلہ تو ان کا پہلے ہی

ہو چکا ہے.....“

”وہ تو مجھے پتہ ہے.....“

”بت خوش ہیں..... امریکہ جا رہے ہیں.....“

”اس کی زبردست خواہش تھی..... اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی.....“

”ہاں تھی تو..... اب وہاں جا کر پتہ چلے گا..... کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں یا.....“

”یا.....“

وہ کچھ کے بغیر کھلکھلا کر ہنس پڑی.....

”عمر بت اچھا لڑکا ہے.....“

”بالکل ہے.....“

”چلیں؟“

”ایسے ہی چلیں گے؟“

”تو پھر.....“

”کپڑے نہیں بدلیں گے..... عمر کے دوست بھی آرہے ہیں..... اور میری دو ایک ہیلیاں بھی“

شہباز نے اپنے کپڑوں پر نگاہ ڈالی..... صاف تو تھے لیکن صبح سے پہنے ہوئے تھے اس لئے ملے

ملے سے لگ رہے تھے.....

”آپ انتظار کریں گی..... میں تیار ہو جاؤں.....“

”جتنی دیر کہیں گے انتظار کروں گی..... لیکن ساتھ لے کر ہی جاؤں گی.....“ اس نے اس

انداز میں کہا جیسے کہہ رہی ہو..... عمر بھر بھی انتظار کرنا گوارہ ہوگا..... لیکن ساتھ نہیں چھوٹنے دوں گی.....

شہباز محرز وہ سارے نکلے گیا.....

”جائیے بھی..... دیر ہو رہی ہے.....“ زوبی نے اپنی کلائی پر بندھی منھی سی گھڑی دیکھی.....

”آپ..... آپ..... میں کھڑی رہیں گی“

”اندر آکر بیٹھنے کی دعوت آپ نے دینا ہے..... خان صاحب.....“

”تو آئیے.....“

وہ اس کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے اندر چلی گئی..... شہباز اسے ڈرائیونگ روم میں بٹھا کر

اپنے کمرے میں جانے لگا.....

”زیادہ دیر نہیں لگائیے گا.....“

”بس دو منٹ میں آیا.....“

”شہباز.....“ زوبی قدرے ہچکچاتے ہوئے بولی.....

”جی.....“ شہباز نے گردن موڑ کر اسے دیکھا.....

”ایک فرمائش کروں.....“ وہ شرماتی لجاتی بولی.....

”کروں.....“ وہ جھجکا.....

”آپ..... ایسے کپڑے پہننے گا..... شلوار قمیض..... اور کوئی.....“

شہباز نے خوب صورت نظروں سے اسے دیکھا.....

”بت سوٹ کرتا ہے آپ کو یہ لباس“ وہ جلدی سے بولی.....

”مجھے سوٹ بھی بت سوٹ کرتا ہے..... مس زوبی احمد.....“ شہباز شوخی سے بولا.....

”ناٹ مس زوبی احمد.....“ زوبی بھی اترائی.....

”تو.....“

”صرف اور صرف زوبی.....“

دونوں ہنس پڑے.....
تھوڑی دیر بعد شہباز تیار ہو کر آگیا..... اس نے آسانی رنگ کے شلوار قمیض پر نیوی بلو کوئی پین رکھی تھی..... پاؤں میں پشاور چلی تھی..... اپنا مخصوص سینٹ پرے کیا تھا..... اس کے کمرے میں آنے سے پرفوم کی مٹک پھیل گئی.....

”یہ میری پسندیدہ پرفوم ہے“ زوبی نے مٹک اندر اتارتے ہوئے ہنس کر کہا.....
”گڈ..... مجھے یہ بہت پسند ہے..... تھیک..... یو..... چلے..... شہباز نے ہاتھ سے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زوبی سے کہا.....

”زوبی باہر آگئی.....“

”شہباز بھی اس کے ساتھ تھا.....“

مستان خان نے دونوں کو گاڑی کی طرف جاتے دیکھا.....

”میں اپنی گاڑی میں نہ جاؤں“ شہباز نے رک کر کہا.....

”کیوں“

”واپسی.....“

”چھوڑ جائیں گے آپ کو.....“

”ترد ہو گا..... میں اپنی گاڑی ہی لے جاتا ہوں..... آپ چلے..... میں آتا ہوں“

”آپ کی مرضی.....“

زوبی اپنی گاڑی میں بیٹھ گئی..... شہباز اپنی گاڑی لے آیا..... جانے سے پہلے اس نے مستان

خان سے کہا.....

”تم لوگ کھانا کھا لینا..... میں ان کے ہاں مدعو ہوں..... کھانا کھا کر آؤں گا.....“

”بہت اچھا خان.....“ مستان خان نے کچھ ایسی نگاہوں سے زوبی کو دیکھا کہ شہباز کے اندر

خطرے کی تھنی بجنے لگی.....

وہ کچھ پریشان سا ہوا..... زوبی گاڑی نکال لے گئی تھی.....

وہ بھی اس کے پیچھے چلا آیا..... مستان خان کی نگاہوں سے پریشان پریشان.....

”زوبی کا گھر آگیا.....“

گاڑیاں آگے پیچھے لے چوڑے ڈرائیوے پر رکیں.....

زوبی گاڑی سے نکل کر شہباز کی طرف آئی..... شہباز بھی گاڑی سے نکل آیا تھا.....

”آئیے“ زوبی اسے ساتھ لے کر ڈرائیونگ روم کی طرف بڑھی..... شہباز اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا.....

خوب صورت کوٹھی کافی وسیع تھی..... سبز بزم خلیس گھاس کے فرش سے گھرے چمنوں اور قد آور درختوں ان سے لپٹی بیلوں پھولوں بھرے کنبوں نے کوٹھی کے حلقہ و قار میں اضافہ کر دیا تھا.....

سانے کی رخ بڑا سا ڈرائیونگ روم تھا..... جس کی تزئین و آرائش خوب صورتی سے کی گئی

تھی..... ہر چیز نفیس اور قیمتی تھی..... کرسٹل کے فانوس چینی کے بڑے بڑے داز..... پتھر لے مجھے..... نایاب

مصوری..... کی تصویریں بیش قیمت نوادرات سب نفاست طبع کے امین تھے.....

ڈرائیونگ روم میں عمر اور اس کے دو تین دوست بیٹھے تھے..... ماریا اور شازیہ بھی تھیں.....

زوبی شہباز کے ساتھ اندر آئی..... تو سب نے بڑے پیار اور جوشیلے انداز میں ان کا خیر مقدم کیا.....

”بالآخر خان صاحب کی سواری آہی گئی“ عمر نے کہا.....

”خود لائی ہوں“ زوبی بولی ”نہ جاتی تو آتے ہی نہیں.....“

”ایسی کیا بات ہے جناب.....“ رفیع نے پوچھا.....

”شان بے نیازی“ ماریا بولی.....

”کب سے ہم سب بیٹھے انتظار کر رہے ہیں“ شازیہ نے ہنس کر کہا ”زوبی کی نئی دریافت

دیکھنے کے لئے“

”کیسی ہے“ زوبی نے ابرو اچکا کر شازیہ سے کہا.....

شازیہ سر ہلا کر بولی ”اچھی ہے.....“

”صرف اچھی“

”تو اور.....“

”لا جواب بھی کہہ سکتی ہو.....“

”چلو لا جواب سہی“

زوبی کھلکھلا کر ہنس دی..... شہباز کچھ کتڑا کتڑا سا لگ رہا تھا..... لڑکیوں کی ایسی بے

تکلف محبت اسے پہلے کہاں میسر آئی تھی..... وہ کچھ جھجک تو محسوس کر رہا تھا..... لیکن یہ سب کچھ برائیں اچھا

لگ رہا تھا.....

تھوڑی دیر گپ شپ ہوئی.....

پھر

زوبی کے می ڈیڈی بھی اندر آگئے۔

زوبی نے بڑے شوق سے شہباز کا تعارف اپنے می ڈیڈی سے کروایا۔

”خان صاحب! ہمارے نئے دوست ہیں۔“ اس نے بلا جھجک انتہائی بے تکلفی سے اپنے می ڈیڈی سے کہا۔ شہباز کچھ حیران سا ہوا۔ اس کے می ڈیڈی نے بیٹی کے دوست کی بڑی عزت افزائی کی تھی پیار اور تپاک سے ملے تھے۔ اور کچھ دیر اسی کے ساتھ باتیں کرتے رہے تھے۔

اتنے بے تکلف والدین!

شاید یہ بھی شہباز کی کوئی خفہ اور دبی ہوئی خواہش تھی۔ اسے بے تکلفانہ ماحول بیحد اچھا

لگا۔

زوبی کی می تو شہباز کو بہت ہی اچھی لگیں۔ پڑھی لکھی روشن خیال عورت اردو میں ملی انگریزی میں بات کرتی تو شہباز کو بہت اچھا لگتا۔ اس کے ڈیڈی تو بہت ہی بے تکلف تھے۔ پاپ منہ میں دبائے ہنسی مذاق کی باتیں اس طرح کر رہے تھے۔ جیسے وہ بھی ان کے ہم عمر ہوں۔ بار بار شہباز کو اپنے خان بابا کا خیال آ رہا تھا۔ جن کے سامنے دم مارنے کی بھی مجال نہ ہوتی تھی۔ اتنی بے تکلفی سے باتیں کرنے کا سوال ہی نہ تھا۔

شہباز نے یہاں یہ بات بھی محسوس کی کہ ان کے گھر میں می کی حکمرانی ہے۔ اور ڈیڈی اس حکمرانی کو بڑے تقاضے سے ماننے ہوئے سب کو احساس بھی دلاتے ہیں۔ شہباز کو اپنی بی بی گل کا خیال آ رہا تھا۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا۔ مردی کو گھر میں حکمرانی کرتے دیکھا تھا۔ حکمرانی بھی سخت گیری کی حد تک۔ عورت تو صرف حکم کا بندہ تھی۔ اس کا اپنا تشخص اپنا وجود کچھ نہیں تھا۔ اپنی مرضی سے برتنے کا کبھی بھی کسی طرح بھی اختیار نہیں تھا۔ لیکن یہاں زوبی کے می ڈیڈی کتنے خوشگوار ماحول میں زندگی گزار رہے تھے۔ حکم حاکمیت می کی تھی۔ جسے فراخ دلی سے ڈیڈی نے قبول کیا ہوا تھا۔

وہ ان سے بہت متاثر و مرعوب ہوا۔

اس کے اندر خان بابا کے رویوں سے خلا پیدا ہو چکا تھا۔ وہ زوبی کے می ڈیڈی کو دیکھ کر کچھ اور پھیل گیا۔ اس کا جی بھی چاہتا تھا۔ کہ گھر ملو ماحول ایسا ہو۔ بی بی گل اور خان بابا میں ایسی ہی مفاہمت ہو۔ گھر کی فضا اسی طرح قہقہوں اور ہنسی مذاق سے بھری رہے۔

لیکن

ایسا نہیں تھا

وہ کچھ الجھن اور جھلاہٹ محسوس کرنے لگا۔ زوبی کے می ڈیڈی اسے بہت اچھے لگے۔

تھوڑی دیر گپ شپ لگانے کے بعد می ڈیڈی اندر چلے گئے۔ بچوں کو بے تکلفی سے بلا گلا کرنے کے لئے چھوڑ دیا۔

رات کھانے پر بھی بے تکلفی کی فضا برقرار رہی۔

کھانے کے بعد سب دوست کوک پان کے لئے گاڑیوں میں لد گئے۔

شہباز حیران ہوا۔ کہ ان کے می ڈیڈی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

ڈیڈی اور می اپنے بیڈروم میں چلے گئے۔ ڈیڈی ناول پڑھنے لگے اور می ٹیپ آن کر کے ہلکے سروں میں میوزک سننے لگیں۔ والدین اور بچوں کی ایسی انڈر شیننگ شہباز کے لئے نئی چیز تھی۔ یہ بات تو اس نے عثمان کے ہاں بھی نہ دیکھی تھی

شہباز بھی اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔ زوبی اور ماریا اس کے ساتھ آ بیٹھیں۔ ماریا زوبی کے انتخاب کی کھلے لفظوں میں داد دینے لگی۔ تو شہباز چونک چونک گیا۔ سب دیر تک سڑکوں پر ڈرائیو کرتے رہے۔ پھر لبرٹی گئے۔ کوک بی پان کھائے۔ اور واپس ہوئے۔

شہباز زوبی اور ماریا کو ڈرائیو کرنا تھا۔ وہ پہلے ماریا کو کینٹ چھوڑنے گیا۔ پھر زوبی کو اس کے گھر۔ ماریا کو ڈرائیو کرنے کے بعد وہ زوبی کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ وہ جھجک رہا تھا۔ لیکن اس جھجک میں بھی لطف تھا۔

اسے یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔

دودن بعد وہ پھر زوبی سے ملا۔ ملاقات مختصر تھی۔ لیکن اثر دیر پا۔

اس سے اگلے دن پھر ملاقات ہوئی۔ یہ بھی سرسری سی ملاقات تھی۔ لیکن بڑی سانی بڑی خوب صورت۔

اور پھر وہ دو دو تین تین دن کے وقفوں کے بعد ملنے لگے۔ کبھی سارے دوستوں کے ساتھ۔ کبھی صرف عمر ساتھ ہوتا اور کبھی دونوں اکیلے ہوتے۔ جھجک اور تکلف کی دیواریں از خود گر گئی تھیں۔

☆☆☆

”آغا بی بی! اب کچھ دیر شہر ہمارے پاس رہئے..... آپ کی صحت اچھی نہیں رہتی..... شہر میں ایک سے ایک اچھا ڈاکٹر ہے..... ہو سہیل میں داخل ہو کر چیک اپ کروائیں..... علاج ہو..... آپ ٹھیک ہو جائیں.....“

آغا بی بی نے پیار سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے دعائیں دیں ”خوش رہو میرے بچے..... خدا زندگی دے نصیب یاور ہوں.....“

”آپ کی دعائیں ہی ہمارا بہترین سرمایہ ہیں آغا بی بی جانے..... لیکن علاج.....“

”میں کوئی بیمار ہوں.....“

”صحت گرتی جا رہی ہے“

”عمر کا تقاضا ہے بچے.....“

”عمر اتنی بھی نہیں ہو گئی.....“

”کچھ نہیں ہے..... کچھ نہیں ہے..... کوئی بیماری نہیں..... تکلیف نہیں..... پھر شر آتی تو

رہتی ہوں تمہارے پاس.....“

ریشمینے نے بھی آغا بی بی سے شرچلنے کی استدعا کی.....

صبور خان بولے ”آغا بی بی کی مرضی اور خوشی ہے..... جہاں جی چاہے رہیں.....“

آغا بی بی موضوع بدلنے کو بولیں ”میری مرضی اور خوشی چاہتے ہو.....“

”بالکل.....“ سب نے کہا.....

”میری خواہش ہے میں بچوں کی شادیاں دیکھ لوں“

”آپ ضرور دیکھیں گی آغا بی بی جانے.....“ نواز جھٹ سے بولے ”اب تو تھوڑا ہی عرصہ رہ

گیا ہے شہباز کے امتحانوں میں..... یہ وقت تو ایسے بھی تیاریوں میں گزر جائے گا.....“

”ہاں.....“ آغا بی بی نے اطمینان سے سانس لی.....

پھر

کانی دیر تک شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں باتیں ہوتی رہیں.....

آغا بی بی نے جو کچھ کہا..... کسی کو اس پر اعتراض نہیں تھا.....

صبور اور نواز اٹھ کر حجرے میں چلے گئے تو آغا بی بی نے ریشمینے سے کہا ”میرے

پاس پرانے زیور رات ہیں..... لڑکیوں کو دکھا دو..... انہیں پسند ہوں تو اسی طرح رہنے دوں..... نہیں تو ان کی پسند

کے ہوا لوں.....“

”بہت خوب صورت زیور ہیں آغا بی بی..... لڑکیوں کو پسند ہوں گے.....“ تمکینے بولی.....

”انہیں دکھا دینے میں ہرج کیا ہے..... ان کی پسند کی چیزیں بنانا چاہئیں.....“ آغا بی بی بولیں.....

”تمکینے ہنس کر بولی ”ہماری پسندنا پسند کا تو آپ نے پوچھا نہیں تھا.....“

آغا بی بی مسکرا کر بولیں ”وقت وقت کی بات ہوتی ہے بچی.....“

”وقت اب بھی ویسا ہی ہے بدلائیں“

”بدل گیا ہے..... غفلت دی کی ہے کہ بدلے وقت کا ساتھ دیا جائے“

”واہ جی.....“

”پچیاں کہاں ہیں.....“

”ادھر کو بھی کی طرف گئی ہیں..... زرگل اسے سجانے سنوارنے میں لگا ہوا ہے..... وہی دیکھنے

گئی ہیں.....“

”آئیں تو میرے پاس بھیج دینا.....“

”جی بہت اچھا.....“

شہنو اور زری تھوڑی دیر بعد ادھر آگئیں..... شہنو کو بھی کی ڈیکوریشن سے بہت مسرور

نظر آ رہی تھی..... زرگل بھی تو اس کی پسند کی چیزیں منگوا رہا تھا..... پردے اور کارپٹ تک اس کے پسندیدہ رنگوں

کے ڈولائے تھے..... فرنچیز بھی شہنو ہی کی پسند کا بنا تھا..... سجاوٹ اور آرائش کی کئی چیزیں اس نے خود خریدی

تھیں.....

شہنو اور زری باتیں کرتی ادھر ہی آگئیں.....

آغا بی بی اپنے زیورات کی صندوقچی کھولے بیٹھی تھیں.....

”یہ کیا ہے آغا بی بی جانے“ شہنو نے ایک کنڈن کا بالا اٹھالیا.....

”پسند ہے“ آغا بی بی نے پوچھا.....

”بہت پیارا ہے آغا بی بی“ شہنو نے کان سے لگاتے ہوئے کہا ”بے نازری“

”ہاں.....“

”بھاری بہت ہے اس سے تو کان ہی دوہرا ہو جائے گا“

”اس کے ساتھ یہ چکیں لگاتے ہیں..... جو بھاری بالے کو سہارا دیتی ہیں.....“ آغا بی بی نے

سچے موتیوں کی لڑی اسے دکھائی..... جس کے ایک سرے پر کلپ لگا تھا..... آغا بی بی نے بالا اس سے لے کر چمک

میں پھنسا لیا..... پھر بولیں ”لو اب اسے کان میں پہنوا دو یہ ایک بک اوپر بالوں میں اڑس لو..... وزن سارے گا

کان.....

شہنو نے شوق سے کان میں بالا پنا اور ہک بالوں میں اٹکالیا..... واقعی بہت حد تک بالے کا وزن اس سارے نے سارا لیا تھا.....

”کیسا ہے زری“ اس نے بالا جھلاتے ہوئے زری کو دکھایا۔

”بہت خوب صورت“ زری نے کہا۔

”تم بھی بہن کر دیکھو“ شہنو نے کان سے بالا اتارتے ہوئے کہا.....

”نہیں شہنو.....“ زری بولی ”تمہیں اچھا لگے گا“

”تمہیں بھی اچھا لگے گا.....“

”نہیں بھئی نہیں.....“

شہنو نے زبردستی بالا اس کے کان میں ڈال دیا..... زری کے بھرے چہرے پر واقعی بالا بہت

پھبن دکھایا.....

”ہائے کتنا اچھا لگ رہا ہے“ شہنو نے اسے پیار کر لیا ”ہیں نا آغا بی بی..... میرے چہرے پر

تو اتنا اچھا نہیں لگا ہو گا..... دیکھیں زری کی طرف..... شہزادی لگ رہی ہے“

”جانے دو شہنو“ زری بالا اتارتے ہوئے بولی ”بڑھا چڑھا کر تعریف کرنے کی عادت

چھوڑو.....“

”اچھا آغا بی بی سے پوچھ لو..... کیوں آغا بی بی جانے..... زری کے چہرے پر زیادہ سجا ہے تا یہ

بالا.....“

”دونوں کے چہرے پہ سجا ہے“ آغا بی بی نے کہا۔

”آغا بی بی“ شہنو نے داوی کے گلے میں بازو ڈال دیئے..... ”ایسے نہ کہیں.....“

”تو کیسے کہوں“ آغا بی بی نے اس کے گال پر پیار کرتے ہوئے کہا ”ماشاء اللہ دونوں ہی بہت

پیاری ہو..... جو چیز پسنوگی اچھی لگے گی“

”اور کیا کچھ ہے آغا بی بی جانے.....“

”بہت کچھ ہے.....“

”دکھائیں“

”دکھاتی ہوں..... میں نے تم دونوں کو بلایا ہی اس لئے ہے..... اپنی اپنی پسند کی چیزیں دیکھ

لو..... یہ پرانے زیور ہی پسندیں یا نئے خادوں.....“

”دکھائیں پہلے.....“ شہنو نے تجسس کا اظہار کیا پھر زری سے بولی ”ادھر قریب آ جاؤ نا

آغا بی بی کے..... گدے پر..... دیکھو تو کتنے پیارے پیارے زیور ہیں.....“

زری بھی قالین سے گدے پر کھٹک آئی۔

آغا بی بی نے اپنے سامنے لال ریشمی رومال بچھا دیا..... پھر منہ دقچی سے ایک ایک زیور نکال کر بچیوں کو دکھانے لگیں.....

سست لڑی کٹھن مالائیں..... جھکے بالے داؤنیاں گلو بند دہرے ہار آریاں کنکن کے مختلف زیور..... کڑے چوڑیاں بازو بند نفیساں پہنچیاں سب نکال نکال کر بچیوں کو دکھا کر رومال پر آغا بی بی رکھتی گئیں.....

جڑاؤ اور کنکنی زیور تو شہنو اور زری دونوں ہی کو بہت پسند آئے.....

”یہ میں لوں گی“

”یہ میرا ہے“

”یہ آپ جسے چاہیں وے دیں“

”یہ پہنچیاں بہت خوب صورت ہیں“

”یہ تم لے لو.....“

”نہیں..... یہ تمہیں پسند ہیں تو تم لے لو.....“

دونوں لڑکیاں اتنے خوب صورت اور نایاب زیور دیکھ کر خوشی خوشی انتخاب کر رہی تھیں.....

”تو مطلب یہ ہوا..... کہ تم دونوں ہی کو پرانا زیور پسند ہے“ آغا بی بی نے دونوں کی پسند کی

چیزیں الگ الگ کرتے ہوئے کہا.....

”بالکل..... بہت اچھا ہے آغا بی بی..... اسے تروانے کا خیال بھی دل میں نہ لائیے گا.....“

شہنو نے ہنس کر کہا.....

”نئے زیور بھی اچھے بن رہے ہیں“ آغا بی بی بولیں.....

”وہ تو خان بابا بنوا کر دیں گے“ شہنو ہنس پڑی.....

”ہاں وہ بھی بنوائیں گے..... نواز کہہ رہا تھا لاہور سے لائے گا زیور.....“

”ہاں آغا بی بی..... وہاں نئی نئی چیزیں بنتی ہیں.....“

”لیکن یہ زیور بھی اپنی جگہ.....“ زری بولی

”اس کی کیا بات“ شہنو نے اس کی بات کاٹے ہوئے کہا.....

”ایسا کھرا سونا اب تو نہیں لگتا زیوروں میں.....“ آغا بی بی خالص پاسے کے کڑے اٹھا کر دیکھتے ہوئے بولیں.....

”موتیوں کا کام آج کل بہت خوب صورت ہوتا ہے“ شہنو بولی.....

آغا بی بی نے دونوں لڑکیوں کی پسند کی چیزیں الگ الگ رکھ لیں.....

خالص سونے کی موٹی موٹی سادہ چوڑیاں دونوں میں سے کسی نے بھی نہ لیں.....

”یہ بہت بھاری ہیں.....“ شہنو نے ایک چوڑی اٹھائی.....

”خالص سونا ہے“ زری بولی۔

چار چار تولے کی ایک ایک چوڑی ہے“ آغا بی بی نے ہتھیلی پر چوڑی رکھ کر وزن کرتے ہوئے

کہا.....

”یوں کریں آغا بی بی.....“ شہنو بولی۔

”کیا.....“

”یہ چوڑیاں تروادیں“

”نہیں بھئی..... ایسے ہی دے دوں گی..... آٹھ تمہاری آٹھ زری کی..... بعد میں جو جی چاہے

بنو الینا.....“

”سونا تو ہے نا.....“

”ہائے اتنا ڈھیر سارا.....“ شہنو نے بچوں کی طرح خوش ہو کر زیور کو دیکھا.....

”اس سے بھی تین گنا تھا میرے پاس..... تمہاری ماؤں کو بھی اسی میں سے دیا تھا.....“

آغا بی بی زیور سنبھالے ہوئے دونوں کو اس کے متعلق بتانے لگیں..... کئی زیور ساٹھ ساٹھ

ستر ستر سال پرانے تھے..... آغا بی بی کو شادی پر ان کی ساس نے دیئے تھے.....

لڑکیاں شوق سے ان کی باتیں سننے لگیں..... شہنو تو اٹنے سیدھے سوال بھی کئے جاری

تھی..... آغا بی بی مسکراتے ہوئے اس شریر بچی کے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے کبھی کبھی اپنے ماضی میں بھی کھو

جاتی تھیں.....

آغا بی بی نے زیور پھر صندوقچی میں بند کر دیا..... زری نے ان کی ہدایت کے مطابق پھر

صندوقچی الماری میں رکھ دی.....

”شام نواز خان ریشمنیے اور شہنو واپس شہر جانے والے تھے.....

بڑے اصرار سے انہوں نے آغا بی بی کو بھی تیار کر لیا..... زری بھی فارغ ہوئی تھی..... آغا بی بی نے اسے بھی ساتھ

چلنے کو کہا.....

”دو تین دن رہ کر آجائیں گے“ آغا بی بی نے کہا.....

”بہت اچھا آغا بی بی“ زری نے کہا اور ساتھ جانے کے لئے تیار ہونے اپنے کمرے میں چلی

گئی.....

زری کا اپنا جی بھی چاہ رہا تھا..... ایک کشش تھی جو دامن کھینچ رہی تھی.....

شاید

شاید شہباز کا فون آجائے..... اسی خیلے ہی سے اس سے چند باتیں ہو جائیں!

آغا بی بی ساتھ جا رہی تھیں..... یقینی تھا کہ وہ شہباز سے بھی فون پر بات کریں گی.....

پھر

وہ بھی

شہباز سے بات کر لے گی.....

زری کے من میں تو یہی کچھ تھا..... لیکن جانے من کی ان باتوں کو وہ اظہار کی راہ دے سکے

بھی کہ نہیں.....

نے وہیں گاڑی روک لی.....

گاڑی نکلی تو اس نے جلدی سے اپنی گاڑی اس خالی جگہ پہ پارک کر دی.....

وہ گاڑی بند کر کے باہر نکلا.....

تو پہلے نکلنے والی گاڑی میں سے کسی نے اسے مخاطب کر کے ہیلو کہا.....

وہ مڑ کر گاڑی کی طرف دیکھنے لگا.....

پہلی نظر میں پہچان نہ سکا.....

لیکن

جب غور سے دیکھا تو شناخت کرنے میں دقت نہ ہوئی..... وہ زو بی کی دوست ماریا تھا.....

ماریا سے وہ کئی دن پہلے زو بی کے ہاں مل چکا تھا.....

”ہیلو“ اس نے جواباً کہا..... اور اس کی گاڑی کے قریب آگیا.....

”کیسی ہیں؟“ اس نے اخلافاً کہا.....

”فائن“ وہ مسکراتے ہوئے بولی..... ”آپ کہئے.....“

”شکریہ“

”شاپنگ کرنے آئے ہیں یا یونی گھومنے پھرنے.....“

”ارادہ تو کچھ خریدنے کا ہی ہے.....“

”ایک کام کریں گے“

”جی فرمائیے“

”زو بی..... اس سائے والی دکان میں ہے.....“

”تو..... تو.....“

”آپ اسے ساتھ لے آئیں گے؟“

”کہاں“

”اس کے گھر.....“

”میں سمجھا نہیں.....“ شہباز کی معصومیت پر ماریا ہنس پڑی..... وہ کچھ خفیف سا ہو گیا..... تو

ماریا سے سمجھاتے ہوئے بولی.....

”سیدھی سی بات ہے مسٹر خان..... مجھے سات بجے ہو سہیل پہنچنا ہے..... میری کزن بیمار

ہے..... اور یہ مختصر میرے ساتھ شاپنگ کے لئے آگئی تھی..... اب اس کی شاپنگ ہی ختم نہیں ہو رہی..... ادھر

شام ابھی پوری طرح اتری نہیں تھی..... گرمیوں کا سورج ڈوبتے گرمی کا جلوہ دکھائے جاتا ہے..... فضائیں خاصا جس اور ٹھنکن تھی..... کبھی کوئی بھولا بھرا ہوا کاجھونکا آجاتا تو بہن تازگی محسوس کرنے لگتے تھے.....

گرمی ٹھنکن اور جس کے باوجود لہری مارکیٹ میں خاصا رش تھا خریداری زوروں پر تھی..... ہر دکان میں جھوم کی سی کیفیت تھی..... زیادہ تر دکانیں ایئر کنڈیشنڈ تھیں..... اس لئے باہر کی نسبت اندر رش زیادہ تھا..... سیل میں بڑی مستعدی دکھارہے تھے..... کاؤنٹروں پر چیزوں کے ڈھیر تھے..... چیزیں فروخت کرنے کا فن جانتے تھے..... گاہک ایک چیز طلب کرتا تو دس حاضر کر دیتے..... بعض اوقات نہ چاہتے ہوئے بھی گاہک چیزیں خریدنے پر مجبور ہو جاتا.....

شہباز نے کچھ شاپنگ کرنا تھی..... بی بی گل نے کچھ چیزیں منگوائی تھیں..... اسے کل پشاور جانا تھا..... آغا بی بی نے بطور خاص اسے فون کر کے آنے کے لئے کہا تھا..... شہباز نے بہترے پڑھائی کے ہمانے بنائے تھے اگلی چھٹیوں میں آنے کا وعدہ کیا تھا..... لیکن آغا بی بی مصرتھیں..... کہ وہ ضرور آئے..... بہت دنوں سے اسے دیکھا نہیں تھا..... پچھلی بار بھی وہ پشاور گیا تو آغا بی بی سے ملنے گاؤں نہیں گیا تھا..... اب وہ بڑے پیار سے بلا رہی تھی..... ”صرف ایک دن کے لئے آجاؤ..... لیکن آؤ ضرور.....“ انہوں نے جیسے درخواست کی تھی.....

شہباز نے حامی بھر لی تھی..... پڑھائی تو محض ہمانہ تھی..... ان دنوں ویسے بھی یونیورسٹی چند طلباء کے جھگڑے کی وجہ سے بند تھی..... پشاور جانے کو ویسے ہی جی نہیں چاہ رہا تھا..... لاہور میں زو بی کی جو کشش تھی..... اس سے وہ بچ نہیں پارہا تھا..... یہ لڑکی پوری طرح اس کے حواس پر مسلط ہوئی جا رہی تھی.....

شہباز کو گاڑی پارک کرنے کے لئے جگہ نہیں مل رہی تھی..... وہ آہستہ آہستہ گاڑی چلاتے آگے بڑھ رہا تھا..... دائیں ہاتھ کھبے کے پاس کھڑی گاڑی واپس نکل رہی تھی..... جگہ بن جانے کے لئے شہباز

مجھے دیر ہو رہی ہے..... پلیز آپ اسے ساتھ لے جائیے گا.....

”ٹھیک ہے..... لیکن وہ ہے کہاں.....“

”اس سپر سٹور میں تھی..... ڈھونڈ لیں نا جا کر..... اتنا کام بھی نہیں ہو سکتا.....“ وہ شوفی سے

آنکھیں نچاتے ہوئے بولی.....

”آپ اسے چھوڑ کر جاری تھیں.....“ شہباز نے پوچھا.....

”یہی ارادہ تھا.....“ وہ ہنسی۔

”اچھی دوست ہیں آپ“

”یہ بات نہیں خان صاحب.....“ ماریا سنجیدگی سے بولی..... ”اسے اپنی ایک واقعہ کار مل

گئی تھیں ان کے ساتھ جانے کا کہہ رہی تھی..... یوں اس نے خود ہی مجھے چھٹی دے دی تھی.....“

”وہ اپنی گاڑی کیوں نہیں لائیں.....“

ماریا ہنس کر بولی ”شاید اس کے دل نے کہا ہو کہ شہباز لبرٹی پہنچ جائیں گے“

”آپ بہت شریر ہیں.....“

”دل کی بات کہہ رہی ہوں نا..... اچھا آپ دیکھئے اسے..... میں جاری ہوں..... دیر ہو رہی

ہے.....“ ماریا نے گاڑی چلائے ہوئے کہا..... پھر وائس ہاتھ برآمدے پر نظر پڑی تو رکستے ہوئے بولی ”وہ ہے

زوبی..... شہباز خان..... وہ برآمدے میں.....“

شہباز نے اس کی طرف دیکھا..... پھر ماریا سے کہا ”اب آپ جا سکتی ہیں..... شکریہ“

ماریا مسکراتے ہوئے چلی گئی

اور

شہباز لمبے لمبے ڈگ بھرتا سڑک عبور کر کے برآمدے میں جا پہنچا.....

”ہیلو.....“ اس نے زوبی کی پشت پر آتے ہوئے کہا.....

زوبی نے دو تین لفافے اٹھا رکھے تھے..... ہیلو کی آواز پر پلٹ کر دیکھا.....

شہباز کو سامنے پا کر وہ خوشی سے لہرائی گئی ”ہیلو..... آپ.....“

شہباز نے اس کے ہاتھ سے لفافے لیتے ہوئے کہا ”شاپنگ ہو چکی یا ابھی باقی ہے“

”آپ کیسے آئے.....“

”کچھ چیزیں خریدنا تھیں.....“

”خرید لیں“

”نہیں ابھی تو آیا ہوں..... آتے ہی آپ کی دوست ماریا نے ڈیوٹی سونپ دی..... کہ آپ کو

ڈھونڈوں.....“

”سو ڈھونڈ لیا.....“

”تردد نہیں کرنا پڑا جلد ہی مل گئیں.....“

”واقعی؟“ زوبی نے دو معنی انداز میں شوفی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تو شہباز اس شوخ ادائی

پر دل تھام کے رہ گیا..... اس نے زوبی سے کچھ کہا تو نہیں لیکن خاموش خوب صورت آنکھیں بہت کچھ کہہ

گئیں.....

زوبی ادائے دلفریبی سے سر کو جھٹک کر بولی ”مجھے دو ایک چیزیں اور خریدنا ہیں..... آپ کو

جانے کی جلدی تو نہیں.....“

”نہیں.....“

”یہ لفافے“

”گاڑی میں رکھ آتا ہوں“

”ٹھیک ہے.....“

”میں نے بھی دو چار چیزیں لینی ہیں..... کل پشاور جا رہا ہوں“

”اے نہیں.....“ زوبی نے گھبرا کر کہا ”کل تو میں نے آپ کو گھر بلانے کا پروگرام بنایا

تھا..... عمر جا رہا ہے اس کے ساتھ آپ بھی کچھ وقت گزارنا پسند کریں گے.....“

”وہ تو ہے..... لیکن.....“

”لیکن کیا“

”آغا بی بی نے بڑے اصرار سے بلایا ہے“

”آغا بی بی کون.....“

”میری دادی ماں.....“

”پھر کسی دن چلے جانا..... کل میں نہیں جانے دوں گی.....“

شہباز سوچ میں پڑ گیا.....

”ایک دن اور سہی.....“ وہ اصرار سے بولی ”لیکن کل آپ کو میرے ہاں آنا ہو گا.....“

”ٹھیک ہے..... میں آج فون کر دوں گا پشاور.....“

”اوہ..... تم کتنے اچھے ہو شہباز“ زوبی اپنی بات منوا کر خوشی سے ہنستے ہوئے بولی۔

”ہوں تو واقعی اچھا.....“ شہباز مسکرایا..... اور گاڑی کی طرف جانے کے لئے قدم اٹھایا.....
 ”اگر تم میری بات نہیں مانتے تو پتہ ہے..... میں ناراض ہو جاتی.....“ زوبی بھی اس کے ساتھ
 ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے بولی.....

”اوں ہوں..... ایسی باتیں نہیں کرتے.....“ شہباز نے ہولے سے کہا..... زوبی مسکرانے
 لگی.....

”تم ہمیں ٹھہرو..... میں یہ چیزیں گاڑی میں رکھ آؤں.....“ شہباز نے اس پر اک خوب
 صورت نگاہ ڈالی.....

”ٹھیک ہے“ زوبی نے کہا اور شہباز کو پیار بھری نظروں سے جاتے دیکھنے لگی.....
 ہر آمدوں میں لوگ آ جا رہے تھے..... کچھ شاپنگ کر کے دکانوں سے نکل رہے تھے کچھ دکانوں
 کے اندر جا رہے تھے..... زوبی کو اپنی وہ واقف کار مل گئی..... جس کے ساتھ اس نے واپسی کا ارادہ کیا تھا.....

”چلیں اب“ وہ زوبی کے قریب آ کر بولی ”ہو گئی نا آپ کی شاپنگ.....“
 ”تھیکس“ زوبی نے خوش دلی سے کہا ”آپ جانیے..... میں آ جاؤں گی..... میری گاڑی
 آگئی ہے.....“

”ٹھیک ہے.....“
 ”شکریہ“
 وہ چلی گئی..... زوبی ستون کے ساتھ کھڑی شہباز کی راہ دیکھنے لگی.....
 شہباز واپس آیا..... دونوں نے اپنی اپنی مطلوبہ چیزیں خریدیں..... لفافے اٹھائے دونوں ساتھ
 ساتھ چلتے گاڑی کی طرف آ گئے.....

”اب؟“ شہباز نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ زوبی کے لئے کھولتے ہوئے پوچھا.....
 ”کوئی ڈرنک لیتے ہیں..... مجھے تو سخت پیاس لگ رہی ہے“ زوبی نے بیٹھتے ہوئے کہا.....
 شہباز بھی گاڑی میں بیٹھ گیا..... پھر زوبی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”کسی سٹیک بار..... یا
 ریٹورنٹ میں لے جاؤں؟ اعتراض تو نہیں ہوگا.....“

”بالکل..... نہیں.....“ زوبی مسکراتی نگاہیں اس پر ڈالتے ہوئے بولی ”لیکن پہلے کچھ پلا
 دیجئے.....“

”بست پیاسی ہیں؟“ شہباز نے بھی پہلی بار شوخی سے ذومعنی بات کہی.....

زوبی کے گالوں پر شفق لہرا گئی..... اس نے سیٹ کی بیک پر سر ڈالتے ہوئے آنکھیں بند
 کر لیں..... اس کے ریلے ہونٹوں پر بڑی دلاویز مسکراہٹ تھرک رہی تھی.....

شہباز کی نگاہیں ہنس رہی تھیں.....
 شاید زوبی نے ان نگاہوں کا طلسم بند آنکھوں سے بھی دیکھ لیا..... اس انداز میں پڑے پڑے
 بولی ”چلے بھی..... مت دیکھئے اس طرح.....“

زوبی نے یہ بات اس طرح کی تھی..... جیسے انکار انداز سپردگی لئے ہو.....
 شہباز مسکورا تھا.....

چند لمبے یونی گزر گئے..... پھر زوبی نے سر اٹھایا..... مخمور اور مسکور نظروں سے شہباز کو
 دیکھا.....

”کیا پیاسا مارنے کا ارادہ ہے“ وہ شگفتگی سے بولی.....
 شہباز نے سر ہلاتے ہوئے اسے اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہا ہو نہیں..... میں تمہیں سیراب
 کر دوں گا..... میں خود بھی پیاسا ہوں..... اور تشنگی مٹنی کرب انگیز ہوتی ہے میں جانتا ہوں.....

شہباز نے گاڑی چلا دی..... شاپنگ کے بیک اور لفافے پچھلی نشست پر پڑے تھے..... وہ اسے
 ایک قریبی کیفے میں لے آیا..... جس کے ایک تنہا گوشے میں دونوں میز پر آئے سامنے بیٹھ گئے.....

ہال کی ٹھنڈی اور سرخی مائل اندھیری فضا نے ہزار دہائی ماحول بنا رکھا تھا..... ہلکے ہلکے سروں میں
 موسیقی کی دلفریب دھن پھوار کی طرح برس رہی تھی..... کئی میزوں پر لوگ بیٹھے..... اس خواب ناک ماحول سے
 لطف اٹھا رہے تھے..... کچھ مشروبات سے شغل کر رہے تھے..... کچھ کھانے پینے کی چیزوں سے..... اس کیفے کی
 آئس کریم بھی کچھ لوگوں کے سامنے رکھی تھی..... زیادہ رش نہیں تھا..... کئی میز خالی تھیں..... اور
 آنے والوں کے لئے چشم براہ تھیں.....

”چائے یا آئس کریم“ شہباز نے زوبی سے پوچھا..... آج وہ اس کی قربت سے گھبراہٹ
 محسوس نہیں کر رہا تھا..... نہ ہی اکیلی لڑکی کے ساتھ بیٹھنے میں جھجک محسوس ہو رہی تھی..... آج وہ بالکل نارمل انداز
 میں اس کے ساتھ بیٹھا تھا..... جوان لڑکے اور لڑکی کی دوستی اور میل جول آج اسے انوکھا اور حیران کن نہیں
 لگ رہا تھا..... اس نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر پوری طرح آمادہ کر لیا تھا..... کہ یہی بات تو اس کی خواہش اور تقاضا
 تھی.....

زوبی نے آئس کریم کے لئے کہا..... ٹوٹی فروٹی اسے پسند تھی.....

شہباز نے ویٹر کو بلا یا اور دو گلاس ٹوٹی فروٹی لانے کا آرڈر دیا.....

بیرہ ”نیس سر“ کستا چلا گیا.....

اور

وہ دونوں ایک دوسرے کی قربت سے سرشار باتیں کرنے لگے.....

آج شہباز بڑے اعتماد اور بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا.....

یہ بات زوبی اچھی طرح محسوس کر رہی تھی..... اس لئے وہ بہت خوش تھی..... جھجک اور تکلف کے پردے از خود اٹھ گئے تھے.....

دونوں باتیں کرتے رہے

ذو معنی

بامعنی

اور

ان باتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے..... ایک دوسرے کی ممکنہ قربتوں سے مدہوش

ہو رہے تھے.....

آنکس کریم آگئی.....

دونوں سرشار سرشار مدہوش مدہوش آنکس کریم کھانے لگے.....

وہ آنکس کریم ختم کرنے کے بعد بھی کچھ دیر وہاں بیٹھے رہے..... ماحول بڑا رومان انگیز تھا.....

فضائیں موسیقی کی مترنم لہریں تھرک رہی تھیں..... سرخی مائل غبار پھیلا تھا..... ٹھنڈک اس غبار میں پکھل رہی تھی..... اندرونی چنزوں کی حدت سے چرے گلنار ہو رہے تھے.....

”چلیں“ سحر توڑتے ہوئے زوبی نے گھڑی دیکھ کر کہا.....

”جی تو نہیں جاتا.....“ شہباز نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شوخی سے کہا.....

”کیوں“ جانتے ہوئے بھی زوبی انجان بن کر بولی.....

شہباز نے بے اختیارانہ بے تابی سے اپنا ہاتھ اس کے میز پر رکھے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا.....

زوبی نے ہاتھ چمڑانے کی کوشش نہیں کی..... ہاں مضبوط اور بھاری ہاتھ کے لمس سے اس

کی ریزہ کی ہڈی میں کپکپی سی ہونے لگی.....

”زوبی.....“ شہباز کے اندر محبت شوریدہ سر آمدھی اور طوفانی غبار کی طرح اٹھ رہی تھی.....

”ہوں“ وہ لجا کر بولی.....

”آئی لو یو زوبی..... آئی لو..... یو.....“ شہباز نے اس کا ہاتھ زور سے کھینچا..... شہباز کی سرگوشی

زوبی کے من میں کیا روح میں اتر گئی.....

شاید اسی لمحے کا اسے عرصے سے انتظار تھا..... اس نے جواباً اپنا سر شہباز کے ہاتھ پر رکھ دیا.....

لمحے بڑے بیجان انگیز ہو گئے.....

زوبی کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا.....

اور

شہباز کی آنکھیں سرخ نگارہ ہو رہی تھیں.....

کئی لمحوں بعد زوبی نے سراٹھایا..... شہباز کی طرف دیکھا..... اس کے لب قسم تھے..... اور

آنکھیں حال دل کہہ رہی تھیں.....

”چلیں.....“ شہباز ایک دم ہی اٹھ کھڑا ہوا.....

”چلو.....“ زوبی لجائی شرمائی ادا سے اسے دیکھتے ہوئے بولی.....

”دونوں ایک دوسرے کے سنگ سنگ چلتے باہر آ گئے.....

باہر گرمی جس اور گھٹن اپنے جبین پر تھی..... شام اتر آئی تھی..... لیکن ہوا بیدم تھی.....

درختوں کا پتا تک بل نہیں رہا تھا.....

دونوں گاڑی میں آ بیٹھے.....

سارا راستہ تقریباً خاموشی ہی سے کٹا.....

شاید اب کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہ رہی تھی..... دونوں سرشاری کی کیفیت سے گزر رہے

تھے.....

زوبی کا گھر آ گیا.....

گیٹ کھلا تھا..... شہباز گاڑی ڈرائیو سے پر لے آیا..... گاڑی سے اتر کر اس نے زوبی کا

دروازہ کھولا..... اور پھر پچھلا دروازہ کھول کر زوبی کے بیک اور لفافے نکال لئے.....

زوبی نے چیزیں اس سے لے لیں اور اندر جانے کے لئے قدم اٹھایا.....

شہباز وہیں کھڑا رہا.....

”آؤ نا.....“ زوبی نے اسے مڑ کر دیکھا.....

”نہیں زوبی..... اب میں گھر جاؤں گا.....“

”می ڈیڈی سے نہیں ملو گے“

”اس وقت جانے ہی دو.....“

”کیوں.....“

”تمنا ضروری ہے کیا“

”ہاں.....“

”تو سنو زوبی..... میں اپنی سرشاری کی کیفیت کو ضائع نہیں کرنا چاہتا..... مجھے ان لمحوں کو پوری طرح اپنے آپ میں جذب کر لینے دو..... اس وقت صرف اور صرف تم ہی میرے حواس پر چھائی ہو..... میں کسی اور سے ملنا نہیں چاہتا“

زوبی اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس دی..... شہباز اسے پیار بھری جذباتی نظروں سے نکلے

گیا.....

وہ زوبی کے اصرار پر بھی نہیں رکا.....

”کل آؤ گے نا.....“ زوبی نے خدا حافظ کہنے سے پہلے اصرار سے یاد دہانی کرائی۔

”پشاور تو نہیں چلے جاؤ گے“

”اب نہیں جا سکتا زوبی..... کل میں ڈھیر سارا وقت تمہارے ساتھ گزاروں گا.....“

”پراس“

”پراس“

شہباز وعدہ کر کے گاڑی میں آ بیٹھا.....

زوبی وہیں کھڑی اسے سختی سے دیکھتی رہی..... ہاتھ ہلا کر بائے کرتی رہی.....

اس رات شہباز بڑی بے قرار نیند سویا..... بار بار آنکھ کھل جاتی..... کچھ کھونے کچھ پانے کا

احساس جاگتا..... زوبی سے اس نے اقرار محبت کر لیا تھا..... ہاں وہ اسے پیار کرنے لگا تھا..... ٹوٹ کر چاہنے لگا

تھا..... وہی اس کی منزل تھی..... وہی اس کا گوہر مقصود تھی.....

وہ چاہتوں محبتوں کے بحرِ خفا میں ڈوب ابھرتا تھا..... مدہوش ہو رہا تھا..... مظلوم ہو رہا تھا.....

زوبی ہی زوبی چاروں اور نظر آ رہی تھی محسوس ہو رہی تھی.....

محبت کی آندھی اتنے زور سے اٹھی تھی..... کہ حقیقتوں کے چہرے بھی اس کے گرد و غبار کے

پچھے چھپ گئے تھے.....

شہباز جانتا تھا کہ زری اس کی بچپن کی منگیتیر ہے..... اور بدلے کے رشتے بھی ہو چکے ہیں.....

اور جس خاندان سے اس کا تعلق تھا اس کے ریت و رواج اور روایتوں سے بھی آگئی تھی.....

پھر بھی

وہ

طوفانی آندھی کی لپیٹ میں آ گیا تھا..... اس کے سارے وسوسے اندیشے اور خدشے یہ آندھی

اڑالے گئی تھی.....

وہ پھسل گیا تھا.....

اس کی ساری کائنات زوبی کے وجود میں ڈھل آئی تھی.....

.....

یہ خوشی بیمار بیماری لگتی تھی..... خوش ہو کر بھی خوش ہونے کا احساس نہیں جاگتا تھا..... اک نیا معلوم سی اداسی اندر ہی اندر اترنے لگتی تھی.....

آج بھی وہ امید و بیم کی حالت میں شہباز کا انتظار کر رہی تھی.....

آج تو وہ اس کی خاطر نہیں آ رہا تھا..... آج تو آغا بی بی نے اسے بلایا تھا..... وہ انہیں ملنے آ رہا تھا..... صرف ایک دن کے لئے.....

ایک دن

یہ ایک دن اس کے لئے کیا لے کر آ رہا تھا؟ زری سوچ رہی تھی.....

ویسے یہ ایک دن تھا بڑا اہم..... آغا بی بی نے نواز خان سے کہہ دیا تھا ”شہباز آئے تو اس سے پوچھ لینا..... کب فارغ ہو رہا ہے امتحانوں سے..... کئی کئی تاریخ بتا دے..... تاکہ شادیوں کا اہتمام اسی حساب سے کیا جائے“

نواز ہنس دیئے تھے ”آغا بی بی..... ابھی تو پانچ چھ مہینے ہیں اس کے امتحانوں میں..... یونیورسٹی کبھی بند ہو جاتی ہے کبھی کھل جاتی ہے..... امتحان اس وجہ سے اور لیٹ ہو جائیں گے“

”تم تو خدا سے یہی چاہو گے.....“ آغا بی بی نے پیار سے ڈانٹا..... تو وہ ماں کے گلے میں بازو ڈال کر پیار کرتے ہوئے بولے ”آغا بی بی..... اتنا وقت گزر ہی گیا ہے نا..... اب چند ماہ کی بات ہے..... تسلی رکھیں..... گزر ہی جائیں گے..... شہباز کا آخری سال ہے..... اسے اطمینان سے امتحان تو دے لینے دیں“

”امتحان آگے ہی آگے ہوتے جائیں تو.....“

”تو کیا ہوا..... بہر حال اسے تعلیم سے پہلے فارغ ہونا ہے..... پھر شادی.....“

پانچ چھ ماہ بعد شادی طے ہے امتحان ہوں یا نہ ہوں میں نہیں جانتی“

نواز ہنس کر ماں سے بولے ”اب اتنی جلدی بھی نہ کیجئے..... امتحان ہو لینے دیں.....“

”پھر وہی بات..... امتحان چھ کی بجائے ایک سال بعد ہوئے تو.....“

”نہیں آغا بی بی جانے..... اتنی دیر نہیں ہوگی..... پانچ چھ ماہ تک انشاء اللہ ہو جائیں گے.....“

اتنی دیر تو رکنا پڑے گا ہی..... اور ہاں.....“

”کیا.....“

”میں بھی تو جا پاں جا رہا ہوں.....“

”کب؟“

”اگلے مہینے کے آخر میں“

گھر میں خاصی چپل چپل تھی..... شہباز ساڑھے چھ بجے کی فلائٹ سے لاہور سے آ رہا تھا..... اس نے فون کر دیا تھا..... وہ اکثر ہی آتا رہتا تھا..... کبھی اطلاع دے کر اور کبھی بنا اطلاع کئے..... لیکن

آج اس کا انتظار بطور خاص ہو رہا تھا..... اس لئے کہ آغا بی بی اس سے ملنے کی خواہش مند تھیں..... گاؤں سے صبور خان اور تنکینے بھی اسے ملنے آئے تھے اور زر گل بھی بعد دوپہر آ گیا تھا..... زر گل کو بھی شہباز سے ملے کافی عرصہ ہو گیا تھا..... سب شہری آگئے تھے اتفاق ہی کی بات تھی..... جو نواز خان بھی گھر پر تھے..... یوں سب کے اکٹھے مل بیٹھنے کا موقع تھا..... اور ایسا موقع کبھی کبھی ہی ملا کرتا تھا..... پچھلی عید پر سب اکٹھے ہوئے تھے.....

مشہنو بھی بہت خوش تھی..... وہ بار بار زری کو چھیڑ رہی تھی.....

زری

جو

گوگو کے عالم میں تھی.....

پچھلی بار شہباز آیا تھا..... تو جانے کیسی کیسی باتیں کر گیا تھا..... یہ باتیں اسے سمجھ نہ آئی تھیں

سوچ سوچ کر بھی نہ نہ چلا تھا..... کہ اس نے ایسی باتیں کیوں کی تھیں.....

کبھی وہ ان باتوں کے متعلق سوچ کر خوش ہونے کی کوشش کرتی..... شہباز صرف اس کی خاطر تو

آیا تھا.....

لیکن جانے کیوں

”آؤ گے کب“

”اڑھائی تین مہینے لگ جائیں گے۔“

آغا بی بی نے انگلیوں پر مہینے گنے اور بولیں ”بس ٹھیک ہے۔ تمہاری واپسی کے بعد شادیاں

کر دی جائیں گی۔“

”اچھا دیکھیں گے۔ تب تک شہباز فارغ ہو جائے گا۔“

”نواز۔“

”جی۔“

”اب شادیاں التوا میں نہیں پڑنا چاہئیں۔ اب توڑکیاں بھی امتحان دے کر فارغ ہو چکی ہیں

اور زرگل۔“

”ٹھیک ہے آغا بی بی۔“

”بس آج وہ آجائے میں خود اس سے بات کر لوں گی۔ کوئی بات نہیں امتحان بعد میں

بھی دے سکتا ہے۔ وقت پر امتحان ہو گئے تو ٹھیک۔ نہیں تو۔“

”نہیں تو۔“

”نہیں تو شادی کے بعد سہی۔“

”اوہ میری ماں۔۔۔۔۔ نواز نے ماں کو اپنے ساتھ لگالیا۔“

”اب تیری ایک نہیں مانوں گی۔ بہت مان لی۔“ آغا بی بی نے ان کو تھکی دیتے ہوئے

کہا۔۔۔۔۔

”جیسے آپ کی مرضی۔۔۔۔۔ لیجئے ہتھیار ڈال دیئے ہم نے۔ آپ شہباز سے خود ہی بات

کر لیجئے گا۔“

نواز اٹھتے ہوئے بولے۔۔۔۔۔ آغا بی بی خوش ہو گئیں۔

چھ بیٹے والے تھے۔ بی بی گل نے زریں خان سے کہا۔۔۔۔۔

”ایزپورٹ تم جارہے ہو۔؟“

”خان زرگل خان جارہے ہیں۔“ زریں نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ بی بی گل نے کہا۔ ”تم نتھیا چلے جانا کباب لینے۔ کچھ اور انڈے ڈلو کر

اجھے سے بنوا کے لانا۔۔۔۔۔“

”جی بہت اچھا۔۔۔۔۔“

”شہباز اور زرگل دونوں ہی کو بہت پسند ہیں کباب۔۔۔۔۔ اور ہاں صبح کے لئے بالائی کا بھی دکان

پہ کبہ آنا۔۔۔۔۔ بالائی اور لمبی تنوری روٹی بھی دونوں بہت شوق سے ناشتے میں کھاتے ہیں۔۔۔۔۔“

”نتھیا جاتے ہوئے بالائی کے لئے برتن دے آؤں گا دووہ والے کی دکان پر۔۔۔۔۔“

”ہاں یاد سے۔۔۔۔۔“

”ٹھیک ہے جی۔“

”زرگل ہیں کہاں۔“

”آغا بی بی جان کے کمرے میں گئے تھے ابھی۔۔۔۔۔“

”اسے فلائٹ کے ٹائم کا پتہ تو ہے نا۔“

”جی۔۔۔۔۔ انہوں نے خود ہی کہا تھا کہ سواچھ تک ایئرپورٹ جائیں گے۔“

”ہوں۔۔۔۔۔“

زرگل کسی کام کے لئے آغا بی بی کے کمرے میں گیا تھا۔۔۔۔۔ بی بی گل ادھر ہی آگئیں۔۔۔۔۔

”بھئی زرگل۔“

”جی چاچی۔“

”ایئرپورٹ تم جارہے ہو۔۔۔۔۔“

”جی ہاں۔“

”وقت ہو رہا ہے۔“

زرگل نے آستین کھینچ کر گھڑی دیکھی اور بولا ”بس جا رہی ہوں۔۔۔۔۔ آغا بی بی کو سلامت اللہ

خان کا پیغام دینا تھا۔۔۔۔۔“

”خیر یہی ہے دیشمینے بیٹی۔۔۔۔۔“ آغا بی بی نے جو پلنگ پر تکتے کے سارے بیٹھی تھیں بی بی

گل سے کہا۔۔۔۔۔

”مدا انے سے پھر جھڑا کیا ہے اس نے۔۔۔۔۔ مجھے کل گاؤں جانا پڑے گا۔۔۔۔۔“

”نہ نہ آغا بی بی جانے۔۔۔۔۔ شہباز آ رہا ہے آپ کی خاطر۔۔۔۔۔“ بی بی گل ان کے قریب پلنگ کی

پٹی پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔۔۔۔۔ ”آپ کو پتہ ہے ان دنوں وہ پڑھائی میں مشغول ہے پھر بھی آپ کی خاطر

آ رہا ہے۔۔۔۔۔ جتنے دن وہ ٹھہرے گا آپ یہیں رہیں گی۔“

زرگل مسکرا کر بولا ”چاچی وہ صرف ایک دن کے لئے ہی تو آ رہا ہے۔“

”نہیں زرگل۔“

”ہاں چاچی..... میری ہی تو بات ہوئی تھی اس دن اس سے فون پر..... آج آئے گا..... کل دو بجے کی فلائیٹ سے واپس چلا جائے گا.....“

”اچھا“

”جی ہاں“

پڑھائی کی وجہ سے..... وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا.....“

زرگل نے مسکراتے ہوئے کندھے اچکائے اور پھر شوخی سے ہنستے ہوئے بولا ”آپ کا بیٹا لاہوری ہو گیا ہے چاچی..... پشاور میں اب اس کا جی نہیں لگتا.....“

”چل ہٹ..... شریر کہیں کا.....“ بی بی گل نے سرزنشی نظروں سے اسے دیکھا.....

”سچ چاچی..... میں اس کے مزاج اور رویوں کی تبدیلی شدت سے محسوس کرتا ہوں“ زرگل نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

”تیری کیا بات“ آغا بی بی بولیں.....

”اپنی مٹی سے جزیں اکھینا آسان نہیں ہوتا.....“ بی بی تقین سے بولیں.....

زرگل مسکرایا..... پھر ریشمینے کی طرف چند لمحے دیکھتا رہا۔

”کیا بات ہے؟“ ریشمینے بولی.....

”چاچی..... آج وہ آئے گا..... تو ذرا اس کی باتوں پر غور کیجئے گا..... وہ پڑھائی کے بعد بھی

لاہور ہی رہنا چاہتا ہے..... نواز چاچا تو ایسے ہی اس کے لئے مل لگانے کی سروردی مول لئے بیٹھے ہیں..... وہ اس مل میں کام نہیں کرے گا.....“

”زرگل بچے.....“ آغا بی بی نے ہلکے سے تنبیہی لہجے میں کہا.....

”جی آغا بی بی جانے“ وہ بولا.....

”تم شہباز کو لینے جا رہے ہو..... وقت ہو گیا ہے جاؤ.....“ وہ بولیں.....

”اچھا آغا بی بی جانتا ہوں“ اس نے جھک کر آغا بی بی کے گلے میں بازو ڈالا..... انہیں پیار کیا اور

بی بی گل سلام کرتے ہوئے بولا..... ”آپ پریشان نہ ہوں..... اس دفعہ آئے تو اس کے کان ضرور کھینچنے

گا..... بڑی بڑی باتیں کرنے لگا ہے..... ٹھیک.....“

بی بی گل اس کے انداز پر مسکرا دیں..... سر اثبات میں ہلایا اور بولیں..... ”میں کیا کھینچوں گی

اس کے کان..... کھینچنے والا تمہارا چاچا جو ہے..... دم مارنے کی مجال نہیں ہوتی صاحب زاوے کو ان کے

سامنے..... تم کیا سمجھتے ہو..... وہ اپنے خان بابا کی مرضی کے خلاف کوئی کام کر سکتا ہے..... مل اس کے لئے لگائی

ہے خان جی نے..... بھلا بھاگ سکتا ہے وہ کہیں.....

آغا بی بی اور ریشمینے دونوں خوشدلی سے مسکرا دیں.....

زرگل کمرے سے باہر چلا آیا.....

ڈرائیوے پر اس کی گاڑی کھڑی تھی.....

وہ برآمدے سے ہوتا ڈرائیوے کی طرف جا رہا تھا..... کہ دائیں ہاتھ والے کمرے سے شہنو

باہر آگئی.....

”کدھر؟“ اس نے زرگل کے سامنے آتے ہوئے پوچھا

”ایئر پورٹ جا رہا ہوں.....“

”شہباز لالہ کو لینے؟“

”جی ہاں..... سالا صاحب کو لینے.....“

”آئے ہائے.....“ شہنو انداز دلربائی سے اس کو گھورتے ہوئے بولی.....

”اچھا..... آکے باتیں کریں گے دیر ہو رہی ہے“ زرگل نے گہری نظروں سے اسے دیکھ

کر کہا.....

”زرگل.....“

”ہاں“

”مجھے اور زری کو بھی ساتھ لے چلو.....“

”کہاں“

”ایئر پورٹ“

”کیوں“

”بس..... ذرا مگوم آئیں گے ہم بھی.....“

”کیوں مروانا ہے“

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی..... ”ڈرتے ہو.....“

”بالکل ڈرتا ہوں“

”مجھ سے؟“

”جی نہیں محترمہ..... آپ سے نہیں..... آپ کے والد گرامی سے..... تمہیں فی الحال اپنے ساتھ لے جانے کی جرات نہیں کر سکتا۔“

”وہ ہنستے ہوئے بولی ”اسی لئے تو کہہ رہی ہوں..... زری کو بھی ساتھ لے چلو۔“

”جی نہیں.....“ زرگل نے کہا۔

”زری کامیگر آ رہا ہے“ وہ ہنس کر بولی۔

”میں جانتا ہوں..... لیکن ہم لوگ اتنے ماڈرن نہیں ہیں۔“

”شہباز لالہ ایک دم خوش ہو جاتے۔“

”ہاں..... وہ تو یہ کچھ چاہتا ہے۔“

”لیکن کوئی انہیں من مانی کرنے میں دیتا۔“

”بالکل.....“

”آپ بھی نہیں کرنے دیتے۔“

”میں اپنی روایات سے باغی نہیں ہونا چاہتا۔“

وہ بڑی شوخی سے اٹھلا کر بولی ”خود تو بڑے دھماکے سے چلے آتے ہیں یہاں.....“

زرگل اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ”میں تو اپنے چچا چچی کے ہاں آتا ہوں.....“

اپنے چچا چچی سے ملنے..... سمجھیں..... اور کوئی مقصد نہیں ہوتا..... ہوں۔“

”ہوں.....“

”جی..... ہوں۔“

دونوں ہنس پڑے۔

پھر زرگل نے گھڑی دیکھی ”اوہو..... دیر ہو رہی ہے..... میں چلتا ہوں۔“

”جائیے“ شہنواز نے کہا۔

زرگل لمبے لمبے ڈگ بھرتا گاڑی کی طرف چل دیا۔ ”وہ جب ایئر پورٹ پہنچا تو لاہور سے آنے

والا اجازت لینڈ کر چکا تھا..... اکاد کا مسافر باہر آرہے تھے..... جن کے ساتھ سامان تھا..... وہ اپنا اپنا سامان ٹریوں پر رکھ رہے تھے۔“

زرگل شہباز کے انتظار میں کھڑا آنے والوں کو دیکھ رہا تھا..... فوکر میں تھوڑے مسافر ہی ہوتے

تھے..... اس لئے انتظار کی زحمت زیادہ دیر نہ اٹھانا پڑتی تھی۔

اکاد کا مسافروں کے بعد ٹرائیاں تھانے والے بھی باہر آنے لگے..... تھوڑی دیر کو پلچل بجی۔

جن مسافروں کو گاڑیاں لینے آئی تھیں وہ گاڑیوں کی طرف بڑھ گئے..... کچھ ٹیکسی رکشے والوں سے بھاؤ تاؤ کرنے لگے..... چند منٹ ہی میں ایئر پورٹ کا حصہ مسافروں سے خالی ہو گیا۔

زرگل کو شہباز نظر نہیں آیا۔

وہ کچھ پریشان سا ہوا..... اوہرا دھڑکیا..... اندر گیا..... مسافروں کے باہر آنے والے رستے پر

دوبارہ گیا..... باہر نکل جانے والوں پر نگاہ ڈالی۔

لیکن

شہباز کہیں نظر نہ پڑا۔

رش تو کوئی تھا نہیں..... جو تلاش مشکل ہوتی۔

لیکن

وہ گیا کہاں.....؟

زرگل اس طرف آیا جس طرف گاڑیاں رکشے اور ٹیکسیاں کھڑے تھے..... اس نے

پورے سرکل کا چکر لگایا۔

لیکن

شہباز نہیں ملا۔

”وہ شاید آیا ہی نہیں“ زرگل نے دل ہی دل میں کہا..... اسے مایوسی بھی ہوئی..... واپسی کے

ارادے سے پلٹا تو پشت پر کسی نے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”اسلام علیکم زرگل خان.....“

زرگل نے پلٹ کر دیکھا وہ اس کے بڑے ماموں کا بیٹا عرفان تھا۔

دونوں آپس میں بغل گیر ہو گئے..... مصافحہ کیا..... احوال پرسی کی۔

”تم کہاں سے آرہے ہو“ زرگل نے پوچھا۔

”کراچی سے لاہور آیا تھا اور اب لاہور سے پشاور آیا ہوں..... پشاور سے گاؤں جاؤں گا۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”اسی فلائٹ سے آرہے ہو۔“

”ہاں۔“

”شہباز نے بھی لاہور سے آنا تھا۔“

”میں نے اسے دیکھا تو نہیں۔“

”ہاں لگتا ہے وہ کسی کام کی وجہ سے آ نہیں سکا۔“

دونوں باتیں کرتے ہوئے گاڑیوں کی طرف آگے عرفان کو لینے ان کا ڈرائیور زربخت خان آیا ہوا تھا۔ جانے سے پہلے دونوں پھر بغل گیر ہوئے۔ عرفان نے زرگل کو اپنے ہاں آنے کی پر زور دعوت دی۔ زرگل نے وعدہ کیا۔ ماموں اور مامی کو سلام کہلا بھیجا۔ عرفان کے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد وہ اپنی گاڑی کی طرف چلا آیا۔ اب یہاں کھڑے رہنا فضول تھا۔

شہباز کے نہ آنے سے سب کو مایوسی اور حیرانی ہوئی۔ اس نے نہ آنے کی اطلاع بھی تو نہیں دی تھی پریشان ہونا ہی تھی۔ نواز خان کو تو اس پر بے طرح غصہ آیا۔ لاپرواہی پر خوب کوسا۔

”اس کے پاس ٹیلیفون ہے۔ نہیں آتا تھا تو اطلاع کر دیتا۔ پورے گھر کو پریشان کر دیا ہے۔“

”میں فون کر کے پتہ کرتا ہوں“ زرگل نے ان کے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کو کہا ”ہو سکتا ہے عین وقت پر کوئی کام پڑ گیا ہو۔“

”فون تو کر سکتا تھا نا لائق۔“

نواز خان اسے خوب کوس رہے تھے۔ بی بی گل چپ چاپ سن رہی تھیں۔ شہباز کے نہ آنے سے انہیں تشویش تھی۔ نواز خان کے کونے پر انہیں غصہ بھی آ رہا تھا۔ لیکن انہیں ٹوکنے کی ہمت کہاں تھی۔ وہ ہولے سے زرگل سے بولیں ”جلدی سے فون کر کے پتہ کرو۔ اللہ نہ کرے کہیں طبیعت ہی ناساز نہ ہو گئی ہو۔“

شہنو بھی باپ کی ڈانٹ ڈپٹ سے خائف تھی۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے زری سے کہہ رہی تھی

”خان بابا کا پارہ تو ایسے ہی چڑھ گیا ہے۔ بھلا فون کر کے پتہ تو کر لیں۔ کہ شہباز لالہ کس حال میں ہیں۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے نہ آنے کی وجہ۔ ہیں نازری۔“

زری نے یونی اہانت میں سر ہلادیا۔ وہ خود مایوس ہوئی تھی۔ من ہی من میں کتنی شدت سے انتظار کر رہی تھی۔

انتظار تو سب ہی کو تھا۔ صبور خان تمکینے اور آغا بی بی تو اسے بطور خاص ملنے آئے تھے۔ زرگل بھی اسی لئے آیا تھا۔

زرگل نے لاہور فون ملایا۔

شہباز کی جگہ متان خان بولا۔ اس نے بتایا ”شہباز خان گھر پہ نہیں ہیں۔ رات کو آئیں گے۔ لاہور میں ہیں پشاور نہیں گئے تھے۔ کسی دوست کے ہاں دعوت پہ گئے ہیں۔“

”وہ آئے تو کہنا پشاور رنگ کرے“ زرگل نے متان خان کی باتوں پر حیران ہوتے ہوئے

کہا۔

”جی بہت اچھا۔“

متان خان پشاور والوں کی خیر خیریت دریافت کرنے لگا۔ زرگل نے ہوں ہاں کہہ کر فون بند کر دیا۔

پاس کھڑی شہنو اور بی بی گل نے بیک زبان پوچھا ”وہ خیر سے ہے نا۔“

”جی“ زرگل بولا ”کسی دعوت میں گئے ہوئے ہیں جناب۔ پشاور نہیں آئے۔“

”اطلاع تو کر دیتا۔“ بی بی گل نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

شہنو بھی حیران ہوئی۔ ”نہیں آتا تھا تو فون ہی کر دیتے۔“

”میں نے متان خان سے کہا ہے وہ آئے تو اس سے کہے کہ فون کرے۔“ زرگل نے کہا۔

”بابا ٹھیک ہی برس رہے تھے شہباز لالہ پر۔“ شہنو بولی۔ ”ایسی بھی کیا لاپرواہی۔“

سب کے موڈ ہی خراب کر دیئے۔

تینوں باتیں کرتے اندر چلے آئے۔ جہاں سب شہباز کے متعلق جاننے کو بیقرار بیٹھے تھے۔

”کیوں ڈسٹرب کرتی ہو انہیں.....“

”ٹھیک ہے پلوڈرائیٹنگروم میں بیٹھتے ہیں..... ممی بھی ادھر ہی آجائیں گی“

”عمر کہاں ہے“

”ادھر اپنے کمرے میں..... ان کے دو تین دوست آئے ہوئے ہیں.....“

”ادھر ہی نہ چلیں.....“

”جی نہیں..... ہم ادھر بیٹھیں گے“

وہ ڈرائیٹنگ روم کی طرف بڑھی..... شہباز بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا.....

ڈرائیٹنگ روم بڑی نفاست سے آراستہ تھا..... ہر چیز خوب صورت نفیس اور اہل خانہ کے بازوق ہونے کا پتہ دیتی تھی..... کھڑکیوں کے پردے گرائے ہوئے تھے..... ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلا ہوا تھا..... ایئر کنڈیشنر آن تھا..... باہر کی نسبت اندر کی فضا خشک تھی.....

شہباز نے جیب سے رومال نکال کر چہرہ اور گردن پونچھی..... تھوڑی دیر پہلے اسے پسینہ آ گیا تھا.....

”یہاں میٹرو... زوبی نے اسے ایئر کنڈیشنر کے سامنے بیٹھنے کے لئے کہا.....“

”بہت گرمی ہے باہر.....“ شہباز بولا.....

”آج کچھ زیادہ ہی ہے..... ہوا بھی بالکل بند ہے“

”ہاں.....“

”یہ مہینہ اسی طرح گزرے گا..... اگلے ماہ سے شاید بارشیں شروع ہو جائیں..... پھر رت بدل جائے گی“

جائے گی“

دونوں تھوڑا دیر موسم کی باتیں کرتے رہے..... زوبی اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی..... آج اس نے بالکل سادہ سے کپڑے پہنے ہوئے تھے..... لیکن اس سادگی میں بھی پرکاری تھی..... شہباز کو وہ آج پہلے سے بھی اچھی لگ رہی تھی..... نگاہوں میں چپے کی ساری بات ہوتی ہے..... جب کوئی پیکر نگاہوں میں جج جائے تو پھر یہ ظاہری آرائشیں کوئی معنی نہیں رکھتیں..... پیکر ناسنورا ہو یا سادگی کا مرقع بنا ہو..... اس کا تاثر ایک سلسی ہوتا ہے..... اس لئے کہ نگاہیں اسے ہر رنگ میں ہر حال میں قبول کر چکی ہوتی ہیں..... اور یہ قبولیت ہی تو اصل چیز ہوتی ہے.....

ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد زوبی بولی ”اوہ..... مجھے تو پوچھنا یا دی نہ رہا..... کیا ہو گئے؟“

شہباز نے اپنی روشن صورت آنکھیں زوبی کے پر گاڑتے ہوئے مسکرا کر کہا ”جو“

شہباز زوبی کے ہاں پہنچا تو اسے منتظر پایا..... وہ بیرونی لان میں تھی..... اسکی گاڑی گیٹ کے اندر آتے دیکھی تو لپک کر ادھر آئی.....

”ہیلو“ اس نے اپنا خوب صورت ہاتھ لہرایا.....

”ہیلو.....“ شہباز نے گاڑی روکتے ہوئے سرور انداز میں جواب دیا.....

”تم کتنے اچھے ہو شہباز.....“ زوبی اس کے گلہائے بچنے سے پہلے ہی کھڑکی کے قریب آکر وفور

مسرت سے بولی.....

”اچھا ہوں؟“ وہ گاڑی سے نکلے ہوئے مسکرایا.....

”مجھے یقین نہیں تھا کہ تم وقت پہ آ جاؤ گے“

”جناب ہم وقت کے بہت پابند ہیں..... آئندہ خیال رکھئے گا“

”میں بہت خوش ہوں..... بہت خوش ہوں شہباز“ اس نے شہباز کا ہاتھ بے اختیاری کے

عالم میں پکڑ لیا.....

شہباز نے اپنے ہاتھ کی گرفت اس کے ہاتھ پر مضبوط کرتے ہوئے اک سرور کی کیفیت

رگ و پے میں اتارتی محسوس کی.....

”آؤ.....“ زوبی اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکالتے ہوئے بولی..... ”اندر چلتے ہیں..... باہر

تو خاصی گرمی ہے.....“

وہ اسے ساتھ لئے اندر چلی گئی..... لاؤنج میں کوئی نہیں تھا.....

”ممی ڈیڈی گھر نہیں ہیں؟“ شہباز نے پوچھا.....

”اپنے کمرے میں ہوں گے..... ڈیڈی شاید سو گئے تھے..... میں دیکھتی ہوں.....“

پلا دو.....

”وہ ہنس کر بولی ”گرم پانی پلا دوں.....“

”بے شک.....“ وہ اس کی شوخی سے محظوظ ہو کر بولا.....

”پنی جاؤ گے“ وہ اٹھتے ہوئے مسکرائی.....

”تم پلاؤ گی..... تو گرم کیا اہلتا ہوا پانی بھی پی جاؤں گا.....“ وہ سرشاری کے عالم میں

بولا.....

”چلو..... اتنے مجنوں بننے کی اداکاری نہیں کرو.....“ زوبی ہنستے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ

مارتے ہوئے بولی.....

”آزما کر تو دیکھو.....“ شہباز نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر دبا دیا.....

”سچی!“

”سچی“

”ابھی لے کے آتی ہوں“

وہ اٹھلاتے مسکراتے لہراتے ڈرائیونگ روم سے نکل گئی..... شہباز کے رگ وپے میں نشہ

اترنے لگا..... اس کے آنے تک وہ تساہل سے صوفے میں پڑا بے معنی نظروں سے آرائشی چیزیں دیکھتا رہا.....

”لیجئے.....“ زری نے نازک سی ٹرے میں کرشل کے نفیس گلاس رکھے تھے..... جن میں بخ

بستہ کوک تھی.....

”شکریہ“ شہباز نے ایک گلاس اٹھالیا.....

دوسرا گلاس ٹرے ہی میں پڑا رہا..... زوبی نے شیشے کی میز پر ٹرے رکھ دی.....

”تم تو ہلتا پانی لینے گئی تھیں.....“

”رحم فرمایا بادولت نے.....“

”آداب بجالا تاہوں ملکہ عالیہ“

دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے.....

شہباز نے کوک پی کر خالی گلاس میز پر رکھ دیا.....

”تم بھی پیو نا.....“

”یہ بھی تم پیو گے“

”کیوں“

”بھئی اتنے لمبے چوڑے آدمی کا ایک گلاس سے کیا بنے گا“

”کستی تو ٹھیک ہو..... لیکن یہ تم پیو گی.....“

”نہیں..... یہ دوسرا بھی تم پیو گے میں تمہارے لئے لائی ہوں.....“

”پھر تم اپنے لئے کیوں نہیں لائیں.....“

”مجھے پیاس نہیں.....“

”آج مجھ گئی پیاس.....“ شہباز نے کل کے حوالے سے شوخی سے اے دیکھا.....

”ہاں.....“ وہ بھی شوخ ادائی سے مسکرائی.....

”کیسے.....“ وہ نیم باز نظروں سے اے دیکھنے لگا.....

”ایسے..... کہ تم آگئے.....“ وہ اے محور سی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی.....

”تم بلاؤ اور میں نہ آؤں“ وہ دوسرا گلاس اٹھاتے ہوئے بولا.....

”شہباز.....“ زوبی ایک دم ہی سنجیدہ ہو کر بولی.....

”ہوں“ شہباز نے گھونٹ بھرا.....

”دیکھو شہباز.....“

”کمو..... ایک دم سے سنجیدہ کیوں ہو گئیں.....“

”ایک بات کہہ دوں.....“

”ضرور.....“

”شہباز..... مجھ سے جھوٹ نہیں بولنا.....“

”کیا مطلب؟“

”یہی کہ..... میں..... ہوں..... جھوٹ برداشت نہیں کر سکتی..... اپنے جذبات کے

معاملے میں یعنی جذبات کے اظہار کے سبکدوش میں تم سچے ہونا.....“

شہباز نے ایک گہری سانس لی..... گلاس خالی کر کے میز پر رکھا..... اور ایک تک اسے تھکنے کے

بعد بولا.....

”یہی بات میں تم سے کموں گا.....“

”شہباز..... تم..... تم میری تلاش ہو..... میں نے تمہیں ڈھونڈ لیا ہے..... ہزاروں لاکھوں

میں.....“ زوبی نے سر جھکاتے اٹھاتے ہوئے سے لیکن محکم لہجے میں کہا.....

”زوبی“ شہباز بھی سنجیدگی سے بولا.....

”ہوں“

”میں تو ازل سے تمہارا ہی متلاشی تھا۔ تم ملیں تو مجھے سب کچھ مل گیا۔ میں سنجیدہ

ہوں۔ یہ کوئی مذاق نہیں۔“

زوبی نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا۔

”لیکن زوبی۔“ وہ کچھ کتے کتے رکا۔

”کیا۔“

”تم میرا ساتھ دو گی نا۔ میرے حالات جیسے بھی ہوئے۔ تم میرا ساتھ نہیں چھوڑو گی۔“

”وعدہ کرو۔“

”میں سر تا پا وعدہ ہوں شہباز۔ میرے قدم کبھی نہیں لڑکھڑائیں گے۔“

”اس کی پابند رہنا۔“

”رہوں گی۔“

”بس مجھے۔“

وہ کچھ کہنے ہی کو تھا۔ کہ زوبی کی می ڈرائیونگ روم میں آگئیں۔

شہباز انہیں دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ تعظیم سے سر جھکا یا اور مودبانہ انداز سے سلام کیا۔

سلام کا جواب دیتے ہوئے اس کی می بولیں ”کیسے ہو۔“

”شکریہ آپ کی دعا چاہئے۔“

”بیٹھو۔“

شہباز بیٹھ گیا۔ اس کی می بھی اپنی نفیس ساڑھی کا پلوٹھیک کرتے ہوئے صوفے پر بیٹھ

گئیں۔ ان کے سر ایاپر سرے کی ہوئی پر نیوم فضا میں پھیلنے لگی۔

وہ تھوڑا دیر شہباز سے باتیں کرتی رہیں۔ ان کے انداز گفتگو سے شہباز برا مرموب تھا۔

انگریزی ملی اردو میں وہ بڑے دلغریب انداز میں باتیں کرتی تھیں۔ جوان بچوں کی ماں تھیں۔ لیکن ابھی تک

بے حد سارٹ اور چاک وچو بند تھیں۔

”زوبی۔“ می نے بیٹی سے کہا۔

”جی ماما۔“

”دیکھو تو تمہارے ڈیڈی تیار ہوئے ہیں یا نہیں۔“

”کیس جارہے ہیں آپ لوگ۔“

”ہاں فاروق کے ہاں۔ وہیں سے جم خانہ جائیں گے۔ تمہارے ڈیڈی بننے سنورنے لگے

ہوئے ہیں۔ جاؤ کو ان سے جلدی آئیں۔“

می کی بات پر زوبی اور شہباز مسکرا دیئے۔

زوبی جانے کو چلی۔

لیکن

اسی وقت ڈیڈی بھی آگئے۔

”ہیلو شہباز خان“ انہوں نے بڑے تپاک سے شہباز سے مصافحہ کیا۔ ”کیا حال ہے کیسے ہو“

شکریہ ”شہباز نے سلام کرتے ہوئے کہا۔“

”تم جیسے نوجوان مجھے بہت اچھے لگتے ہیں“ ڈیڈی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہولے

سے کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ایک دم۔“ خوب صورت۔ ”گرائیڈیل۔“ پر عزم نوجوان۔

”شکریہ جناب“ شہباز جلدی سے بولا ”آپ کی محبت اور شفقت ہی ہے۔“

”عمر چلا جائے گا۔ تو پھر بھی ملتے رہنا۔“ وہ بے تکلفی سے بولے۔

”تا بعد از ہوں جی۔“ شہباز نے اپنے مخصوص روایتی لمبے میں کہا۔

می اور زوبی مسکرائے لگیں۔

انہوں نے کھڑے کھڑے شہباز سے دو چار باتیں کیں۔ امتحانوں کی تیاری کا پوچھا۔ اور

پھر زوبی کی می کی طرف دیکھ کر بولے۔ ”چلے جناب بندہ حاضر ہے۔“

سب ہنس پڑے۔

”لیٹ کر دیا آپ نے“ می نے سرزنشی نگاہ ان پر ڈالی۔ ”آپ جانتے ہیں میں وقت کی

بہت پابند ہوں۔“

”آپ پابند ہیں۔“ ہو سکتا ہے جن کے پاس آپ جارہی ہیں وہ پابند نہ ہوں۔ دوسروں کا

خیال بھی رکھنا چاہئے بیگم صاحبہ۔“

”باتیں نہیں بناؤ۔“ چلو اب۔“ می نے حکم داغا۔ ڈیڈی ایک دم چل پڑے۔

زوبی اور شہباز ہنسنے لگے۔

می بولیں ”اچھا بیٹا۔ ہم جارہے ہیں۔ تم لوگ چائے وائے پو۔“

”چائے ہی نہیں۔“ می آج شہباز کھانا بھی ہمارے ساتھ کھائیں گے۔

”اچھی بات ہے۔“ حاکم بابا سے ان کی پسند کی ڈشیں بنانے کو کہہ دینا۔

”نہیں آنٹی..... خاص تردد کی ضرورت نہیں..... جو سب کے لئے بنے گا کھالوں گا.....“

”یہ تم دونوں سیٹل کر لو..... ہم تو جا رہے ہیں.....“ ڈیڈی بولے

”کھانے پہ تو آجائیں گے نا.....“

”ہاں تب تک آجائیں گے..... آج کلب میں تمبرلہ ہے.....“

”اسی لئے جلدی ہے.....“

دونوں باتیں کرتے چل دیئے.....

زوبی اور شہباز اکیلے رہ گئے.....

شہباز می اور ڈیڈی کی بالغ نظری اور وسیع القلبی سے خاصہ مرعوب ہوا تھا..... انہوں نے نہ

تو اس کے آنے پر کوئی اعتراض کیا تھا نہ ہی زوبی کے ساتھ اکیلے چھوڑ جانے پر.....

”میں برا حیران ہوتا ہوں“ شہباز نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”کس بات پر“ زوبی بولی.....

”تمہارے می ڈیڈی کے رویے پر.....“

”کیوں؟“

”بھئی میں تو ڈر رہا تھا..... کیس وہ کچھ کہہ ہی نہ دیں“

”میں سمجھی نہیں.....“

”ہم دونوں یہاں اکیلے بیٹھے تھے..... می ڈیڈی برا بھی مان سکتے تھے.....“

”اوہ..... نو.....“ زوبی کھلکھلا کر ہنس پڑی.....

”زوبی..... تم لوگ واقعی بہت برا ڈسائنڈ ہو..... تمہارے می ڈیڈی تو..... بڑے کشادہ نظر

ہیں.....“

”کیا اچھی بات نہیں.....“

”ہے.....“

”زمانہ کہاں سے کہاں نکل گیا ہے شہباز خان..... اگر والدین اتنے لبرل بھی نہ ہوں تو زندگی

مشکل ہو جائے.....“

”تم خوش قسمت ہو کہ تمہارے والدین اتنے لبرل ہیں.....“

”تمہارے نہیں.....“

”توبہ کرو..... اس لفظ کا گزر ابھی ہمارے خاندان میں نہیں ہوا.....“

”تو..... تو تم لوگ قدامت.....“ میرا مطلب ہے تمہارے والدین.....“

”قدامت پسند تو نہیں تھا.....“

”ریلی.....“

”ہاں زوبی..... ہم پٹھان لوگ ابھی تک اپنے روایتی خولوں میں بند ہیں.....“

”سب پٹھان لوگ تو ایسے نہیں ہوتے..... میری ایک دوست ہے تابندہ خان..... وہ تو خاصے

ماڈ لوگ ہیں..... اس کے ڈیڈی می بھی اصل پٹھان ہیں..... لیکن مغربی تہذیب کے دلدادہ ہیں..... شہباز وہ

لوگ تو ہم سے بھی زیادہ ایڈوانس ہیں..... میں تمہیں کبھی ان سے ملاؤں گی..... تابندہ کی ایجوکیشن باہر ہوئی

ہے..... اس کی می..... بالکل انگریز لگتی ہیں..... اس کے بھائی آکسفورڈ میں پڑھ رہے ہیں..... ان کا طرز زندگی کسی

طور قدامت سے لگا نہیں کھاتا..... بہت ماڈرن اور ویٹرنائزڈ ہیں.....“

”ہوں گے.....“

”تو.....“

”میرا خاندان ایسا نہیں.....“

”ایجوکیشن تو ہے تمہارے خاندان میں..... تم بتا رہے تھے نا..... کہ تمہارے ڈیڈی اور می

پڑھے لکھے ہیں“

شہباز ہنس کر بولا ”ڈیڈی می نہیں..... خان بابا اور بی بی گل.....“

”تم اپنے بابا کو خان بابا اور ماں کو بی بی گل کہتے ہو نا.....“

”ہاں“

”کتنے پیارے الفاظ ہیں.....“

”قدامت کی بو نہیں آتی ان سے“

”نہیں شہباز کیسی باتیں کرتے ہو..... مجھے تو بہت اچھے لگے یہ القاب..... اپنی دادی ماں کو تم

بتا رہے تھے..... آں..... کیا؟“

”آغا بی بی جان.....“

”کتنے سویٹ الفاظ ہیں.....“

”ایسے ہی نہیں کہو.....“

”سچ کہتی ہوں شہباز..... تم جب بھی اپنے خاندان کی اپنے گاؤں کی باتیں کرتے ہو مجھے بہت

مزہ آتا ہے..... بالکل کہانیوں کی سی باتیں لگتی ہیں..... اس دن تم نے وہ..... وہ کیا تھا..... نام یاد نہیں..... وہ بدلے

کا قتل..... انتقام والی بات بتائی تھی تا..... بالکل افسانوی لگے محسوس.....
 ”ہاں وہ گل پروشے والا صدمہ..... تم تو جا رہے ہو کہ بعد مار ڈالا اجمل خان نے دریا خان کو“
 ”بہت بہادر لوگ ہوتے ہیں..... مجھے یہی پسند ہے..... شہباز تم بھی ایسے ہی بہادر ہونا خطرات
 سے ٹکرا جانے والے.....“

شہباز جھٹ سے بولا..... ”تمہاری خاطر بہادری دکھانا ہی پڑے گی زوبلی..... میں خطرات سے
 ٹکرا جاؤں گا..... بالکل نہیں ڈرتا خطرات سے..... تمہاری خاطر سب کچھ کر گزروں گا زوبلی..... سب کچھ.....“
 زوبلی متاثر سی اسے ہنسنے لگی.....

شہباز جوش جذبات میں بولا..... ”ظاہر ہے زوبلی میرے قدامت پرست..... والدین مجھے من مانی
 کرنے نہیں دیں گے..... تمہارے معاملے میں.....“

زوبلی نے جلدی سے شہباز کا کندھا پکڑ لیا..... اور بے اختیار نہ بے تابی سے بولی.....
 ”شہباز..... مجھے چھوڑ نہیں دیتا..... میں..... میں زندہ نہیں رہ سکوں گی تمہارے بغیر.....“
 شہباز نے اس کی پشت پر بازو لے جاتے ہوئے کہا ”تم میری زندگی بن چکی ہو زوبلی.....
 تمہارے بغیر میں خود کو ناسچیوں گا..... تم فکر نہ کرو..... میں تمہاری خاطر سب کچھ کر گزروں
 گا..... سب کچھ.....“

اس نے زوبلی کو اپنے قریب بٹھالیا..... اس سے وعدے کئے..... اپنی بے کراں محبت کا یقین
 دلایا..... اس کی خاطر خطرات سے ٹکرانے کا عزم دہرایا.....
 زوبلی مطمئن ہو گئی.....

پھر

وہ اس سے

اس کے خاندان

اس کے گھر والوں

اور

اس کی ریت روایتوں کے متعلق باتیں سننے لگی.....

شہباز نے بہت سی باتیں اسے بتائیں..... قصے سنائے واقعات گوش گزار کئے.....

لیکن

زری کے متعلق کچھ نہیں کہا.....

نہ ہی اپنی معافی کی بات بتائی

اور

نہ ہی بدلے کے رشتوں کا ذکر کیا.....

رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے جب شہباز گھر آیا..... زوبی کے ساتھ اس نے آج ڈھیروں سارا وقت گزارا تھا..... رات کھانا بھی اس کے گھر کھایا تھا..... زوبی کے می ڈی بھی کھانے پر موجود تھے عمو اور اس کے دو اور دوست بھی تھے..... ان دوستوں سے عمر نے شہباز کا تعارف بھی کرایا تھا.....

”یہ میرے اور زوبی کے مشترکہ دوست شہباز ہیں.....“ عمر نے کہا تھا..... شہباز کو کتنی عجیب بات لگی تھی..... اس نے ایک لمحہ کو گھبرا کر عمو اور می ڈی کو دیکھا تھا..... لیکن کسی کے چہرے پر کوئی ناگواری نہیں تھی..... بلکہ می ڈی نے تو اس کی تعریفیں شروع کر دی تھیں..... اور ہنستے ہوئے کہا تھا.....

”کاش میری عمر تم لوگوں جتنی ہوتی..... پھر میں بھی شہباز خان کا بے تکلف دوست ہوتا..... ویسے کوئی بات نہیں شہباز خان..... دوستی تو ہماری اب بھی نہیں ہو سکتی ہے..... راز کی بات بتاؤں..... میں اندر سے تمہاری عمر ہی کا ہوں.....“

وہ کھلکھلا کر ہنس دیئے تھے اور اس ہنسی میں سب ہی شریک ہو گئے تھے.....

”سویت بوائے.....“ انہوں نے شہباز پر مسکراتی نگاہ ڈالی تھی اور می ہنستے ہوئے بولی تھیں.....

”اس میں کوئی شک نہیں..... لیکن یہ سویت بوائے آپ کا نہیں عمر کا دوست ہے..... زوبی کا دوست ہے.....“

”ہمارا دشمن تو نہیں.....“ وہ ہنس کر بولے.....

شہباز کوئی دیر موضوع گفتگو بناتا تھا..... یہ گفتگو اتنی خوشگوار اور خوش کن تھی کہ زوبی اسے دیکھ دیکھ کر اترا تری رہی تھی.....

کھانے کے بعد عمر اپنے دوستوں کے ساتھ چلا گیا تھا..... می ڈی بھی اٹھ گئے تھے..... زوبی اور شہباز باہر لان میں بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے..... چاندنی مسکور کن تھی..... دن بھر کی تپ نصاب قدرے ٹنک

تھی..... کبھی کبھی ہوائیں بھی سرسراتی تھیں..... دونوں باتوں میں لگن تھے..... کبھی کبھی چپ بھی ہو جاتے اس چپ میں قربتوں کی محک اندر اتارتے.....

عمرواپس آیا تب بھی وہ لان میں چل قدمی کے انداز میں پھر رہے تھے..... وہ بھی ان کی طرف آگیا.....

اب وہ تینوں باتوں میں لگ گئے..... شہباز عمر سے اس کی تیاریوں کے متعلق پوچھنے لگا..... سب کچھ ہو چکا تھا..... اس کے جانے میں چند دن ہی باقی تھے.....

”وہاں جا کر ہمیں بھول نہیں جانا“ شہباز نے کہا.....

”جاؤ تو لوں.....“ عمر بولا..... ”جوں جوں جانے کے دن قریب آرہے ہیں..... میں تو اداس ہوتا جا رہا ہوں“

”ایویں گپ بار رہے ہیں“ زوبی نے کہا ”من میں لڈو پھوٹ رہے ہیں..... اتنے خوش ہیں جانے سے اداس تو میں ہوں گی..... گھر میں اکیلی رہ جاؤں گی..... جب سوچتی ہوں تو ہول آتا ہے“

عمر ہنس کر بولا..... ”یہ دوسری بات ہے کہ تجھے سوچنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا.....“

”اچھا جی؟“

”تو اور کیا“

”آپ کو کیا پتہ“

”یہی کہ تجھے کچھ اور سوچنے کا وقت ہی نہیں ملتا..... تو تو ہر وقت اپنے ہی بارے میں سوچتی رہتی ہے آج کل“

”اپنے بارے میں“

”بالکل.....“

”قطعاً غلط..... اپنے بارے میں میں بالکل نہیں سوچتی.....“

”تو پھر ان خان صاحب کے بارے میں سوچتی رہتی ہوگی.....“

”ہنوبھی.....“ زوبی نے بھائی کو کہنی ماری..... عمر شوخی سے بولا ”ویسے خان میری اس چیز میں بہن سے بچ کر رہنا.....“

”کیوں.....“ شہباز دونوں بہن بھائی کی چہلوں سے محظوظ ہو رہا تھا.....

”کیوں پچانہ دے تھیں“ عمر ہنسا.....

”کیا مطلب؟“ جلدی سے زوبی بولی.....

”بھئی جب یہ کسی کو نیا یادوست بناتی ہے نا تو.....“

”تو..... کیا؟“ زوبی بے صبری سے بولی.....

”تو پہلے..... پہلے تو بہت سرچڑھالیتی ہے..... پھر.....“

”پھر؟“ اب شہباز نے بے تابی سے پوچھا.....

”پھر شیخ دیتی ہے..... منہ ہی نہیں لگاتی.....“

”عمر.....“ زوبی نے ڈانٹنے کے انداز میں کہا..... شہباز کچھ ہراساں سا نظر آیا.....

”جھوٹ تھوڑا ہی کہا ہے.....“

”تمہاری بکواس سچی بھی نہیں..... شہباز اس کی باتوں پر وہیانا نہ دیتا.....“

عمر شوخ ہوا جا رہا تھا بولا ”بھئی میں تمہیں اس کی عادت سے مطلع کر رہا ہوں..... آگے تمہاری مرضی وہ ضیغ بے چارہ..... آج تک اس کی جان کو رو رہا ہے..... بہت دوستی تھی اس سے اس کی..... اور اب؟“

شہباز کا دل بیٹھنے لگا..... اس نے زوبی کی طرف پتھارگی سے دیکھا.....

”شہباز..... یہ ایسے ہی کہہ رہا ہے..... ضیغ مئی کی دوست کا بیٹا ہے..... دیکھا ہوا ہے تم نے

میری اس سے صرف دوستی تھی..... اب بھی صرف دوست ہے میرا.....“

”اب تو صرف دوست صرف خان صاحب ہی ہیں تمہارے“ عمر نے ہنس کر کہا.....

”ضیغ سے تو کبھی بات بھی نہیں کرتیں اب.....“

”میری مرضی..... نہیں کرتی.....“ وہ رو ہانسی ہو گئی..... ”تمہیں کیا پتہ وہ کیسی باتیں کرنے لگا

تھا..... پتہ نہیں وہ کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو..... میرا امیدوار بنا بیٹھا ہے..... ہونہ..... نہیں پسند مجھے اس کی بد تمیزی.....“

”اوہو.....“ عمر نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا ”میں تو چھیڑ رہا تھا تم رونے لگیں.....“

”تم نے شہباز کے سامنے میری انسٹ کی ہے“ وہ جھج جھج رو دی.....

”سوری..... میری گڑیا من..... سوسوری..... بھئی شہباز میری باتوں کو سیریس نہیں لینا.....

میں اسے چھیڑ رہا تھا..... سوری ڈیر زوبی..... ویری سوری.....“

اس نے بمشکل زوبی کو منایا.....

وہ مانی اس شرط پر کہ عمر انہیں آنس کریم کھلانے باہر لے چلے.....

تینوں شہباز کی گاڑی میں باہر چلے گئے..... آنس کریم کھائی..... لبرٹی کا چکر لگایا پان لئے اور واپس آگئے.....

رات کافی اتر آئی تھی..... اس لئے شہباز نے واپسی کی اجازت لی.....

زوبی نے اسے خدا حافظ کہنے سے پہلے یقین دلایا..... کہ ضیغ سے اس کا فیسر نہیں تھا.....

صرف دوستی تھی اور اب بھی ہے..... اس دوستی میں بے تکلفی کا عنصر بھی قطعاً شامل نہیں.....

”عمر کی باتوں سے کوئی اثر نہیں لینا شہباز..... ضیغ صرف دوست ہے بس.....“

”اور میں“ شہباز نے اس کی باتوں پر یقین کرتے ہوئے پوچھا.....

”تم.....“

”ہاں“

”تم میرے لئے کیا ہو..... یہ بات..... اپنے دل سے پوچھو شہباز..... اپنے دل سے..... تمہیں

خود ہی جواب مل جائے گا.....“

شہباز کی کوئی بات سننے بغیر اس نے خدا حافظ کہا اور گاڑی سے قدرے پرے ہٹ گئی.....

شہباز اس پر متانہ سی نگاہیں ڈالتے ہوئے گاڑی گیٹ سے نکال لے گیا.....

نہ چاہتے ہوئے بھی سارا راستہ شہباز کے ذہن پر ضیغ مسلط رہا..... وہ اس سے مل چکا تھا..... دبلا

پتلا لمبا سالز کا زوبی کی مٹی کی دوست کا بیٹا تھا..... ڈاکٹر بن چکا تھا..... ان دنوں سروسز ہسپتال میں ہاؤس جاب کر رہا

تھا..... خوش ذوق اور با مذاق لڑکا تھا..... لیکن شہباز کو پہلی ملاقات ہی میں وہ بھایا نہیں تھا.....

وہ اپنے آپ سے الجھتا سلجھتا گھر پہنچا.....

مستان خان گیٹ کے قریب ہی چارپائی ڈالے پڑا تھا..... مجھروں سے بچنے کے لئے سرمہ

چادر میں لپیٹ رکھا تھا.....

ہارن کی آواز پر وہ یکدم ہی اٹھ کھڑا ہوا..... شاید خان کے انتظار میں جاگ رہا تھا..... اس نے

گیٹ کھول دیا.....

شہباز گاڑی اندر لے گیا..... پورچ میں گاڑی کھڑی کر کے وہ باہر نکلا..... توستان خان بھی

قریب آچکا تھا.....

”سلام علیکم شہباز خان.....“

”وعلیکم سلام“ شہباز نے گاڑی بند کرتے ہوئے جواب دیا.....

”خان“

”ہوں“

”آپ نے تو آج پشاور جانا تھا.....“

”اوہ ہو..... ہو..... میں تو بالکل ہی بھول گیا تھا.....“

”زرگل خان نے فون کیا تھا..... وہاں سب آپ کا انتظار کر رہے تھے.....“

”اوہ ہو..... مجھے اطلاع دینا یا دینی نہ رہا.....“

”وہ سب پریشان تھے جی.....“

”وہ تو ظاہر ہے ہو گئے.....“

”زرگل خان نے بولا تھا..... کہ.....“

”تم نے کیا کہا تھا انہیں.....“

”جی میں نے بول دیا تھا کہ اپنے کسی دوست کے ہاں دعوت پہ گئے ہیں.....“

”اوہ تیرا ستیاناس.....“

”کیوں خان..... کیا کہتا..... آپ ہی تو کہہ کر گئے تھے.....“

”اب کون جان چھڑائے گا ان سے.....“ شہباز اپنے آپ سے بولا..... ”مستان خان نے کہا

”خان نے بولا تھا..... کہ جب آپ واپس آئیں تو پشاور فون کریں“

”شہباز نے آستین کھینچ کر گھڑی دیکھی..... ساڑھے گیارہ بجنے کو تھے..... وہ کچھ پریشان سا

نظر آیا..... یاد ہی نہ رہا..... اطلاع کر دیتا کہ میں آج نہیں آ رہا.....“

”آپ فون کریں جی“ ”مستان خان بولا.....“ ”آغا بی بی جان بھی پشاور ہی ہیں..... وہ بہت

پریشان تھیں..... اور بڑے خان کو تو.....“

”اس وقت فون کر دوں.....؟“

”کوئی بات نہیں..... کوئی نہ کوئی تو جاگتا ہوگا.....“

”اپنی شامت لانے والی بات ہے.....“ شہباز بڑبڑایا..... ”پھر مستان سے بولا“ ”خیر تم جاؤ سو

جاؤ میں دیکھتا ہوں“

شہباز چابی انگلی کے گرد گھماتا اندر چلا گیا.....

مستان واپس آکر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا..... لیٹنے سے پہلے اس نے سرہانے رکھی سگریٹ کی

ڈبیہ اٹھائی سگریٹ سلگایا اور اس کے کش لینے لگا.....

شہباز اندر آکر گومگو کے عالم میں چند لمحے فون کے پاس کھڑا رہا.....

فون کرے یا نہ کرے؟

وہ سوچنے لگا.....

اس وقت یقیناً سب سو رہے ہوں گے.....

اور

یہ بھی یقین ممکن ہے کہ اس کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملنے کے انتظار میں جاگ رہے

ہوں.....

بی بی گل شہنوازری..... ان تینوں میں سے تو یقیناً کوئی نہ کوئی انتظار میں جاگ رہا ہوگا.....

وہ فون اٹھائے بغیر اپنے کمرے میں چلا آیا.....

”صبح دیکھیں گے“ اس نے کمرے کا کنڈیشنر آن کرتے ہوئے سوچا.....

دوسرا خیال لپک بھپک ذہن میں آیا..... ”فون ابھی کرنا چاہئے..... کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑ لینا

چاہئے.....“

فون اٹھایا اور اپنے کمرے میں لے گیا.....

نمبر ڈائل کرنے سے پہلے وہ بہانہ سوچنے لگا..... کم از کم خان بابا کے عتاب سے بچنے کے لئے تو

کسی مؤثر بہانے کی اشد ضرورت تھی.....

چند لمحے کھڑے رہنے کے بعد اس نے نمبر ڈائل کر دیا.....

جو ہو سو ہو..... اس نے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا.....

”کھٹی بجتے ہی“ ”ہیلو“ کی آواز آئی.....

یہ آواز وہ بڑی آسانی سے پہچان سکتا تھا..... لیکن یہ آواز سنتے ہی اسے جانے کیا ہوا..... موڑ

ایک دم ہی بگڑ سا گیا.....

”زری“ وہ ہیلو کے جواب میں بولا.....

”جی.....“

”کیا بات ہے..... فون سرہانے رکھے بیٹھی تھیں.....“

”جی؟“

”میں آج نہیں آسکا..... اطلاع دینی ہی بھول گیا تھا.....“

”دوست کے ہاں دعوت پہ گئے تھے.....“

”جہاں بھی گیا تھا..... تمہیں حساب دینا ضروری نہیں ہے.....“

اور

”سن نہیں رہیں.....“

“آپ.....”

”میرے نہ آنے سے تمہیں نے زیادہ بھڑکایا ہو گا سب کو.....“

”میں نے؟ خان بابا کا آپ کو پتہ نہیں ہے کیا..... بہت غصے ہو رہے تھے.....“

”ایک تو یہ خان بابا چین سے نہیں لینے دیتے.....“

”شہاز آپ کیا کہہ رہے ہیں..... کیا ہو گیا ہے آپ کو..... آپ نہیں آئے پریشانی تو سب کو

تھی.....

”کیوں پریشانی تھی..... نہیں آسکا تو کیا ہوا..... آسمان گر گیا زمین پھٹ گئی..... دماغ پر مسلط

رہتے ہیں سب..... چھین سے سانس بھی نہیں لینے دیتے.....“

وہ جانے کیا بکے جا رہا تھا..... زری بھونچکی سی سن رہی تھی..... ایک تو آیا نہیں تھا اوپر سے اس

طرح برس رہا تھا..... وہ بیچاری تو کچھ سمجھ نہ پائی.....

”صبح خان بابا یا اور کوئی پوچھے تو کہہ دینا..... میں نے ضروری نوٹس لینے تھے..... اس لئے

دوست کے ہاں چلا گیا..... آج نہ جاتا تو ٹولس نہ ملتے..... ”شہباز نے گر جنے برسنے کے بعد زری سے کہا..... تو وہ

”بی بی گل آگئیں ہیں یہ پیغام خود ہی انہیں دے دیں.....“

زری نے فون گل بی بی کو پکڑا دیا..... خود پرے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

شہبازی بی گل سے باتیں کرنے لگا..... اب اس کا موڈ بدلا ہوا تھا بہانہ بنا لیا تھا..... ماں سے ہنس

ہنس کر باتیں کر رہا تھا..... فون کرنے کے بعد شہباز نے کپڑے بدلے..... اس نے کل پشاور آنے کا بی بی گل سے

کہہ دیا تھا.....

اب وہ مطمئن تھا.....

وہ بستر میں لیٹا..... تو زری کا خیال آگیا..... اس سے باتیں کرتے ہوئے اس پر

جھنجھلاہٹ کیوں مسلط ہو گئی تھی؟ وہ سوچنے لگا.....

اور

سوچتے سوچتے وہ زری سے زوہبی تک جا پہنچا.....

زونی

جواس کے دل و دماغ پر چھائی تھی..... جواس کی تلاش و جستجو تھی..... جواس کا آئیڈیل تھی.....

کے لئے وہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی..... جی تو چیخ چیخ کر رونے کو چاہتا تھا لیکن وہ شروع ہی سے شاکر و صابر قسم کی طبیعت رکھتی تھی..... اس لئے اس غم جاناں کو بھی نماں رکھنا تھا..... خاموشی سے چرکہ پہنا تھا..... واہلا کرنے سے کبھی کچھ ہاتھ نہیں آتا..... اپنا غم اپنا خون جگر ہی پیتا ہے..... شاید وہ یہ بات جانتی تھی.....

اس کی گھمبیر خاموشی نے شہنو کو پریشان کر دیا تھا.....

اسی لئے وہ شہباز سے باز پرس کر رہی تھی.....

شہباز ایک دن کے لئے آیا تھا..... زرگل بکینے اور صبور خان اسے مل کر واپس گاؤں چلے گئے تھے..... زری کو شہنو ہی نے روک لیا تھا..... وہ آئی بھی تو آغابی بی کے ساتھ تھی..... آغابی بی شہباز کی خاطر ایک دن کے لئے رک گئی تھیں..... ویسے بھی انہیں شہباز سے امتحانوں کے بارے میں پوچھ گچھ کر شادی کا فیصلہ کرنا تھا.....

رات کھانے کے بعد جب آغابی بی اپنے کمرے میں چلی گئیں..... تو انہوں نے شہباز کو بلا

بھیجا.....

شہباز قہقہہ پی کر ان کے کمرے میں چلا گیا.....

آغابی بی نے پانگ پر ہی اسے بٹھالیا..... تھوڑی ہی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں پھر اس کی پڑھائی کے متعلق پوچھا..... ”کیسے جا رہی ہے“

”بس ٹھیک ٹھاک“ وہ ان کے قریب پٹی پر بیٹھے بیٹھے بولا.....

”فارغ کب ہو رہے ہو.....“

”امتحانوں کے بعد“

”وہی تو میں پوچھ رہی ہوں امتحان کب ہو رہے ہیں.....“

”ہو ہی جائیں گے..... آپ کیوں پوچھ رہی ہیں.....“

”قربان جاؤں.....“ آغابی بی اپنے مخصوص انداز سے مسکرائیں ”بڑے“ امتحان کی تیاری جو

کرتی ہے“

”بڑے امتحان.....“

وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ کر بولیں ”بچے..... شادی.....“

”اُدھ.....“ وہ کچھ ہراساں سا ہو گیا.....

”تمہارے فارغ ہونے کا انتظار ہے..... بس اب بہت ہو گیا..... جوں ہی امتحان وے لو گے

شادیاں کر دی جائیں گی..... تمہاری خاطر شادیاں رکی ہوئی ہیں..... ورنہ زرگل تو چار سال سے فارغ ہے اور اب

”شہباز لالہ“

”ہوں“

”آپ نے زری سے کچھ کہا.....“

”کیوں“

”بہت چپ چاپ سی ہے“

”وہ بولتی کب تھی.....“

”نہیں شہباز لالہ..... کوئی بات ہے..... آپ نے اسے ضرور کچھ کہا ہے“

”جب سے آیا ہوں تم لوگوں کے ساتھ ہوں..... اس سے اکیلے میں تو ملا نہیں..... پھر یہ

الزام؟“

شہنو شہباز کی بات پر چپ ہو گئی..... وہ ابھی ابھی زری کے کمرے ہی سے آئی تھی..... زری

بہت خاموش اور اداس اداس لگ رہی تھی..... اس نے پوچھا بھی تھا..... لیکن زری بات ٹال گئی تھی..... ہاں اس

کی آنکھوں میں نمی ضرور تیر گئی تھی.....

اداس تو وہ پہلے ہی تھی..... رات فون پر شہباز اس پر جس طرح گرجا رہا تھا وہ کوئی خوش کن

بات تو نہ تھی..... زری تو کتنی ہی دیر بستر میں پڑی چکے چکے آنسو بھی بہاتی رہی تھی..... اسے تو کچھ سمجھ نہیں آتا

تھا..... کہ شہباز کو ہوتا کیا جا رہا ہے..... ہر ابھرنے والا دن اور ڈوبنے والی شام دونوں کے درمیان فاصلوں کو

بڑھانے کا کام کر رہے تھے.....

آج شہباز آیا تھا.....

لیکن اس نے اتنی بے رخی اور بے اعتنائی برتی تھی..... کہ زری کو یقین ہونے لگا تھا..... کہ شہباز

توجیاں بھی امتحان دے چکی ہیں..... تم بتاؤ کب تک امتحان دے کر فارغ ہو رہے ہو“
 ”میں..... میں..... آغا بی بی جانے..... ابھی تو کچھ مہینے ہیں..... یونیورسٹی..... میں گریڈ ہوتی
 رہتی ہے..... ابھی تو خدا جانے امتحان کب ہوں گے..... کچھ پتہ نہیں..... دیئے آپ زر گل کی شادی کر دیں.....
 ضروری تو نہیں دونوں شادیاں.....“
 آغا بی بی اس کی بات کانٹے ہوئے بولیں ”یہ تمہارا باپ جو ہے نامنفر پھر ہے..... یہ بات تو
 میں عرصے سے کہتی آرہی ہوں وہ مانتا ہی نہیں..... دونوں شادیاں اکٹھی کرنا چاہتا ہے..... میں جانتی ہوں یہ بات
 وہ صرف شہنو کے پیار میں کہتا ہے..... جتنا عرصہ ہو سکے وہ اسے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے..... بہت پیاری اور
 لاڈلی ہے نا اپنے بابا کی.....“
 آغا بی بی باتیں کر رہی تھیں..... شہنو کی زری کی زر گل کی..... شادیوں کی..... رسم و رواج
 کی.....

شہبازان کے قریب پٹی پر میٹھا سن کر جیسے سن ہوا جا رہا تھا..... اس کے ذہن پر گھبراہٹ
 سی مسلط ہو رہی تھی..... وہ سوچوں میں ڈوب رہا تھا.....
 جب وہ آغا بی بی کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں آیا..... تو اس کے دل دماغ پر
 ناقابل برداشت بوجھ تھا.....
 وہ ساری رات ٹھیک طریقے سے سونہ سکا..... کبھی سانس تھکتی محسوس ہوتی..... کبھی دل پر بوجھ
 پڑتا کبھی دماغ چکراتا.....
 وہ اٹھ اٹھ کر ٹھٹھا رہا.....

بے شمار سگریٹ پھونک ڈالے.....
 جس حقیقت سے آنکھیں پھری ہوئی تھیں..... وہ برہنہ چہرے کے ساتھ اس کا سامنا کر رہی
 تھی.....

زری اس کی خشکری کی منگ تھی.....
 شہنو اس کی سن تھی.....
 بدلے کے رشتے طے پا کر ہوں بیت چکے تھے.....
 یہ رشتے پھر پھر لکیر تھے..... پھر پھر لکیر..... جو مٹائے نہ تھی..... مٹانے کی کوئی جرأت بھی نہیں
 کر سکتا..... اگر کوئی مٹانے کی کوشش کرے تو زندگیاں مٹ جاتی ہیں..... یہ لکیر نہیں مٹتی.....
 یہ رشتے

کچھ دھاگے بھی نہیں تھے..... جو توڑے جاسکتے.....

پھر

پھر؟

وہ سوچ سوچ کر بے طرح پریشان ہو رہا تھا.....

زوبی کی طرف بے اختیاری سے بڑھتے ہوئے اس نے اس زندہ حقیقت کو جانے نظر انداز کیے

کر دیا تھا.....

زوبی کو دل دے کر زری کو رد کر دیا تھا.....

زری کچا دھاگہ تو نہیں تھی.....

پھر پھر لکیر تھی.....

اب کیا ہو گا؟

اس کا دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا.....

ساری رات اس نے بے چینی اور پریشانی کے عالم میں گزار دی..... آنکھ لگ بھی جاتی تو ہمایک

خواب ذہن کو قتل کر دیتے.....

وہ حیران بھی تھا کہ اس نے اتنی بڑی حقیقت کو نظر انداز کیسے کر دیا تھا..... اپنے خاندانی نظریات
 کو کیسے بھول گیا تھا..... اپنی روائتوں سے کیسے چشم پوشی کر لی تھی..... رشتوں کے بندھن سے کیسے منفر ہو گیا
 تھا..... بزرگوں کے فیصلوں سے انحراف کا تو سوچا بھی نہ جاسکتا تھا..... اس نے نئے بندھن کیسے باندھ لئے
 تھے.....

اس کا انجام کیا ہو گا

انجام؟

خون خرابہ؟

رشتے ٹوٹ جائیں گے

ناٹے بکھر جائیں گے

خاندان برباد ہو جائے گا.....

اف

اس کا دماغ جیسے پھٹنے لگا

وہ گھبرا گھبرا کر کمرے میں ٹھٹھا رہا.....

ہم صرف حال میں جیتے ہیں..... مستقبل ہمارے لئے پتھری دیوار ہے..... ہم اس کے پار نہیں دیکھ سکتے..... لیکن یہ مستقبل ہم ہر لمحہ لمحہ وار دہو کر حال میں ڈھلکا رہتا ہے.....

حال

جس کا ہمیں شعور ہوتا ہے..... آگئی ہوتی ہے..... ہم اسے محسوس کرتے ہیں اس سے نپٹتے ہیں..... اس سے لپٹ کر جیتے ہیں پھر یہ سرکنا ہوا لمحہ ماضی میں گم ہو کر مستقبل سے ٹوٹ کر حال میں آنے والے لمحے کے لئے جگہ چھوڑ دیتا ہے یوں ماضی بھی ہماری گرفت سے دور ہو جاتا ہے ہم اسے پکڑ نہیں سکتے پانہیں سکتے مستقبل کی طرح یہ بھی دیوار کے پیچھے گم ہو جاتا ہے.....

لیکن

مستقبل اور ماضی میں ایک فرق ہے..... مستقبل پتھری دیوار ہے..... جس کے پار ہم دیکھنے کے اہل نہیں ہوئے اور ماضی

ماضی

شیشے کی دیوار ہے..... جس کے پیچھے سرکا ہوا ہر لمحہ گزاری نظر میں ہوتا ہے ہم اسے دیکھ سکتے ہیں اس کی حدت و شدت کو محسوس کر سکتے ہیں..... لیکن اسے لوٹا نہیں سکتے پانہیں سکتے چھو نہیں سکتے..... شہباز کا حسیاتی شعور اسے مستقبل حال اور ماضی میں لئے بھٹک رہا تھا..... کبھی وہ مستقبل کی پتھر کی دیوار سے سر پھوڑ رہا تھا.....

کبھی

حال کی سنگینیوں سے نبرد آزما ہو رہا تھا.....

اور

کبھی

لپٹ کر لوٹ کر شیشے کی دیوار کے پیچھے سرکے ہوئے لمحوں کو دیکھ رہا تھا..... ماضی ایک باگی اس پر لپٹ پڑا تھا..... وہ زری کے پیار کی شدتوں کو محسوس کر رہا تھا..... اس سے کی ہوئی زیادتی پر تاسف کر رہا تھا.....

صبح وہ کافی دیر کے بعد کمرے سے باہر نکلا..... دن خاصہ گرم تھا..... دھوپ چمک رہی تھی..... بی بی گل اس کے بیدار ہونے کے انتظار میں تھیں..... ناشتے کے بعد وہ آغا بی بی کے پاس تھوڑی دیر بیٹھا..... پھر شہنو کے کمرے میں چلا آیا..... دو بجے کی فلاٹ سے اسے واپس جانا تھا.....

اور

جانے سے پہلے وہ زری سے کی ہوئی زیادتیوں کے لئے اس سے معافی مانگنا چاہتا تھا..... اس کا دل پکھل رہا تھا.....

زری اسے بیرونی لان میں نظر آئی..... وہ اک لمحہ ضائع کئے بغیر باہر چلا آیا..... اور تیز قدم اٹھائے زری کی پشت پر جا پھنسا.....

زری اپنے خیالوں میں گم سست قدم رکھتے دائیں ہاتھ والے پتھر اور رخت کی طرف جارہی تھی..... اس درخت سے بھی بچپن اور لڑکپن کی کئی یادیں وابستہ تھیں.....

یادیں

جو سہانی تھیں

لیکن جن کے متعلق سوچ کر اب دکھ درد کے سوا اسے کچھ نہیں ملتا تھا.....

”زری“ شہباز نے اسے آواز دی.....

”زری چونک گئی..... ایک لمحہ کو توبے یقین بھی ہوئی..... شہباز کی آواز وہ پہچانتی تھی..... لیکن وہ اسے کیوں کر پکار سکتا تھا..... وہ تو..... وہ تو.....

زری نے لپٹ کر دیکھا.....

وہ شہباز ہی تھا.....

اسے دیکھ کر وہ خفت سے مسکرایا.....

”زری“ اس نے پھر پکارا.....

زری اس کے عین سامنے کھڑی اپنی جھیل ایسی گہری آنکھوں کے پورے سکوت کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی.....

”زری“ وہ گڑ گڑایا.....

جی..... ”زری نے آنکھیں جھکالیں.....

”میں..... میں تم سے شرمندہ ہوں زری.....“

زری نے اک گہری سانس لی..... اس بہروپے کو سمجھنے سے وہ بیجاری قاصر رہی تو تھی.....

”مجھے معاف کر دو زری.....“ وہ پھر گڑ گڑایا.....

”کیا معاف کر دوں.....“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی.....

”میں..... میں نادم ہوں“

”کس بات پر“

”چھوڑو تاب..... کیوں شرمندہ کرتی ہو..... اس رات فون پر جانے مجھے کیا ہو گیا تھا.....“

”کوئی نئی بات نہیں تھی..... کچھ نہ کچھ تو آپ کو ہوتا ہی رہتا ہے.....“

”تم ہر دفعہ مجھے معاف کر دیا کرو.....“

زری کے ہونٹوں پر اک طنزیہ تبسم لہرا گیا.....

شہباز نے بے چینی سے اس کی طرف دیکھا.....

زری چند لمحے سر جھکائے کھڑی رہی..... چپل کی نوک سے سبز گھاس کو مسلتی رہی پھر سر اٹھا کر

اسے دیکھا..... اور بولی.....

”شہباز..... میں آپ کو سمجھ نہیں پائی..... پتہ نہیں کیوں..... جانے آپ ہیں ہی پیچیدہ..... یا

میرا ذہن ہی اس کا اہل نہیں.....“

شہباز جھنجھلا کر بولا ”چپ ہوتی ہو تو گھمبیری چپ سادھ لیتی ہو..... بولنے پہ آتی ہو تو

لا جواب کر دیتی ہو..... میں بھی یقیناً تمہیں سمجھ نہیں سکا..... تم ہو کیا.....“

”ایک عام سی معمولی سی لڑکی“ وہ ہولے سے بولی..... ”جو شاید آپ کی آئیڈل نہیں.....“

”زری.....“ شہباز گھبرا کر بولا..... ”تمہیں..... تمہیں اس انداز میں باتیں نہیں کرنا چاہئیں

زری اس انداز میں سوچنا بھی نہیں چاہئے.....“

وہ تنہی سے مسکرا کر بولی ”کیا اس لئے کہ ہماری تقدیروں کے فیصلے ہمارے بزرگوں نے مدتوں پہلے

کر دیئے تھے؟“

وہ جلدی سے جذباتی لہجے میں بولا ”یہ فیصلے ناقابل قبول بھی تو نہیں.....“

زری نے پوری آنکھیں کھول کر شہباز کو دیکھا..... شہباز ان نظروں کی تاب نہ لا کر بولا.....

”آؤ ادھر چلتے ہیں..... اس درخت کے پاس مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں.....“

وہ اسے چھتتا اور درخت تلے لے گیا..... ساری رات کی گھبراہٹ اور سوچ نے اس کے ذہن

کو جس رخ ڈھالا تھا..... وہ زری کے لئے بہت حد تک تسکین اور طمانیت لئے ہوئے تھا.....

شہباز خود کو اس سے وابستہ کرنے کی شعوری کوشش کر رہا تھا..... زری اس کے لئے ایسا فرض

تھی جسے ہر صورت اس نے نبھانا تھا..... اور رات کی بیقرار سوچوں میں اس نے یہ بیجانی اور جذباتی

فیصلہ کر لیا تھا.....

زری کے من میں جو گھٹاؤ پانڈا ہیرے بھر گئے تھے وہ اس کی باتوں اور رویے سے بہت حد

تک دور ہو گئے گو اس نے کوئی رومانی باتیں نہیں کی تھیں..... نہ ہی یہ احساس دلایا تھا..... کہ وہ اس کے بغیر جی نہیں
سکتا، تاہم اس نے بزرگوں کے کئے ہوئے فیصلوں کو تسلیم کیا تھا ان کی افادیت کو مانا تھا..... اور ان سے انحراف کو
بغاوت گردانا تھا.....

شہباز لاہور واپس آگیا.....

وہ اپنے دل و دماغ سے کئے ہوئے فیصلے پر قائم تھا..... اس نے آغا بی بی سے کہہ دیا تھا..... کہ استخوانوں کے بعد وہ جب چاہیں اپنی خوشی پوری کر لیں..... اس نے زری سے بھی عمر بھر بھگاہ کرنے کا وعدہ کیا تھا..... وہ اپنا مسکن اپنا ٹھکانہ اپنا گھر تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا.....

اس نے اپنے دل سے عہد کر لیا تھا..... کہ اب پوری توجہ اور انہماک سے پڑھائی میں مشغول ہو جائے گا زوبی سے نہیں ملے گا..... اس کی محبت کو دل سے نکال پھینکے گا.....

لیکن

بعض اوقات

یوں بھی ہوتا ہے..... کہ پتھر کی دیواریں ریت کی دیواریں ثابت ہوتی ہیں چٹانیں از خود بھر بھری مٹی بن جاتی ہیں..... ڈھلوانوں پر بھاؤ کو روکا نہیں جاسکتا..... فیصلے پتھر پر لکیریں نہیں نقش بر آب ثابت ہوتے ہیں..... انسان اس معمول کے روپ میں ڈھل جاتا ہے..... جس کی باگ ڈور کسی زبردست عامل کے ہاتھ ہوتی ہے.....

شہباز ابھی سچ سچ اپنے فیصلوں کو نبھال رہا تھا کہ زوبی کا فون آگیا.....

”ہیلو“ شہباز نے فون اٹھایا

”شہباز“ زوبی کی آواز تھی.....

”ہوں“

”کب آئے“

”ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی ہے“

”ایئر پورٹ سے سیدھے ادھر آ جاتے تو کچھ بگڑ جاتا.....“

”کیوں؟“

”اس کیوں کا جواب طلب کرو گے“

”زوبی.....“

”فوراً چلے آؤ.....“

”کیوں“

”پھر کیوں؟“

”ہاں.....“

”شہباز میں نے تمہارے بغیر یہ وقت کیسے گزارا ہے؟ کیا تم اندازہ نہیں کر سکتے“

”زوبی.....“

”کیا زوبی زوبی کے جارہے ہو..... میں نے کہا فوراً چلے آؤ..... نہیں تو.....“

”نہیں تو.....؟“

”میں خود ہی چلی آؤں گی..... پھر نہ کہنا..... متان خان گھر پہ ہے..... تم..... کیوں

آگئیں.....“

”اچھا..... میں خود ہی آ جاتا ہوں.....“

”کب؟“

”ابھی.....“

”اوہ تم کتنے اچھے ہو شہباز.....“ زوبی نے کہا.....

شہباز نے فون رکھ دیا.....

زوبی متنطیس تھی اور وہ لوہے کا کٹرا..... لوہا چاہے نہ چاہے متنطیس کشش اسے آپوں

آپ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے.....

شہباز کے سارے فیصلے دھڑے کے دھڑے رہ گئے تھوڑی دیر کے بعد وہ تیار ہو کر زوبی کے گھر

جارہا تھا..... اس کے حواس پر نشیلا سناغبار چھا رہا تھا..... اسے زوبی کے سوا اور کسی کا خیال نہیں رہا تھا.....

وہ گاڑی سے نکلا تو انتظار میں شعلتی زوبی دوڑ کر اس کی طرف آئی..... اس کے بازو سے جھول کر

بولی ”شہباز میں تو ایک دن ہی میں تم سے اتنی اداس ہو گئی تھی..... تم کہاں چلے گئے تھے..... کیوں چلے گئے

تھے.....“

شہباز جذباتی طوفانوں میں بے سارا ذرہ بن گیا۔ اسے بھی یوں لگا جیسے وہ بھی زوبی سے کٹ کر جی نہیں سکتا۔ زندگی محبت کا دوسرا نام ہے۔ محبت نہ ہو تو زندگی بھی نہیں۔ اس نے زوبی کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

دونوں باتیں کرتے اندر چلے آئے۔

تھوڑی دیر می کے پاس بیٹھے۔ می نے اس کے اہل خانہ کا حال احوال پوچھا۔ سو فٹ ڈنکس منگوائیں۔ پھر ہنستے ہوئے بولیں ”زوبی نے تمہیں بہت مس کیا۔ اس نے تو روز تمہارے ساتھ وقت گزارنے کی روٹیں بنائی ہے۔“

شہباز نے نیم باز نظروں سے زوبی کو دیکھا۔ زوبی اٹھلا کر بولی ”یقین آگیا نا۔“

می اٹھ کر چلی گئیں۔ تو زوبی شہباز کو اپنے کمرے میں لے آئی۔

دونوں شام ڈھلنے تک وہیں رہے۔ خوب جی بھر کر باتیں کیں۔ میوزک سنا۔ چائے پی۔ زوبی نے اپنے الہم اسے دکھائے۔ کچھ تقریرات کی وڈیو کیسٹس اسے دکھائیں۔ شہباز دنیا دافیا کو بھولے اس کی قربت میں مسحور ہوتا رہا۔

”شہباز“ زوبی نے اس کے گھٹنوں پر رکھی الہم اٹھاتے ہوئے کہا۔

”ہوں“ اس نے سگریٹ سگاتے ہوئے کہا۔

”شہباز۔ میں تو تمہارے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ سکتی۔ تم۔ تم امتحانوں کے بعد

پشاور تو نہیں جاؤ گے۔“

”کیا فضول بات کر رہی۔“

”نہیں شہباز۔ میں سوچتی ہوں تو پریشان ہو جاتی ہوں۔ تم چلے گئے تو میں۔ میں۔

میں تمہیں کبھی جانے ہی نہیں دوں گی۔“ وہ بے حد جذباتی انداز میں اس کے کندھے سے سر ٹکاتے ہوئے بولی۔

”لیکن۔ مجھے جانا تو پڑے گا زوبی۔“ شہباز اپنا گال اس کے خوشبو سے مسکتے بالوں سے

لگاتے ہوئے بولا۔

”میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

وہ ہنس کر بولا۔ ”میرے ساتھ۔؟“

”ہاں۔“

”کس حیثیت سے؟“

”تمہاری دوست۔“

”دوست نہیں شریک حیات کی حیثیت سے زوبی۔“

”اوہ شہباز۔“

”میں بھی تمہارے بغیر نہیں جی سکتا زوبی۔ اب میں جہاں بھی جاؤں گا تم میرے ساتھ

جاؤ گی“

زوبی نے شہباز کے بازو کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

جذبات کی آندھی اتنے زور و شور سے چڑھی کہ شہباز کو گرد و پیش کا ہوش ہی نہ رہا۔

وہ زوبی سے روز ملنے لگا۔ کبھی اس کے گھر پہ۔ کبھی ریسٹورانوں میں اور کبھی سرسری

سرکوں پر برقی رفتاری سے دوڑتی گاڑی میں۔

وہ پشاور کے قیام میں کئے ہوئے فیصلے وعدہ سب بھول گیا۔ اسے آغابی بی یا درہی نہ زری۔

وہ زوبی کی محبت میں اندھا بہرہ ہو گیا۔ اس نے طوفانوں سے ٹکرانے کا عہد کر لیا۔ اس نے

روایتوں سے بغاوت کا عزم کر لیا۔

اور

اس شام جب وہ زوبی کے ساتھ سنسان ویران سرکوں پر گاڑی دوڑا رہا تھا۔ اس نے زوبی

سے زری کا تعارف کروا دیا۔

زوبی بھونچکا سی رہ گئی۔ حیران حیران نظروں سے شہباز کو دیکھ کر ڈوبتی آواز میں بولی

” شہباز کیا کہہ رہے ہو۔“

شہباز نے اس کی کمرے کے گرد ہاتھ لے جاتے ہوئے اسے اپنے قریب کر لیا۔ پھر اس کے

بالوں سے گال لگاتے ہوئے بولا ”زوبی معاملہ بہت کٹھن ہے۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔ میں دنیا چھوڑ سکتا ہوں

لیکن تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔“

”شہباز۔“ زوبی جیسے بیہوش ہوئی جا رہی تھی۔

شہباز نے گاڑی سرک کے کنارے روک لی۔ گاڑی کی سیٹ پیچھے کر کے زوبی کے لئے

آرام دہ جگہ بنائی۔ زوبی آنکھیں بند کر کے لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔

”زوبی۔ میری جان۔“ شہباز نے اس کا کندھا ہلایا۔

زوبی بے اختیار ہو کر رونے لگی۔

”زوبی۔ بخدا۔ حوصلے سے کام لو۔“

وہ روتی رہی..... شہباز اس کی گردن کے گروا ہنا بازو حمال کے اس پر جھکا تسلی و تسفی دیتا رہا
زوبی کافی دیر کے بعد سنبھلی تو شاکی لہجے میں بولی ”تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا.....“

”پہلے بتا دیتا تو کیا ہوتا.....“

”میں..... میں.....“

”مجھے چھوڑ دیتیں؟“

”ایسا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی شہباز“

”تو پھر ہمت سے کام لو..... میری ہمت بندھاؤ..... مرحلہ بڑا کٹھن اور دشوار ہے زوبی.....

لیکن میں تمہاری خاطر سب سے ٹکرا جاؤں گا..... مجھ پر یقین کرو..... اعتماد کرو.....“

”مجھے تم پر پورا اور اعتماد ہے شہباز..... مجھے اپنے پیار پر بھی اعتماد ہے..... لیکن.....“

”لیکن دیکھ کچھ نہیں..... مت سوچو..... یہ سب میرے مسائل ہیں..... میں انہیں خود ہی

حل کروں گا.....“

”اور اگر نہ کر سکے تو.....“ زوبی نے سر تا پا لڑتے ہوئے شہباز کا گریبان مٹھی میں پکڑ لیا شہباز

نے اس کی بند مٹھی اپنے مضبوط ہاتھ میں پکڑ کر اس کا کندھا تھپتھپایا..... ”اگر نہ کر سکا تو تمہاری خاطر جان دے

دوں گا.....“

”شہباز“ وہ پھر کانپ اٹھی.....

شہباز نے اسے اپنے ساتھ لگالیا.....

زوبی کئی دن پریشان رہی..... شہباز بعض اوقات تو اس کی پریشانی سے خود بھی بے انتہا

پریشان ہو جاتا.....

پھر

ایک دن اس نے اسی پریشانی کے عالم میں زوبی کو مطمئن کرنے کے لئے کہا..... ”زوبی ہم

شادی کر لیتے ہیں“

”کیا؟“ زوبی نے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا.....

”شادی“ وہ بولا.....

زوبی اسے حیرت زدہ سی سمجھتی رہی.....

”ہاں زوبی..... سارے مسئلوں کا یہی حل ہے..... ہم شادی کر لیتے ہیں..... ہمیشہ ہمیشہ کے

لئے ایک ہو جاتے ہیں..... پھر دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر سکے گی.....“

”تمہارے والدین.....“

”شادی ہو گئی تو وہ بھی کچھ نہیں کر سکیں گے..... انہیں اس شادی کو تسلیم کرنا پڑے گا.....

نہ کیا تو پھر وہ مجھے ہمیشہ کے لئے کھودیں گے..... میں تمہیں کسی حال میں نہیں چھوڑوں گا زوبی.....“

”لیکن.....“

”اس میں لیکن کی کوئی گنجائش نہیں..... اگر تم تیار ہو تو میں تمہارے می ڈی سے بات

کروں.....“

زوبی نے ہولے سے کہا ”جیسے تم چاہو کرو شہباز..... مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آتا.....“

”میں کسی دن موقع دیکھ کر می سے بات کروں گا..... اب تم بالکل بے فکر ہو جاؤ.....“

لیکن

شہباز کے بات کرنے سے پہلے ہی خود می نے بات چھیڑ دی.....

”ہیفم ان کی دوست کا کلو تاپنا تھا..... مزنا شم کی مرتبہ اشار تازہ کر چکی تھیں..... زوبی انہیں

بھی پسند تھی اور ہیفم کو بھی..... زوبی کی می کو بھی یہ رشتہ پسند تھا..... اپنی ٹائپ کے لوگ تھے روپیہ پیسہ بھی تھا..... تعلیم

بھی تھی..... ہیفم کو ہائر سٹڈیز کے لئے باہر بھی بھیجنا چاہتے تھے یوں مستقبل بھی تابناک تھا..... می زوبی کے لئے جس

معیار کا رشتہ چاہتی تھیں..... ہیفم اس پر پورا اترتا تھا.....

لیکن

رشتہ ان کی نہیں زوبی کی پسند سے ہوتا تھا..... وہ جب تک بیٹی کی پسند ناپسند دریافت نہ کر لیتیں

مزنا شم کو کوئی تسلی نہ دے سکتی تھیں..... بیٹی کو اتنی خود مختاری اور آزادی خیال و اظہار دے رکھی تھی اس

کی مرضی کے بغیر کوئی قدم اٹھانا ممکن ہی نہ تھا.....

مزنا شم سے بھی انہوں نے یہی بات کہی.....

اس دن عمر کو کسی آف کرنے کے بعد مزنا شم بھی مسرت اور قمر احسان صاحب کے ساتھ ان

کے گھر آگئیں شہباز بھی زوبی کے ساتھ ادھر ہی آگیا تھا..... وہ دونوں تو تھوڑی دیر ان کے ساتھ بیٹھ کر باہر نکل

گئے تھے..... مزنا شم البتہ مسرت کے پاس کافی دیر بیٹھی رہی تھیں..... اور باتوں ہی باتوں میں زوبی کے رشتے کی

بات نکل آئی تھی.....

”میں زوبی سے بات کروں گی“ زوبی کی می نے کہا تھا.....

”ہائے مسرت تم نے ابھی تک اس سلسلے میں کوئی قدم ہی نہیں اٹھایا..... مزنا شم بولیں

”ہیفم کا ہاؤس جا ب ختم ہونے کو ہے..... اور وہ پوکے جانے کی تیاری بھی کر چکا ہے..... میں چاہتی ہوں کہ جانے

”میری اول و آخر پسند شہباز ہے..... صرف شہباز.....“

ممی کی باتوں سے پور ہونے لگی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی.....

”زوبی..... سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو..... تمہارے لئے کئی پروپوزل ہیں..... ضیغم کے علاوہ

وجاہت بھی ہے..... ثار اور سلمان بھی ہیں.....“

”ممی کوئی بھی نہیں ہے..... ہے تو صرف شہباز ہے بس.....“ اس نے مسکرا کر ممی کے گال پر

پیار کیا اور مزید باتیں سننے کی بجائے ممی کو ہاتھ ہلاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی.....

☆☆☆

ہال میں سرخ اندھیرا پھیلا تھا..... ہلکا ہلکا میوزک فضا کو مترنم کئے ہوئے تھا..... لوگ میزوں کے گرد بیٹھے کھانے پینے میں مشغول تھے..... کھانوں کی منک لذت اشتہا بن رہی تھی.....

زوبی اور شہباز ایک کونے والی میز پر بیٹھے تھے..... سوپ کے پیالے ان کے سامنے پڑے تھے..... وہ ہولے ہولے سوپ پی رہے تھے..... چائیز ریٹورنٹ میں وہ پہلے بھی کئی بار آچکے تھے..... ہاٹ اینڈ سار سوپ دونوں ہی کو پسند تھا..... باقی کھانا بھی دونوں نے اپنی اپنی پسند کا منگوا یا تھا اب تو شہباز بھی چائیز کھانے پسند کرنے لگا تھا..... دونوں باتیں بھی کر رہے تھے.....

زوبی نے شہباز کو ممی سے ہونے والی ساری باتیں بتادی تھیں..... اس وقت بھی وہ یہی باتیں کر رہے تھے.....

”بات میں نے شروع کر دی ہے..... اب تم بڑھاؤ گے آگے“ زوبی نے پیالے میں جھجھلاتے ہوئے کہا.....

”ممی کا رد عمل کیا تھا.....“

”بتایا نا..... کہ.....“

”میں پشیمان ہوں اس لئے“

”ان کا خیال ہے میرا نہیں.....“

”تو وہ راضی ہو جائیں گی“

”تم راضی کر لو انہیں.....“

”کیسے بات کروں گا.....“

زوبی ہنس پڑی.....

دکان کے سیڑھوں پر تیرتے پھر رہے تھے۔ اور چاند ستاروں سے آنکھ پھولی کھیل رہے تھے۔ دور کیس بارش ہوئی تھی۔ جس نے ہواؤں کو بھگودیا تھا۔

”اب؟“ شہباز نے گاڑی چلاتے ہوئے زوبی سے پوچھا۔ جو کھڑکی میں کبھی نکائے ہاتھ پھیلانے نم آلود ہواؤں کو محسوس کر رہی تھی۔

”ہوں“ اس نے ویسے ہی ہاتھ پھیلائے پھیلائے کہا۔

”کدھر چلیں“ وہ بولا۔

زوبی نے ہاتھ اندر کر کے شہباز سے کہا ”گھر“

شہباز شوخی سے بولا۔ ”میرے؟“

”اوہ نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی ”میرے گھر۔“

وہ مسکرا کر بولا ”اچھا اچھا یعنی تمہارے ڈیڈی کے گھر۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔“

”لڑکی کا اپنا تو کوئی گھر ہوتا نہیں۔ پہلے وہ ڈیڈی می کے گھر میں رہتی ہے۔ پھر شوہر کے گھر میں آجاتی ہے۔“

”بڑے سیدھے لگتے ہو۔ لیکن ہو بڑے چالاک۔ یوں کیوں نہیں کہتے کہ لڑکی کے ایک نہیں دو گھر ہوتے ہیں۔“

وہ ہنس پڑا۔

زوبی اسے گھورتے ہوئے مسکرا دی۔

شہباز نے زوبی کو اس کے گھر ڈراپ کیا۔

”تھوڑی دیر کے لئے آ جاؤ۔“ زوبی نے کہا۔

”نہیں اب چلوں۔“ شہباز بولا۔

”کل آؤ گے۔“

”سر کے بل آؤں گا جناب۔“

”کل می سے بات کر لینا۔“

”اچھا۔ کل رشتہ لے کر آؤں گا۔ شہباز خان کا باپ بن کر آؤں گا۔ خان نواز

خان۔“

وہ ہنس کر بولا۔ تو زوبی بھی ہنس دی۔

پھر

ادائے ناز سے بولی ”جیسے میں نے کی ہے۔“

”ڈیڈی۔“

”ڈیڈی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ جانتے تو ہو می ہی کا ہولڈ ہے۔ اس لئے تم

می سے بات کرو گے سمجھ۔“

”سمجھ گیا۔“

”شہباز تم آج کل میں می کو پروپوزل دے دو۔ ورنہ ڈر ہے ہمارے یوں گھونٹنے پھرنے پر وہ

کوئی پابندی لگا دیں۔“

”پابندی۔“

”ہاں۔ میں نے جو اپنا دو ٹوک فیصلہ انہیں سنا دیا ہے۔ اس سے وہ کچھ خوش نہیں ہیں۔“

کل ڈیڈی سے بھی میری جسارت کی کہانی کہہ رہی تھیں۔“

”پھر؟ انہوں نے کیا کہا۔“

”اے کچھ نہیں۔ ڈیڈی کو تم جانتے ہی ہو۔ می کی کسی بات میں دخل نہیں دے سکتے۔“

ویسے ڈیڈی کی باتوں سے لگتا تھا۔ کہ انہیں کوئی اعتراض نہیں۔ انہیں میرے فیصلے پر اعتماد ہے۔“

”بہت اچھا۔ اب تو میں می سے بات کر لوں گا۔ ہمارا پلڑہ بھاری ہے۔“

”می اکیلی ہی سب کے لئے کافی ہیں شہباز ایسا نہ ہو وہ ضد میں آجائیں۔“

”وہ ضد میں آئیں تو ہم کونسا کم ہیں۔ ہم بھی ضد میں آجائیں گے۔ تم تو میرا ساتھ دو گی

نا۔“

”دو گی۔ لیکن بد مزگی پیدا کرنے سے کیا فائدہ۔ بات خوش اسلوبی سے طے ہو جائے تو

اچھائی ہے۔“

”یہ تو ہے۔“

باتوں کے دوران انہوں نے کھانا کھایا۔

کھانے کے بعد بھی کچھ دیر بیٹھے رہے۔

پھر

بل ادا کر کے باہر نکل آئے۔

آج موسم نسبتاً خوشگوار تھا۔ رات بیگی بیگی تھی۔ آسمان کے کنارے ابر آلود تھے۔ اکا

خدا حافظ کے تباد لے کے بعد شہباز گاڑی نکال لے گیا اور زوبی گنگنائی مسکراتی اندر چلی گئی مئی لاؤنج ہی میں بیٹھی تھیں..... ٹی وی پر کوئی انگریزی فلم لگی تھی..... وہ دیکھ رہی تھیں..... وہ صوفے پر نیم دراز تھیں.....

زوبی نے سلام کر کے اپنے کمرے میں جانا چاہا..... تو انہوں نے اسے اپنے پاس بلالیا.....
”ادھر بیٹھو“ مئی نے کہا.....

”ڈیڈی کہاں ہیں.....“ زوبی ان کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے پاؤں سے چپل اتارتے ہوئے بولی.....

”شہباز چلا گیا“ مئی نے جواب دینے کی بجائے اس سے سوال کیا.....

”جی وراپ کر کے چلا گیا ہے.....“

”ہوں.....“ مئی نے نگاہیں ٹی وی کی طرف پھیرتے ہوئے کہا.....

زوبی چند لمحوں صوفے کی پشت پر گردن ڈالے پڑی رہی..... پھر اٹھتے ہوئے بولی ”مئی میں جاؤں تو اس کا کام کرنا ہے کالج کا.....“

”بیٹھو..... میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں..... کہ تم نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی.....“

”اوہ مئی“ زوبی دھپ سے بیٹھتے ہوئے بولی ”میں نے کل بھی کہا تھا پر سوں بھی..... کہ یہ میرا

آخری فیصلہ ہے..... آخر شہباز میں کی کیا ہے..... جو آپ اسے قبول نہیں کر رہیں.....“

”یہ بات نہیں زوبی“ مئی گردن گھما کر اسے دیکھتے ہوئے بولیں.....

”تو پھر.....“

”شادی بیاہ کھیل نہیں ہوتا.....“

”میں اتنا تو شاید سمجھتی ہوں.....“

”تم اتنا نہیں سمجھتیں..... تمہیں گائیڈ کرنا ہمارا فرض ہے..... شہباز بہت اچھا لڑکا ہے.....

لیکن.....“

”وہ پٹھان ہے..... اس کا رہن سن طور طریق ہم سے مختلف ہے.....“

مئی اس کی بات پر مسکراتے ہوئے بولیں..... ”ہاں بے شک..... اور ایک پہلو یہ بھی ہے.....

کہ ہم صرف اسے اس کی ذات تک جانتے ہیں اس کے خاندان والوں سے ملے تک نہیں.....“

”تو مل لیں نا.....“

”یہی بات میں کرنا چاہتی ہوں..... شہباز بھی اگر تم سے شادی کا خواہشمند ہے..... تو رشتہ لے

کر اس کے ماں باپ کو ہمارے پاس آنا چاہئے.....“

زوبی اٹھتے ہوئے بولی ”کل شہباز آپ کے پاس پروپوزل لے کر آئے گا.....“

”شہباز؟“

”ہاں مئی.....“

”اس کے ماں باپ کو آنا چاہئے.....؟“

”یہ باتیں آپ اسی سے کیجئے گا“ زوبی پاؤں میں چپل ڈالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی..... مئی نے پھر توجہ ڈی وی کی طرف مبذول کر دی..... لیکن ان کا ذہن ادھر متوجہ نہیں تھا.....

اگلی شام شہباز جھپکتے جھپکتے لیکن بڑی سعادت مندی سے مئی کے پہلو میں ان کے کمرے میں بیٹھان کا بیٹا بننے کی استدعا کر رہا تھا.....

یہ خوب رو بادقار اور گرائیڈل نوجوان مئی کو ناپسند تو نہیں تھا..... لیکن پھر بھی وہ مصر تھی..... کہ شہباز رشتہ لینے کے لئے اپنے والدین کو ساتھ لے کر آئے.....

”وہ نہیں آئیں گے مئی..... بالآخر شہباز کہہ اٹھا.....“

”کیوں؟“ مئی کو دھچکا سا لگا.....

”ہمارے ہاں خاندان سے باہر شادی نہیں ہوتی.....“ وہ جسارت اور صاف گوئی سے بولا.....

”تو..... تو..... تم.....“

”میں اپنے خاندان سے باہر ہو کر آپ کے پاس آیا ہوں“

”لیکن شہباز بیٹے.....“ مئی نے کچھ کہنا چاہا..... تو وہ بڑے جذباتی لہجے میں بولا ”مئی..... پلیز

آپ میرے والدین کو درمیان میں نہ لائیں.....“

”لیکن.....“

”لیکن ویکن کچھ نہیں..... میں خود یہ سارا کام سرانجام دے دوں گا مئی..... آپ میرے

حالات کو نہیں سمجھ سکتیں.....“

”اس نے فرط جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے گھر والوں زری اور شہنو کے بدلے کے

رشتوں سب کے متعلق مئی کو تادیب.....

مئی تو مگن سی رہ گئیں.....

”تمہاری اتنی گھمبیرا بلعز ہیں شہباز“

”وہ سب مجھ پر چھوڑ دیں.....“

می نے نفی میں سر ہلایا..... تو اس نے بے اختیار ہو کر می کے ہاتھ پکڑ لئے..... ”می..... پلیز می آپ جانتی ہیں میں اور زوبی ایک دوسرے کو کس حد تک پسند کرتے ہیں..... ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر جی نہیں سکتے می..... آپ..... آپ میرے پروپوزل کو رد نہ کیجئے..... میرے والدین کبھی یہ بات نہیں مان سکتے“

”تو پھر ہم کیسے مان لیں شہباز..... زوبی ہماری اکلوتی بیٹی ہے..... اس کے مستقبل کا ہم نے سوچنا ہے“

”می..... آپ بالکل بے فکر رہئے..... میں آپ کو یقین دلاتا ہوں می..... کہ زوبی کو میں ہمیشہ خوش رکھوں گا..... اسے کبھی بھی کوئی تکلیف نہیں ہوگی..... میرے پاس پیسے کی کمی نہیں..... میرا ذاتی بینک بیلنس اور جائیداد اتنی ہے کہ.....“

”روپے پیسے کی بات نہیں شہباز بیٹے..... وہ تو ہمارے پاس بھی زوبی کے لئے اتنا ہے کہ وہ عمر بھر بیٹھ کر کھا سکتی ہے..... سوال تو یہ ہے کہ تمہارے گھر والے اس شادی پر آمادہ نہیں ہو سکتے.....“

”نہ ہوں..... میں اپنی ذمہ داری پر شادی کروں گا.....“

”ماں باپ اور خاندان والوں سے بغاوت کر کے.....“

”می یہ بغاوت شادی تک ہی ہوگی..... میرے والدین شادی ہو جانے پر کچھ نہیں کر سکیں گے.....“

”وہ زوبی کو قبول نہیں کریں گے.....“

”نہ بھی کریں تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا..... میں ان سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر لوں گا.....“

”یہ سب باتیں تم نے زوبی کو بتائی ہیں.....“

”ہاں می“ زوبی جو کافی دیر سے می کے پشت پر کھلنے والے دروازے میں کھڑی تھی

آگے بڑھتے ہوئے صوفے کی پشت پر آکر بولی ”شہباز نے اپنی ساری پراہل مز مجھے بتادی ہیں..... اور میں اس کی یہ پراہل مز شیر کر دوں گی می.....“

می چپ ہو گئیں.....

شہباز منت سماجت کرتا رہا..... اپنا یقین دلاتا رہا..... ان کا اعتماد جیتنے کی کوشش کرتا رہا.....

”اچھا.....“ بالآخر بولیں ”مجھے چند دن کی سہلت دو..... میں پوری کوشش سے سوچنا چاہتا ہوں“

”جتنا مرضی ہے وقت لے لیں..... لیکن می آپ کو فیصلہ ہمارے حق میں کرنا ہو گا.....“

شہباز نے کہا.....

پھر

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ آیا.....

وہ زوبی کی محبت میں اندھا بہرہ ہو چکا تھا..... اسے زوبی کے بغیر کسی اور کا خیال تھا نہ احساس..... اتنی تلخ اور خوفناک حقیقتوں کو وہ اسی لئے تو نظر انداز کر رہا تھا.....

زوبی کے می ڈیڈی بڑی سنجیدگی سے اس مسئلے کو حل کرنے کا سوچ رہے تھے..... انہیں تو صرف شہباز کے پٹھان ہونے کی وجہ سے تہذیبی تضاد پر ہی اعتراض تھا اب تو اس کی بچپن کی منگنی اور بدلے کی شادی کا انکشاف ہوا تو وہ بہت ہی پریشان ہو گئے.....

زوبی اپنے فیصلے سے سرموادرادہ نہیں ہو رہی تھی..... بیٹی کو انہوں نے جس انداز سے پالا پوسا تھا اور اس کی جس طور ذہنی تربیت کی تھی..... اس پر اب اپنا فیصلہ مسلط بھی نہ کر سکتے تھے..... اسی لئے صرف سمجھانے پر ہی اکتفا کر رہے تھے.....

”زوبی..... انجام دعو اقب سے بے خبر ہو کر کئے گئے فیصلوں پر پچھتا پڑتا ہے..... تم ابھی نا کچھ ہو جذبات کی رو میں بہہ رہی ہو..... یہ شادی تمہارے سامنے مسائل کے پہاڑ کھڑے کر دے گی“ اس دن می نے بڑے دھیمے انداز میں زوبی سے کہا.....

”می آپ فکر کیوں کرتی ہیں..... مسائل حل کرنے ہی کے لئے ہوتے ہیں..... شہباز انہیں حل کر لے گا..... شادی کے بعد اس کے والدین کچھ نہیں کر سکیں گے..... انہیں شادی کو تسلیم کرنا پڑے گا.....“ زوبی نے ماں کو سمجھانے کی کوشش کی.....

”تسلیم تو جب کریں گے نا جو وہ تجھے قبول کریں گے“ می فکر انگیز لہجے میں بولیں.....

”کیوں می کیا میں اتنی بری ہوں..... کہ وہ لوگ مجھے قبول کرنے سے گریز کریں گے؟“

”اوه یہ بات نہیں زوبی..... وہ لوگ ان خطوط پر نہیں سوچتے..... وہ تو..... دشمنیاں خریدنے کے عادی ہوتے ہیں..... شہباز کے اس اقدام کو وہ کبھی نہیں بخشیں گے..... خصوصاً اس لئے بھی کہ اس کی اپنی بچاؤ سے بچپن کی نسبت ٹھہری ہوئی ہے..... اور بدلے کا رشتہ بھی طے ہے.....“

”ہوا کرے“

”اس طرح کہنے سے بات نہیں بنتی..... وہ لوگ جس کو دشمن مان لیں اسے پھر کبھی معاف نہیں کرتے.....“

”مجھے شہباز نے بتایا ہے“

”پھر بھی تو.....“

”ہاں ماما..... اس نے یہ بھی بتایا ہے..... کہ پٹھان لوگ جس سے دوستی کر لیں اسے بھی

نبھاہنے کے لئے جان تک دے دیتے ہیں..... عمدوفا کا پاس جتنا وہ لوگ کرتے ہیں کوئی نہیں کرتا.....“

”لیکن وہ لوگ دوستی نہیں دشمنی کے حوالے سے پیش آئیں گے“

”ان لوگوں کو صفر سے ضرب دے دو ماما..... میرا تعلق تو شہباز سے ہے اور شہباز دوستی

کے ناٹے کو نبھاہنا جانتا ہے..... اس کی رگوں میں بھی تو انہیں لوگوں کا خون ہے..... جو دوستی اور دشمنی دونوں

حوالوں سے انتہا پسند ہوتے ہیں..... آپ کو شہباز پر اعتماد نہیں ہوگا..... لیکن مجھے پورا پورا ہے.....“

زوبی نے دلائل دینا شروع کر دیئے.....

ممی کو چپ ہونا پڑا.....

چپ تو اس نے اس دن ڈیڈی کو بھی کرادیا..... وہ بھی ممی کی طرح فکر مند تھے..... گو شہباز

انہیں ہر طرح سے پسند تھا..... لیکن یہ جو بدلے کے رشتے اور بچپن کی مٹگنی کا قصہ تھا اس نے انہیں بے طرح

پریشان کر دیا تھا.....

انہوں نے زوبی کو بہت سمجھایا.....

پٹھانوں کی دشمنیوں اور انتقام کے سنے سنائے کئی واقعات اسے سنائے

لیکن

وہ بھی تو

شہباز کی طرح محبت کے طوفانی دور سے گزر رہی تھی.....

بڑی ثابت قدمی سے اپنی بات پر قائم تھی.....

ڈیڈی نے ڈرا یا..... سمجھایا اور غیر محسوس طریق سے دھمکا یا بھی

لیکن

وہ

نہیں مانی

”تمہیں اس فیصلے کی ہماری قیمت چکانا پڑے گی زوبی..... وہ لوگ تمہیں کبھی قبول نہیں

کریں گے“

”مجھے جس نے قبول کرنا ہے وہ کر رہا ہے ڈیڈی مجھے اور کسی کی پرواہ ہے نہ ضرورت.....“

میں نے اپنا فیصلہ پہلے دن ہی ممی کو سنا دیا تھا..... میرا فیصلہ وہی ہے اور ڈیڈی..... اگر آپ لوگوں نے میرا ساتھ نہ

دیا تو میں مجبور ہو جاؤں گی کہ اپنے فیصلے پر خود عمل درآمد کر لوں.....“

ڈیڈی چپ کے چپ رہ گئے تھے..... زوبی رندھی ہوئی آواز میں بات کر کے کمرے میں جا چکی

تھی..... ڈیڈی کمرے میں جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہ گئے تھے.....

☆☆☆

”تم نے کیس کا چھوڑا ہی نہیں.....“

”چلو ہٹو..... کوئی کام کی بات کرو.....“

”کام کی بات تو ویسی ہے جس کے لئے آیا ہوں“

”شاپنگ کے لئے چلنا ہے“

”ہاں“

”مئی آلیس.....“

”چیزیں تم نے اپنی پسند کی خریدنی ہیں.....“

”میں بھی ساتھ چلوں گی..... لیکن مئی آلیس..... وہی بتائیں گی تاکہ کیا کچھ خریدوں.....“

”ساری شاپنگ ایک دن ہی میں تھوڑی ہو جائے گی.....“

”بہت زیادہ خریداری نہیں کرنی.....“

”کیوں؟“

”مئی بھی تو سب کچھ بیاری ہیں.....“

”وہ ان کا مسئلہ ہے..... میں نے بھی تو کچھ بنانا ہے.....“

”دیکھو شہباز..... ہماری شادی تمہاری وجہ سے انتہائی سادگی سے ہو رہی ہے.....“

”کیوں؟ سادگی اپنی جگہ..... لیکن میں کوئی بھوکا نہ تو نہیں..... تمہارے لئے دنیا کی ہر چیز خرید

سکتا ہوں“

”تم بڑے جذباتی ہو جاتے ہو شہباز..... میں نے یہ کب کہا کہ تم کچھ خرید نہیں

سکتے.....“

”تو پھر.....“

”پھر یہ کہ چونکہ شادی جلدی میں ہو رہی ہے دوسرا کسی کو کچھ دکھانا بھی نہیں..... اس

لئے..... جتنا پیسہ کم خرچ ہو سکے، کرنا چاہئے.....“

”میں نے سب پلان کر لیا ہے..... تمہاری پند و نصیحت کی ضرورت نہیں سمجھیں.....“

”سمجھ گئی.....“

زوبی ڈر گئی مبادا شہباز خانہ ہو جائے یوں بھی ان دنوں وہ خاصہ ٹچی ہو رہا تھا..... ماں باپ کے

بغیر وہ بہت بڑا قدم اٹھا رہا تھا..... لیکن کبھی کبھی اندر سے بے طرح اداس ہو جاتا تھا..... زوبی یہ

بات اچھی طرح محسوس کر رہی تھی.....

”امتحان دے رہے ہوتا“

”زندگی کا سب سے بڑا امتحان دے رہا ہوں“

”میرا مطلب شادی سے نہیں.....“

”تو اور.....“

”تمہارے فائنل ایگزیمز سے ہے شروع ہونے والے ہیں.....“

”دو مہینے بعد“

”دے رہے ہوتا.....“

”تیاری بالکل نہیں.....“

”تو پھر.....“

”پھر یہ کہ پہلے شادی کی بات کرو.....“

”وہ تو ہو چکی..... اب امتحانوں کے بعد..... ہی ہوگی“

”اوہ خدا یا..... کیا ضروری ہیں امتحان.....“

”کیوں چار سال کی محنت ضائع کر دے“

”میں بیک وقت دو دو محاذوں پر نہیں لڑ سکتا.....“

”ایک محاذ تو سر کر لیا..... اب کیا ہے؟“

”پوری طرح سر کر لوں تو یقین آئے گا..... امتحانوں کا کیا ہے دوسری ٹرم میں بھی دیئے

جاسکتے ہیں“

”ہائے شہباز.....“

شادی کے لئے زوبی کے می ڈی ریضامند ہو ہی گئے تھے۔ اس لئے کہ زوبی اور شہباز ان کے بغیر بھی اس بندھن میں بندھنے کے لئے آمادہ تھے۔ شہباز والدین کے بغیر شادی کر سکتا تھا۔ تو زوبی جیسی آزاد ماحول کی پروردہ لڑکی اپنی من مانی کر سکتی تھی۔

می ڈی نے تو عمر سے بھی اس سلسلہ میں مشورہ لیا تھا۔ فون پر ساری کتھا کہانی اسے سنائی تھی۔ وہ شہباز کا دوست تھا۔ اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اور جب یہ زوبی کی بھی خواہش تھی۔ تو ماں باپ کو مسئلہ نہیں بنانا چاہئے تھا۔ اس نے بھی زوبی کی حمایت کی تھی اور ماں باپ کو یہی رائے دی تھی۔ کہ پیشتر اس کے زوبی خود سری پر اتر آئے۔ شادی کر دی جائے۔

شادی کے بعد کیا ہو گا؟

یہ تو کسی شادی کے متعلق بھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ شادی اک مقدس بندھن ہے۔ لیکن اس مقدس بندھن کو کئی دفعہ اس طرح پامال ہوتے بھی دیکھا جاتا ہے۔ کہ انسان تڑپ اٹھتا ہے ضروری نہیں کہ محبت کی شادیوں کا یہ انجام ہو۔ بعض اوقات تو بڑی دیکھ رکھ کے بعد کئے ہوئے رشتے بھی بھینک انجام سے دو چار ہو جاتے ہیں۔ والدین کی رضا سے کی ہوئی شادیاں بھی ناکام ہو جاتی ہیں۔

بات ٹھیک سی تھی

اس لئے می ڈی نے رضامندی ظاہر کر دی تھی۔

شہباز جلدی چاہتا تھا۔ اسے پتہ تھا امتحان ہوتے ہی آغا بی بی شادی کے لئے جلدی چا دیں گی۔ تب جس سے ہر طور نپٹنا ہو گا۔ استخوانوں سے پہلے زوبی کے ساتھ ازدواجی بندھن میں بندھ کر وہ سیشنل ہو جانا چاہتا تھا۔ تاکہ جو بھی ہنگامہ کھڑا ہو اسے اطمینان سے فرو کیا جاسکے۔

اس شادی کو اس نے اس ہنگامے تک مخفی رکھنا تھا۔

اس سلسلے میں بھی اس نے کئی اقدام کرنا تھے۔

شادی سادگی سے کرنے کے لئے اسی لئے اس نے می سے کہا تھا۔

مستان خان گھر کا آدمی تھا۔ اس کے لاہور میں ہوتے ہوئے شادی مخفی نہ رکھی جاسکتی

تھی۔ اسے کسی طرح پشاور واپس بھیجنا تھا۔

یہ موقع بھی خود بخود پیدا ہو گیا۔

مستان خان کی بیٹی گاؤں میں ہی بیاہی تھی۔ اس کا داماد ٹرک ڈرائیور تھا۔ ایک بار پھر وہ سنگنگ کے مجرموں کے ساتھ پکڑا گیا تھا۔ حالانکہ وہ صرف ڈرائیور تھا سنگنگ سے اس کا کوئی واسطہ نہیں تھا

لیکن وہ پکڑا گیا تھا۔

مستان خان اطلاع ملتے ہی پشاور جانے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔

”خان میں جلدی واپس آ جاؤں گا۔“ اس نے شہباز کے چھٹی دے دینے کے بعد شکریہ

ادا کرتے ہوئے کہا۔

”تم دو چار ماہ وہاں رہ سکتے ہو۔ تمہارا بیٹا بھی تو کسی لیسے جی چکر میں پڑا ہے۔ اس کے پاس رہ

کر اس کی نگرانی کرو۔“

”لیکن خان۔۔۔۔۔ یہاں۔۔۔۔۔“

”یہاں کوئی خاص ضرورت نہیں تمہاری۔۔۔۔۔ ویسے بھی میں دو تین مہینے یہاں نہیں ہوں

گا۔۔۔۔۔“

”کہاں جائیں گے خان۔۔۔۔۔ پشاور۔۔۔۔۔“

”اوہ نہیں مستان خان۔۔۔۔۔ میرے پریکٹیکل ہیں۔ مختلف فیکٹریوں میں جا جا کر علم حاصل کرنا

ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں کبھی کبھی جانا پڑے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ تمہارے بغیر کام ٹھیک ٹھاک

چلے گا۔“

”لیکن بڑے خان۔۔۔۔۔“

”بابا جاپان جا رہے ہیں۔ اس لئے تم ان کی طرف سے بھی بے فکر ہو جاؤ۔ وہ دس بارہ ہفتے

بعد آئیں گے۔ تب تک تمہیں کوئی نہیں پوچھے گا۔ تم اپنے گھریلو معاملات سدھار د جا کر۔۔۔۔۔“

”خدا آپ کو زندگی دے خان۔۔۔۔۔“

”مستان خان نے ہزاروں دعائیں دے ڈالیں۔ وہ اپنے ماحول سے کٹ کر یہاں مجبوراً رہ

رہا تھا۔ یوں چھٹی ملی تو بے حد خوش ہوا۔

یوں شہباز نے ایک بڑی رکاوٹ دور کر لی۔

جس دن مستان پشاور روانہ ہوا تھا اس دن اس نے زوبی کو فون پر مبارک باد کہی تھی۔

”مستان کو میں نے بک کر دیا۔“ وہ خوشی سے بولا تھا۔

”کہاں؟“

”پشاور“

”وہ کیسے چلا گیا اپنے خان کو چھوڑ کر۔۔۔۔۔“

”محافظ کے بغیر رہنے کی عادت ڈالوں گا اب۔۔۔۔۔“

تمت...

”زوبی..... تم نہیں جانتیں مجھے کتنا افسوس ہے“

”اس کا کہ میں تمہارے لئے اتنی معمولی چیزیں خرید سکا.....

”اور نہیں تو کیا..... مئی اور تم نے کچھ لینے ہی نہ دیا.....“

”یہ تو کچھ بھی نہیں زوہبی..... کاش یہ شادی میرے ماں باپ کرتے.....“

”تمہیں سر سے پیر تک سونے میں پیلا کر دیتے..... ہیرے موتیوں سے لاد دیتے.....“ شہباز

سوچوں میں ڈوبتے ہوئے بولا..... ” سچی زوہبی اس شادی کا لطف ہی کچھ اور ہوتا..... کئی دن گھر میں ہنگامہ ہوتا.....

حجرے میں عید کا سماں ہوتا..... رات گئے تک نوجوان لوہے اور پٹے کا تے..... طوافیں ناچتی..... گانا بجانا

ہوتا..... پورے گاؤں کی ضیافت ہوتی..... نوجوان خٹک ناچ کرتے اور بارات کے ساتھ آنے والے لوگ خوشی

میں اتنی فائزنگ کرتے اتنی فائزنگ کرتے تمہارے ارد گرد رہنے والے لوگ بھی ہر اسماں ہو جاتے.....“

زوبی شہباز کے اندر اتری اداسی کو محسوس کر رہی تھی..... وہ تصور کی آنکھ سے اپنے ہاں کی

شادی کا نظارہ کرتے ہوئے خاصہ جذباتی اور مغلوب ہو رہا تھا.....

سجید کی کولم لڑنے کے لئے زوبی جان بوجھ کر زور سے ہس پڑی.....

سہا جوصوئے کی پست پر اردن نکائے تصور میں م بیٹھا تھا..... چونکہ لرزوبی کی طرف دیکھنے

.....

زوبی ہنسے جارہی تھی.....

”کیوں؟“

”ہائے تم نے تو میرا دل دہلا دیا..... اتنی فائزنگ کرتے ہو تم لوگ اچھا ہی ہوا..... جو

تمہارے گھروالوں نے شادی میں شرکت نہیں کرنی..... ورنہ میرا توفان رنگ سے دم ہی نکل جاتا.....“

”بزدل کہیں کی.....“ شہباز نے مسکرا کر اسے دیکھا.....

اسی سلسلے میں زدبلی کے پاس آیا تھا..... اسے ساتھ لے کر شاہنگ کے لئے جانا تھا.....

زوبی نے بھی معقول بات کی تھی..... مئی کو ساتھ لے جانا ٹھیک تھا..... کیونکہ اسے خود تو اس قسم

کی شاپنگ کا کوئی تجربہ ہی نہیں تھا.....

می آئیں تو چائے پینے کے بعد تینوں شاپنگ کے لئے چلے گئے.....

تھوڑی سی جیولری اور چند قیمتی ملبوسات خریدے گئے..... ممی نے شہباز کو زیادہ چیزیں خریدنے

ہی نہ دیں..... بڑے پیار سے سمجھایا ”یوں پیسے ضائع نہ کرو بیٹے..... زوہبی کے لئے میں نے بہت کچھ خریدا ہوا

ہے..... تم یہ پیسے سنبھال کر رکھو..... شادی کے بعد امریکہ کا چکر لگاتا..... ویسے بھی عمر نے ہمیں پرزور دعوت

”دے رکھی ہے.....“

زوبی نے بھی ممی کی ہاں میں ہاں ملائی..... "ہاں شہباز یہ بات ٹھیک ہے..... جتنی شاپنگ مجھے

یہاں سے کروانی ہے..... وہ امریکہ سے کروادیتا.....“

”ٹھیکے“

"وعدہ"

"BAC"

”ہم روگرام بنالیں گے..... عمر بہت خوش ہوگا.....“

" " "

”جنتی جزہ فخریہ میں اتنی ہی ہے۔“

”تمہاری مرضی، جیسا کہ فکر نہ کرو اور خدا تاجاہر تو خدایا! امیرکے سے بھی شاہک

کے لئے یہ ایک نیا فن ہے۔

..... کروادوں 6..... سر میں

وہ سب پیڑیں گے کروا دیں گے..... راہ کے میں سواری دیر

”جی میں تو برداشت نہ کر پاتی.....“ وہ دانستہ ہنسنے لگی۔

دونوں وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے..... می نے ان کے لئے خوش ذائقہ مشروب اور پھل بھجوا دیئے زوبی یہ چیزیں شہباز کو پیش کرنے لگی۔

ادھر ادھر کی باتوں کے بعد شہباز پھر شاپنگ کی باتیں کرنے لگا..... اس نے ڈائمنڈ کی منی سی انگوٹھی زوبی کو کل ہی پہنائی تھی..... یہ انگیجمنٹ کی نشانی کے طور پر تھی۔

زوبی اس انگوٹھی کو اپنی انگلی میں یونہی گھمائے جا رہی تھی۔

شہباز انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے بولا..... ”ہمارے ہاں عورتیں بھاری بھاری زیور پہنتی ہیں..... اس انگوٹھی کو تو کوئی کچھ سمجھے گا ہی نہیں..... آغا بی بی نے ڈھیر سارے زیور میری دلمن کے لئے رکھے ہوئے ہیں لیکن افسوس کہ میری دلمن کی رسائی ان تک نہیں ہو رہی..... وہ تو.....“

”شہباز.....“ زوبی نے اسے ٹوک دیا..... ”تم کیوں دل گرفتہ ہو رہے ہو..... یقین مانو مجھے زیور کی تمنا ہے نہ کسی اور چیز کی..... مجھے تم مل گئے ہو..... تو دنیا کی ہر چیز مل گئی ہے..... ساری دنیا کی دولت کوئی لا کر ایک طرف ڈھیر کر دے اور کوئی دوسری طرف تمہیں کھڑا کر کے مجھے پوچھے کہ میں کیا لینا چاہوں گی..... تو شہباز یقین مانو میں تمہارے سوا کچھ نہیں چاہوں گی..... ایک نظر بھی دولت کے اس ڈھیر پر نہیں ڈالوں گی..... تم ہی تو میری متاع ہو..... میری زندگی میری خوشی..... میرا بھرم.....“

وہ بے حد جذباتی ہو گئی۔

”ج زوبی.....“ شہباز نے اس کا نرم دماغ ہاتھ پکڑ لیا۔

”یقین مانو شہباز.....“ اس نے ہاتھ اس کے ہاتھ ہی میں رہنے دیا۔

”میرا انتخاب واقعی لا جواب ہے“ شہباز نے مسرور انداز اور تقاضے سے بھری نگاہ زوبی پر

ڈالی۔

زوبی سرشاری سی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

لو میرج اس طبقے میں کوئی معیوب بات نہیں تھی..... پھر بھی زوبی کے می ڈیڑی آسودگی محسوس نہیں کر رہے تھے..... شادی میں بہت کم لوگوں کو مدعو کیا تھا..... شہباز کے ساتھ بھی چند دوستوں کے سوا کوئی نہیں آیا تھا..... دوست بھی اتنی قریبی نہ تھے..... عثمان تو ویسے ہی ان دنوں حیدر آباد گیا ہوا تھا..... وہ یہاں ہوتا بھی تو شہباز اسے نہیں بلاتا..... یہ محبت کا سارا پکڑ اور شادی کا قصہ اس نے عثمان کو تھوڑا ہی بتایا تھا..... انجم اور ندیم تک کو اس کی ہوا لگنے نہ دی تھی..... اسی لئے ان قریبی دوستوں کو نہیں بلایا تھا..... علیک سلیک والے ہی دو چار نوجوان مدعو کئے تھے قمر احسان اور مسرت احسان اپنے طبقے کے روح رواں تھے..... کلب کے شمار ساتھی تھے..... حلقہ احباب بڑا وسیع تھا..... اتنی محدود گید رنگ پر آنے والے مہمان بھی حیران تھے..... بے تکلف دوست پوچھ بھی رہے تھے..... بار بار وضاحت کرتا مسرت احسان کی مزاحیہ پر گراں بھی گزر رہا تھا۔

شادی ہلشن میں تھی..... سچے سچائے سٹیج پر زوبی دلمن بنی بیٹھی تھی..... بیوٹی پارلر سے ج ب بن کر آئی تھی..... قیمتی اور شاندار ویڈیو ڈریس پہنا تھا..... زیورات سے لدی پھندی تھی..... اندرونی خوشیاں چہرے پر دمک رہی تھیں..... جوان چہرے پر صرف مسکراہٹ ہی ج ج جائے تو حسین نظر آنے لگتا ہے..... زوبی کے حسن کی تو آج بھاری اور تھی۔

شہباز اس کے قریب ہی بیٹھا تھا..... وہ مردانہ وجاہت وقار کا پیکر نظر آ رہا تھا..... لوگ اس جوڑے کی تعریف کر رہے تھے..... زوبی کی پسندوا انتخاب کو سراہ رہے تھے۔

کھانے کے بعد مہمان خصوصی رخصت ہونے لگے..... مسٹر و مسز احسان مہمانوں کو خدا حافظ کہنے کے لئے ہال کے دروازے پر کھڑے تھے۔

شہباز ادھر زوبی کو اس کی سیلیاں کا دوست اس کمرے میں لے گئے جو ہوٹل کی طرف سے ان کے لئے

بک تھا.....

تھوڑی دیر سب وہاں بیٹھے..... کچھ ہلا گلاکی..... کچھ چھیڑا..... کچھ ستایا..... زوبی کی سیلیوں نے شہباز سے ٹریٹ کے لئے پیسے لئے..... ماریہ تو پوری پوری سالی بن کر نیک وصول کرنے لگی..... رات بارہ ایک بجے تک یہی ہنگامہ رہا.....

پھر سب چل دیئے..... می ڈیڈی بھی گھر جانے سے پہلے زوبی اور شہباز سے ملنے آئے..... می لاکھ ماڈرن سسی اس موقع پر ان کی آنکھوں میں نمی تیر رہی گئی..... رندھی آواز میں شہباز سے کہا..... ”بیٹے تم نے اپنی ذمہ داری پہ بہت بڑا قدم اٹھایا ہے..... اب ثابت قدم رہنا.....“ شہباز نے ان کی گردن میں بازو ڈال کر انہیں پیار کر لیا اور مسکراتے ہوئے بولا ”می آپ بے فکر رہیں..... آپ کو کبھی شکایت کا موقعہ نہیں ملے گا.....“

”خدا کرے“ انہوں نے ننھے سے رومال سے اپنی آنکھوں کے گوشے پونچھے.....

”سب ٹھیک ہو جائے گا می.....“ زوبی بھی ماں کے کندھے سر لگا کر بولی.....

ڈیڈی نے دونوں کو پیار کیا.....

پھر می ڈیڈی دعائیہ کلمے کہتے ہوئے واپس ہو گئے.....

شہباز نے دروازہ بند کیا..... اور زوبی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے بیڈ تک لے آیا.....

زوبی شرماتے لجاتے تکتے کے سہارے بیٹھ گئی..... اسے واقعی شہباز سے اس وقت حجاب آرہا تھا..... محبوب محبوب نظروں سے وہ شہباز کو دیکھ رہی تھی..... جو اس کی محبوب اداؤں پر فدا ہوا جا رہا تھا..... شہباز اس کے سامنے آ بیٹھا..... نگاہ شوق اس پر ڈالتے ہوئے جیب سے رونمائی کا تحفہ سفید زنجیر کالا کلاٹ نکالا..... جس میں نازک نازک ہیرے چمک رہے تھے.....

لاکٹ اس کے گلے میں ڈالتے ہوئے شہباز نے کہا ”زوبی..... یہ معمولی سا تحفہ نظر کر رہا ہوں آج اگر میری شادی اپنے ہاں ہوتی تو میں اپنا خاندانی ہیرا تمہیں پیش کرتا.....“

”میرے لئے یہی بہت بڑا تحفہ ہے شہباز.....“ زوبی نے لاکٹ کو ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا ”مجھے تم مل گئے ہو..... یہی میرے لئے سب سے بڑا تحفہ ہے.....“

”سچ“ وہ شورق سے شہباز نے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیلے میں بھر لیا.....

”ہاں“ زوبی نے لمحہ بھر کو اس کی آنکھوں میں جھانک کر آنکھیں بند کر لیں اس کے ہونٹ اثباتی انداز میں کانپ رہے تھے شہباز کا سر جھکا اور اس نے زوبی کے کانپتے ہونٹوں پر محبت کی مرہبت کر دی.....

دونوں خوش تھے.....

سرشار تھے.....

خمور تھے.....

سہاگ رات ہوئے ہوئے بیت رہی تھی.....

شہباز اور زوبی اس رات کے لمحے لمحے سے اپنی خوشیوں کا رس کشید رہے تھے.....

تیسرے دن وہ بہنی مون کے لئے چلے گئے.....

جانے سے پہلے زوبی نے شہباز کے گھر کی چابیاں می کو دیتے ہوئے کہا ”می ہمارے آنے تک

ہمارا گھر پوری طرح سیٹنگ کر دینا..... واپس آکر ہم اپنے گھر میں رہیں گے“

می نے مسکراتے ہوئے چابیاں لے لی تھیں.....

وہ پہلے مری گئے..... چند دن مری تھیا گلی کالا باغ اور یو۔ پی کی سیر کی.....

مری کا سیزن ختم ہو رہا تھا زیادہ لوگ میدانوں کی طرف اترائی میں مشغول تھے..... پھر بھی کافی

گہما گہمی تھی.....

مری میں ان کا قیام زیادہ نہیں تھا..... یہاں کئی جانے پہچانے چہرے نظر آتے تھے..... شہباز

ان کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا..... شادی ابھی مخفی رکھنا تھی..... اس لئے ضروری تھا کہ اس جگہ کو خیر آباد کہہ دیا

جائے.....

وہ مری سے پنڈی آئے..... دو دن اسلام آباد میں گزارے.....

پھر

کراچی چلے گئے.....

تنہائی اور یک جائی کا انہوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا..... ایک دوسرے کی محبت میں سرشار تھے

قریبیں مہک رہی تھیں..... انہیں ایک دوسرے کی ذات کے سوا کسی اور کا احساس ہی نہ رہا تھا.....

عام نوجوان نئے شادی شدہ جوڑوں کی طرح رومانوی باتیں ہوتیں..... سامنے مستقبل کے

خواب ہوتے..... عہد وفا کا پاس کرنے کی باتیں ہوتیں..... عمر بھر نبھانے کے یقین دلائے جاتے..... کوئی غم

کوئی فکر پاس نہ پہنکتا..... زندگی اتنی رنگین اور ایسی حسین ہوتی ہے وہ کبھی کبھی تو بے طرح حیران ہو کر ایک دوسرے

سے پوچھتے.....

”شہباز وقت اسی طرح چمکتا دکھتا ہے گانا.....“

”زوبی تمہاری محبت لازوال ہوگی نا.....“

”ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک ہو گئے ہیں۔“
ایسی ایسی باتیں کرتے کرتے کبھی کبھی زوبی ہراساں بھی ہو جاتی

اور

شہباز سوچوں میں گم بھی ہو جاتا۔۔۔۔۔

”شہباز“

”ہوں“

”یہ خواب تو نہیں۔۔۔۔۔ کہ تم ہمیشہ کے لئے میرے ہو گئے ہو۔۔۔۔۔“

”ہے تو حقیقت کہ میں نے تمہیں پایا ہے۔۔۔۔۔“

”شہباز یہ خواب یہ حقیقت۔۔۔۔۔ اگر کبھی ٹوٹ گئے تو۔۔۔۔۔“

”ایسی فال بد منہ سے نہ نکالو۔۔۔۔۔“

”شہباز میرا ہاتھ اسی مضبوطی سے تھامے رہو گے نا۔۔۔۔۔ کبھی چھوڑ تو نہ دو گے“

”کیسی باتیں کرتی ہو میری جان۔۔۔۔۔ شہباز تم سے بچھڑ کر جی نہیں سکتا۔۔۔۔۔“

”تمہارے گھر والے مجھے قبول کر لیں گے“

”زوبی۔۔۔۔۔ میں نے کتنی دفعہ کہا ہے ان حسین لمحوں کو پامال نہ کیا کرو۔۔۔۔۔ میرے گھر والوں

کے متعلق سوچ کر کیوں پریشان کرتی ہو اپنے آپ کو۔۔۔۔۔ تم میری زندگی ہو میری جان ہو کیا میرے الفاظ پر یقین

نہیں آتا۔۔۔۔۔“

”آتا ہے“

”پھر۔۔۔۔۔“

”کبھی کبھی سوچیں بسک جاتی ہیں۔۔۔۔۔“

”سوائے پریشانی کے حاصل کیا ہوتا ہے“

”تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔۔۔۔۔ جب تم میرے ہو تو پھر غم کس بات کا۔۔۔۔۔“

دونوں ایک دوسرے کو تسلی و تسفی دیتے۔۔۔۔۔ ان گنت محبتوں اور چاہتوں کا یقین دلاتے۔۔۔۔۔

لیکن

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ قائم و دائم تھی۔۔۔۔۔ کہ اک انجانا سا خوف ہر وقت اعصاب پر مسلط

رہتا۔۔۔۔۔

یہ خوف زوبی سے بھی زیادہ شہباز کے دل و دماغ پر غیر محسوس سے انداز میں چھایا رہتا۔۔۔۔۔

وہ اکثر زہنی منصوبے بناتے کچھ کھوسا جاتا۔۔۔۔۔

شادی کب تک صیغہ راز میں رکھی جاسکے گی؟

خان بابا کے جاپان سے لوٹنے ہی شادیوں کا چرچا شروع ہو جائے گا۔۔۔۔۔

گو اس نے امتحان اس دفعہ نہ دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔۔۔۔۔ لیکن امتحانوں کے خاتمے کی تاریخ کے

ساتھ ہی اس کو پشاور بلانے کے لئے اصرار شروع ہو جائے گا۔۔۔۔۔

تب اسے کیا کرنا ہو گا؟

وہ کئی منصوبے بنا چکا تھا۔۔۔۔۔

وہ بغاوت تو کر چکا تھا۔۔۔۔۔

لیکن

ابھی براہ راست نکر ہونا باقی تھی۔۔۔۔۔

اس دن بھی وہ کچھ ایسی ہی سوچوں میں گھرا ہوا تھا۔۔۔۔۔ زوبی اس کے پہلو میں تھی۔۔۔۔۔ وہ آنکھیں

بند کئے ہوئے تھی۔۔۔۔۔ اور شہباز اسے سوتا سمجھ کر اپنی سوچوں کے تانے بانے بن رہا تھا۔۔۔۔۔ تھوڑی دیر ہی پہلے

وہ ہال میں کھانا کھا کر اوپر اپنے کمرے میں آئے تھے۔۔۔۔۔

”شہباز“ اچانک ہی زوبی نے اس کے سینے پر بازو پھیلاتے ہوئے اس سے لپٹ کر کہا۔۔۔۔۔

”ہوں۔۔۔۔۔ تو تم سوئی نہیں ہو۔۔۔۔۔“

”کیسے سو سکتی ہوں“

”کیوں؟“

”تم پریشان سے لگ رہے ہو۔۔۔۔۔“

”نہیں تو۔۔۔۔۔“

”جھوٹ مت بولو۔۔۔۔۔ سچ بتاؤ کیا سوچ رہے تھے۔۔۔۔۔“

”میری سوچیں آج کل صرف ایک وجود کے گرد ہی گھومتی ہیں۔۔۔۔۔“

”کس وجود کے گرد۔۔۔۔۔“

”تمہارے۔۔۔۔۔ تمہارے گرد زوبی۔۔۔۔۔“ اس نے سر جھکا کر زوبی کو پیار کر لیا۔۔۔۔۔

”نہیں۔۔۔۔۔ میں دیکھتی ہوں تم کسی کسی وقت پریشان ہو جاتے ہو۔۔۔۔۔“

”دہم ہے تمہارا۔۔۔۔۔ تمہیں پا کر میری ہر پریشانی مٹ گئی ہے۔۔۔۔۔“

”جھوٹ تو نہیں کہہ رہے۔۔۔۔۔“

”میں اور تم سے جھوٹ کموں گا..... اپنی جان اپنی زندگی اور اپنی خوشی سے..... ہوں.....“

شہباز نے اسے مضبوطی سے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا.....

زوبی کو یوں لگا جیسے وہ اک مضبوط حصار میں ہر فکر اور ہر دکھ سے محفوظ ہو گئی ہے.....

ون، ہنسی خوشی گزرتے چلے گئے.....

ایک شام جب وہ سمندر کے کنارے ٹہل رہے تھے گیلی گیلی ریت ان کے قدموں تلے سے ہولے ہولے کھسک رہی تھی..... سمندر کی شوریدہ سرلہرس طوفانی انداز میں کناروں کی طرف جھپٹ رہی تھیں..... ہوا چل رہی تھی..... اور تفریح کے لئے آنے والے ریتلے کناروں پر ٹیالی چٹانوں پر بیٹھے تھے..... بل کھاتی آتی جاتی لہروں سے خطا اٹھا رہے تھے.....

زوبی شہباز کے بازو میں بازو ڈالے اپنا وزن اس پر ڈالتے ہوئے لہروں کو دیکھ کر بولی ”شہباز دیکھو نا جب لہرس کنارے کی طرف بڑھتی ہیں..... تو ان کی تندی اور تیزی سے کتنا خوف آتا ہے..... اور جب پسپا ہوتی ہیں تو کس خاموشی سے شکست خوردہ سی لوٹ جاتی ہیں.....“

”ہاں“ شہباز بولا..... ”ساحل پہ حملہ آور ہوتی ہیں..... ساحل زیادہ تو مند ہوتا ہے.....

ایک دم پلٹا رہتا ہے لوٹا رہتا ہے.....“

”کبھی کبھی بہت اوپر اٹھ آتی ہیں..... تندی زیادہ ہی ہو جاتی ہے“

”پھر بھی پسپا تو ہونا ہی ہوتا ہے انہیں.....“

”واقعی.....“

شہباز نے زوبی کی کمر کے گرد بازو لے جاتے ہوئے کہا ”زوبی..... زندگی میں بھی ایسا ہی ہوتا

ہے“

”کیسا؟“

”ساحل تو مند ہو تو حملہ آور لہروں کو پسپا کر دیتا ہے“

”یعنی.....“

”یعنی یہ کہ مقابلے کی ہمت و طاقت ہونی چاہئے.....“

”کس سے.....“

”ہر مصیبت سے..... ہر افتاد سے.....“

”یہ کیا نقطہ نکالا ہے“

”ان لہروں کو دیکھ کر خیال آیا تھا.....“

”کس کا“

”اپنے خاندان کا..... خان بابا کا..... روایتوں کا.....“

”شوریدہ سرلہروں کو لوٹا دینے کی ہمت ہے نا.....“

”بالکل..... اس ساحل کی طرح..... تمہارا شہباز بھی تو مند ہے“

”اوہ شہباز..... مجھے تم پر ناز ہے.....“

کئی شب دروڑا سی انداز اسی طریق سے گزار کر وہ واپس لوٹ آئے.....

می ڈیڈی نے ان کا استقبال بڑی گرمجوشی اور محبت سے کیا..... زوبی کی صحت پہلے سے بہت

اچھی نظر آئی..... چہرے کی شکستگی اور نکھار میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا..... می نے اس کا منہ سرکئی بار چوما.....

ڈیڈی نے پیار سے گلے لگایا..... شہباز کو بھی دونوں نے پیار کیا.....

”خوش ہونا“

می ڈیڈی کے سوال پر زوبی کھلکھلا کر ہنس پڑی..... ”می..... خوش نظر نہیں آتی

کیا.....“

بیٹی کو خوش دیکھ کر می ڈیڈی کے چہرے جگمگا اٹھے.....

رات سب دیر تک باتیں کرتے رہے..... زوبی اور شہباز می ڈیڈی کے لئے خوب صورت

تحائف لائے تھے..... اپنے نئے گھر کے لئے کئی قیمتی اور نفیس چیزیں خریدی تھیں..... زوبی نے سب چیزیں انہیں

دکھائیں.....

”تمہارا گھر میں نے سیٹ کر دیا ہے.....“ می نے زوبی کو بتایا..... ”لیکن چند دن تم لوگ

ہمارے پاس رہو گے.....“

”ٹھیک ہے؟“ زوبی نے شہباز کی طرف دیکھا.....

اس نے اثبات میں سر ہلادیا.....

وہ کچھ دن بیس ٹھہرے می ڈیڈی اور ان کے دوست و احباب کی محبتوں سے فیض یاب ہوتے

رہے.....

پھر

اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو گئے.....

”چل ہٹ..... آنکھوں کا علاج کروا پہلے..... وہ لاہور میں ہے اور امتحانوں کی تیاری میں مصروف۔“
 یار لیا کہہ رہے ہو..... میں نے خود اسے ایک کچی بنی لڑکی کے ساتھ..... تو..... تو..... وہ خود ہی کپٹی
 پر انگلی بجاتے ہوئے بڑبڑایا..... ”وہ لڑکی اس کی بیوی نہیں تو کون ہو سکتی ہے.....“
 زرگل نے اس کا کندھا پھٹتے پایا اور ہنس کر بولا..... ”جانے کسے دیکھا اور شہباز بنا دیا.....“
 ”حد کرتے ہو زرگل..... کیا میں شہباز کو نہیں پہچانتا.....“
 ”اسے دیکھا ہی تھا یا ملے بھی تھے.....“
 ”مل نہیں سکا..... میں کشمیر پوائنٹ سے ڈاک خانے کی طرف آرہا تھا وہ کلڈنہ کی طرف جا
 رہے تھے“

”بس پھر ٹھیک ہے“ زرگل نے ہنس کر دیکھا..... ”اتنی دور سے تم نے شہباز کو ضرور پہچانا
 ہو گا.....“

بھٹلائے جانے پر اس کا دوست چڑ گیا۔ ”وہ شہباز ہی تھا..... اس کے ساتھ دہلی پتلی سی لڑکی
 تھی..... کئے بالوں والی..... خوب صورت اور سارٹ سی.....“
 زرگل نے اپنا ہاتھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہٹتے ہوئے لہرایا ”جاگ رہے ہونا.....“
 ”نہیں مانتے تو نہ مانو..... وہ شہباز ہی تھا..... اور وہ لڑکی..... وہ لڑکی اس کی بیوی نہیں تو.....
 تو.....“

”گرل فرینڈ ہوگی“
 ”بالکل..... یہی بات ہے تھی اس کے ساتھ ضرور.....“
 ”ہو بھی..... کوئی اور بات کرو..... شہباز کی شادی ہوگی تو تمہیں مدعو ضرور کیا جائے گا.....
 ویسے تیاری پکڑ لو ڈیڑھ دو ماہ بعد شادی ہو رہی ہے اس کی..... ڈیڑھ دو ماہ بعد.....“ زرگل نے ہنستے ہوئے ڈیڑھ
 دو ماہ پر زور دیتے ہوئے کہا.....

دوست کو الجھن ہوتی رہی..... لیکن وہ زرگل کو کسی طور یقین نہ دلا سکا.....
 زرگل نے یہ بات شہنو کو بھی بتائی.....
 گھر آتے ہی شہنو سے کہا ”بھئی مبارک ہو شہنو“
 ”کس بات کی“ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔
 ”تمہارے بھائی نے شادی کر لی.....“ زرگل ہنستے ہوئے بولا.....
 ”کس بھائی نے.....“

۲۰

”شہباز نے شادی کر لی.....“
 ”شہباز نے شادی کر لی.....“
 شہباز کی شادی کی خبر کسی ہم کے دھماکے سے کم نہ تھی.....
 کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے یہ بات سچ ہی ہے بات کہیں نہ کہیں سے نکل ہی جاتی
 ہے۔
 اڑتی اڑتی خبر تو کئی دن پہلے بھی زرگل تک پہنچی تھی..... لیکن اتنی ان ہونی سی بات تھی.....
 کہ اس پر یقین کرنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی گئی تھی..... زرگل کا کوئی دوست اس دن اچانک ہی پشاور کے صدر
 بازار میں مل گیا تھا.....

اس نے ملتے ہی لمبا چوڑا گلہ دار غ دیا.....
 ”بھی شادی میں ہمیں بلایا ہی نہیں.....“ اس نے زبردست شکی انداز میں کہا تو زرگل حیرانگی
 سے بولا ”کس کی شادی میں.....“
 ”شہباز کی شادی اور کس کی“
 ”شہباز کی شادی؟ یہ کس نے بے پر کی اڑادی.....“
 ”نہیں ہوئی اس کی شادی“
 ”بھی حیران کیوں ہو رہے ہو.....“
 ”حیران ہونے کی بات تو ہے ہی..... میں نے خود اسے اس کی بیوی کے ساتھ دیکھا ہے.....“
 ”کہاں“
 ”مری میں“

”ایک ہی تو ہے تمہارا بھائی..... شہباز.....“

”کیا کہہ رہے ہیں.....“

”کہہ رہا ہوں کہ شہباز نے شادی کر لی.....“

”جانتے بھی ہیں کیا کہہ رہے ہیں آپ.....“

”جانتا ہوں..... لیکن جو سنا وہ کہہ دیا.....“

”کیا سنا..... کس سے سنا.....“

”ابھی بازار میں ایک دوست مل گیا..... اس نے بتایا.....“

”کیا.....“

زرگل نے ہنستے مسکراتے دوست سے سنی بات شہنو سے کہہ دی۔

”لوگوں کو بے پرکی اڑانے کی عادت ہوتی ہے“ شہنو بولی۔

”وہ بے وقوف تو اتنے وثوق سے کہہ رہا تھا.....“

”دور سے دیکھا اور شادی بھی کر دی.....“

”ویسے شہنو.....“

”کیا.....“

”اگر یہ بات سچ ہوتی..... تو.....“

”سچ ہوتی کیسے..... ہو ہی نہیں سکتی“

”فرض کیا ہو سکتی..... تو.....“

”تو.....“

”سوچ سکتی ہو کیا ہوتا.....“

”کیا ہوتا.....“

”رشتے ٹوٹ جاتے خاندان بکھر جاتا..... خون خرابے کی فوٹ آجاتی..... شہباز زری کو چھوڑ

دیتا..... شہنو زرگل سے بچھڑ.....“

”مت کریں ایسی باتیں“ شہنو خوف زدہ ہو کر چیخی..... تو زرگل کلکھلا کر ہنس پڑا.....

”مذاق کر رہا تھا..... شہنو..... میں مذاق کر رہا تھا.....“ وہ ہنسے جا رہا تھا.....

”میں ایسا مذاق بھی برداشت نہیں کر سکتی زرگل.....“ وہ روہانی ہو رہی تھی.....

”یعنی مجھ سے بچھڑنے کا.....“ وہ اب بھی شوخی کے موڈ میں تھا.....

”ہاں.....“ اس نے رندھی آواز میں کہا..... زرگل اس کی غم خیز آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معذرتانہ انداز میں بولا..... ”بھی معاف کر دو..... میں نے تو تمہیں لطیفہ سنایا تھا..... ہنسنے کے لئے تم تو رو دیں.....“

”مت سنائیں مجھے ایسے لطیفے.....“

”اچھا ابھی جانے بھی دو..... آؤ اندر چلیں.....“ زرگل نے قدم اٹھایا شہنو بھی ساتھ ساتھ اندر چلی آئی.....

”بی بی گل کو بھی سنادیں یہ لطیفہ؟“ زرگل نے مسکراتے ہوئے شہنو سے پوچھا.....

”جی نہیں..... یہ لطیفہ اپنے پاس ہی رکھیں.....“

”تو چلو شہبازی کو سناتے ہیں..... فون کرتے ہیں اسے.....“

”وہ اس وقت نہیں ملیں گے.....“

”یونیورسٹی تو بند ہے.....“

”ہاں وہ آج کل مختلف فیکٹیوں میں جاتے ہیں..... کل ہی ان کا فون آیا تھا.....“

اس دن بات آئی گئی ہو گئی.....

ویسے یہ لطیفہ زرگل نے گاؤں جا کر بی بی جان اور آغا بی بی اور زری کو بھی خوب مزے لے لے

کر سنایا..... سب نے قہرات ہنسی میں اڑا دی..... لیکن زری کے دل میں تیر سا تازہ ہو گیا..... اس کی اداسی کو زرگل

نے محسوس کیا..... اس کی موٹی سی چٹیا ہاتھ میں پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیتے ہوئے بولا..... ”یہ مذاق تھا زری..... تو سنجیدہ

کیوں ہو گئی..... شہنو کی طرح تو بھی یہی کہے گی تاکہ میں ایسا مذاق بھی برداشت نہیں کر سکتی..... ہے نا.....“

زرگل نے شہنو کی سی آواز بنائی..... تو زری مسکرا دی.....

لیکن

اس طرح کہ اس مسکراہٹ پر رونے کا گمان ہوا.....

لیکن

یہ لطیفہ نہیں تھا.....

بے پرکی بھی نہیں اڑی تھی.....

یہ حقیقت تھی..... جو واقع ہو چکی تھی.....

اور

جب شادی کی مستند خبر پہنچی تو جیسے آسمان ہی گر پڑا..... خبر کا دھماکہ اتنا تباہ کن تھا کہ تباہی کا

اندازہ ہی نہیں ہو سکتا تھا.....

اتفاقاً ہی راز کھل گیا۔

شہنو نے شہباز کو لاہور فون کیا.....

شہباز کی بجائے حاکم نے اس سے بات کی..... ”صاحب گھر پہ نہیں ہیں.....“

”کہاں گئے ہیں.....“

”پتہ نہیں جی..... بیگم صاحبہ کے ساتھ ہی گئے ہیں خان صاحب“

”بیگم صاحبہ..... کس بیگم صاحبہ کے ساتھ..... میں شہباز خان کا پوچھ رہی ہوں..... یہ نمبر اسی

کا ہے.....“

”آپ کون بول رہی ہیں.....“

”پشاور سے شہباز خان کی بہن.....“

”اوئی.....“ اس آواز کے ساتھ ہی کھٹک سے فون بند ہو گیا.....

شہنو بے طرح گھبرا گئی..... فون ہاتھ سے چھوٹ گیا..... دوزی ہوئی بی بی گل کے پاس

آئی..... اور ہراساں ہو کر ماں سے لپٹ گئی.....

بی بی گل نے سنا تو کتے میں آگئیں..... بات اتنی اُن ہونی تھی کہ اس کے ہونے کا یقین نہ

آیا.....

لیکن حواس مجتمع کئے..... اور جلدی سے فون کی طرف بڑھیں.....

نمبر ڈائل کیا..... ایک بار پھر کئی بار..... لیکن رابطہ نہ ہو سکا..... فون بگڑ گیا تھا..... یا

ڈسکنکٹ کر دیا گیا تھا..... کوئی بات تو تھی.....

ماں بیٹی کی پریشانی دیدنی تھی.....

حواس باختہ ہی ایک دوسری سے سوال کر رہی تھیں.....

”یہ کیسے ہو سکتا ہے.....“

”بی بی گل اس نے کہا ہے کہ خان صاحب بیگم صاحبہ کے ساتھ گئے ہیں..... میں نے تسلی کے

لئے جب پوچھا کہ یہ نمبر شہباز خان کا ہی ہے..... تو وہ گھبرا کر بولا آپ کون بول رہی ہیں..... اور جب میں نے

بتایا..... تو اس نے جھٹ سے اوئی کہتے ہوئے فون بند کر دیا..... ضرور کوئی بات ہے بی بی گل ضرور کوئی بات

ہے.....“

”اللہ کرے کوئی بات نہ ہو.....“

”ضرور ہے..... میرا دل کتا ہے ضرور ہے..... پہلے بھی زنگل کے کسی دوست نے.....“

”بس کر شہنو..... کیوں پریشان ہوتی ہے کبھی نہیں ہو سکتا..... شہباز پاگل تو نہیں..... اس

کے تو امتحان ہیں..... وہ تو پڑھنے میں لگا ہے..... فیکٹیوں میں پریکٹیکل کرنے جاتا ہے آج کل..... تو نے کسی اور

نمبر پر.....“

”اوہ بی بی گل..... میں پاگل ہو جاؤں گی..... آپ..... آپ اس بات کو پھینک نہ دیں.....

لاہور سے پتہ کروائیں..... وہاں کیا ہو رہا ہے.....“

”فون تو ہونے نہیں سکا..... کیا کروں.....“

”کچھ کریں.....“

”میں کیا کروں..... کہاں سے پتہ کروں تیرے بابا ایک ہفتے بعد آرہے ہیں.....“

شہنو نے خوفزدہ ہو کر کانوں پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر لیں..... ”شہباز لالہ..... آپ نے

شادی کر لی ہوئی تو کیا ہو گا بی بی گل..... خان بابا کے آنے سے پہلے تسلی کر لیں بی بی گل پہلے..... ورنہ خان بابا.....

اف.....“

بی بی گل بھی متوحش نظر آرہی تھیں..... کچھ سمجھ نہ آرہا تھا..... کہ کیا کریں..... شہنو ہی کو

تدبیر سوچھی.....

”کسی کو لاہور بھیج کر پتہ کروائیں.....“

”کس کو بھیجوں.....“

”کسی کو بھی..... زر گل کو بھیج دیں.....“

”بے وقوف کہیں کی..... بات اپنے تک ہی رکھو..... دھواں بھی نہ نکلے..... کیوں فساد ڈلوانا

ہے..... اللہ کرے یہ سب جھوٹ ہی ہو.....“

”اللہ کرے.....“

دونوں ماں بیٹی صلاح مشورے کرتی رہیں..... بی بی گل کو مستان خان کا خیال آیا..... انہوں نے

اسی وقت زرین کو بھیج کر اسے بلایا..... اور رات خیبر میل سے لاہور روانہ کر دیا..... وہ شہباز کے پاس رہ چکا

تھا..... تصدیق کرنے کے لئے وہی موزوں تھا.....

مستان خان تیسرے دن واپس آیا.....

تو

شادی کی مستند خبر کے ساتھ زرین اور شہباز کی تصویریں بھی ان کے کمرے سے لے آیا..... وہ

دونوں اسلام آباد کسی شادی میں شرکت کے لئے گئے ہوئے تھے..... ان سے مل نہیں سکا..... لیکن شادی ہو چکی تھی..... یہ خبر کبھی تھی.....

”شادی کو تیسرا مہینہ جا رہا ہے..... خان نے امتحان بھی نہیں دیا..... یہ لڑکی جس سے شادی ہوئی ہے میں نے دیکھی ہوئی ہے..... خان کے دوست کی بہن ہے..... خان ان کے گھر جاتے تھے..... یہ لڑکی بھی ایک دفعہ میرے سامنے گھر آئی تھی..... میں نے دیکھی ہوئی ہے.....“

مستان خان نے انکشاف کیا.....

بی بی گل نے سینہ پیٹ لیا.....

شہنو رو رو کر بے حال ہو گئی.....

خبر چھپی کیسے رہتی..... نوکر چاکر خدمت گاریں سب پریشان ہو گئے..... ہر کوئی چپ کا چپرہ گیا.....

”اب کیا ہو گا“

”یہ کیا ہو گیا“

”کیا کروں.....“

بی بی گل سینے پر ہاتھ مارتے پاگلوں کی طرح ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں آ جا رہی تھیں..... نواز خان آنے والے تھے..... ان کو پتہ چلے گا..... تو کیا ہو گا..... وہ سوچ سوچ کر کانپتی.....

گھر میں صف ماتم بچھ گئی.....

شہنو کا برا حال تھا.....

کبھی چیخ چیخ کر رونے لگتی

کبھی

پتھرا سی جاتی.....

مستان خان نے یہ خبر گاؤں بھی پہنچادی

صبور خان اور زر گل کے تو قدموں تلے سے زمین سرک گئی..... گنگ سے رہ گئے.....

”ایسا نہیں ہو سکتا..... مستان خان..... تمہیں یقیناً غلطی لگی ہے“ صبور خان نے کئی لمحوں کے

سکتے کے بعد بے اختیار انہ کما۔

مستان خان نے جیب سے تصویر نکال کر ان کے سامنے کر دی.....

صبور خان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

زر گل نے دیوار کا سہارا لے کر تصویر پر نگاہ ڈالی۔ یقین نہ کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی.....

وہ بت کی طرح خاموش کھڑا رہ گیا۔

بات حجرے میں پہنچی..... لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

اور جب حویلی میں پہنچی

تو

جیسے قیامت ٹوٹ پڑی.....

آغا بی بی نے سینے پر دو ہتھ مارا..... تکبیریں کا سر پکڑا لے لگا۔

اور

زری کی رنگت چلی اور ہونٹ سپید پڑ گئے..... سارا وجود تھر تھر کانپنے لگا۔ آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں..... زر گل نے ہی لپک کر اسے تھام لیا..... سینے سے لگا کر اس کے سر کو تھپکا اور پھر بی بی گل کے پاس پلنگ پر بٹھا دیا..... وہ اسے تسلی نہ دے سکا..... الفاظ ہی کہاں تھے اس کے پاس..... اس کے اپنے ذہن میں بھی تو بھگڑ چل رہے تھے.....

پوری حویلی اک سناٹے کی لپیٹ میں آ گئی تھی.....

دل و دماغ صدمے سے اس طرح ماؤف ہو گئے تھے کہ کوئی سمجھ ہی نہ پا رہا تھا..... کہ کیا کیا جائے

زر گل حویلی سے باہر آیا۔

جیب

اور شہر بھاگا۔

صبور خان نے بھی کچھ دیر بعد گاڑی نکلوائی اور شہر چل دیئے.....

شہر میں تو پہلے ہی سے صف ماتم تھیں تھی.....

شہنو کا برا حال تھا..... بی بی گل پتھرائی ہوئی تھیں..... ان سے کیا کہتے کیا پوچھتے.....

صبور خان نے شہنو کو گلے سے لگالیا..... دلشمنی سے پوچھ گچھ کی.....

لیکن

وہ کیا بتاتی..... وہ تو خود بھی کچھ نہیں جانتی تھی..... کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا..... کیسے ہوا کہ

ہوا.....

زر گل صدمے سے بے حال تھا.....

شہباز کے اس فعل سے ان کی رسوائی ہوئی تھی..... جوان خون جوش اور غصے میں اُلٹنے لگا تھا.....
اس نے ریشمینے کے سامنے شہباز کو بے نقط سا ڈالیں.....
”مجھے کبھی کبھی ڈر لگتا تھا..... شہباز ہمت سے اکھڑ رہا ہے..... اس نے ایسا ہی کیا..... اس نے
ہمارے منہ پر کالک مل دی.....“

صبر خان نے اس کے کندھے پر تھپکا دیتے ہوئے اس کا غصہ فرو کرنے کی کوشش کی..... لیکن
وہ چنگھاڑا..... ”خان بابا! اس نے ہمیں ذلیل کر دیا ہے..... اس نے ہماری جٹک کی ہے“
صبر خان کچھ نہیں بولے..... ہاں ریشمینے زور زور سے رونے لگی.....
زر گل تاب اتنا مشتعل ہو رہا تھا کہ لاہور جانے کا راہ وہ کر لیا۔
لیکن اس حال میں اس کا لاہور جانا کسی طور ٹھیک نہیں تھا..... سب نے اسے جانے سے منع

کیا..... روک لیا۔

تیسرے دن نواز خان بھی آگئے..... وہ خوشی خوشی گھر پہنچے تھے..... دورہ بیحد کامیاب رہا
تھا..... وہ سب کے لئے بے انتہا خوب صورت اور بیش قیمت تحفے لائے تھے.....
لیکن گھر میں قدم رکھتے ہی فضا کدردی لگی..... ریشمینے کا سپید پرتا عین چہرہ دیکھ کر الجھن
ہوئی تو کروں خدمت گاروں کی خاموشی مسیب سی لگی.....
اور جب بیمار بیمار سی شہنو کو دیکھا تو پریشان ہو گئے..... بچی کو گلے لگایا تو وہ بے اختیار ہو کر
رونے لگی.....

”کیا بات ہے کیا ہوا..... تم سب اتنے پریشان کیوں ہو..... کوئی خاص بات“ شہنو کا سر
سینے سے لگا کر تھپکتے ہوئے انہوں نے ریشمینے سے پوچھا.....
ریشمینے بھی ہاتھوں پر چہرہ گرا کر رو دی..... اس کی پشت پر کھڑی سلطان مورے اور درنی
بھی آنسو پونچھنے لگیں۔

”کیا ہوا..... کیا ہوا..... بتاتے کیوں نہیں ہو..... سب خیریت تو ہے نا..... آغا بی بی اور باقی
سب.....“

نوازی پریشانی دیدنی تھی

کسی میں حوصلہ ہی نہ تھا کہ منہ پھاڑ کر اتنی بڑی بات ان کے سامنے کہہ دے.....

”ریشمینے.....“ انہوں نے شہنو کو صوفے پر بٹھاتے ہوئے تیز آواز میں پکارا.....
”کیا بات ہے..... کیا چھپا رہی ہو کوئی مر.....“

وہ بات پوری نہ کر سکے..... ریشمینے نے چادر سے آنسو پونچھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر انہیں
بات پوری کرنے سے روک دیا پھر آنسو بھری آواز میں بولی ”جیتے جی مر گیا..... ہمارے لئے جیتے جی مر گیا.....
خان گل..... شہباز نے لاہور میں شادی کر لی ہے.....“

”کیا.....“ نواز خان نے حیرت اور اچھٹے سے ماتھے پر شکن ڈالتے ہوئے پوچھا.....

”جی بابا.....“ شہنو نے روتے ہوئے صرف اسی قدر کہہ سکے.....

نواز خان گنگ سے کھڑے رہ گئے.....

اور

جب انہیں معاملے کی ساری تفصیلات سے آگاہ کیا گیا..... تو ان کی آنکھیں غصے سے لال
ہو گئیں.....

”اس ناہنجار نے یہ قدم اٹھالیا“ دانت پیٹتے ہوئے انہوں نے بات اس طرح کی..... کہ
لگا..... شہباز تو کیا اس سے متعلق ہر چیز کو وہ دینے کی ہمت اور صلاحیت رکھتے ہیں.....
وہ کوئی اور بات کئے بغیر کرے سے نکل کر دوسرے کرے میں آگئے.....

پھر

مسیب سی خاموشی چھا گئی.....

مسیب سی خاموشی

جو طوفانوں کی آمد کا پتہ دیتی ہے.....

کئی دن

گھر کی فضا پہ سکوت مرگ کی سی کیفیت طاری رہی.....

سکوت ٹوٹنے نہ دیکھ کر ریشمینے اور شہنو کی پریشانیوں اور گھبراہٹوں میں اضافہ ہو رہا
تھا..... زر گل کے متعلق خبریں ان تک بھی پہنچ رہی تھیں..... اس نے شہباز کو زندہ نہیں چھوڑنا تھا..... سارے
بندھن سارے رشتے توڑ ڈالے تھے..... صرف اور صرف شہباز کے خون سے پیاس بجھانے کی ضرورت تھی.....

اس دن ریشمینے کے صبر و ضبط کے بند ٹوٹ گئے.....

”خان جی“ اس نے نواز خان کو کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا..... زندگی میں اس کی پہلی اتنی
بڑی جسارت تھی..... ”کیا سوچ رہے ہیں..... کیا دیکھ رہے ہیں..... کچھ تو بتائیں کچھ تو کریں..... ہم تباہی کے
دہانے پر کھڑے ہیں.....“

نواز نے جھٹک کر اس کا ہاتھ پرے کیا اور غصے سے بولے ”یہ سب تمہاری غلط تربیت کا نتیجہ

”میری.....“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر چیخی ”یا آپ کی.....“

اس نے نواز خان کی طرف انگلی اٹھائی.....

صدے اور غم سے وہ چور چور تھی..... غصے اور طیش میں اس نے نواز خان کو سناڈالیں..... ”یہ

سب آپ کی وجہ سے ہوا..... آپ نے ہی اسے گھر اور گھر والوں سے متنفر کیا..... بچپن ہی سے اس کے ساتھ ایسا

سلوک کیا..... کہ وہ فرار کی راہیں تلاش کرنے لگا..... یہ سب آپ کی..... آپ کی وجہ سے ہوا ہے.....“

وہ بے مکان بولتی چلی گئی..... سارا غم سارا غصہ نواز خان پر انڈیل دیا..... نواز خان..... جن کے

سامنے اس نے کبھی اونچی آواز میں بات نہ کی تھی..... سر اٹھا کر جواب نہ دیا تھا..... دل کی بھڑاس آج بے دھڑک

نکال رہی تھی..... نواز خان بھی گر بے بر سے.....

بی بی گل غصے سے چٹکھڑکتے ہوئے روتے ہوئے چیختے ہوئے برسوں کا غبار اور بھڑاس نکالتی

رہیں..... انہیں نواز خان سے ڈر لگانے کوئی خوف محسوس ہوا..... ترکی بہ ترکی جواب دیئے.....

نواز خان کبھی طیش میں چپے

اور

کبھی ہمدردی سے بی بی گل کی باتیں سنیں.....

وہ بیدم ہو کر گمرے گمرے غیر متوازن سانس لینے لگیں..... تو نواز خان نے مسکرا کر کہا

” نکال لیا غصہ یا ابھی اور باقی ہے.....“

ریشمینے نے ان کے پتھر یلے چہرے پر نگاہ ڈالی جس پر مسکراہٹ سج نہیں رہی تھی.....

”آپ کو کوئی فکر نہیں.....“ ریشمینے نے کہا۔

”نہیں.....“ وہ سنگین لہجے میں بولے.....

”کیا.....؟“ ریشمینے نے حیرانگی سے انہیں دیکھا.....

”شہباز نے یہ طفلانہ سی حرکت کی ہے..... اسے میں یوں مسل دوں گا..... انہوں نے انگوٹھے

کو انگلیوں پر مسلا..... ان کا لہجہ اتنا سنگین اور کٹھور تھا کہ ریشمینے سسم گئی.....

انہوں نے سر ہلایا..... جیسے ریشمینے کو تسلی دے رہے ہوں.....

”ریشمینے تم لوگ اتنے جذباتی نہ ہو جاؤ..... میرے عتاب کو دعوت دے کر شہباز ایک دن

بھی نہیں جی سکتا..... تم دیکھتی جاؤ.....“

کھینے کا موقع نہیں دیا جائے گا..... وہ سر کے بل آئے گا اور ان کے قدموں میں جھکے گا.....“

خان نواز خان نے اپنے قدموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا.....

ریشمینے نے ان کی طرف دیکھا..... وہ بھڑکنے شعلے کی طرح دکھائی دے رہے تھے.....

☆☆☆

لیکن

وہ کچھ بھی کر دیتے..... تو.....

اس سے ہنگ اور بے عزتی کا احساس تو نہیں مٹ سکتا تھا..... جو صبور خان کے سینے میں زخم ڈال گیا تھا..... جس نے زرگل کو شعلہ بنادیا تھا

اور

جس نے زری کی ہر سوچ کو لہو لہان کر دیا تھا.....

صبور خان بڑے ٹھنڈے اور دھیمے مزاج کے انسان تھے..... غیظ و غضب ان کی فطرت سے دور تھے..... درگزر کرنے کے عادی تھے.....

لیکن شہباز کی اس حرکت سے وہ بھی اتنے برا فروختہ تھے..... کہ اس فعل کی معافی یا سزا کی سوچ بھی نہ سکتے تھے..... کل کالہ کا ان کی عزت و وقار کی یوں و جیوں بکھیر دے گا..... انہوں نے تو کبھی تصور میں بھی نہ سوچا تھا..... وہ تو شہباز کے ساتھ نواز سے بھی قطع تعلق کر بیٹھے تھے.....

نواز ان کے پاس آئے تھے..... تو صبور خان نے ملنے سے انکار کر دیا تھا.....

دونوں بھائی اب تک ایک دوسرے کے لئے جان دیتے تھے..... دونوں ایک تھے..... لیکن اب رخنے آن پڑا تھا..... آغا بی اپنی جگہ آتش زیر پا تھیں..... ان کے مرحوم شوہر کی ایما پر باندھے گئے بندھن ٹوٹ گئے تھے..... قصور نواز خان کا نہیں تھا..... لیکن آغا بی بی نے بھی بی بی گل کی طرح غم و غصہ ان پر نکالا تھا..... بہت بھڑکی تھیں..... بے طرح برسی تھیں..... لیکن اس طرح مسئلہ حل تو نہیں ہو سکتا تھا..... خاندان ٹوٹ رہا تھا..... بکھر رہا تھا..... جیتے جی وہ یہ سب کچھ کیسے دیکھ سکتی تھیں..... ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والے بھائیوں کے درمیان دشمنی کی لکیر ابھر رہی تھی..... یہ لکیر خون آشام بھی ہو سکتی تھی..... زرگل اس ذلت و رسوائی پر جس طرح مشتعل تھا..... کچھ بھی ہو سکتا تھا.....

اس نے سوگوار اور گرم صم سی زری کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا..... ”زری..... میں تیری اس توہین کا بدلہ شہباز سے لے کر رہوں گا..... آج سے ہمارا اس خاندان سے ہر رشتہ ٹوٹ گیا ہے.....“

زری نے گہرا کر کہا تھا..... ”زرگل لالہ..... میرے رشتے ٹوٹے ہیں..... آپ تو.....“

”زری..... زرگل نے فرط جوش سے مغلوب آواز میں کہا تھا..... ”کیا تم اپنے بھائی کو غیرت مند نہیں سمجھتیں..... میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں..... لیکن شہنو میرے لئے مرچکی ہے“

”زرگل لالہ.....“ زری بے اختیارانہ رو دی تھی..... روتے روتے اس نے زرگل کو اس انتہائی اقدام سے روکنے کی کوشش کی..... شہباز کے فعل کی سزا اس کی معصوم اور بے قصور بہن کو دیئے جانے کے

جب قسمت سو جائے تو آنکھیں سونا بھول جاتی ہیں.....

زری کی آنکھوں میں ویرانی کی دھول پھیلی تھی..... لاتعداد اندیشے بے شمار وسوسے ذہن کو گھیرے ہوئے تھے..... دن کو چین تھا نہ رات کو آرام..... ساری ساری رات جاگتے گزر جاتی..... بیٹھے بٹھائے پورے خاندان پر افتاد آن پڑی تھی..... شہباز ان انتہاؤں کو چھو لے گا اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا..... وہ شہباز کی طرف سے پر امید بے شک نہیں تھی..... لیکن کبھی ناامید بھی نہیں ہوئی تھی..... اتنے مضبوط بندھنوں کو وہ اس طرح توڑ ڈالے گا..... یہ کبھی کب سوچا تھا اس نے..... صرف اس کی اپنی ذات کا واسطہ ہوتا تو بات اور تھی..... اب تو..... سارے خاندان کی بنیادیں ہل گئی تھیں.....

نواز خان تو گرم اور جوشیلے مزاج کے تھے ہی..... آگ بگولہ ہو رہے تھے..... شہباز کو فون کیا تھا..... اتفاق ہی سے شہباز نے فون اٹھایا..... وہ جس طرح گرے بر سے تھے..... سننے والوں کے دل دہل گئے تھے..... شہباز بھی ڈر گیا تھا..... خان بابا نے اپنا آخری فیصلہ سنایا تھا..... سوچنے کے لئے صرف دو دن کی مہلت دی تھی.....

وہ اپنا فیصلہ مسلط کر کے شہباز سے اثبات میں جواب لینا چاہتے تھے..... نفی کی صورت میں انہوں نے دھمکی بھی دی تھی..... ”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا..... اور تمہاری اس بیوی کو بھی..... جسے صرف تم نے تسلیم کیا ہے.....“

اور

شہباز جانتا تھا کہ نواز خان کا کہا پتھر پر لکیر ہوتا ہے.....

شہباز کیا سب ہی جانتے تھے کہ یہ صرف دھمکی ہی نہیں..... وہ حقیقت میں بھی ایسا کر گزرنے

والے ہیں.....

حق میں وہ نہیں تھی..... اس نے اپنی طرف سے سمجھانے کے لئے بہت کچھ کما رو کر مفتیں کر کر کے.....

لیکن زرگل شعلے کی طرح..... بھڑک رہا تھا..... سارے بندھن ٹوٹ چکے تھے..... غیرت کا تقاضہ یہی تھا کوئی عزت دار بھائی اپنی بہن کی خوشیوں کے مزاروں پر اپنے محل تعمیر نہیں کر سکتا..... بندھن تو از خود ہی ٹوٹ گئے تھے.....

زری کے دکھ گھمبیر تھے..... اپنے ساتھ اسے بھائی کا دکھ بھی اذیت دے رہا تھا..... وہ جانتی تھی زرگل اور شہنو ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہیں..... محبتوں اور چاہتوں سے آگہی کے باوجود وہ ان کے لئے کچھ نہ کر سکتی تھی.....

وہ اپنے آپ ہی کو مورد الزام ٹھہراتی اسے لگتا اس کی ذات ہی منحوس ہے اور یہ نحوست اس کے نصیبوں کی سیاهی بننے کے ساتھ ساتھ زرگل اور شہنو کے مقدروں کو بھی سیاہ کر گئی ہے..... کبھی کبھی تو اس کا جی چاہتا کہ خاموشی سے مر جائے..... لیکن

اس کے مر جانے سے بھی تو کچھ نہ ہوتا.....

مسئلہ تو وہی رہتا..... جوں کا توں..... بلکہ اس کے مرنے سے غصہ انتقام بن کر بھی بھڑک سکتا تھا..... اسے کچھ سمجھ نہ آتی تھی..... کہ کیا کرے..... گھر میں ماتی کی کیفیت تھی..... فضا سو گوار رہتی تھی..... دنیا کے لگے بندھے اصولوں کے تحت کام ہو رہے تھے..... دن نکلتا تھا شام ڈھلتی تھی اور رات اتر آتی تھی..... چکر چل رہا تھا..... لیکن سارا نظام جیسے ابتری سے دو چار تھا..... گما گمی رہی تھی نہ رونق..... بی بی جان ایک طرف سر منہ لیٹے پڑی رہتیں..... آغا بی ٹھنڈی آپں بھرتے شہباز کو کوستے اور بے شمار خدمت گاروں کے سامنے دکھ سکھ کی باتیں کرتے وقت گزارے جاتیں..... گاؤں میں جی گھبرائے لگتا تو شہر چلی جاتیں..... وہاں شہنو کو دیکھتیں تو کلیجہ منہ کو آتا..... تسلی دینے کو الفاظ نہ ملتے..... نواز خان پر گرج برس کر اپنے الجھاؤ کا مداوا کرنے کی کوشش کرتیں..... شہر اور گاؤں والوں میں اب رابطے کی کڑی صرف وہی توره لگتی تھیں.....

اس دن بھی وہ شہر لگتی تھیں.....

زرگل کو ان کے شہر جانے پر بھی اعتراض تھا..... اس نے بی بی جان اور صبور خان سے کہا تھا..... ”آغا بی بی جان کو ایک فیصلہ کر لینا چاہیئے.....

”کیسا فیصلہ“ صبور خان نے پوچھا.....

”یہی..... کہ انہیں ہمارا ساتھ دینا ہے..... یا شہر والوں کا.....“ زرگل نے کہا.....

”تم انہیں پابند نہیں کر سکتے زرگل بیٹے“ تمکینے صبور خان سے پہلے بول اٹھی.....

”آغا بی بی تو صدے سے نڈھال ہیں..... لیکن ماں ہیں..... کیا کریں.....“ صبور خان نے کہا.....

زرگل کو ماں اور باپ دونوں کی باتیں پسند نہ آئیں..... زری نے دیکھا زرگل کے چہرے پر بڑی سختی ابھر آئی تھی..... قطع تعلقی کن حدوں کو چھو رہی تھی..... یہ جان لینا مشکل نہ تھا..... زری ڈر گئی..... زرگل کے تیور خطرناک تھے.....

آغا بی بی دودن پشاور گزار کر واپس آئیں تو ان کے ساتھ نواز خان اور بی بی گل بھی تھیں..... صبور خان اتفاق ہی سے گھر پر تھے..... زرگل زمینوں پر گیا ہوا تھا..... بی بی گل آتے ہی تمکینے سے پلٹ کر رو پڑی..... تمکینے کو بھی دل کی بھڑاس نکالنا تھی خوب روئیں..... ان دونوں نے کیا کچھ سوچ رکھا تھا..... شہباز کی حرکت نے سب پر پانی پھیر دیا تھا.....

نواز نے صبور خان کو سلام کیا..... تو صبور نے سرد مہری سے جواب دیا..... وہ قطع تعلق کے اظہار کے طور پر اٹھ کر جانے لگے..... تو آغا بی بی نے ان کا بازو پکڑ لیا.....

”صبور..... نواز تمہارے گھر آیا ہے..... آنے والوں سے بے رخی اور بے مروتی میزبانی کے دستور و آئین کے خلاف ہے“

صبور نے آغا بی بی کی طرف دیکھا..... تمکینے بھی ادھر متوجہ ہوئی بی بی گل اب زری کا منہ سر چومتے ہوئے آنسو بہا رہی تھیں.....

”بیٹھو آغا بی بی تکنے کے سارے گدے پر بیٹھ گئیں..... صبور تن کر کھڑے تھے..... نواز ان کے سامنے آکر بڑی انکساری سے بولے ”خان لالہ..... میں آپ کا چھوٹا بھائی ہوں..... سارے معاملے میں آپ بھی جانتے ہیں..... کہ میرا کوئی قصور نہیں..... پھر بھی میں اپنے ناخلف بیٹے کے جرم کی معافی مانگتا ہوں.....“

صبور خان سرد مہر لہجے میں بولے ”نواز خان..... معافی تلافی کا دوسرا نام ہے..... جس بات کی تلافی نہ ہو سکے..... اس کی معافی کیسے.....“

”خان لالہ“ نواز بے اختیار ان کے قدموں میں جھکتے ہوئے بولے..... ”تلافی بھی ہو سکتی ہے..... آپ میرا ساتھ دیں..... میں آپ کی منت کرتا ہوں خان لالہ..... آپ غصے میں ایسے فیصلے نہ کر دیں..... جن کی سزا ہمیں تو کیا ہماری آنے والی نسلوں کو بھی بھگتنا پڑے..... خدا را..... تھوڑی دیر کو بیٹھ جائیے..... میری سنہریہ مجھے کچھ کہنے کا موقع دیجئے.....“

نواز نے ان کے قدموں کو چھوا.....

آغا بی بی حکم کے انداز میں بولیں..... ”بھائی کو اٹھا کر گلے سے لگا لو صبور خان..... اس کی سنو..... اپنی کمو..... اور کہہ سن کر کوئی تدبیر نکالو..... میں اپنے بچوں کو پچھرتے نہیں دیکھ سکتی..... جب تک میں زندہ ہوں..... یہ خاندان نہیں بکھر سکتا..... چلو بھائی کو سارا دو..... وہ بھی کچھ کم دکھی نہیں ہے.....“

صبور خان نے ماں کے حکم کی تعمیل بے دلی سے کی..... نواز کو اٹھا یا گلے سے لگایا..... دونوں کی آنکھیں نم ہو گئیں..... زری سے تو برداشت ہی نہ ہو سکا..... جلدی سے دالان سے نکل گئی.....

اب آغا بی بی کے پاس نواز صبور ریشمینے اور تکینے رہ گئے تھے..... تکینے ایک طرف سر جھکا کر بیٹھ گئی..... بی بی گل دایں ہاتھ گدے پر آٹھنیں..... صبور اور نواز آغا بی بی کے سامنے بیٹھے تھے.....

کچھ دیر سب سر جھکائے چپ چاپ بیٹھے رہے..... پھر آغا بی بی بولیں ”صبور بچے.....“

”جی آغا بی بی“

”نواز اور ریشمینے تم سے شرمندہ ہیں..... لیکن قصور دار نہیں..... ان سے جو ہو سکتا ہے کر رہے ہیں..... وہ شہباز کو بخش دینے پر تیار نہیں..... نواز نے شہباز کو فون کیا ہے..... آج رات وہ جواب دے گا یقیناً اس کا جواب نواز کے فیصلے سے نہیں ٹکرائے گا.....“

”خان لالہ.....“ نواز..... آہستگی سے بولے ”شہباز نے جو گھاؤ لگا یا ہے..... بے شک وہ بہت گمراہ ہے..... لیکن..... وہ کچھ بھی کر لے..... اسے میرے فیصلے کے سامنے جھکنا پڑے گا..... وہ شادی کر بیٹھا ہے..... ہم اس شادی کو تسلیم نہیں کر سکتے ایسی دس شادیاں بھی وہ رچالے..... پھر بھی اسے ہمارے فیصلوں کے سامنے جھکنا پڑے گا.....“

”تم زبردستی کرنا چاہتے ہو.....“ صبور بولے۔

”ہاں خان لالہ..... کوئی عار نہیں مجھے..... وہ لڑکی ہمارے لئے غیر ہے..... شہباز کو اسے طلاق دے کر بیس شادی کرنا ہوگی..... یہ میرا فیصلہ ہے اور اسے اس کے آگے جھکنا ہے..... ہم اپنے خاندان کو صرف اسی طرح بکھرنے سے بچا سکتے ہیں.....“

”ہاں.....“ آغا بی بی بولیں..... ”شہباز کو زری سے شادی کرنا ہی ہوگی.....“

”پہلے کچھ کم بے عزتی ہوئی ہے آغا بی بی..... جواب یہ ذلت بھی ہماری جھولی میں ڈالی جا رہی ہے..... ایسا کبھی نہیں ہو گا..... میری بیٹی اتنی گری پڑی نہیں ہے..... وہ تمام عمر بیٹھی رہے گی لیکن میں ایسا ہونے نہیں دوں گا.....“

”سوچ سمجھ کر بات کرو صبور خان..... تم اپنے دستور ادب و ادب کو جانتے ہو..... زری! یا تمہنو! کی شادیاں اب کہیں اور نہیں ہو سکتیں.....“ آغا بی بی نے تنبیہی لہجے میں کہا.....

”جانتا ہوں.....“ صبور بولے.....

”شہباز کی غلطی ہے..... اور سزا شہنو اور زرگل کو ناحق ملے گی.....“ وہ تیزی سے بولیں.....

”بدلے کے رشتے ہوئے تھے آغا بی بی..... زری کو گھر بٹھا کر میں زرگل کی خوشیاں نہیں خرید سکتا..... زرگل سے اس سلسلے میں کوئی بات بھی نہ کریں..... وہ بہت مشتعل ہے..... کچھ کر بیٹھے گا.....“

”گولی مار دے گا..... قتل کر دے گا؟ یہی کرے گا نا.....“ نواز بولے..... ”تو پھر بلائیں اسے..... کر لے اپنا کام لے لے مجھ سے بدلہ..... ہم دونوں حاضر ہیں..... کر دے سینے چھلی ہمارے..... شہباز تک تو وہ بعد میں پیچھے گا پہلے ہم سے نمٹ لے.....“

نواز کچھ جذباتی ہو گئے تھے..... آغا بی بی نے ان کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہیں پرسکون ہونے کی تلقین کی.....

”خان لالہ“ ریشمینے جو چپ چاپ بیٹھی باتیں سن رہی تھی پہلی دفعہ بولیں ”ہم اپنے بیٹے کی غلطی مانتے ہیں..... ہم اس کی طرف داری نہیں کر رہے..... اس کے غلط رویے سے آپ سب کو دکھ پہنچا ہے..... تو خوشی ہمیں بھی نہیں ہوئی..... خان لالہ خدا کے لئے سوچئے..... شہباز نے زری سے منہ موڑ کر جرم کیا ہے..... تو زرگل شہنو کو جواب دے کر بھی ظلم کر رہا ہے ہمارے دونوں گھرانے اس طرح بندھے ہیں..... کہ چھٹ جانا بتا دی و بار دی کامو جب ہے..... ہم ایک ہیں..... الگ الگ نہیں ہو سکتے.....“

صبور خان نے ریشمینے کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا..... وہ اپنی چادر سے آنسو پونچھتے ہوئے آغا بی بی سے مخاطب ہوئیں ”آغا بی بی جانے..... آپ ہی سمجھائیے خان لالہ کو..... شہباز فون پر بلانے سے نہ آیا تو ہم جا کر اسے لے آئیں گے..... اسے ان کے قدموں میں ڈال دیں گے..... وہ اس لڑکی سے علیحدہ ہو جائے گا یہ کوئی بڑی بات نہیں..... نہ ہی بڑی بات ہے..... ہم نے اپنے خاندان کو بچانا ہے اپنے بچوں کے مستقبل کو بچانا ہے..... تمکینے چپ بیٹھی تھی..... اس نے ماتھا کالی پی سے باندھ رکھا تھا..... اسے مستقل سردرد رہنے لگی تھی..... صرف..... پچھی پچھی آنکھوں سے سب کو تکتے ہوئے ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھر رہی تھیں.....

آغا بی بی کو ریشمینے نے واسطے دیئے..... فتیں کی..... رورو کر استدعا کی.....

آغا بی بی خود بھی تڑپتی چاہتی تھیں..... صبور خان کو سمجھانے لگیں.....

صبور خاموشی سے ماں کی دھواں دھار تقریر سنتے رہے..... کچھ قائل بھی ہو گئے.....

لیکن

انہیں زرگل کی طرف سے خدشہ تھا..... وہ یقیناً ایسا کوئی قدم نہیں اٹھائے گا..... یقین و اعتماد

جب ٹوٹ جائیں تو ان کا لوٹنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

تین چار گھنٹے بحث و تکرار ہوتی رہی۔ نواز خان کاروبہ مصلحتاً جواز نہ تھا۔ زیادتی ان کے بیٹے نے کی تھی۔ اس لئے جرم وار اپنے ہی کو گردان کر مجھ کو اکساری کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ورنہ نواز خان اور اتنی جلی کئی سن لیں۔ یہ بات تو ان کے مزاج ہی کے خلاف تھی۔

شام اترنے لگی تھی۔ ریشمینے اور نواز خان کو واپس جانا تھا۔ وہ سب ابھی تک اسی دالان میں بیٹھے تھے۔ کھانا بھی وہیں زہر مار کیا تھا۔ قہوہ بھی وہیں پیا تھا اور اب تاج برو اور دوسری خدمت گاریں چائے بھی وہیں لے آئی تھیں۔

چائے کے بعد نواز خان نے آغا بی بی اور صبور خان سے جانے کی اجازت مانگی۔ وہ ماں سے گلے مل کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ بی بی گل بھی آغا بی بی سے گلے ملیں اور کہنے لگیں صبور اٹھیں۔

نواز خان نے ایک بار پھر ان کی ٹھوڑی چھوئی۔ لجاجت سے التجا کی۔ معاملے کو سلجھانے کی استدعا کی۔ شہباز کے جرم کی معافی مانگی۔

صبور نے ہولے ہولے سر ہلایا۔ منہ سے کچھ نہیں بولے۔ زر گل سے بات کئے بغیر وہ کچھ کہہ بھی تو نہیں سکتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد صبور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تمکینے بھی وہاں سے اٹھ گئی۔

آغا بی بی نے تاج سے کہہ کر زری کو اپنے پاس بلالیا۔ زری آگئی۔ آغا بی بی کے پہلو میں بیٹھے ہوئے ان کے سینے سے لگ کر بے اختیار ہو کر رونے لگی۔

اس نے بزرگوں کی باتیں بحیثیت اور تکرار سن لی تھیں۔ دل و دماغ میں بالچل پچی ہوئی تھی۔ انکار و اقرار کے درمیان جنگ جاری تھی۔ شہباز نے اسے ٹھکرایا تھا۔ ماں باپ کی سختی اور دباؤ میں آکر وہ جھک بھی گیا۔ تو کیا دلوں کی دنیا آباد ہو سکے گی؟

دل اس کا جواب نفی میں دے رہا تھا۔

لیکن

دماغ

دماغ بھی تو دلائل سے قائل کر رہا تھا۔

شہباز کے ایک ہاتھ میں فون تھا اور دوسرے سے زویٰ کو سننے والے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو فون کی آواز سنتے ہی چیخ اٹھی تھی اور شہباز کے بلو کہنے پر بھر بھری مٹی کی طرح اس کے بازوؤں سے نکلی جا رہی تھی۔ صدے سے چور چور وہ نڈھال اور بے حال تھی۔ شہباز فون پکڑے پکڑے اسے بازو کے سارے لئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ خود اس کی اپنی حالت بھی تو غیر ہو رہی تھی۔ جو چمن بسایا تھا۔ اس کی پوری بہاریں بھی دیکھ نہ پایا تھا۔ کہ ویرانی اور بربادی کے سماں ہونے لگے تھے۔

فون پر خان بابا تھے۔

انہوں نے لمبی چوڑی باتیں نہیں کرنا تھیں۔ صرف شہباز کا فیصلہ سننا تھا۔

صرف فیصلہ ہی نہیں سننا تھا۔ یہ فیصلہ اثبات میں سننا تھا۔ اس کے پشاور آنے کا دن اور

وقت معلوم کرنا تھا۔ وہ جس انداز میں بات کر رہے تھے شہباز کا دل ہول رہا تھا۔

”کب آرہے ہو“ انہوں نے آہنی لہجے میں پوچھا۔

”جی۔۔۔ آ جاؤں گا“

”کب“

”دو ایک دن میں“

”کل یا پرسوں“

”ٹھیک ہے۔۔۔ ایک ہی فلائیٹ آتی ہے شام ساڑھے چھ۔“

”جی“

”شہباز خان کان کھول کر سن لو۔ تم نے پرسوں شام پشاور پہنچنا ہے۔“

”جی۔۔۔ جی۔۔۔“

”تم نے اس فیصلے سے فرار کی کوشش کی..... تو انجام جانتے ہو..... میرے ریا الوری گولیاں تم تک نہ پہنچ سکیں تو میرے سینے میں ضرور اتر جائیں گی..... اور..... تم جانتے ہو..... کہ میں..... جو کتاہوں وہ کر بھی گزر رہا ہوں.....“

”خان بابا..... میں..... میں آجاؤں گا..... آجاؤں گا خان بابا.....“

شہباز خان بابا کی باتوں سے دہل گیا تھا..... فون بند ہوا تو وہ بے حال ہو کر صوفے کی پشت سے لگ گیا چند لمحے اس کچھ سوچا ہوا تھا ہی نہیں..... زوبی اس کے پہلو میں سسک رہی تھی..... وہ اسے بھی دلا سے نہ دے سکا..... زوبی ہچکیوں سے روئے جاری تھی.....

”شہباز..... یہ کیا ہو رہا ہے.....“ اس نے اس کی گود میں سر رکھے رکھے تڑپنے کے انداز میں کہا.....

”یہی ہوتا تھا.....“ شہباز نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے رندھے لہجے میں کہا.....

”اب..... اب تم کیا کرو گے“ بیگی بیگی آنکھوں سے شہباز کو دیکھتے ہوئے زوبی التجائی لہجے میں بولی۔

”پشاور جاؤں گا.....“ اس کا لہجہ بر فیا تھا.....

”مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے.....“

”جانا پڑے گا.....“

”شہباز.....“

”جانا ضروری ہے زوبی..... تم معاملے کی سنگینی کو محسوس نہیں کر سکتیں..... یہ سب کچھ ہونا ہی تھا..... لیکن تم اس طرح رو رو کر ہلکان ہوتی رہیں تو میں..... میں کچھ بھی نہیں کر سکتا گا.....“

”میں کیا کروں.....“

”تم کیا کروں.....“

”حوصلہ رکھو..... ہمت نہیں ہارو..... میں پشاور جاؤں گا..... وہاں اپنے حق کے لئے آواز اٹھاؤں گا.....“

”تم..... تم ایسا کر سکو گے..... سارا خاندان ایک طرف اور تم اکیلے.....“

”یہ میری بھرپور کوشش ہوگی.....“

”اور اگر ناکام ہو گئے تو.....“

”تو بھی کیا ہو گا؟ زیادہ سے زیادہ یہی ناکہ زری کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور کیا جائے گا.....“

”شہباز..... یہ..... یہ.....“

شہباز نے زوبی کو لپٹا کر پیار کرتے ہوئے کہا ”میں تمہارا ہوں زوبی..... تمہارا..... حالات کی مجبوری کے تحت زری سے شادی کی بھی..... تو یہ محض اک رسم ہوگی..... جسے خاندان کو تباہی سے بچانے کے لئے پورا کرنا ہو گا.....“

”تم..... تم زری سے شادی کر لو گے“ زوبی روتے ہوئے بولی۔

”صرف شادی..... نام کی شادی..... زوبی مجھ پر اعتماد کرو..... میں زری کو چھوڑوں گا بھی نہیں..... اس کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا..... میں تمہارا ہی رہوں گا.....“

وہ کافی دیر سے زوبی کو اپنے حالات بتاتا رہا اسے تسلیاں دیتا رہا..... زری سے برائے نام شادی کا ذکر کرتا رہا..... زوبی کبھی رونے لگتی کبھی سنہل جاتی..... کبھی شہباز کی مجبوریوں کا احساس ہوتا..... کبھی اپنی ذہنی اذیت سے لہلہا اٹھتی.....

دوسرا دن بھی اسی کرب و اذیت میں گزر گیا۔

تیسرے دن وہ زوبی کو اس کی ممی کے ہاں چھوڑ آیا..... ممی ڈیڈی اسلام آباد سے آج رات واپس آنے والے تھے..... یہاں کیا افتاد آن پڑی تھی اس کا انہیں علم نہیں تھا.....

شام کو فضا ٹیٹ سے شہباز نے پشاور آنا تھا..... زوبی کسی حد تک سنہل حکمی تھی..... وہ شہباز کو ایئر پورٹ پر چھوڑنے آئی.....

”کب واپس آؤ گے“ اس نے افسردگی سے پوچھا.....

”جب بھی آیا..... تمہارے پاس ہی آؤں گا..... مجھ پر اعتماد کرو زوبی..... میں زندگی کی آخری سانسوں تک تمہارا ہوں.....“ شہباز نے جذباتی لہجے میں کہا.....

”تم اپنے الفاظ پر قائم نہ رہے تو میں مرجاؤں گی شہباز.....“

”ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالو.....“

”میں سچ کہہ رہی ہوں.....“

”اس کی نوبت نہیں آئے گی میری جان..... میں جلد لوٹنے کی کوشش کروں گا..... مجھے اپنے حق کے لئے لڑنا ہے پشاور جا کر ہی ایسا ہو سکتا ہے..... تم ہمت نہ ہارو..... میں لوٹ آؤں گا..... فکر نہ کرو..... لوٹ ضرور آؤں گا.....“

اس نے زوبی کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر محبت سے وہایا..... پھر خدا حافظ کہتے ہوئے اوجھڑا

گیا جدھر مسافر چیک ان ہو رہے تھے..... زوبی پتھر کے بت کی طرح وہیں کھڑی رہی.....

پشاور ایئرپورٹ پر زرین خان گاڑی لئے اس کا منتظر تھا۔ اس نے بیگ اس کے ہاتھ سے لے کر گاڑی میں رکھا۔ علیک سلیک اور رسمی احوال پرسی کے سوا کوئی بات نہ ہوئی۔ وہ خاموشی سے گھر آگئے۔

شہباز گھر میں مجرموں کی طرح داخل ہوا فضا بیٹی سی لگی۔ نوکروں خدمت گاروں نے سرد مری سے سلام کیا کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے انتظار میں نہ تو بی بی گل دروازے میں کھڑی تھیں نہ ہی شہنواز گاڑی کی آواز پر دوڑتے ہوئے استقبال کو آئی تھی۔

وہ اندر آیا۔ چند لمحے کوریڈور میں کھڑا رہا۔ پھر دائیں ہاتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ شہباز کے کمرے تو اوپر تھے۔ یہ مہمانوں کے ٹھہرنے کا کمرہ تھا۔

وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے اندر اتھل پھتل ہو رہی تھی۔ وہ انتہاؤں میں مٹ رہا تھا۔ کبھی اپنے کئے پر افسوس اور ندامت محسوس کر رہا تھا اور کبھی گھر والوں کی زیادتی پر غصہ آ رہا تھا۔

وہ اس کمرے سے نکلا۔ صوفے کی پشت پر سر ڈالے آنکھیں بند کئے آنے والے لمحات کے لئے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرتا رہا۔ زوبی کے حق کے لئے آواز اٹھانے کا اس نے تہیہ کر لیا۔ خاندان والوں کو قائل کرنے کی اس نے ہر ممکن کوشش کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ لڑائی جھگڑے کے لئے بھی وہ تیار ہو گیا۔

وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں آیا۔ بی بی گل ہی انتظار کے بعد ادھر آئیں۔

”شہباز۔۔۔۔۔“ انہوں نے کمرے میں آکر اسے پکارا۔

وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ ماں کو دیکھا سلام کیا اور سر جھکا لیا۔

بی بی گل کو دھچکا سا لگا۔ بازو پھیلائے ہوئے بولیں ”شہباز خان!۔۔۔۔۔ ماں سے ملنے کا دستور بھی بھول گیا سارے طور طریقے بدل ڈالے۔۔۔۔۔“

بی بی گل نے رندھی آواز میں کہا۔ تو خفت و ندامت سے شہباز پانی پانی ہو گیا۔ بے اختیار اندھا اور ماں سے لپٹ گیا۔ بی بی گل نے لپٹائے لپٹائے اس کی پیشانی چومی اور اس نے ماں کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔

بی بی گل اسے لئے لئے صوفے پر آ بیٹھیں۔ ماں کے پیار سے وہ کھلنے لگا۔ مونگے کی چٹان بھر بھری مٹی بننے لگی۔

”شہباز۔۔۔۔۔ تم نے کیا کر دیا بیٹے۔۔۔۔۔ خاندان کو تباہی کے دھانے پر لا کر کھڑا کر دیا۔ کیا بھول ہوئی تھی ہم سے کیا گناہ کیا تھا۔۔۔۔۔ جس کی تو نے ہمارے لئے اتنی کڑی سزاجوز کی۔۔۔۔۔ تو اپنے حالات سے کٹ

کیسے گیا۔۔۔۔۔ تو نے اس بد نصیب لڑکی کا بھی کچھ نہ سوچا۔۔۔۔۔ جسے تیرے پلے باندھ دیا گیا۔۔۔۔۔ جو تیرے لئے جیتی اور تیرے لئے مرتی ہے۔۔۔۔۔ جس کو تیرے سوا کوئی آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔۔۔۔۔“

”بی بی گل!۔۔۔۔۔ اس نے ہاتھوں پر چہرہ گرالیا۔

”اپنی بہن کا خیال نہ آیا تجھے۔۔۔۔۔ وہ بھی بدلے کی زنجیر میں بندھی ہے۔۔۔۔۔ تو زرگل کی بہن سے ناٹھ توڑے گا تو زرگل تیری بہن سے رشتہ کیسے جوڑے گا۔۔۔۔۔“

بی بی گل بڑے دلگرفتہ انداز میں اسے سرزنش کر رہی تھیں۔ حالات کے تقاضے سمجھا رہی تھیں۔ وہ سن رہا تھا۔ لیکن کہہ کچھ نہیں رہا تھا۔ اس کے پاس کوئی دلیل تھی نہ مواد۔ خود غرضی کے سوا اس کے دامن میں تھا ہی کیا۔

بی بی گل نے بہت جھنجھوڑا۔ تلخی سے باتیں کیں۔ طنزیہ انداز اختیار کیا۔ تو وہ صرف اسی قدر کہہ سکا۔

”بی بی گل!۔۔۔۔۔ انسان کو اپنی خوشی اور خواہش کے مطابق آپ لوگ جینے کیوں نہیں دیتے۔۔۔۔۔“

بی بی گل بھڑک اٹھیں۔ اس کی گستاخی کو معاف نہیں کر سکتی تھیں۔ خوب سنائیں۔ خوب لاتاڑا۔ شہباز کو بھی طیش آ گیا۔ اپنے حق کے لئے اس نے آواز اٹھانا ہی تھی۔ زوبی اس کی زندگی میں آچکی تھی۔ اب وہ اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

ماں بیٹھے میں خوب بحث و تکرار ہوئی۔ شہباز کبھی سر جھکا چڑھ کر بولا۔ کبھی مغلوب مغلوب ہوا۔

لیکن

وہ اپنے موقف سے ہٹا نہیں۔

بی بی گل رونے لگیں۔

شہباز کا دل دکنے لگا۔

لیکن وہ اپنی بات منوانے پر تیار رہا۔

یہ سب کچھ بی بی گل کے ساتھ ہی وہ کر سکا۔

رات خان بابا کے سامنے اس کی پیشی ہوئی۔

انہوں نے اکیلے کو اپنی لائبریری میں بلایا۔ بی بی گل کو بھی ادھر آنے کی اجازت نہ دی۔

وہاں

جو کچھ ہوا.....

وہ باپ بیٹے کے سوا کوئی نہ جان سکا.....

ہاں جب دو گھنٹے بعد وہ لائبریری سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا..... تو وہ سر جھکائے چال بھی متوازن نہیں تھی..... فیصلہ اس پر مسلط کر دیا گیا تھا..... وہ خان بابا کے سامنے پوری طرح جھک گیا تھا.....

زری سے اسے شادی کرنا ہی تھی.....

یہ

فیصلہ

پتھر پر لکیر تھا.....

اور

اس سے منحرف ہونے سے جو خون خرابہ ہو سکتا تھا..... وہ بھی اک نہ بدلنے والی حقیقت

تھی.....

شہباز رات بھر بے چین رہا..... اس کی تڑپ دیدنی تھی..... زوبی کا خیال آتا تو دل بیٹھنے لگتا.....

لیکن

فرار کی کوئی راہ تو نہ تھی۔

اس نے زوبی سے بھی بات کی..... اس خبر سے اس پر جو کچھ گزرتا تھی اس کا اسے احساس

تھا.....

لیکن

وہ اسے تسلیاں دیتا رہا..... اس نام نہاد شادی کی کوئی حقیقت نہ تھی..... صرف خاندان کو خون

خرابے سے بچانے اور اپنی بہن کا ذولہ اٹھانے کے لئے اس نے زری کو اس گھر سے اس گھر لانا تھا..... وہ قسمیں کھا کھا کر زوبی کو یقین دلاتا رہا.....

اس کی ہمت بندھا تار رہا.....

اور

شادی کے فریضے سے نہٹ کر لاہور چلے آنے کی یقین دہانی کراتا رہا.....

شہباز کے آنے کی خبر گاؤں بھی پہنچ گئی..... فون پر جو بات ہوئی تھی..... وہ توکل نواز خان خود

بتانے گئے تھے.....

آغا بی بی تسکین نے تسکین کا اظہار کیا تھا..... خاندان کو بکھرنے سے بچانے کا حیلہ سن رہا تھا..... وہ شادیوں پر نیم دلی سے رضامند ہو گئے تھے.....

لیکن

زرگل ذلت اور رسوائی کو بھلا دینے پر آمادہ نہیں تھا..... وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا تھا..... اس نے نواز چاچا سے بھی کہہ دیا تھا..... ”جو ہو چکا سو ہو چکا..... نہ دل ویسے رہے نہ ذہن..... شہباز کو زبردستی پکڑ لانے سے وہ ذلت و رسوائی تو دور نہیں ہو سکے گی نواز چاچا..... بہتر ہے آپ بات یہیں ختم کر دیں..... میں کیس..... کوئی گستاخی نہ کر بیٹھوں“ نواز خان نے ملاٹمت اور پیار سے بہت سمجھایا.....

لیکن

وہ اپنی بات پر قائم رہا.....

”زری کی شادی ہوگی نہ میری“ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا اور چاچا کا جواب نے بغیر اٹھ کر چلا گیا تھا یہ نواز خان کی بے عزتی کے مترادف تھا..... غصہ تو انہیں بہت آتا تھا..... لیکن صبور خان نے کندھا پھینچتے ہوئے کہا تھا..... ”درگزر کر دو نواز خان..... زرگل نے بڑی گہری چوٹ کھائی ہے..... وہ در در و دواذیت سے بلبلار رہا ہے“

آغا بی بی نے بھی نواز خان کو سمجھایا تھا..... ”سب ٹھیک ہو جائے گا..... شہباز آجائے تو جتنی جلدی ہو سکے دونوں شادیاں کر دی جائیں گی“

شہباز کل شام کی فلائیٹ سے آرہا ہے..... ”نواز نے کہا تھا.....

”بس ٹھیک ہے میں سارا معاملہ طے کر لوں گی..... زرگل کو بھی سمجھا بھالوں گی“

لیکن

زرگل آغا بی بی کے سمجھانے پر بھی آمادہ نہیں تھا..... اس کا خون کھول رہا تھا..... جوش غیرت میں وہ شہباز کے خون سے بھی ہاتھ رنگ سکتا تھا..... اور یہ بات وہ سب کے سامنے برملا کہہ رہا تھا.....

صبور خان نے بھی بہتر مغرمارا..... تسکین نے بھی رو دھو کر سمجھانے کی کوشش کی.....

لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا رہا.....

گھر میں جو کچھ ہو رہا تھا..... زری اک خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھ رہی تھی..... اس نے ماں باپ سے کچھ کہا تھا نہ آغا بی بی سے..... زرگل سے بھی کوئی بات نہیں کی تھی..... اس نے اپنا آپ تقدیر کے ہاتھوں میں سونپ دیا تھا..... وہ تو اس دن بھی نہیں بولی تھی جس دن آغا بی بی نے اپنے اختیارات اور حقوق استعمال کرتے ہوئے دونوں شادیوں کی تاریخ کا اعلان کر دیا تھا..... جمعرات کا دن زرگل اور شہنلو کی شادی

کے لئے مقرر ہوا تھا۔ اور جمعہ شہباز اور زری کے بندھن کا۔۔۔۔۔

لیکن اس اعلان کو زرگل نے زری کی طرح چپ رہ کر نہیں سنا تھا نہ ہی برداشت کرنے کی ضرورت سمجھی اس نے تو آغا بی بی کے حکم کا احترام بھی نہیں کیا تھا۔ صبور خان سے صاف صاف کہہ دیا تھا ”ایسا نہیں ہو سکتا بابا ایسا نہیں ہو گا“

”آغا بی بی کے فیصلے کے سامنے ہم سب نے سر جھکا دیا ہے۔ تم عدول حکمی کی جسارت نہیں کر سکتے“ خان صبور خان نے غصے سے کہا۔۔۔۔۔

وہ بھی زندگی میں پہلی بار باپ کے سامنے ڈٹ کر بولا ”خان بابا۔۔۔ میری غیرت یہ بات گوارہ نہیں کرتی۔“

”تم شہنو کو کس بات کی سزا دینا چاہتے ہو“

”جس بات کی سزا میری معصوم اور بے گناہ بہن کو ملی ہے“

”شہباز غلطی کا کفارہ ادا کر رہا ہے۔۔۔۔۔“

”میں نہیں مانتا۔۔۔۔۔“

”اس نے ہم سب سے معافی مانگی ہے۔۔۔۔۔“

”معافی سے اس کے جرم کی تلافی ہو جائے گی؟“

”ضرور ہوگی“

”ناممکن۔۔۔ اس شادی سے نہ تو زری خوش ہوگی نہ ہی وہ ذلیل آدمی۔۔۔۔۔“

”زرگل زری خاموش ہے۔۔۔ اس نے انکار نہیں کیا۔۔۔ اس نے آغا بی بی کے فیصلے کو رد نہیں کیا۔“

”کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ خوشی سے اس فیصلے پر متفق ہے“

”مصلحت کو تو اس نے سمجھا ہے۔۔۔۔۔“

”یہ سراسر زیادتی ہے خان بابا۔۔۔۔۔“

صبور چپ ہو گئے۔ کئی دنوں سے مغراری کر رہے تھے۔ وہ مان ہی نہیں رہا تھا۔ اسے

منوانے کے لئے تو صبور خان نے یہ جتن بھی کر دیئے تھے۔ کہ اس کے نانا سر بلند خان اور ماما حیدر خان کو بلا:

تھا۔۔۔ ان سے استدعا کی تھی کہ اسے صورت حال سے نپٹنے کے لئے جیسے بھی ہوتا رہا کریں۔۔۔۔۔

لیکن اس نے تو شفقتوں کو بھی جھٹلایا تھا۔ بہن کی جو تذلیل ہوئی تھی۔ اسے وہ کسی طور بھلا

نہیں سکتا تھا۔۔۔ زری ان سب باتوں سے بے خبر نہ تھی۔۔۔۔۔

زرگل اس کی خاطر اپنی زندگی بھی تباہی سے ہمکنار کر رہا تھا۔ اپنی محبتوں سے منہ موڑ رہا

تھا۔۔۔ شہنو اس کے لئے کیا تھی وہ جانتی تھی۔ لیکن اس نے اپنے پیار اور چاہت کو بھی اس کی خاطر قربان کرنے کا عزم کر لیا تھا۔ زرگل کی یہ حیثیت بھائی یہ قربانی ایسی نہ تھی۔ کہ زری متاثر نہ ہوتی۔۔۔۔۔

لیکن

وہ بھی تو زرگل کی بہن تھی۔ بھائی پر جان دینے والی۔۔۔ اس کے درد پر تڑپ اٹھنے والی۔۔۔۔۔

اس کی ذرہ بھر تکلیف پر بے چین ہونے والی۔۔۔ ٹوٹ کر چاہنے اور دل کی گہرائیوں سے پیار کرنے والی بہن۔۔۔۔۔

وہ بھی تو زرگل کو تباہ و برباد نہ دیکھ سکتی تھی۔۔۔۔۔

وہ پہروں سوچتی۔۔۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ ماؤف ہونے لگتا۔۔۔ کوئی راہ نہ نکلی کوئی رستہ

بھائی نہ دیتا۔۔۔۔۔

لیکن اس دن۔۔۔ جب زرگل نے آغا بی بی کے حکم کی تعمیل سے بھی انکار کر دیا۔۔۔ تو وہ بے

طرح پریشان ہو گئی۔۔۔ وہ اب دور ہے پر کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ اسے ایک راستہ چننا ہی تھا۔۔۔۔۔

پھر

اس نے ایک راستہ چن ہی لیا۔۔۔۔۔

اس پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی۔ کہ اپنے لئے زندہ رہنے والے مرجاتے ہیں۔۔۔ لیکن

دوسروں کے لئے مرنے والے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔۔۔ یہ موت خواہ رومانی ہو ذہنی ہو یا جسمانی بات ایک ہی ہوتی

ہے۔۔۔۔۔

اس رات وہ کھڑکی میں کھڑی دور آسمان پر ننھے ستاروں کو دیکھتے ہوئے سوچوں میں گم

تھی۔ کہ زرگل اس کے کمرے میں آگیا۔۔۔۔۔

زری کو اس کی آمد کا احساس ہی نہیں ہوا۔۔۔ وہ چند لمحے خاموشی سے کھڑا اے دیکھتا رہا۔۔۔۔۔

اس کا دل جل اٹھا۔۔۔ دماغ سنسانے لگا۔۔۔ بہن کا دکھ اس سے مخفی نہیں تھا۔ کاش وہ اس کا دامن خوشیوں

سے بھر سکتا۔۔۔ مگر ایسا ہو نہیں سکتا تھا۔۔۔۔۔

”زری“ اس نے کئی لمحوں کے بعد اسے پکارا تو وہ جلدی سے پلٹ کر اسے دیکھتے ہوئے بولی

”آپ۔۔۔ کب آئے زرگل لالہ“

”کافی دیر سے کھڑا ہوں۔“ وہ اس لمحے میں بولا۔۔۔۔۔

زری نے اس کے سر پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔۔۔ زرگل کتنا اس کا بکھرا بکھرا تھا۔۔۔ زری کی

آنکھوں میں غمی تیر گئی۔۔۔۔۔

”کیا کر رہی ہو۔“

”کچھ نہیں۔“

”ہر سوچ ذہن سے جھٹک دو زری۔ خوش رہنے کی کوشش کیا کرو۔“

”خوش ہونہ۔؟“

اس نے منہ پھیر لیا۔ زرگل اس کے چہرے کے تاثرات تو نہ دیکھ سکا۔ لیکن اس کی آواز

میں رچے دکھ نے اسے دہلا دیا۔

”زری“ وہ اس کے قریب آگیا۔ ”ہیں خوش رہنے کی شعوری کوشش کرنا ہوگی۔“

زری مڑی۔ زرگل پر اک گھائل نگاہ ڈالتے ہوئے بولی ”درپہ آئی خوشیوں کو ٹھکرا کر بھی

آپ خوش رہنے کی کوشش میں یقین رکھتے ہیں۔“

”کیا مطلب۔؟“ وہ قدرے بوکھلا کر اسے تنکے لگا۔

”زرگل لالہ“ وہ منہ موڑ کر پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ ”آپ جو کچھ بھی کر رہے ہیں

اچھا نہیں کر رہے۔“

”میں جو کچھ کر رہا ہوں۔ سوچ سمجھ کر کر رہا ہوں۔“

”شہنو کو چھوڑ کر آپ کبھی خوش رہ سکیں گے؟“

”لیکن میں اپنی بہن کے دکھوں پر اپنی خوشیوں کے محل نہیں بنا سکتا۔“

”مجھے کوئی دکھ نہیں زرگل لالہ۔ شہباز واپس آگئے ہیں۔ میرے لئے اس سے بڑھ کر

اور خوشی کیا ہوگی“

زری ”زرگل نے اک جھٹکے سے اس کا کندھا گھما کر اس کا رخ اپنی طرف کرتے ہوئے تیزی

سے کہا ”کیا کہہ رہی ہو۔“

زری نگاہیں جھکاتے ہوئے بولی ”وی جو مجھے کہنا چاہئے تھا۔ آپ کو خود سمجھ لینا چاہئے

تھا۔“

”تو کیا تم رضامند ہو شادی پر۔“

اس نے منہ موڑتے ہوئے پر اعتماد لہجے میں ہاں کہہ دیا۔ ”تو زرگل کو جیسے بجلی کا زبردست

جھٹکا لگا۔ حیرت زدہ سانس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔“

وہ زری کے چہرے سے کچھ اندازہ نہ لگا سکا۔

بعض اوقات ہم اپنے ارد گرد اتنی مضبوط اور سنگین دیواریں کھڑی کر لیتے ہیں۔ کہ کوئی ان

کے اندر جھانک سکتا ہے نہ قیاس کر سکتا ہے۔ کہ ان کے اندر کیا ہے۔ زری نے بھی مضبوط اور سنگین دیواریں کھڑی کر لی تھیں۔ وہ جان گئی تھی۔ کہ زندگی موت سے پہلے نہیں مرقی۔ اسے جینا ہے تو جینے جانے کا گر سیکھ لینا اچھا ہوتا ہے۔

”زری۔“ کافی دیر کے بعد زرگل بولا۔

جی وہ سر جھکائے جھکائے بولی۔

”یہ بات ہے۔ تو پھر۔ تم اتنی پریشان کیوں رہتی ہو۔“ وہ باؤلا سا ہور ہاتھا۔

”آپ نے پریشان کر رکھا ہے۔“ اس نے جھٹ سے کہا۔ ”تو زرگل بھونچکا سا اسے تنکنا

رہ گیا۔“

وہ چند لمحے اپنے ہاتھ مسلتی رہی۔ پھر زرگل کی طرف دیکھا۔

”زری۔ تم جھوٹ کہہ رہی ہو۔ تم شہباز کو معاف نہیں کر سکتیں۔ اسے معاف

نہیں کرنا چاہئے۔“

”یہ میرا اور شہباز کا معاملہ ہے۔“ اس نے مستحکم لہجے میں کہا۔ زرگل کو ایک بار پھر دھچکا

لگا۔

”زری۔ تم۔ تم جانتی ہو۔ نواز چاچا کی ساری دمکیوں اور سختیوں کے باوجود بھی وہ

اپنی بیوی کو طلاق نہیں دے رہا۔“

”جانتی ہوں۔“

”پھر بھی۔“

”ہاں پھر بھی میں تیار ہوں۔ رضامند ہوں۔ شہباز میرا بچپن کا مگیت رہے۔ وہ میرا چچا زاد

ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں اسے جیت لوں گی۔ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے گا۔ یہ

میرا اور شہباز کا معاملہ ہے۔ اور اس میں کسی کی بھی دخل اندازی مجھے پسند نہیں ہوگی۔“

اس نے پھر رخ کھڑکی کی طرف کر لیا۔ زرگل حیرت زدہ سا اسے تنکے لگا۔ وہ جو کچھ زری

کے منہ سے سن رہا تھا۔ اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

وہ بے یقینی سے بولا ”زری۔ تم میری ہٹ اور ضد کی وجہ سے پریشان تھیں۔“

”اوہ نہیں تو کیا۔“ وہ تیز لہجے میں کہتے ہوئے دونوں ہاتھوں پر چہرہ گرا کر رو دی۔

زرگل چند لمحے گم سم کھڑا رہا۔

پھر آگے بڑھ کر اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کے سر پر لوسہ دیتے ہوئے بولا ”مجھے معاف کر دو

زری..... میں تو بالکل ہی الٹ سمجھ رہا تھا..... میری پیاری بہن مجھے معاف کر دو نا..... تمہاری خوشیاں تو مجھے اپنی خوشیوں سے بھی زیادہ عزیز ہیں.....“

”بہنیں زر گل لالہ زری آنسو پونچھتے ہوئے مسکرا دی.....

زر گل کے چہرے پر بھی دنوں بعد مسکراہٹ کھلی.....

دوسری صبح سویرے وہ آغا بی بی کے کمرے میں تھا..... اور ان کی گود میں سر رکھے بچوں کی طرح

مچل مچل کر کہہ رہا تھا.....

”آغا بی بی جانے..... مجھے معاف کر دیں..... میں غلطی پر تھا.....“

”وہی قربان بچے.....“ آغا بی بی خوشی سے اس کا سر چوم چوم کر کہہ رہی تھیں.....

.....

دلوں میں سکون اور خوشی ویسی تو نہ تھی جیسی ہونی چاہئے تھی..... شہباز کی حرکت سے بد مزگی پیدا ہو گئی تھی..... پھر بھی یہ شادیاں خان خوش دل خان کے خاندان کے شادیاں تھیں..... پوتے پوتیوں کی..... اور اپنی خاندانی حیثیت کے مطابق تزک و احتشام سے انجام پانا تھا..... وہ سب کچھ ہوتا تھا..... جو معزز اور سرکردہ گھرانوں کی شادیوں میں ہوتا تھا..... شادیانے بنائے..... رونقیں جھوم اٹھیں..... گہما گہمی اور ہلا گلا ہونے لگی.....

شہر میں نواز خان کی کوٹھی رنگارنگ برقی قہقروں سے جگمگا اٹھی..... کوٹھی کی بہار ہی اور تھی.....

خان خوش دل خان کے پوتوں اور پوتیوں کی شادیاں ہو رہی تھیں..... کون تھا جو اس خوشی میں شریک نہ ہونا چاہتا تھا..... حجرے میں تو بہاریں اتر آئی تھیں..... گاؤں کے لوگ جوق در جوق آ رہے تھے..... رات کو خوش گلوں جو ان لوہے اور نپے گا گا کر فضا کو مترنم بناتے تھے..... خوشی میں تازہ فارنگ کی جاتی تھی..... دن میں ڈھولک سرننے والے محفل جماتے..... لختیاں ناچتیں..... اک ہنگامہ پیا ہوتا.....

ضیافتیں بھی خوب اڑنے لگی تھیں..... چھوٹے بڑے امیر غریب کی کوئی تشخیص نہ تھی..... جو کئی آباد ستر خوان پر بیٹھ جاتا..... صبور خان کے بچے خدمت گار مہمانوں کی خاطر مدارت میں بٹے ہوئے تھے..... قبوے کے دور پہ دور چلتے..... خوشبودار تمباکو کی چلمیں بھر بھر کو مہمانوں کے آگے رکھی جاتیں.....

حویلی کے اندر بھی اسی طرح گہما گہمی تھی..... گاؤں کی عورتیں..... عزیز واقارب چھوٹے بڑے سبھی روز ہی حویلی میں آ جاتے..... فرصت کے اوقات میں خدمت گاریں ڈھولک لے کر بیٹھتیں..... لڑی ڈالتیں خشک ڈانس کرتیں..... ہر فرد اس خوشی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی کوشش کر رہا تھا..... بات بات پہ مبارک سلامت کا غلغلہ اٹھتا تھا..... گو اس ہلا گلا کے لئے کوئی زیادہ دقت نہیں ملا تھا..... چند دن ہی تھے.....

پھر بھی ساں بندھ جاتا تھا..... آغا بی بی کو تو یہی ارمان تھا..... کہ کاش یہ سب کچھ مہینہ بھر پہلے طے ہو گیا ہوتا..... اپنی خوشیاں تو پوری کر تیں.....

دلوں کے حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے..... لیکن اس خوشی میں صبور خان تکینے زرگل اور زری بھی حصہ لے رہے تھے..... زری تو زرگل کی خوشیوں پر قریان ہوئی جا رہی تھی..... جب اس کا پھول کی طرح کھلا چہرہ دیکھتی تو ہاتھ اس کی طرف کر کے اپنی کپٹیوں پر مٹھیاں بنا کر رکھ لیتی اور ہنس ہنس کر کہتی ”قریان جاؤں زرگل لالہ..... قریان.....“

”اب تو خوش ہے نا.....“ وہ ہنس کر چھیڑتا..... ”شکر کر میری ضد کی وجہ سے تو جیج ہی قریان نہیں ہو گئی.....“

زری ہنس دیتی.....

مہندی کی رات بھی خوب ہنگامہ رہا..... بے انتہا فائزنگ کی گئی..... زرگل اور زری کے نھیاں والے بھی بڑی دھوم دھام سے آئے..... پھولوں کی تو جیسے بارش برسی..... شرے بنوائے گئے پھولوں کے بڑے بڑے کٹھن مہمانوں کے گلوں کی زینت بنے..... دونوں طرف مہمان تقریب میں مشرک ہی تھے..... ہاں تہکال بالا والے لوگ شر والوں کی طرف سے آئے تھے..... انہوں نے بھی خوشی میں خوب فائزنگ کی..... لگتا تھا..... دونوں نھیاں والے فائزنگ میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں.....

لوگوں کی خوشیاں انتہا کو پہنچ رہی تھیں.....

جمعرات کو زرگل کی بارات نے پشاور جانا تھا..... دوپہر کا کھانا مہمانوں کو پیش کیا گیا..... پورے پورے دنبے روست کئے گئے تھے..... کباب اور نیکوں کی بھی فراوانی تھی..... کھانا اتنا عمدہ اور وافر تھا..... کہ لوگ کھا کھا کر بے حال ہو رہے تھے.....

بست لمبی چوڑی بارات تھی..... ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع تھے..... انہیں شر لے جانے کے لئے گاڑیوں بسوں اور ٹرالیوں اور ویکٹوں کا بندوبست کیا گیا تھا..... طلحے دار ٹوپیاں اور کونیاں..... مشدی لنگیاں اور زری کے کلاہ..... گلے میں کار تو سوں کی بیٹیاں اور ہولسٹروں میں لٹکے ریوالور..... کئی کندھوں پر لٹکی بند و قیس..... بارات کی اپنی ہی روایتی آن بان اور جج دھج تھی.....

زرگل دولہا بننا..... خوب صورت کریم گلہر جوڑے پر براؤن طلحے دار واسکٹ پہنی..... صبور خان نے اس کے سر پر اپنی دستار رکھی.....

”میرا شہزادہ بھائی“ زری بھائی سے پٹ گئی..... زرگل نے اس کے سر پر شفقت سے بوسہ دیا..... آغا بی بی نے زرگل کا صدقہ اتارا..... تکینے نے اس کی پیشانی چومی..... خاندان کی ساری عورتوں

نے باری باری اسے پیار کیا..... دعائیں دیں..... پھر زرگل کے دوست رشتے کے بھائی اسے اپنے جلو میں لئے حجرے میں آگئے..... کئی فائز ہوئے..... ڈھول پٹے..... لختیاں ناچیں..... ڈھولک سرنے والوں نے رنگ جمایا..... نوجوانوں نے رقص کئے..... یوں بڑی شان سے بارات شہر روانہ ہو گئی.....

شہر میں بھی شور شرابہ اور ہنگامہ اسی طرح تھا..... بارات کی آؤ بھگت ہوئی..... پھول برسائے گئے کٹھن پہنائے گئے..... خاطر مدارات کی گئی..... رات شہنوں سرخ جوڑے اور بھاری زیورات سے لدی پھندی گاؤں پہنچ گئی..... ایک مرحلہ بخیر و خوبی طے ہو گیا تھا..... گھر والوں نے سجدہ شکر ادا کیا.....

زری کے سر سے جیسے کوئی گراں بوجھ اتر گیا..... شہنوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی تھی..... یہ آنسو کیسے تھے وہی جانتی تھی.....

کچھ بھی تھا..... اس نے زرگل اور شہنوں کے دامن لازوال خوشیوں سے بھر دیئے تھے..... دوسری شام پھر کچھ کل جیسا ہی ہنگامہ تھا.....

ہنگامہ تو سارا دن ہی رہا تھا..... لیکن اس وقت شر سے بارات کے آنے پر پورے گاؤں میں ہلچل مچی تھی..... شور شرابا بارات تھا..... کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی..... باجے گاجے کی آوازیں میں فائزنگ کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھی.....

شہباز بھی روایتی دولہوں کی طرح آیا تھا..... پر اس کے چہرے پر دولہوں جیسا نکھار اور جگمگاتی روشنی نہیں تھی.....

اس کے اندر جانے کتنا اندھیرا تھا..... کہ نہ تو چہرے پر بھی پڑ رہا تھا..... اور نہ ہی خوشی کی اداکاری بھی پورے ڈھنگ سے نہ ہو پارہی تھی..... اس شادی کا اسے شوق تھا نہ خوشی..... جبر کی شادی تھی..... خاندانوں کو دشمنی کی آگ میں جلنے سے بچانے کے لئے وہ اس نام نہاد شادی پر آمادہ ہوا تھا..... اس نے دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ زری کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا..... زوبی سے کیا ہوا وعدہ پوری ایماندار سے نبھا ہے گا..... زری کو تو اس نے صرف اس گھر سے اپنے گھر لے جا کر فرض پورا کرنا تھا.....

زری دلہن بنی سرخ جوڑا پہنا..... زیورات سے لادی گئی..... پھولوں کے ہار گجرے اسے پہنائے گئے..... تلے کی تاروں اور پھولوں کی لڑیوں والا بھاری سہرا اس کے ماتھے پر باندھ دیا گیا.....

پھر وہ وعادوں کی چھاؤں میں حویلی سے رخصت ہوئی۔۔۔۔۔

خاندان کی عزت اور وقار قائم رہا خان خوش دل خان کی خواہش پوری ہوئی۔۔۔۔۔ آغا بی بی نے صبور اور نواز کو گلے لگا کر رندھی آواز میں مبارک دیتے ہوئے کہا ”آج ہم سرخرو ہو گئے ہیں“
دونوں بھائیوں نے ماں کے ہاتھوں پر بوسے دے کر ہاتھ آکھوں سے لگائے۔۔۔۔۔ دلشمنینے اور عکینے بھی بغل گیر ہوئیں۔۔۔۔۔ سارے مرحلے بخیر و خوبی طے ہو گئے۔
لیکن عکینے اور صبور خان رنجیدہ و رنجیدہ تھے۔ بیٹی کو خدا کے بعد تقدیر کے ہاتھوں سونپا تھا۔ شہباز کا رویہ اس کے ساتھ کیسا ہو گا؟ کچھ کمر نہیں سکتے تھے۔۔۔۔۔ دلشمنینے اور نواز خان ان کی ڈھارس بندھاتے ہوئے شہر رخصت ہو گئے۔۔۔۔۔

رات اتر آئی تھی۔۔۔۔۔ حجرے اور کوٹھی میں مہمان بھرے ہوئے تھے۔ اتنے دنوں کی تکان تھی۔۔۔۔۔ کھانا کھاتے ہی لوگ سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ جسے جہاں جگہ مل رہی تھی ٹھکانہ بنا رہا تھا۔۔۔۔۔ کوٹھی کے سب کمروں میں قالینوں پر گدے اور بچے پڑے تھے۔۔۔۔۔ برآمدوں میں بھی قالین بچھے تھے۔۔۔۔۔ دلشمنینے اور تہنیکال بالاسے آئی اس کی دونوں بھابیاں مہمانوں کے لئے اندر باہر جگہ بتاتی پھر رہی تھیں۔۔۔۔۔
زری کو چھت پر شہباز کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔۔۔۔۔ وائیں ہاتھ کے دونوں کمرے شہباز کے تصرف میں ہوتے تھے۔۔۔۔۔ بڑے کمرے کو پھولوں اور رنگ برنگی روشنیوں سے خوب آراستہ کیا گیا تھا۔۔۔۔۔
کھڑکیوں و دروازوں پر پھولوں کے پردے پڑے تھے۔۔۔۔۔ بیڈ صوفے اور میزوں پر پھول بکھرے تھے۔۔۔۔۔ کمرہ ان کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔۔۔۔۔

رات خاصی ہو چکی تھی۔۔۔۔۔

جب

رشتے کی بھابیاں شہباز کو لے کر اوپر آئیں۔۔۔۔۔ چھینر چھاڑ کرتے بچتے مسکراتے انہوں نے شہباز کو کمرے میں دھکیل دیا۔۔۔۔۔

شہباز ذہنی اذیت سے دوچار تھا۔۔۔۔۔ کوشش کے باوجود وہ زری کے متعلق سوچنے سے اپنے آپ کو باز نہیں رکھ پا رہا تھا۔۔۔۔۔ بچپن سے لے کر اب تک کے واقعات ذہن کے پردے پر متحرک قلم کی طرح لہرا رہے تھے۔۔۔۔۔ زری اس کی بچپن کی منسوب۔۔۔۔۔ اس کی دوست اس کی ساتھی خدا جانے کس کمزور لمحے میں اس سے بچھڑ گئی تھی۔۔۔۔۔ وہ تو اس کی شخصیت کا حصہ تھی۔۔۔۔۔ ٹوٹ کر الگ کیوں کر ہو گئی۔۔۔۔۔ درمیان میں زوبلی آگئی تھی۔۔۔۔۔ وہ زوبلی سے محبت کرنے لگا تھا۔۔۔۔۔ لیکن کیا زری سے اسے نفرت ہو گئی تھی؟ اس کا من نفی میں خواب دے رہا تھا۔۔۔۔۔ وہ سوچنے لگا تھا۔۔۔۔۔ کہ اگر نفرت نہیں تو محبت بھی تو نہیں رہی۔۔۔۔۔ محبت تو اسے زوبلی سے تھی۔۔۔۔۔ تو

پھر۔۔۔۔۔ اس کا دل زری کے لئے کیوں پکھل رہا تھا۔۔۔۔۔ اسے نہ چھونے نہ بلانے پر ذہنی کوفت کیوں ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ ظلم کا احساس کیوں ڈس رہا تھا۔۔۔۔۔؟

انسان کچھ بھی کر گزرے۔۔۔۔۔ من مانی کر لے ظلم ڈھالے حق چھین لے پھر بھی اسے اپنے ضمیر کے سامنے جواب دہ ہونا پڑتا ہے۔۔۔۔۔ یہ انسان سے اس کی کارگزاریوں کا بڑی بے باکی سے حساب لیتا ہے۔۔۔۔۔ بالکل نہیں بخشا۔۔۔۔۔ شہباز بھی جگہ عروسی میں داخل ہوتے اسی عجب کے شکنجے میں تھا۔۔۔۔۔
وہ مجرمانہ انداز میں سر جھکائے چند لمحے دروازے ہی میں کھڑا رہا۔۔۔۔۔ اسے بیڈ کی طرف دیکھنے کی جرأت ہی نہ ہوئی۔۔۔۔۔

”شہباز“ زری کی آواز پر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔۔۔۔۔ بیڈ کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔ جہاں زری بیٹھی تھی۔۔۔۔۔ پھر اُپری پھر اُپری سی۔۔۔۔۔

چہرہ سپاٹ تھا۔۔۔۔۔ سبزی مائل بادامی حسین آنکھیں جذبوں کی کسی چمک سے نا آشنا تھیں۔۔۔۔۔ اس نے سر اٹھول اوزیو رات اتار دیئے تھے۔۔۔۔۔ سرخ جوڑا بھی زیب تن نہیں تھا۔۔۔۔۔ اس نے سادہ سے کریم کلر کپڑے پہنے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ اس کے خوب صورت بال بھی پٹیا کی صورت گندھے تھے۔۔۔۔۔ میک اپ نام کی کوئی چیز اس کے چہرے پر نہیں تھی۔۔۔۔۔ پھر بھی وہ اتنی حسین نظر آ رہی تھی۔۔۔۔۔ کہ شہباز نے پلکیں جھپکا جھپکا کر اسے دیکھا۔۔۔۔۔ اس کے سارے ارادے ڈھس گئے۔۔۔۔۔ زری کو نہ چھونے نہ بلانے کا تہیہ بھی متزلزل ہو گیا۔۔۔۔۔ اس نے بے اختیار کسے آگے بڑھنے کو قدم اٹھایا۔۔۔۔۔

زری نے اک بھر پور نگاہ اس پر ڈالی۔۔۔۔۔ ایسی نگاہ جس میں زمانے بھر کی تلخیاں سموئی تھیں۔۔۔۔۔ شہباز سر تاپا کانپ گیا۔۔۔۔۔ اس نگاہ کو سہارنے کی ہمت ہی نہ تھی اس میں۔۔۔۔۔ وہ دروازے کے قریب ہی بت بنا کھڑا رہ گیا۔۔۔۔۔ کئی بے جان۔۔۔۔۔ خاموش لیکن جانگسل لمحے گزر گئے۔۔۔۔۔

زری بیڈ سے نیچے اتر آئی۔۔۔۔۔ شہباز محذرت کے لئے لفظوں کی تشکیل کرنے میں قطعاً کام رہا تھا۔۔۔۔۔ آواز اس کے حلق ہی میں گھٹ گئی۔۔۔۔۔ اس نے بار بار کچھ کہنے کی کوشش کی۔۔۔۔۔ لیکن زبان نے ساتھ نہیں دیا۔۔۔۔۔

زری اس کے عین سامنے آن کھڑی ہوئی۔۔۔۔۔ شہباز کے سراپا پر اک گہری اور بھرپور لیکن جذبات سے خالی نگاہ ڈالی پھر وہ بے دھڑک اور سپاٹ لہجے میں لولی ”شہباز۔۔۔۔۔ یہ شادی تم نے شادی کی نیت سے نہیں کی تم اس خون خرابے سے ڈر گئے جو یہ شادی نہ ہونے کی صورت میں ہو سکتا تھا۔۔۔۔۔“

شہباز نے سر جھکا لیا۔۔۔۔۔ اپنے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بمشکل بولا ”میں شرمندہ ہوں

”اس کی کوئی ضرورت نہیں.....“ زری رخ پھیرتے ہوئے بولی ”شادی میں نے بھی نبھاہ کرنے کے لئے نہیں کی شہباز خان..... میں بھی نہیں چاہتی تھی کہ دونوں خاندان الگ ہو کر دشمنی کی ایسی راہ پر گامزن ہو جائیں..... جو کہیں ختم نہیں ہوتی..... اور نسلیں اس کی زد میں آکر تباہ و برباد ہو جاتی ہیں.....“

وہ سر جھکائے نادم نادم سا کھڑا رہا

زری اسی طرح رخ موڑے موڑے بولی ”دوسرے میں یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ تمہارے کئے کی سزا زرگل لالہ اور شہنو کو بھگتنا پڑے..... وہ ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے ہیں..... اور چاہتیں بکھر جائیں!! اس سے بڑی زیادتی اور کوئی نہیں ہوتی.....“

”زری“ شہباز نے ہاتھ بے اختیارانہ اس کی طرف بڑھایا.....

زری قدرے پرے ہٹ کر بولی ”ہاں شہباز میں نے ان دونوں کو خوش و خرم دیکھنے کے لئے شادی کے لئے آمادگی ظاہر کی تھی..... ورنہ میں بے خبر تو نہیں تھی کہ کھوٹے سکے کیش نہیں ہوتے.....“

”زری مجھے معاف کر دو..... زری.....“ وہ بے بسی سے رندھی آواز میں بولا.....

زری نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا..... یہ مسکراہٹ آنسوؤں کی نمی میں ڈوبی تھی..... کتنا کرب تھا اس مسکراہٹ میں..... کتنا دکھ تھا کتنی اذیت تھی اس مسکراہٹ میں شہباز کا دل کٹ گیا..... وہ بچا رنگی سے زری کو دیکھنے لگا..... اس وقت اسے ذوبی بھول گئی..... اس کے سامنے زری تھی..... صرف زری..... جو انتہائی معصوم بے گناہ اور عظیم نظر آ رہی تھی.....

”زری.....“ شہباز پھر گھگھکیا ”مجھے معاف کر دو.....“

”شہباز..... معافی کا کیوں بار بار کہہ رہے ہو..... جب جانتے بھی ہو کہ ہماری یہ شادی نمائشی شادی ہے..... صرف کچھ فرض نبھانے کے لئے..... شادی تو دونوں کے بندھنوں سے بندھتی ہے..... تم یہ بندھن کہیں اور باندھ چکے ہو..... کیا تم اس بندھن سے مخلص رہنا نہیں چاہتے.....؟“

”زری“ شہباز سے کوئی جواب نہ بن پڑا.....

”شہباز..... کوئی عورت..... کوئی بیوی اپنی محبت میں شراکت برداشت نہیں کر سکتی..... یہ اتنی بڑی حقیقت ہے کہ جسے دنیا کی ہر عورت جانتی ہے تسلیم کرتی ہے..... تمہاری..... بیوی بھی ایک عورت ہے..... وہ بھی یہ شراکت برداشت نہیں کرے گی..... جانے اب تک ایک ایک لمحہ اس پر کتنا بڑا عذاب بن کر گزرا ہو گا..... وہ کس طرح ترپ رہی ہوگی..... کس طرح بے حال ہوگی..... تم نے تو اسے عام سی اطلاع دے دی ہوگی..... اپنی شادی کی اطلاع..... لیکن اس پر جو بیت رہی ہوگی..... اس کا مجھے احساس ہے..... اور اسی لئے..... میں چاہتی ہوں.....“

زری چند لمحوں کے لئے رکی..... تھوک نگلی..... ذرا سا کھنکار کر گھاساف کیا..... قریب پڑی کر سی کی پشت کو مضبوطی سے پکڑ لیا..... یوں لگا جیسے وہ اپنے آپ کو مجتمع کرنے کی کوشش کر رہی ہے.....

شہباز نے اس کی طرف دیکھا..... اس کے رک جانے سے سہم گیا..... اس کے تیر ہتا رہے تھے کہ وہ کوئی انتہائی اہم فیصلہ سنانے والی ہے..... ایسا فیصلہ جس کی ہلاکت آنسوؤں سے وہ خود بھی ہراساں ہے..... لیکن جس کے سنا دینے میں وہ کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کر رہی.....

زری نے پھر رخ اس کی طرف موڑ لیا..... چند لمحے اسے دیکھتی رہی..... شہباز اس کی نظروں سے بچنے کے لئے کبھی دائیں کبھی بائیں تنکنا رہا.....

”شہباز“ وہ مستحکم آواز اور ٹھوس لہجے میں بولی ”میں چاہتی ہوں کہ آج..... اور اسی وقت..... اس نمائشی شادی کو ختم کر دیا جائے.....“

”زری.....“ شہباز نے ترپ کر اس کی طرف دیکھا..... بے اختیارانہ آگے بڑھا.....

زری نے کوئی اثر لئے بغیر اس کو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا..... ”کوئی جذباتی کمزوری نہیں چلے گی شہباز خان..... ہمارا رشتہ آج اور ابھی..... ختم ہو جانا چاہئے.....“

”کیا کہہ رہی ہو زری.....“ شہباز کا دماغ چکرانے لگا.....

”اپنا فیصلہ میں نے سنا دیا ہے..... یہ فیصلہ میں نے اسی دن کر لیا تھا..... جس دن شادی کے لئے آمادگی کا اظہار کیا تھا..... خاندان رنجشوں سے بچ گیا ہے..... میرے زرگل لالہ نے اپنی منزل پالی ہے..... میرے سامنے صرف یہی مشن تھا..... میں..... اب میرا تمہارا کوئی رشتہ نہیں.....“ زری کے فیصلے میں تلواری دھار کی کاٹ تھی.....

”زری..... سوچو تو..... کیا کہہ رہی ہو..... یہ بندھن.....“ شہباز کی اکھڑی اکھڑی سانس تھی.....

زری کھوکھلی سی ہنسی اور بولی ”کیسا بندھن شہباز خان؟..... جب کوئی بندھن بندھنا ہی نہیں..... تو توڑنے میں کیسی دشواری..... مجھے طلاق چاہئے..... ابھی..... اسی وقت.....“

زری کے لہجے میں طوفانوں کی دھمک تھی..... اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں..... اس کی سنہری رنگت میں شعلوں کی لپک دکھائی دینے لگی تھی.....

”زری..... ہوش کی باتیں کرو..... تم نہیں سمجھ رہیں کہ کیا کہہ رہی ہو.....“ شہباز قدم بڑھا کر آگے بڑھا.....

زری نے پھر ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ ”میں نے خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے شہباز خان۔“

”اس کے نتیجے کا بھی سوچا۔“

”ہاں خوب اچھی طرح۔ نتیجہ اس لئے بھی برا نہیں ہوگا۔ کہ یہ فیصلہ صرف میرے اور تمہارے درمیان زندگی بھراک راز کی صورت رہے گا۔ اور یہ بھی صرف خاندانوں کی آن بان اور اپنے والدین کی بے داغ عزتوں کی خاطر مجھے یقین ہے تم بھی تعاون کرو گے۔“

”زری۔“ شہباز نے ماتھا ہاتھ پر گرالیا۔ پھر بے چینی سے سراٹھایا۔ ملتی نظر دوں سے زری کو دیکھا بچا رنگی سے بولا۔ ”تم جو کچھ کہہ رہی ہو اسے سمجھ نہیں رہیں۔“

”میں اتنی نادان بھی نہیں ہوں۔ جتنا شاید۔۔۔ تم مجھے سمجھتے رہے ہو۔“

شہباز تڑپ اٹھا۔ بلبلاتے ہوئے بولا ”زندگی کا سفر طویل ہوتا ہے۔ تم اکیلے مسافیت طے کر لوگی؟“

وہ تلخی سے ہنسی اور دل چیر دینے والے انداز میں بولی ”شہباز خان۔۔۔ مسافیت تو مجھے اکیلے ہی طے کرنا ہیں۔۔۔ طلاق ہو یا نہ ہو۔۔۔“

”زری“ وہ تڑپا۔

زری ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی ”میں کبھی نہیں چاہوں گی شہباز کہ تم نے جس عورت سے زندگی بھر نبھانے کے لئے مجھے ٹھکرا کر بندھ گیا ہوں اسے کسی دھوکے میں رکھو۔ اس سے وفاداری تمہارا اخلاقی فرض ہے۔ میں تمہارے لئے آزمائش بننا نہیں چاہتی۔ نہ ہی میں۔۔۔ کسی اترن کو اپنے بدن کے قریب آنے دوں گی۔“

شہباز ندامت سے سر جھکائے کھڑا ہوا۔

زری چند لمحے چپانی سے اپنے ہاتھ مسلتی رہی۔ پھر گھبر لہجے میں بولی ”زندگی کی راہ بڑی طویل ہے۔۔۔ تم یقین رکھو شہباز میں اسے مختصر کرنے کی شعوری کوشش کبھی نہیں کروں گی۔ تم اطمینان سے اپنی خوشگوار اور پرہیزگار زندگی کی طرف لوٹ جانا۔ اب مجھے طلاق دے دو۔۔۔“

”زری۔“ شہباز بے آنسوؤں کے روناٹھا۔ ”تم نے خاندان کو جن مصائب سے بچایا ہے اس فعل سے وہ پھر اسی طرح دوچار ہو جائے گا۔“

وہ اطمینان سے سرفنی میں ہلاتے ہوئے بولی ”نہیں۔۔۔ نہیں شہباز۔ ایسا نہیں ہوگا۔ یہ میرے بچا کا گھر ہے۔ میں طلاق کے بعد بھی یہاں رہ سکتی ہوں۔ پورا حق ہے مجھے یہاں رہنے کا

اور میں یہیں رہوں گی بھی۔۔۔ تم نے اس راز کو راز رکھا۔۔۔ تو یقین جانو۔۔۔ کوئی۔۔۔ الجھن پیدا نہیں ہوگی۔۔۔ سب۔۔۔ ٹھیک رہے گا۔۔۔ بالکل ٹھیک رہے گا۔۔۔“

”زری۔۔۔“ وہ بے اختیار نہ چیخا۔ اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں پر گرا لیا۔ وہ شاید سک بھی اٹھا۔

لیکن

زری کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی۔ اس کی کرسی پر گرفت بے شک اور مضبوط ہو گئی۔ لیکن اس نے اپنا مطالبہ بار بار دہرایا۔

شہباز سراٹھا کر زری کو تنکے لگا۔

زری

جس کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ اس سے پوشیدہ نہ تھی۔

لیکن

جو اپنا آپ لٹا کر اس کے لئے زندگی کی راہیں سہل بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔

یہ غیور بہادر اور عظیم لڑکی۔

جسے اس نے اس وقت نہیں بلکہ اس وقت ہی کھو دیا تھا۔ جب زری نے پیار کا ناطہ جوڑا تھا۔

اپنا آپ اس کے سامنے بالکل مفرگ رہا تھا۔

بحث و تکرار کچھ دیر اور چلی۔

لیکن

زری کسی اترن کو چھونے تک تیار نہ تھی۔

”تم نے جس کے ساتھ ناطہ جوڑا ہے۔ اب پوری وفاداری کے ساتھ صرف اسی کے رہو۔۔۔ تم زندگی کو آزمائش نہیں بناؤ۔ شہباز۔۔۔ لوٹ جاؤ اپنی بیوی کے پاس۔۔۔ خون کے رشتے نہیں ٹوٹتے۔ میں تمہاری بچا زاد ہوں۔ اس ناطے سے اس گھر میں ساری عمر اس خاموشی سے گزار دوں گی۔۔۔ کہ کسی کو۔۔۔“

”زری۔۔۔“ وہ زخم خوردہ تھا۔۔۔ کرچیاں چنٹے پوریں لہو لہان ہوئی جاتی ہیں۔

”مجھے طلاق چاہئے شہباز۔۔۔ تم ابھی مجھے تین بار طلاق دے دو۔۔۔ بس بحث و تکرار سے کچھ نتیجہ نہیں نکلے گا۔ طلاق دے دو۔۔۔ پھر میری طرف سے تم بالکل آزاد ہو۔۔۔ چاہو تو کل ہی لاہور جا سکتے

ہو..... میں معاملہ منہال لوں گی.....

”زری..... خدا کے لئے یہ الفاظ زبان پر نہ لاؤ.....“ شہباز مشتعل سا ہو کر بولا.....

زری نے ایک بار پھر اس پر بھرپور نگاہ ڈالی.....

”میں ایسا نہیں کر سکتا..... میں ایسا نہیں کروں گا.....“ وہ جوش جذبات میں آکر اونچی

آواز میں بولا.....

”کیوں؟ کیوں! نہیں کر سکتے..... کیوں نہیں کر دگے.....“ زری کالجہ بھی اونچا ہو گیا.....

”اس لئے..... اس لئے کہ..... میں.....“ وہ کچھ کہہ نہ سکا..... زری نے گہری سانس لی اور

زہریلی مسکراہٹ لبوں پر پھیلاتے ہوئے بولی ”اس لئے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو.....“

”ہاں..... ہاں کرتا ہوں.....“ شہباز نے اپنے سینے میں سوئی محبت کو ایک طوفانی انگڑائی

لے کر بیدار ہوتے ہوئے محسوس کیا زری ہنس پڑی..... اتنا ہنسی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے.....

شہباز پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا.....

”اتنا جذباتی ہونے کی گنجائش نہیں ہے شہباز خان.....“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر بولی.....

”میں اتنی ارزاں نہیں ہوں..... کہ تم جب چاہو ٹھکرا دو..... جب چاہو اپنا لو.....“

”مجھے معاف کر دو زری..... معاف کر دو..... وہ بے بسی اور بیچارگی کی انتہاؤں

کو چھوتے ہوئے چیخا.....

”نہیں..... کبھی نہیں.....“ جواب آہنی اور دو ٹوک تھا.....

زری بڑے استحکام سے اپنی بات پر قائم تھی..... کسی جذباتی لمحے نے اسے کمزور نہیں ہونے دیا

تھا..... زری ایک بیکراں سمندر کی طرح پھیلی ہوئی تھی..... اس سمندر میں زری کی ذات تنکے کی سی لگ رہی تھی.....

استحکام اور طوفان ٹکراتے رہے.....

رات کا دل دہلتا رہا ڈوتا رہا.....

لمحے سرکتے رہے.....

زری اپنی بات پر ثابت قدمی سے جمی رہی..... اس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر شہباز نے اسے

طلاق نہ دی تو وہ ریوڑ کی ساری گولیاں اپنے سینے میں اتار لے گی.....

اس نے جو کچھ کہا تھا وہ کبھی گزرنے والی تھی.....

اسی لئے جب اس نے کئی بار یہی بات کی..... تو شہباز کچھ نہ کر سکا.....

زری نے اس کے منہ سے طلاق کا لفظ تین بار کہلوا لیا..... بے آوازی سارے بندھن ٹوٹ

گئے.....

”اب تم آزاد ہو.....“ زری نے پتھر لیے برقیے لمبے میں کہا اور اس کی طرف دیکھ کر

سے نکل کر دوسرے کمرے میں چلی گئی.....

شہباز لانا لٹا سا کھڑا رہ گیا.....

حیران

پریشان

اور شذر

وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا

کہ

زری نے اسے آزاد کر دیا ہے

یا

ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سلگتی آگ کی بھٹی میں ڈال کر کبھی نہ ختم ہونے والی سزا دے دی ہے.....

کبھی نہ ختم ہونے والی سزا

ضمیر کی سلگتی بھٹی میں ڈال کر

زری خوش ہو گئی کہ شہباز واپس آ گیا..... وہ تو سارے بندھن بھی توڑ آیا تھا..... جو زری کی

خوشیوں کو لو لہان کر رہے تھے..... وہ جیت گئی تھی..... زری ہار گئی تھی

لیکن

زری کی جلد ہی احساس ہونے لگا کہ شہباز تو واپس آکر بھی نہیں آیا.....

بندھن ٹوٹ کر انٹ بن گئے ہیں..... زری ہار کر بھی جیت گئی ہے.....

زری کو شہباز کا صرف پکیر ہی ملا.....

اس کی روح اور دل و دماغ کے افق پر زری کی عکسوں کی پوری تابانی سے چمکتی رہی.....

قابض رہی.....